دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
اکتوبر 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 43 • شمارہ 10 • اکتوبر 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

اختتام کی جانب رواں دواں سال 2013ء کے ماہِ اکتوبر کا شمارہ آپ کی نذر ہے... ہمارے اہم پڑوسی اور برادر ملک نے امریکی جبر و استبداد کے سامنے سینہ سپر ہو کر دنیا کو یہ دکھا دیا کہ عزم و استقلال کے زور پر قومیں... جی ہاں، قومیں جو کروڑوں کا منتشر الخیال ہجوم نہیں بلکہ یک آواز و یک جان ہوتی ہیں... آخرکار سرخرو ہوتی ہیں۔ 1979ء سے 2013ء آ گیا۔ چونتیس برس کھینچا تانی جاری رہی، ایران پر آتش و آہن کی برسات کی سرگوشیاں بھی گونجتی رہیں لیکن ایرانی قیادت اپنی قوم کی بھرپور پشت پناہی کے اعتماد کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹی رہی اور آخرکار امریکی صدر اپنے ایرانی ہم منصب سے ہم کلام ہونے پر مجبور ہو گیا... یہ معاشی استعمار کی شکست کی ایک بے مثال حقیقت ہے۔ ذرا موازنہ تو کریں کہ ہم کہاں ہیں۔ نائن الیون کے ہولناک سانحے کے بعد ہی امریکا کے ایک سرکاری گرگے کے فون پر ہم نے اپنا سب کچھ نہیں تو بہت کچھ اسے سونپ دیا جس کا خمیازہ پاکستانی آج تک بھگت رہے ہیں۔ آج کی حزبِ اختلاف نے اپنے آخری دورِ اقتدار میں ایران کے ساتھ قدرتی گیس کی خریداری کا اہم ترین معاہدہ کیا تھا جو ایران سے امریکی ناراضی کے سبب ایک امتحان بنتا نظر آ رہا ہے۔ اب امریکا کے تیور نرم ہوئے ہیں تو امید کی جانی چاہیے کہ پاک ایران گیس پائپ لائن کا منصوبہ بروقت مکمل ہو کر ہماری معاشی شہ رگ کے لیے ایک کامیاب بائی پاس آپریشن ثابت ہوگا۔ چولہے جلتے رہیں گے، گاڑیاں اور کارخانے بھی اس شہ رگ سے جان پکڑیں گے۔ اس خوش گمانی کے ساتھ قارئین کو عیدِ قرباں کی دلی مبارکباد... بس ایک گزارش کے ساتھ کہ ان خوشیوں میں پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خان کی 16 اکتوبر کی شہادت کو بھی یاد رکھیں۔ پاکستان کے اکابرین اور محسنوں کو نئی نسل رفتہ رفتہ فراموش کرتی جا رہی ہے۔

اب چلتے ہیں میدان کی طرف جہاں زور کا رن پڑا ہوا ہے۔

رحیم یار خان سے مظہر سلیم کی حاضری ”بھئی ہم جاسوسی سے خفا ہیں، اگر ہمیں جاسوسی سے محبت ہوئی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اتنا طویل انتظار آخر کون سے طوفان کا پیش خیمہ ہے؟ ویسے ہم جاسوسی سے کتنے ہی خفا کیوں نہ ہو جائیں، جاسوسی کو خود سے زیادہ دور نہیں رکھ سکتے۔ ستمبر کا جاسوسی ڈائجسٹ طویل اور کٹھن انتظار کے بعد 8 تاریخ کو ہاتھوں کی زینت بنا۔ اس بار سرورق جاسوسی کے عین مطابق تھا، پردے کو تھوڑا سا ہٹا کر کھڑکی سے باہر نکلتا پستول والا ہاتھ اور عقب میں دھندلی دھندلی دکھائی دینے والی تین منزلہ عمارت سے یہ تاثر ملتا تھا کہ جاسوسی کے رنگ کمال کے ہوں گے۔ سرورق کے بعد ہم سیدھے چینی نکتہ چینی میں پہنچے۔ خطوط میں تخت و طاؤس پر مستند اور سینئر تبصرہ نگار محترمہ بشریٰ افضل صاحبہ براجمان نظر آئیں۔ لیکن محترمہ نے مختصر لکھا مگر پھر بھی اچھا لکھا۔ ادارے نے جو اعزاز انہیں بخشا ہے، اس کی مخالفت کی تاب ہم میں کہاں؟ بشریٰ جی مبارک باد قبول فرمائیے۔ اعجاز راحیل، قیصر اقبال دونوں کا اندازِ نگارش بہت دل لبھانے والا ہوتا ہے۔ حلہ گنگ سے عروج ناز عرف بے نام دوشیزہ آپ نے جس بات کی وضاحت کی ہے آپ کی پختہ تحریر اس وضاحت کی نفی کرتی ہے اور جناب اس مرتبہ تو جاسوسی کو دیکھ کر ماہا ایمان کی باچھیں اتنی کھلیں کے کانوں تک جا لگیں اور مردوں کی باچھیں صنفِ نازک کو دیکھ کر کھلنے پر آپ کو اعتراض ہے تو آپ شٹل کاک برقع کا استعمال کیا کریں، کیا خیال ہے؟ کہانیوں میں سب سے پہلے جواری پڑھی۔ احمد اقبال صاحب کی کہانیوں میں گہرائی معنویت اور انسانی نفسیات کا ادراک ملتا ہے۔ جواری کی موجودہ قسط سے کہانی کے خال و خط واضح ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ابتدائی صفحات کی کہانی کو اس ماہ کی بہترین کہانی نہ کہنا مصنفہ پروین زبیر کے استحقاق کی نفی ہوگی۔ پیادے موجودہ حالات کے تناظر میں لکھی گئی ایسی داستان جو ہم نے دل کی آنکھ سے پڑھی۔ سرورق کی پہلی کہانی نجات میں سرمد رحمٰن نے ہمارے ازلی دشمن بھارت کے مکروہ نمائندے روبندر کوشک عرف حمید داتا کو جہنم واصل کیا اور اپنی جان دے کر وطن کا سپوت ہونے کا ثبوت دیا۔ سرورق کی دوسری کہانی مقتول قاتل میں غوثیہ شبیر نے ایسے افراد کا پول کھولنے کی کوشش کی ہے جو خود کو انتہائی پارسا ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے باطن میں غلاظتوں کا تعفن ہوتا ہے۔ مختصر کہانیوں میں محمد فاروق انجم کی عمر قید اچھی لگی۔ باقی کہانیوں میں سلیم انور کی آنکھ اوجھل، جمال دستی کی احسان فراموش، امجد رئیس کی ترکیب، کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ، شمارے کے اقتباسات اور تراش خراش بھی خوب رہیں۔“

سرگودھا سے راجا اسلم اینڈ زیبی بڈھے والا کا اشتراک ”جاسوسی سب سے پہلے ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ ٹائٹل پر موجود گرل خمار زدہ آنکھیں لیے بڑی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد فہرست پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے پہنچے اپنی پیاری محفل میں جہاں مدیرِ اعلیٰ صاحب پاکستان کے دگرگوں حالات کا قصہ سنا رہے تھے جو کہ پاکستان میں معمول بن چکا ہے۔ اس دفعہ کرسیٔ صدارت پر ہماری بزرگ راہنما بشریٰ افضل کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ شاید انکل نے ان کا کرسی کے لیے رونا دیکھ کر انہیں وہاں بٹھا دیا ورنہ اس عمر میں وہ کہاں اس عہدے کو سنبھال پائیں گی۔ (اب آپ دل دکھانے والی باتیں بالکل نہ کریں) آگے بڑھے تو دیکھا کہ عروج ناز اپنے آپ کو انکل کی طرف سے دوشیزہ کہنے پر خود بھی حیران و پریشان منہ پھاڑے کھڑی تھیں اور اسی خوشی میں جناب نے ایک اچھا تبصرہ لکھ ڈالا۔ ماہا ایمان صاحبہ! ڈاکر انکل چونکہ صرف شادی شدہ مردوں کو ہی ٹائٹل پر دکھاتے ہیں اس لیے ان کی ایسی حالت ہوتی ہے جو کہ بیویوں کے ہاتھوں بن چکی ہوتی ہے۔ (واہ! کیا زبردست تجزیہ ہے... ہم تو آپ کے قائل ہو گئے) احمد وصال صاحب! آپ یقیناً آگے اچھا تبصرہ لکھیں گے کیونکہ بقول آپ کے آپ لفظوں کے کھلاڑی نہیں تو ہمیں اناڑی بھی نہیں لگے۔ آفتاب صاحب کہیں آپ نے رمضان شریف

میں پھلوں کی ریڑھی تو نہیں لگا رکھی جو اپنے تبصرے میں بھی پھلوں کی بولیاں ہی لگاتے رہے۔ اس کے علاوہ انجینئر عمیر، یوسف زئی، ثمینہ حبیب اور ڈاکٹر عمران کے تبصرے اچھے لگے۔ گرداب میں شہریار اور سلو فل ایکشن میں نظر آئے جبکہ لگتا ہے اسلم اس مہم میں مر جائے گا۔ مشا برم بھی ماہ بانو کے پاس پہنچ گیا ہے جہاں وہ اس کو شہریار کے کوے میں چلے جانے کا بھی بتائے گا۔ جواری میں جان بوجھ کر آخر میں سسنی پھیلائی گئی ہے حالانکہ نازی نے دروازہ احتیاطاً بند کیا ہوگا۔ پروین زبیر کی ابتدائی صفحات پر پیادے بالکل حقیقت کے قریب تر اسٹوری تھی جس میں ان کالی بھیڑوں کے چہرے سے پردہ اٹھایا گیا ہے جس میں ہمارے وزیر، مشیر، انجینئرز اور نام نہاد مذہبی راہنما تک موجود ہیں۔ پہلا رنگ نجات بھی اسی سلسلے کی ہی ایک کڑی تھا جس میں دکھایا گیا کہ کس طرح یہودی اور بھارتی ایجنٹ نام کے مسلمان بن کر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور اندر ہی اندر پاکستان کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ دوسرا رنگ مقتول قاتل بہت زبردست رہا جس میں مصنفہ نے ہمارے معاشرے کا ایک اور گھناؤنا کردار دکھایا ہے۔ حاکم جیسے کردار واقعی اس معاشرے کا ناسور ہیں جن کو انسانیت اور رشتے کی کوئی پہچان نہیں۔"

خانیوال سے محمد قدرت اللہ نیازی کے پُرحکمت جوابات "جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ حسینہ کا چہرہ دیکھ کر ایسا لگا جیسے بدلے کی آگ دل میں لیے بیٹھی ہو۔ سامنے ہی سینے پر گولی کھا کر مرنے والا ادھیڑ عمر مرد اور خفیہ ہاتھ پستول لیے موجود تھا۔ سرورق سے بائی جمپ لگائی تو سیدھے چینی دان میں جا پہنچے جہاں نئے پرانے ساتھی اپنے حصے کے مطابق چینی کھانے میں مصروف تھے۔ (تھوڑی سی آپ بھی کھالیں) کرسیِ صدارت پر بشریٰ افضل قیام پذیر ہیں۔ کافی عرصے بعد واپسی ہوئی۔ ہماری طرف سے واپسی اور کرسیِ صدارت دونوں کی مبارک باد قبول کریں۔ قیصر اقبال آپ کی باتیں ہم تو سمجھ رہے ہیں لیکن نہ سعدیہ کو سمجھ آتی ہے نہ پڑوسنوں کو اس لیے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ زویا اعجاز! کسی سے انسپائر ہو جانا ایک فطری عمل ہے لیکن اتنا زیادہ اثر تو نہ لیں۔ کبیر عباسی کی گریڈنگ کو ہضم کرنا ہی مشکل تھا، اب آپ بھی؟ عروج ناز! پلیز آپ پہلے دوشیزہ کے معنی دیکھ لیں، اپنے آپ کو دوشیزہ کہتے ہوئے خود ہی شرمندہ ہو جائیں گی۔ اللہ آپ کو غلطیوں کی اصلاح کرنے کی مزید توفیق دے، آمین۔ رانا حماد فرہاد! جاسوسی سے اتنی بدگمانی؟ بہرحال اب آپ کی بدگمانی یقیناً دور ہو گئی ہوگی۔ ثمینہ حبیب! جو لوگ اپنے اوپر ہنسنا جانتے ہیں، وہ واقعی بہادر ہوتے ہیں اور ہم نے بھی خط لکھا، نہیں چھپا اب پھر لکھ رہے ہیں کیونکہ جاسوسی تو اپنا ہے۔ (واہ کیا بات ہے... دل والوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے) ماہا ایمان! صنفِ وجاہت کو صنفِ کرخت میں بدلنے والی اور اسے مضحکہ خیز پوزیشن میں لانے والی آپ ہی تو ہیں۔ اوہ، میرا مطلب آپ کی صنف ہی ہے، باقی جتنی چاہے خوش فہمیاں آپ پال لیں ہم چپ ہیں۔ احمد حیات! آپ کے پاؤں پالنے میں نظر آ گئے ہیں۔ ہماری طرف سے بھی ویلکم۔ تصویر العین نان اسٹاپ بولتی نظر آئیں۔ پیادے پڑھ کر ایسے لگا جیسے ہر پاکستانی بکاؤ مال ہے۔ آستین کے سانپوں کی نشاندہی کرتی ہوئی چشم کشا تحریر بہت پسند آئی تاہم موساد جیسی عیار تنظیم کی اتنی آسانی سے جاسوسی کرنا اور ویڈیو وغیرہ بنا کے لانا کچھ جچا نہیں۔ گرداب میں شہریار اور سلو کا ایکشن مزہ دے گیا۔ ایڈی کا کردار مغربی معاشرے کی سفاک اور غیر انسانی ریسرچ کا حامل تھا۔ اسلم بھی اس گروپ کے شکنجے میں جکڑا جا چکا ہے۔ دیکھیں اسماجی ان کو کیسے اس صورتِ حال سے نکالتی ہیں۔ آخری رنگ مقتول قاتل انسانی رشتوں کی پامالی کا عکاس رہا۔ حاکم کے کردار پر شروع میں ہی شک ہونا شروع ہو گیا جو ٹھیک نکلا۔ پہلا رنگ نجات بھی اچھا رہا۔ کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ مزاح سے بھرپور تھی۔ پولیس کی تیز رفتار کارکردگی پڑھتے ہوئے لاشعوری طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے۔"

شہزادہ کوہسار مری سے کبیر عباسی کا گونا گوں تبصرہ "ٹائٹل گرل کی منڈی (گردن) الگ تے مونڈھا (کندھا) الگ۔ ڈاکٹر انکل سے اس ٹیکنیکل خامی کی امید نہیں تھی۔ بہرحال، بندہ اگین ایک ہی دیکھ کر دل کو گونا گوں سکون حاصل ہوا۔ کھڑکی سے جھانکتا پستول بردار ہاتھ اور بلڈنگ... سرورق کے رائٹرز کی سوچ کو مہمیز کر رہے تھے۔ مجموعی طور پر ٹائٹل اوسط سے کچھ بہتر رہا۔ فہرست کا ڈیزائن تو عام سا ہی تھا مگر سرورق کے رنگوں میں نئے نام دیکھ کر دل کو ایک بار پھر گونا گوں سکون حاصل ہوا۔ بشریٰ آنٹی! اب وہ خوراکیں کہاں؟ ویسے دوستو! بشریٰ افضل کو آنٹی کہنا جائز ہے کیا؟ یہ نہ ہو نا سمجھ کی آنٹیاں مائنڈ کر جائیں کہ "لے دس اگر یہ آنٹی ہے تو ہم تو کل کی بچیاں ہیں" اور انکل ذرا انہیں بتائیں کہ ضروری نہیں کہ معیاری تبصرہ لمبا چوڑا ہی ہو۔ عروج ناز! آپ نے کترینہ جی کو لنگور کہا۔ بہت بری بات ہے، اتنی حسین تو ہیں وہ۔ قیصر اقبال کے ساتھ اعجاز احمد راحیل بطور... چلیں رہنے دیں، آپ کو دُم چھلا کہیں تو آپ بہت تپتے ہیں، سو نہیں کہتے۔ ماہا ایمان! آپ لگتا ہے اس بکری سے بہت متاثر ہیں جو دودھ تو دیتی ہے مگر مینگنیاں ڈال کر۔ سید اکبر! ہم کترینہ جی کے پیچھے نہیں پڑے ہوئے، ہم تو انہیں ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ اپنا تفصیلی تبصرہ پڑھ کر ایک دفعہ پھر دل گونا گوں سکون سے دوچار ہو گیا۔ محی الدین اشفاق! ہماری وائف جی کہتی ہیں کترینہ جی کے بارے میں جتنا چاہیں سوچیں کہ ہنوز دلی دور است۔ لیکن خبردار جو پاکستانی ایکٹریس کے بارے میں سوچا۔ اب آپ بتائیں ہم کریں تو کیا کریں؟ احمد وصال اور وشیفہ زمرہ پہلی انٹری پر ہم آپ کو ویلکم کہتے ہیں۔ اے کیو حسین! آپ کیا خوب صورتی سے الرجک ہیں جو بقول آپ کے ہمارے ساتھ سرورق کی حسینہ کو دیکھ کر آپ کی آنکھ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ تصویر العین! جب ماہ شناختی کارڈ بنوانے کے لیے لائن میں کھڑی تھیں تو آپ کیا کر رہی تھیں ادھر؟ جواری کی یہ قسط قدرے بہتر رہی۔ سسپنس کا جال احمد اقبال نے بہت خوب بُنا۔ اولین صفحات پر پروین زبیر کی پیادے اچھی کاوش تھی۔ گو کہ کہانی بعض جگہوں سے ہمیں کافی کمزور محسوس ہوئی مثلاً صمد رحمٰن نے اپنے بچوں کو جب اپنے جیسا ہی بنانا تھا تو ان کی تربیت اس ڈھب پر کیوں نہیں کی یا خوباں کو اس نے شعبۂ صحافت میں کیسے جانے دیا، وہ بھی ایسے کہ اس کی حرکتوں پر نظر تک نہیں رکھی۔ (شاید آپ بھول رہے ہیں ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ہے جو اپنے ہی گھر سے نکلتا ہے) رزاق شاہد کی جاسوسی ڈائجسٹ میں پہلی تحریر نجات اوسط درجے کی رہی۔ غوثیہ شبیر کی جاسوسی میں دوسری تحریر مقتول قاتل ایک اچھی معاشرتی کہانی ثابت ہوئی۔ ان سے مستقل لکھوائیں۔ (جو حکم) کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ پڑھ کر سواد آ گیا۔ گو کہ ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عظیم الدین کی فیلی میچ دیکھ رہی ہوگی مگر پھر بھی تحریر ہمارے معیار پر پورا اترنے میں کامیاب رہی۔"

قیصر اعوان بھیا کا ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے بہتاں نامہ "ماہ ستمبر کا جاسوسی 7 ستمبر کو صبح 9 بجے سزائے موت کی کال کوٹھڑیوں میں بالکل ایسے جیسے طویل لوڈشیڈنگ کے بعد بجلی کا آنا، ویسے ہی آملا۔ ویسے تو جاسوسی کے پرانے قاری ہیں مگر خط بھیجنے کی جسارت وہمت پہلی دفعہ کی، اس امید کے ساتھ کہ خوش آمدید ضرور کہا جائے گا۔ (یقیناً مرحبا مرحبا تشریف رکھیں) کرسیِ صدارت پر محترمہ بشریٰ افضل کو اچھل کود کے بعد تھکے چہرے کے ساتھ براجمان پایا۔ مبارک باد قبول فرمائیں جی اور سسٹر بشریٰ! پہلے بہناں ماہتاب گل تھی، اب مہتاب عمیر رانا یہ تو کامن سینس کی بات ہے کہ ان کے "وہ" عمیر ہیں مدیر اور قیصر اقبال سید بادشاہ کی نگری میں کہیں وہ الو آپ تو؟ بہناں زویا کہیں آپ کسی پرائمری اسکول میں ٹیچر تو نہیں؟ میرے آبائی ضلع چکوال کی سب تحصیل تلہ گنگ کی عروج ناز کی شرکت سے اک انجانی سی خوشی اور مسرت محسوس ہوئی، آنی رکھیے گا۔ برادر نشی حماد اللہ! آپ کی اور ہم سب سزائے موت کے قیدیوں کی مشکلات آسان فرمائے، آمین۔ ویسے کوشش کیا کریں، خط پڑھ کے تبصرہ لکھا کریں۔ ویسے ساہیوال جیل کا ماحول کیسا ہے، ضرور آگاہ کریں۔ (لوجی... کرلو بات) جناب محی الدین اشفاق چلیں کترینہ کیف کو چھوڑ دیا، وینا ملک کو پکڑ لیا؟ میرا مطلب ہے کہ وینا ملک کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بہناں ثمینہ حبیب! اپنے اوپر تو پاگل میرا مطلب ہے کہ اپنے اوپر کیوں ہنستی ہیں۔ دیکھیں یہ اچھی علامت نہیں فوراً سے پہلے کسی اچھے معالج سے رجوع کریں۔ میرا در اقبال یوسف زئی اگر ڈاکٹر انکل کے دستخط الٹے تھے تو آپ بھی الٹے ہو کر پڑھ لیتے پھر یقیناً دستخط سیدھے نظر آ جاتے۔ (واہ کیا نکتہ ہے) سسٹر ماہا ایمان! صنفِ وجاہت جو کہ بقول آپ کے صنفِ کرخت ہو چکی ہے میں آپ کے والد، بھائی اور کل کلاں آپ کے ہونے والے "ان" کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان سب کے بارے میں آپ کا کیا مشاہدہ ہے، بہناں طاہرہ گلزار، آپ کے پاؤں میں کہیں موچ تو نہیں آئی جو بات بے بات آپ کی ہائے ہائے نکل جاتی ہے۔ بہناں آپ کی پولیس کے بارے میں کہی بات درست ہے کیونکہ ان کا لٹکایا عرصہ 5 سال سے میں بے گناہ سزائے موت کاٹ رہا ہوں۔ میرا مستقبل محکمہ پولیس نے اندھیروں کی نذر کر دیا۔ اللہ ہماری پولیس کو ہدایت نصیب فرمائے۔ برادر آفتاب احمد نصیر اشرفی! آپ نے اتنا لمبا چوڑا نام کہاں سے بلٹی کروایا ہے؟ ویسے پھلوں، سبزیوں کا کاروبار کریں بہت ترقی کریں گے۔ کہانیوں میں اسٹارٹ لیا اپنی فیورٹ رائٹر اسما قادری کی گرداب سے۔ سلو اور شہریار کی طرف سے راولوں کو پے در پے دینے والی شکستوں نے اور ڈاکٹر فرحان کی رہائی نے خوش کیا۔ کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ میں عظیم الدین کی بے وقوفی اور ریحان کی جلد بازی سے یہ نوبت آئی مگر ساتھ ہی ساؤتھ افریقا کی پولیس کی کارکردگی دیکھ کر دلی خواہش ہوئی کہ کاش ہماری پولیس بھی اس معیار پر پوری اتر سکے۔ باقی کی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں جو خرابیِ صحت کے باعث شاید جلد نہ پڑھ سکوں سو معذرت۔ آئندہ ماہ مکمل تبصرہ کر سکوں گا۔ آخر میں تمام دوستوں اور اسٹاف سے پرزور اپیل کہ میرے لیے خصوصی دعا کریں۔" (ہماری اور تمام قارئین کی نیک تمنائیں آپ کے ہمراہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد آزاد فضاؤں کا پنچھی بنائے)

سرگودھا سے وقار احمد سیال کا اعتراض "میں کافی عرصے سے جاسوسی ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ گرداب بہت اچھا سلسلہ ہے اور سنسنی سے بھرپور ہے۔ للکار بھی بہت اچھا تھا ہمیں بہت پسند تھا۔ للکار کی جگہ آپ نے جو نئی کہانی شروع کی ہے جواری، اس کا وہ مزہ نہیں ہے۔ کہانی کا ٹیمپو بہت سلو ہے۔ ستمبر کے شمارے میں وہ چارم نظر نہیں آیا جو کہ اس سے پہلے شماروں میں نظر آتا تھا۔ سوائے ایک کہانی نجات کے باقی کہانیوں میں کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا خط آپ کے رسالے میں قابلِ اشاعت خطوط کے معیار کے مطابق نہیں، لہٰذا میرا نام ناقابلِ اشاعت خطوط میں ضرور شامل کیجیے گا۔" (آپ کا خط پورا شائع کر رہے ہیں)

اٹک سے احمد وصال حیات کا عذر "اس بار جاسوسی کسی روٹھی ہوئی محبوبہ کی طرح ہم سے روٹھا رہا اور بہت انتظار کروانے کے بعد 9 ستمبر کو ملا۔ ٹائٹل گرل پر نو کمنٹس۔ اشتہارات کے ہرڈلز کو کراس کر کے سیدھا اپنی بزمِ یاراں میں پہنچے جہاں بشریٰ افضل کرسیِ صدارت پر قبضہ جمائے اپنے سینئر ہونے کا رعب جھاڑتی نظر آئیں آپ کا تبصرہ اچھا تھا۔ عروج ناز اپنے تیکھے تبصرے کے ساتھ شرارتی موڈ میں نظر آئیں۔ ماہا ایمان فل ایکشن میں نظر آئیں۔ لیکن ایک اختلاف ہے آپ سے ماہا جی! آپ کی ہر دوسری بات صنفِ وجاہت کے خلاف ہوتی ہے۔ آپ کے اس سوال کا جواب کہ مرد حضرات کو ہمیشہ افراتفری کے عالم میں کیوں دکھایا جاتا ہے تو ماہا جی! اس مشکل دور کی مشکل زندگی میں اکثر آزمائشیں اور امتحانات کا سامنا مرد حضرات کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ کبھی بھائی تو کبھی باپ اور کبھی بیٹے کے روپ میں۔ اور آپ تو خود اپنے منہ سے خود کو صنفِ نازک کہتی ہیں جو کہ سچ بھی ہے تو پھر اس صورت میں آپ کا یہ سوال بے معنی سا لگتا ہے۔ تصویر العین کا تبصرہ بہت پسند آیا، خاص طور پر آپ کی یہ بات کہ کترینہ کیف سے زیادہ تو ہماری صنم بلوچ خوب صورت ہیں۔ میں آپ کی اس بات سے ایک سو ایک فیصد متفق ہوں۔ شہزادہ کبیر عباسی آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ آپ کا میرڈ تبصرہ کافی منفرد تھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی آپ کا فروٹ چاٹ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ہمایوں سعید، سید شکیل حسین کاظمی، ماہ تاب گل، محسن علی سوم اور راجی غارس اس بار غائب تھے۔ آپ سب کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ انکل جی! اس بار جاسوسی جگر بہت دیر سے ملا۔ کہانیاں نہیں پڑھ پایا ابھی تک۔ لیکن محفل چینی نکتہ چینی میں شامل ہونے کے لیے کہانیوں پر تبصرہ کیے بغیر حاضر ہونے کی کوشش کر رہا ہوں۔" (آئندہ ایسی کوشش ہم ناکام بنا دیں گے، برخوردار)

مظفر آباد آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان لکھتے ہیں "جاسوسی کا خلافِ توقع 5 تاریخ کو دیدار نصیب ہوا اور اپنے نصیب پر اش اش کر اٹھا۔ سرورق جاسوسی کے عین مطابق تھا۔ پستول، پُراسرار ہاتھ، ایک عدد لاش اور چڑیل نما صنفِ نازک، اس کی آنکھیں، بال اور اسٹائل تو مجھے ایسے لگا جیسے بالکل شیش ناگن کی ہوتی ہیں جن میں پتا نہیں کتنے معصوم لوگوں کے خون کا عکس جھلک رہا تھا۔ فہرست کا جائزہ لیا تو بہت سے نئے نام پڑھنے کو ملے۔ حد یہ کہ سرورق کے دونوں رنگ بھی نیو رائٹرز کے تھے۔ خیر، اپنی محفل میں پہنچے تو بازی کو ایک بار پھر صنفِ نازک کے ہاتھوں میں پایا۔ بشریٰ افضل مسندِ صدارت مبارک ہو۔ یہ کرسی آپ کا حق بنتی تھی اور وضاحت انکل نے خود ہی کر بھی دی ہے کہ آپ بہت پرانی قاریہ ہیں۔ لاہور سے زویا اعجاز کا نپا تلا انداز بہت اچھا لگا۔ غیر ضروری باتوں سے اجتناب اور صرف کہانیوں کو مرکزِ نگاہ رکھا۔ تلہ گنگ سے عروج ناز! آپ نامعلوم دوشیزہ نہیں بلکہ پھلکو بڑھیا

ہیں۔ خیر آپ کا قصور نہیں، یہ عمر کا تقاضا ہے۔ ماہا ایمان! کچھ زیادہ ہی خوش فہمیاں ہیں آپ کو۔ ایسا نہ ہو کہ جن ہواؤں میں آپ اونچا اڑنے کی کوشش کر رہی ہیں، کبھی اوندھے منہ پٹخ دیں اور دھڑام سے نیچے آن گرو۔ کبیر عباسی! محترم آپ کا تبصرہ تو بہت شاندار تھا۔ گرداب کا اینڈ گزشتہ ماہ خاصا سنسنی خیز ہوا تھا مگر کھودا پہاڑ نکلا چوہا، والی بات ہوئی۔ البتہ اس قسط میں گرداب کا ٹیمپو انتہائی فاسٹ رہا۔ شہریار اور سلو، ڈاکٹر فرحان کو بازیاب کرانے میں کامیاب تو ہوئے البتہ یہ کامیابی فی الحال ادھوری ثابت ہوئی ہے۔ جواری، فی الحال مزہ نہیں دے رہی۔ کہانی کے تانے بانے کچھ اس طرح کے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ جب تک کہانی کا شروع کا پارٹ، آئی مین خاور کی ابتدائی زندگی اور بدنصیبی کی شروعات پڑھنے کو نہیں ملتیں، سمجھنا مشکل ہے۔ بہر حال، یہ اقبال صاحب کے قلم سے لکھی گئی ہے، ہم خامیاں نہیں نکال سکتے۔ نجات، رزاق شاہد کو ملا، ایک نیا نام پڑھنے کو ملا۔ کہانی شروع سے تو اچھی تھی۔ درمیان سے جا کر کچھ بور لگی۔ اینڈ کو اچھا ٹچ دینے کی کوشش کی گئی تھی مگر کچھ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ مقتول قاتل، غوثیہ شبیر کی ایک جذباتی نوعیت کی کہانی تھی جو کہ پہلے نمبر پر رہی۔ پروین زبیر کی طویل اسٹوری پیادے انتہائی فنٹاسٹک ثابت ہوئی اور ابتدائی صفحات پر خوب جچ رہی تھی۔ دلی جذبوں کی عکاس، خونی رشتوں کی محبت اور انسانیت سوزی کا امتزاج لیے یہ کہانی پڑھتے ہوئے آنکھ جھپکنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ صمد رحمٰن جیسے غدار لوگ جو اپنی مجبوریوں کا رونا روتے ہیں اور دوسروں کی مجبوریوں سے کھیلتے ہیں، اسی انجام کا مستحق تھا۔ پروین زبیر ویلڈن، اتنی اچھی اسٹوری لکھنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے انتہائی نازک موضوع کو چنا۔ ایسے کردار ہمارے معاشرے میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔ کم بخت کرکٹ، کاشف زبیر کی مزاحیہ اسٹوری تھی۔ اس کا نام کم بخت عقل ہوتا تو کیسا رہتا؟ عظیم الدین نام کا تو عظیم تھا مگر عقل کا نہیں۔ آنکھ اوجھل، سلیم انور کی مختصر اسٹوری جسے ہیرا کہانی کہا گیا مگر مجھے کہیں سے بھی ہیرا نہیں لگی۔ مجھے اس کہانی میں بہت سے جھول نظر آئے۔ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ (نہیں جائیں، ہم نے منع نہیں کیا) احسان فراموش، جمال دستی کی شارٹ اسٹوری ایک اچھی کہانی تھی۔"

ضلع اٹک سے سعدیہ بخاری کی خبر گیری "ستمبر کا جاسوسی قلم کبھی خوشی کبھی غم، دھوپ چھاؤں کے منظر کی طرح کبھی گرمی کبھی ٹھنڈ کے موسم میں خود بک اسٹال پر جا کے لیا۔ بک اسٹال والے بھائی کہنے لگے کیا اس طرح بندہ جاسوس بن سکتا ہے؟ اب اوروں کا تو پتا نہیں لیکن میں نے تو اسی طرح جاسوسانہ طبیعت پائی ہے (بلے بلے بھئی) سرورق پر نیم دراز اسٹائل میں کھلے بالوں کے ساتھ خوب صورت سی دوشیزہ براجمان ہے۔ پس منظر میں ایک نامعلوم ہاتھ میں ریوالور اور نشانہ بننے والا شاید قانون کا محافظ اس بات کا اشارہ ہے کہ اب کوئی بھی محفوظ نہیں، یہ ہمارے حالات کی صحیح ترین عکاسی ہے۔ خطوط میں ٹاپ پوزیشن حاصل کی ہماری سینئر تبصرہ نگار بشریٰ افضل نے۔ مبارک باد اینڈ ویلکم بیک جی۔ اٹک سے وصال احمد آپ کو خصوصی ویلکم کیونکہ آپ میرے شہر کے ہیں۔ ماہا ایمان جی! ڈاکٹر، ڈاکٹر ہوتا ہے چاہے وہ ڈنگروں کا ہو یا انسانوں کا ہاہاہا... کبیر عباسی کا مظلوم اور فریادی قسم کا تبصرہ کافی اچھا لگا۔ خاص طور پر ان کی کہانیوں پر رائے۔ تصویر العین ڈیئر! شکیل کاظمی کو اپنی پڑوسن کے ذکر پر ہارٹ اٹیک ہونے لگتا ہے لیکن غصے سے نہیں، خوشی سے۔ شکیل کاظمی! انسان ہر چیز کا انتخاب اپنی مرضی سے کر سکتا ہے پر اپنے پڑوسیوں کا انتخاب نہیں۔ (شیخیوں کی کتاب، میں تے میری پڑوسن) سے اقتباس۔ انکل! آپ احسان سحر کے تبصرے کے ساتھ لکھتے ہیں احسان سحر کی سحر انگیز باتیں، اب یہ آپ کی دریا دلی ہے ورنہ ہمیں تو وہ شر انگیز باتیں محسوس ہوتی ہیں۔ (سمجھا کریں) تبصروں میں ماہا، آفتاب نفیس اور عروج ناز کے تبصرے پسند آئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سحر انگیز تحریر کے مالک احمد اقبال کی جواری سے جہاں فرید اور نورین بچتے بچاتے اب مشکلات میں پڑتے نظر آ رہے ہیں، قسط کا اینڈ خاصا سسپنس میں کیا گیا۔ احمد اقبال کا انداز بیاں بلاشبہ زبردست ہے۔ یہود و ہنود کی ازلی و ابدی اسلام دشمنی اور سازشوں پر مشتمل پہلی کہانی پیادے ایک بہترین تحریر ثابت ہوئی۔ ایک قابلِ غور بات جو ایسی ہر کہانی میں مشترک نظر آتی ہے، وہ یہ کہ ہمارے ہاں کے غداران اسلام و وطن کی غداری کی وجوہات میں غربت اور طاقت و اقتدار کی خواہش، ناانصافی کا عنصر ہوتا ہے تو جب تک ہمارے معاشرے سے ان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا تو یہ اسلام دشمن اپنے مکروہ عزائم میں کامیابیاں سمیٹتے رہیں گے۔ (بجا فرمایا) گرداب میں صرف شہریار اینڈ کمپنی ہی نظر آ رہی ہے، باقی کردار تو بس فارمیلٹی ہی رہ گئی ہے۔ اس سلسلے کو بلاضرورت طوالت دی جا رہی ہے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ نجات، بے روزگاری، سفارش اور ٹیلنٹ کی قدر نہ کرنے کے موضوع پر اچھی تحریر تھی۔ سرمد رحمٰن کے ساتھ بہت ناانصافی ہوئی۔ دوسرا رنگ مقتول قاتل درمیانے درجے کی رہی اگرچہ انداز بیان بہتر رہا۔ کرکٹ کے موضوع پر کاشف زبیر کی کہانی کم بخت کرکٹ نے بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عظیم الدین کی فیملی گراؤنڈ میں ہوگی۔ آنکھ اوجھل مختصر ترین اور حیران ترین ثابت ہوئی۔ بلاشبہ ذہین مجرم کا ذہن منفی انداز میں بہترین کام کرتا ہے لیکن پولیس بھی ذہین ترین ہو تو نہلے پہ دہلا والی بات ہو جاتی ہے۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی تعریف "جاسوسی اس بار تاخیر سے 5 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ کسی بار رفلم کی ہیروئن لگی۔ خطوط کی محفل کی بازی اس بار بی بی بشریٰ افضل (شاید ایڈووکیٹ) نے جیت لی جو کافی عرصے بعد شریک ہوئیں اور ازسرِنو شرکت سے ہی صدرِ محفل قرار پائیں۔ پشاور کے بخش صاحب کو بھی خوش آمدید۔ حافظ آباد کی بی بی ماہا ایمان صرف ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد نظر آگئیں۔ اب اس بار بریک طویل ہوگا یا مختصر؟ لاہور کے آفتاب اشرفی صاحب کا تبصرہ چٹکلوں کی ٹوکری لیے بڑا ہی اچھوتا تھا جس پر انہیں بہت بہت مبارک باد۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جواری پڑھی۔ خاور اور نورین کی بھاگ دوڑ جاری ہے اور اب مار دھاڑ بھی شروع ہو گئی۔ چلتی گاڑی سے نازی کا کود کر بھی بچ جانا کچھ ہضم نہیں ہوا (کیا وہ ایک انسان ہے یا جن؟) دوسری قسط وار کہانی گرداب اس بار کافی دلچسپ رہی۔ اسلم آخر کار ماہ بانو کے ٹھکانے تک پہنچ ہی گیا اور شہریار اور سلو بھی ڈاکٹر فرحان کو نکال لے جانے میں کامیاب رہے۔ عائشہ کی دوبارہ انٹری دیکھیں، اب کیا گل کھلاتی ہے۔ شمارے کی اولین کہانی پروین زبیر کی پیادے حالات حاضرہ کی عین عکاسی کرتی ہے۔ ملک سے غداری کی سزا صمد رحمٰن کو مل ہی گئی۔ سرورق کی دونوں کہانیاں نجات اور مقتول قاتل نئے لکھنے والوں کی تھیں مگر اچھی تھیں۔

دیسی کہانیوں میں کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ اول رہی۔ بدیسی کہانیوں میں ہیروں کی تینوں کہانیوں کا انتخاب شاندار رہا۔ خاص طور پر ہیرے کی تلاش کا تو جواب ہی نہیں۔ مجموعی طور پر اس بار جاسوسی اتنا دلچسپ رہا کہ دو راتوں میں ہی دیر تک جاگ کر ختم کر لیا۔ مدیرِ اعلیٰ مبارک باد کے حق دار ہیں۔"
(شکریہ، چلو کسی نے تو تعریف کی)

لاہور سے انجم فاروق ساحلی کا مکتوب "اس مرتبہ جاسوسی کا ٹائٹل ایکشن کے مناظر سے بھرپور خاصا جاذبِ نظر تھا۔ فہرست کا ڈیزائن بھی اچھے انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔ آنکھ اوجھل مختصر ترجمہ اور اس کے علاوہ دوسری ترجمہ کہانیاں بھی خوب تھیں۔ گرداب کی قسط اس مرتبہ کافی پُرتجسس اور ہنگاموں سے بھرپور ایکشن پر مبنی تھی۔ طبع زاد میں عمر قید اور نجات زیادہ اچھی اور متاثر کن تھیں۔ اندازِ بیان دلچسپی سے مزین تھا۔ چیچی، نکتہ چینی کی محفل میں تقریباً سبھی قارئین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بشریٰ افضل پہلے نمبر پر جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں، یہ جاسوسی کی پرانی قاری ہیں۔"

فوجی بستی بہاولپور سے بشیر احمد بھٹی کی رائے "ستمبر 2013ء کا جاسوسی اس دفعہ مفت میں میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ نصیب اچھے ہیں میرے جاسوسی مفت میں درشن ہو گئے تیرے۔ ہوا یوں کہ میرا سوہنا نہیں منہ جو کوئی ذی وقار مجھے مفت میں جاسوسی دے دیتا۔ جاسوسی تو ویسے بھی بیس تاریخ کے بعد بک اسٹال پر نظر نہیں آتا۔ ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہے۔ میں لاہور سے بائی بس آ رہا تھا۔ میرے قریب جو صاحب بیٹھے تھے، جاسوسی ان کے ہاتھ میں تھا۔ جاسوسی کو دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ کسی شہر میں بس رکنے پر کوئی بک اسٹال نظر آیا تو ڈائجسٹ فوراً خرید لوں گا۔ میں نے مبلغ 60 روپے باقی رقم سے الگ کر کے سامنے والی جیب میں رکھ لیے اور پٹر پٹر ان صاحب کو دیکھتا رہا جو جاسوسی کے مطالعے کے مزے لوٹ رہے تھے۔ پھر مجھے اونگھ آ گئی۔ میں اس وقت چونک کے بیدار ہوا جب ایک آدمی نے مجھے ہلا کر کہا۔ بھائی صاحب سیٹ سے اپنا ڈائجسٹ اٹھا لیں۔ مجھے بیٹھنا ہے۔ جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے والا غائب تھا۔ ڈائجسٹ میرے قریب خالی جگہ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے خاموشی سے ڈائجسٹ اٹھا کے گود میں رکھ لیا۔ جاسوسی طبیعت سے اس کہانی کا تانا بانا بُنا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ صاحب جو جاسوسی ڈائجسٹ کے بلاشرکت ایرے غیرے مالک تھے، اپنے اسٹاپ پر عجلت میں اترتے ہوئے اسے سیٹ پر بھول گئے ہیں۔ میں دل میں تو خوش ہوا لیکن افسوس بھی ہوا کہ ان کا جاسوسی دوست ان سے دورانِ سفر ان کی اپنی غلطی سے بچھڑ گیا۔ پھر گود سے ڈائجسٹ اٹھایا اور بڑے غور سے ٹائٹل دیکھا اور مفت کا ڈائجسٹ پا کر ذاکر صاحب کی مین غلطی پکڑ لی۔ ٹائٹل پر موجود دوشیزہ کا چہرہ بالکل سیدھا ہے جبکہ وہ ترچھی لیٹی ہوئی ہے۔ مرد ہو یا عورت۔ ترچھے لیٹ کر چہرہ سیدھا نہیں رکھ سکتے گردن کی نسوں پر دباؤ آتا ہے۔ ترچھے لیٹے ہوئے کا چہرہ بھی ذرا ترچھا ہونا چاہیے۔ ذاکر صاحب بڑے مصنف نہیں، بڑے مصور ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ احمد اقبال صاحب کی جواری کی قسط نمبر تین کا مطالعہ جاری ہے۔ مظلوم نورین کے کردار نے کافی متاثر کیا ہے۔ احمد اقبال تیزی سے کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں، یہ تیزی برقرار رہنی چاہیے۔"

رحیم یار خان سے اے کیو حسنین کے شکوے "خوب صورت ماہنامہ 9 ستمبر کو ہمارے دلکش وجود کو رونق بخش کر چار چاند لگا رہا تھا۔ (کیا تعریف ہے) کرسیِ صدارت بشریٰ آپی کے حصے میں آئی مبارکاں بھئی مبارکاں۔ تبصرہ تو واقعی کافی زیادہ سینئر ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔ باقی سب کے تبصرات بھی خوب تھے۔ خاص کر عروج ناز کو خوش آمدید محفلِ یاراں میں۔ ڈاکٹر عمران کی لفاظی نے تو دنگ کر دیا بہت خوب بھئی۔ انور صاحب کے غور فرمانے کا اب ہم کیا کہیں۔ سب ساتھیوں کو ان کے تیز نظر ہونے کا ثبوت مل گیا۔ ماہا ایمان کے پاس دل ہے اس کا بھی خوب اندازہ ہوا۔ سید صاحب اب تو خوش ہو جائیں کیونکہ ہم تو کرشمہ کے پیچھے تھے لیکن اب! انجینئر عمیر! آپ نے اب تک کلیئر نہیں کیا کہ آخر آپ نے اپنے نام کے ساتھ ابھی سے انجینئر ورڈ کیوں جوڑ لیا۔ سب دوستوں سے گزارش، انکل سے بھی کہ ہمارے لیے دعا کریں ہمارا پارٹ ون کا رزلٹ آنے والا ہے۔ (کامیابی آپ کے قدم چومے) کہانیوں میں سب سے پہلے ہم نے گرداب میں انٹری دی۔ اب بھی سلسلہ ماہ بانو کا تو وہیں ہے بہرحال شہریار اور سلو نے کمال کر دکھایا۔ مشابرم خان کے آنے سے اب تو اور بھی مزہ آئے گا۔ جواری بس ٹھیک ہی۔۔ چل رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ سب سے زبردست فسانہ پروین زبیر کا پیادے تھا۔ اس نے خوب رلایا ہمیں اور ساتھ ہی ساتھ ہماری گرہ لگی ہوئی سوچ اور آنکھیں بھی کھول دیں۔ اس تصنیف کی ہم جتنی تعریف کریں، بہت کم ہے۔ ہم کھڑے ہو کر سلام پیش کرتے ہیں اس خوب صورت تحریر کے لکھنے والی پیاری مصنفہ کو، بہت بہت خوب۔۔۔ دونوں رنگوں نے بھی خوب رنگ جمایا اور بہت مزہ دیا اور بے شک ہمیں رزاق اور غوثیہ کی کی ہوئی محنت کا احساس ہوا۔ ہم دل سے سب کے ممنون ہیں بہت شکریے کے ساتھ۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسنین کاظمی کی وضاحتیں "پہلے پہل مجھے یہی لگتا تھا کہ میرا تبصرہ سیدھا سادہ، ہلکا پھلکا اور سب کے لیے قابلِ ہضم ہوتا ہے مگر اگست کے شمارے کو پڑھنے کے بعد میرا خیال یکسر تبدیل ہو گیا۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ میرا تبصرہ پڑھ کر لوگوں کا فشارِ خون تین چار ماہ تک بلند ہی رہتا ہے۔ یہ تسلی بخش صورتِ حال نہیں۔ باقی میرے عظیم ہونے پر چند لوگوں کو تحفظات بھی تھے۔ شاید اس لیے میں وضاحت کرتا چلوں کہ میری ہر تحریر اور مزاح صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو اچھی جمالیاتی حس رکھتے اور سخن فہم لوگ ہیں جن کی طبیعت میں لطافت ہے، کثافت نہیں اور تقریباً سبھی سخن شناس لوگوں نے اسے بطور مزاح ہی لیا کیونکہ عام فہم باتیں اور مزاح سمجھنے کے لیے زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود بھی اگر میرے عظیم ہونے سے کسی مرد یا خاتون کی نسوانی انا کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں اپنے اس عمل کی غلطی چاہتا ہوں، شکریہ۔ میں یہی کر سکتا ہوں زیادہ سے زیادہ کہ آئندہ ہر ماہ تبصرہ بھیجتا رہوں تاکہ میری عظمت میں کوئی کلام باقی نہ رہے۔ ماہ ستمبر کا شمارہ اس دفعہ چار تاریخ کو قریبی بک اسٹال سے لیا۔ سرورق اچھا تھا

ہمیشہ کی طرح۔ صرف خاتون کی گردن کا زاویہ قاتھمہ کسی طور بھی باقی جسم سے مربوط نہیں لگ رہا تھا۔ چینی بکنہ چینی میں سیاسی اور معاشی حالات پر مدیر اعلیٰ کی فکر انگیز تحریر ملاحظہ کی۔ کرسیِ صدارت پر اس دفعہ بہاولپور سے بہت ہی سینئر تبصرہ نگار محترمہ بشریٰ افضل براجمان تھیں۔ سب سے پہلے مبارک باد اور واپسی پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ آپ کی درخواست کی طرح جو کہ مان لی گئی۔ قیصر اقبال گجر آپ نے الووالی بات خوب کہی۔ اور الو سے یاد آیا کہ عزیز جان ہمایوں سعید کو بتاتا چلوں کہ میرے عظیم الشان شہر کا نام سیالکوٹ ہے اور میں یہ دو تین دفعہ پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اسلام آباد سے خط ارسال کرتا ہوں اس لیے ساتھ اسلام آباد لکھتا ہوں۔ زویا اعجاز ہمیشہ کی طرح کہانیوں پر بہترین تبصرہ کرتی نظر آئیں۔ عروج ناز! آپ کو بے نام سے بانام ہونے تک کا سفر مبارک ہو۔ ماہا ایمان! آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا۔ بس مجھے اس بات کی ذرا سمجھ نہیں آئی کہ آپ کن خطروں کی کھلاڑی نہیں ہیں۔ اصل میں زیادہ گہری باتیں مجھ جیسے سیدھے انسان کو کم ہی سمجھ آتی ہیں۔ عمیر شہزاد بنگش! میں نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا، اپنی پڑوسن کے متعلق۔ کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار! آپ کا تبصرہ بہت اعلیٰ تھا۔ بس جا بجا آپ نے اپنی بیگم صاحبہ اور ان کی پسندیدگی کا ذکر کر کے یہ تو بتا دیا آپ کی ازدواجی حیثیت کیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آپ کافی فرمانبردار شوہر واقع ہوئے ہیں۔ دوشیزہ زمرد! اپنے نام کی وضاحت ضرور کیجیے گا۔ محترم اے کیو حسین امیری پڑوسن کو لے کر آپ اتنے جذباتی کیوں ہو گئے؟ آپ بھی اپنے معاملات پر نظر رکھیں بجائے لوگوں کی پڑوسنوں اور معاملات پر توجہ دینے کے۔ پشاور سے طاہرہ گلزار صاحب! آپ اگر میرا تبصرہ غور سے پڑھتیں تو مجھے بے جا وضاحت نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے یہ کب کہا کہ پڑوسن کے حقوق میرے پاس محفوظ ہیں؟ میں نے یہ کہا تھا کہ میری پڑوسن کون ہو گی کون نہیں، یہ اختیار میرے پاس ہے، ورنہ کل کوئی بھی منہ اٹھا کے کہہ دے کہ میں کا نجمی کی پڑوسن ہوں اور میں تسلیم کرلوں؟ اس دفعہ سب سے منفرد اور زبردست تبصرہ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تھا۔ اس ماہ کے لیے اتنا ہی، کہانیوں پر تبصرہ انشاء اللہ اگلے ماہ کروں گا۔''

پنجاب سے انور مجذوب کی سواری ''یہ میرا پہلا خط ہے، یہ معیاری رسالہ ہے۔ اس کا منفرد سلسلہ سرورق کے رنگ ہیں جو کہ مجھے بے حد پسند ہیں۔ اس ماہ کا شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ سرورق کی حسینہ دل میں اتر گئی۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی گرداب کا مطالعہ کیا۔ بالآخر شہریار، ڈاکٹر صاحب کو نکالنے میں کامیاب ہو گیا اور اسلم بھی ماہ بانو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا لیکن دشمن کی نظر سے بچنے میں ناکام رہا۔ جواری کی تیسری قسط زبردست رہی لیکن لگتا ہے احمد اقبال اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کہانی میں وہ تیزی نہیں جو اناڑی میں تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ نمبر لے گیا۔ البتہ حیرت کی بات یہ کہ کہانی میں ہیروئن نہیں تھی ہیرو پر گزارہ کیا گیا۔ دوسری کہانی بھی زبردست رہی۔ پروین زبیر کی تحریر سنسنی خیز رہی۔''

فیروزہ سے محمد نعیم کی جسارت ''یہ ہماری پہلی انٹری ہے۔ میں جاسوسی کا خاموش قاری ہوں۔ للکار پڑھنے کے بعد ہمیں لکھنے کا شوق ہوا۔ للکار ہر طرح سے ایک شاہکار کہانی تھی۔ اسی طرح گرداب بھی اسما قادری کی بہترین کاوش ہے۔ یہ کسی بھی رسالے میں ہمارا پہلا تعارف ہے اس لیے لکھنے میں کچھ غلطیاں بھی ہوں گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا جاسوسی سے رشتہ ہمیشہ قائم رہے۔ اگر ہمیں خوش آمدید کہا گیا تو ہم اس رشتے کو قائم رکھیں گے۔'' (خوش آمدید)

نامعلوم مقام سے علی ڈٹو کی سلامی ''8 تاریخ کو جاسوسی ملا تو سب کچھ بھول کر ٹائٹل پر نظریں دوڑائیں۔ حسینہ ایک کھلی آنکھ سے شاید مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں بہت دور دور تک محبت نظر نہ آئی تو صفحات کو پلٹتے ہوئے گرداب کو ڈھونڈ لیا۔ (یقیناً اسی میں عافیت تھی) شہریار اور سلو نے اپنی جان ارضِ وطن کے لیے ہتھیلی پر رکھ کر راکے منہ سے نوالے کی طرح ڈاکٹر فرحان کو نکالا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنے مشن کو اچھی طرح پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ احمد اقبال صاحب یو آر ویری گریٹ، آپ کے قلم سے جواری تین قسطوں میں ہی اپنا جادو جگانے لگی۔ سرورق کے دونوں رنگ حسبِ سابق برقرار رہے۔ آخر میں تمام جاسوسی ٹیم کو بالخصوص مدیر اعلیٰ صاحب کو 21 توپوں کی سلامی۔''

سردار ظفر اقبال وڑائچ کی نوشہرہ کینٹ سے معروفیت ''ستمبر کا شمارہ 5 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل گرل ایک ناگن کا کردار ادا کرتی نظر آئی اور دوسری منزل کی کھڑکی سے ایک خاموش فائر ہوا اور ایک وطن کا سپاہی ٹارگٹ کلنگ ہو گیا۔ محفل میں بشریٰ افضل صاحبہ کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز تھیں ہماری طرف سے مبارک باد۔ میرا خیال ہے میں دو سال کے بعد حاضری لگوا رہا ہوں۔ انجینئر عمیر شہزاد بنگش، شہزادہ کبیر عباسی، محمد اقبال اور آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب کے تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ تفسیر عباس آپ محفل میں نہیں تھے آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ جواری بہت اچھی جا رہی ہے۔ ترکیب، آنکھ اوجھل، ہیرے کی تلاش اور کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ اچھی رہی۔ او کے دوستو اب دیکھو کب حاضری لگواتے ہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آج کل جودھپور کبیر والا کے بجائے نوشہرہ (KPK) میں ڈیوٹی کر رہے ہیں، باقی پھر کبھی سہی۔'' (انشاء اللہ)

بنوں سے محمد ہمایوں سعید کا پیغامِ محبت بہ عذرِ مجبوری ''تمام قارئین کے لیے خبرِ پُرمسرت ہے کہ مابدولت ستمبر کی پندرہ تاریخ کو اپنی کزن محترمہ کے ساتھ منگنی کے مبارک بندھن میں بندھ جائیں گے۔ (بھئی بہت مبارک ہو، کسی کھونٹے سے تو بندھے) صدر، وزیراعظم اور تمام پارٹی راہنماؤں نے مبارک باد کے ساتھ ساتھ اپنے ٹوئٹر پیغام میں اس کو جمہوریت کی بڑی کامیابی قرار دیا اور امید ظاہر کی ہے کہ یہ ملک وقوم کو ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کرے گا۔ سوری انکل جی، اب کی بار ہم نے کوئی کہانی نہیں پڑھی۔ پڑھ بھی کیسے سکتے ہیں۔ آپ تو خود سمجھدار ہیں اور آخر میں کچھ خاص الخاص لوگوں سے اتنا ہی کہنا ہے کہ ہماری خواہشیں، ارادے اور سپنے، ہماری زندگیاں ہمارا سب کچھ ہمارے والدین کی خوشیوں کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ ہمیں اپنی خوشیوں سے زیادہ اپنے والدین کی خوشیوں کو مقدم رکھنا چاہیے اور یقین کریں کہ وہ ہمارے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں، وہ ہمارے لیے باعثِ خیر و رحمت ہے۔''

پشاور سے عمیر شہزاد بنگش کے شادیانے ''اس دفعہ 4 تاریخ کو ملک کے مختلف علاقوں سے جاسوسی نظر آنے کی شہادتیں موصول ہونا شروع ہوئیں اور ہمیں بھی جاسوسی نظر آنے کے لیے زیادہ تگ و دو اور محنت کرنا نہ پڑی۔ سرورق کچھ تاثر قائم نہ کر سکا۔ بس وہی ازل سے ہمایوں سعید اور کبیر عباسی کے درمیان بنتِ حوا پر مار دھاڑ اور وہی ہمایوں سعید ایک بار پھر سے کبیر عباسی کے ہاتھوں گولی کھائے اوندھے منہ پڑے لوگوں کے لیے سامانِ عبرت کا نمونہ رہے۔ مگر ان سب سے بے پروا حسینہ دوشیزہ ہمیں دیکھنے میں محو تھی۔ ماہا ایمان آپا کا تبصرہ پڑھ کر یہ یقین ہوا کہ واقعی بڑھتی عمر کے ساتھ انسان چڑچڑے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ احمد وصال حیات! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور آپ لکھا کریں۔ تصویر العین صاحبہ! آپ تو ہاتھ منہ دھو کر بلکہ نہا کر شکیل کاظمی صاحب کی بے چاری اور معصوم پڑوسن کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ کبیر عباسی صاحب! کہیں آپ اپنا تبصرہ ہماری بھابی جی سے تو نہیں لکھواتے۔ اب کچھ بات کرتے ہیں کہانیوں کی۔ (چلو شکر ہے خیال تو آیا) بہت ٹائم سے میں سوچ رہا تھا (اچھا یہ کام بھی کرتے ہیں؟) کہ ہمارے بے حس حکمرانوں کی طرح ہمارے رائٹروں نے بھی دہشت گردی جیسے سنگین مسائل پر خاموشی کیوں طاری کی ہے (وہ سب تو کمربستہ تھے، ہم نے ہی باگ تھام رکھی تھی) مگر پروین زبیر کی پیادے پڑھ کر میرے بہت سے سوالوں کا جواب مل گیا۔ پیادے پاکستانیوں اور مسلمانوں کو ہوش میں لانے کے لیے ان کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ تھا۔ میں پروین زبیر کو ایسا شاہکار پیش کرنے پر سلام کرتا ہوں اور ایڈیٹر صاحب سے التجا کرتا ہوں کہ ہر ماہ اس طرح کی کم از کم ایک کہانی ضرور ہونی چاہیے۔'' (پڑھنے والوں میں حوصلہ بھی تو ہو)

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی دلی کیفیات ''ماہ ستمبر کا خوب صورت شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق جاسوسی کے عین مطابق ہے۔ مہ جبیں کی آنکھیں قابلِ توجہ ہیں۔ بہرحال سرورق اچھا لگا۔ ہم بزمو! ایک بار پھر آپ کے سنگ سنگ موجود ہوں۔ دوستو! میرے خوابوں اور خیالوں نے جس نگر کے بام و در تعمیر کیے تھے وہ بے نشاں ہو چکا ہے۔ کوئی سائباں، کوئی سایہ دار شجر میری زندگی کو فن کر کے حبس آلود موسم کے جان لیوا فشار سے بچا کر پناہ دینے کو تیار نہیں۔ میں دھوپ اوڑھ کر اور کبھی برف پہن کر سانس لینے کا قرض ادا کر رہا ہوں۔ اس لیے تو مجھے جاسوسی کی محفل میں ہی آ کر دلی سکون ملتا ہے۔ بہاولپور سے بشریٰ افضل صاحبہ کی منت سماجت رنگ لائی اور وہ کرسیِ صدارت کی حق دار بن گئیں مبارکاں... لالہ قیصر اقبال اور اپنا نام ساتھ ساتھ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بلاشبہ لالہ بہت اچھے اور زندہ دل انسان ہیں۔ حلہ گنگ سے عروج ناز صاحبہ بھی نام نہاد ہمایوں سعید کی ٹانگ کھینچتی نظر آئیں۔ ویسے آپ کا تبصرہ پسند آیا مجھے۔ ڈاکٹر عمران فاروق کا تبصرہ اور اندازِ تحریر اچھا لگا۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان کا خط اچھا رہا۔ ماہا جی! قسم سے آپ کے افسوس پر ہمیں افسوس ہوا کہ ہم آپ کو پہچان نہ پائے۔ اوکاڑہ سے تصویر العین کا تبصرہ بیسٹ رہا۔''

کورنگی کراچی سے احقر شیخ عبدالشکور کی کاوش ''میرا یہ کسی بھی رسالے یا ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے۔ سب سے پہلے بشریٰ افضل کو کرسیِ صدارت مبارکاں جی، آپ کا خط پسند آیا۔ محمد اقبال صاحب! لوگوں کو مت ڈرائیے گا، ہم بھی ہیں راہوں میں لب سی کے آپ کی رائے گریڈ ہے ہم بھی مہر ثبت کرتے ہیں۔ نئے آنے والے پرانے ساتھیوں کے نقشِ پا پہ چل سکیں گے اگر ایڈیٹر صاحب موقع دیں۔ آپا پروین زبیر سے گزارش ہے کہ معاشرے کے تمام ڈپارٹمنٹ میں تھوڑی بہت برائی موجود ہوتی ہے۔ کوئی بھی سسٹم ہمیشہ مکمل پاک صاف نہیں چل سکتا۔ اس بار گرداب پورے جوبن پر ہے۔ مشارم خان کا کردار اسلم کی گرفتاری کے بعد بنایا جاتا تو اور تجسس ہوتا۔ واہ نصیر اشرفی صاحب! آپ نے تو نکتہ چینی کے تمام ممبران کو پھلوں کا جمعہ بازار بنا دیا ہے۔''

اوکاڑہ سے تفسیر عباس بابر کی مجتبیں ''سرورق کافی سے زیادہ خوف صورت ثابت ہوا۔ دوشیزۂ سرورق کا سر اور دھڑ آپس میں منسلک محسوس نہ ہوئے۔ یعنی سر کہیں اور دھڑ کہیں اور اوپر کونے میں پراسرار کھڑکی سے ایک ماہر تخریب کار و فساد کی خونی کوشش یوں کامیاب قرار پائی کہ نیچے والے صاحب کے سینے میں شگاف پیدا کر گئی۔ مسندِ صدارت پر ہماری بہت پرانی دوست اور مستند تبصرہ نگار محترمہ بشریٰ افضل کی بھرپور آمد، کافی پرانے دوست یاد آ گئے۔ جواری کا تیسرا میچ بھی شاندار رہا لیکن ابھی کہانی کے کردار و مقاصد واضح نہیں ہو رہے۔ اسما قادری کی گرداب اس قدر جذبۂ حب الوطنی کہ جان ہر پل جانے کو بے تاب ہے۔ سرزمین ہند پر سرفروشوں کا معرکۂ حق و باطل... ایمان افروز جلوے جذبے اور ولولے... ڈاکٹر فرحان کی سرخ پانی سے گزر کر بازیابی، شہریار اور سلو کی شاندار کامیابی ثابت ہو گی۔ آنکھ اوجھل، ہیرے کی پہلی کہانی بھی دلچسپ رہی۔ مختار آزاد کی دلچسپ تحریر ہیرا پھیری کا غیر متوقع انجام ساری تگ و دو لا حاصل ٹھہری، پر کیا کریں اس طرح ہی ہوتا ہے۔ حمیرا اقبال کی اثر انگیز تحریر بے بسی نے افسردہ کر دیا۔ کاشف زبیر کی کم بخت کرکٹ نہایت دلچسپ مزاح سے بھرپور کوشش بھی کامیاب رہی۔ فاروق انجم کی عمر قید بھی دلچسپ لیکن سزا جرم سے زیادہ تھی۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محسن علی سوم، بالاکوٹ۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ ادریس احمد خان، کراچی۔ بشریٰ افضل، بہاولپور۔ انیلہ نصیر، دینہ جہلم۔ محمد ہمایوں سعید، بنوں۔ سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ۔ سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور۔ ڈاکٹر عمران فاروق اینڈ وقار طیب ماہی، جھنگ۔ ثمر خان، بھکر۔ فاطمہ حرا، جمال دین والی۔ سہیل احمد تبسم، آزاد کشمیر۔ اظہار احمد، کراچی۔ اے آر شیخ، لاہور۔ غزالہ تزئین، سرائے عالمگیر۔ دعا عالم بخاری، اوکاڑہ۔ تصویر العین، اوکاڑہ۔ طاہرہ جبیں، آزاد کشمیر۔

خوابوں کا سوداگر

صبا احمد

ہر خرابی کا مداوا ممکن ہے... لیکن حماقت کا نہیں... کسی ضدی... احمق... کو نصیحت کرنا یا سمجھانا ایسا ہی ہے جیسے پانی پر نقش بنا دینا... خوابوں کی دنیا بسا لینے والے ایک ایسے ہی جوشیلے نوجوان کی داستاں... جس نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتے دیکھتے خوابوں کا تاج محل بنالیا تھا.. اپنے خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار کرنے کے لیے اس سے ایک نہیں... کتنی حماقتیں سرزد ہورہی تھیں... ہر شخص نے اسے سمجھانے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا... مگر نصیحتیں اس کے سر پر سے گزر رہی تھیں... جذبوں اور خوابوں کے سوداگر نے ٹھان لیا تھا کہ... بالآخر فتح اسی کی ہوگی...

محبتوں... خوابوں اور جذبوں سے سرشار... لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھلا دینے والی پرمزاح کہانی...

مغلِ اعظم اپنے روایتی جاہ و جلال کے ساتھ دربار میں داخل ہوا تو مہارانی جودھا بائی اس کے بائیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قدم بہ قدم ساتھ چل رہی تھی۔ یہ شاہانہ انداز اس کے ایک نورتن لارڈ بیربل نے تجویز کیا تھا۔ وہ ایک عادی فلم بین یعنی فالم تھا جس کو دعویٰ تھا کہ وہ ہر کاسٹیوم فلم دیکھ چکا ہے اور اس نے تمام ولایتی بادشاہوں کو ملکہ کے ساتھ ایسے ہی ملتا دیکھا ہے۔ وہ ایک کتاب ”اصلی ولایتی شاہانہ آداب“ بھی لکھ رہا تھا۔ اکبرِ اعظم نے پہلے ہی اسے شہزادوں کے کالج میں نصاب کے طور پر شامل کرنے کے احکامات صادر فرما دیے تھے۔

تخت پر چڑھتے ہوئے تین اسٹیپ والے لکڑی کے زینے کا سب سے اوپر والا تختہ ٹوٹ گیا۔ مغلِ اعظم منہ کے بل تخت پر گرا اور اس کے گھٹنے میں بھی سخت چوٹ آئی۔ کوئن جودھا کے ساتھ اکبر کے اے ڈی کانگ نے اسے اٹھنے میں مدد دی اور وہ لنگڑاتا ہوا تختِ طاؤس تک گیا۔ وہ سرِ دربار

اپنے تماشا بننے اور کوئن جودھا کے قدموں میں سر رکھنے پر سخت برہم تھا۔ جلال اکبری کا اظہار اس کی اژدہے جیسی پھنکار اور کلف لگی سوا تو بجاتی مونچھوں کی لرزش سے بھی ہو رہا تھا۔

اس نے دہاڑ کے کہا۔ ”راجہ... سوری... لارڈ مان سنگھ! یہ کیسے ہوا... سرِ دربار مغل شہنشاہ ایک عورت کے قدموں میں گر پڑا اور عورت بھی ہندو۔“

لارڈ مان سنگھ نے اتنی دیر میں حادثے کی انکوائری مکمل کرلی تھی۔ ”حضورِ والا! لکڑی بہت پرانی اور کرم خوردہ تھی... اس پر آپ کے دادا محترم چڑھ کے تخت نشین ہوتے تھے بلکہ سنا ہے گھوڑے پر بھی سوار ہوتے تھے۔ اس کی جگہ جرمنی کا بنا ہوا سینتھٹک فائبر کا زینہ آرڈر کردیا جائے گا۔“

مغلِ اعظم نے ملکہ جودھا کی طرف دیکھا۔ ”گلاب کا پھول کہاں ہے جو ہم تخت پر بیٹھ کر سونگھتے تھے؟“

”پھر گرا دیا کہیں؟... تمہارے ہاتھ میں تو تھا۔ اب یہ لے لو۔“ اس نے اپنے جوڑے میں سے ایک پھول نکال کے مہابلی کو تھما دیا۔ ”اب یہ سنبھال کے رکھنا... پہلے پگڑی تو سیدھی کرلو... اوپر تاج بھی ٹیڑھا ہو رہا ہے... اتنی عمر ہوگئی بادشاہت کرتے... سلیقہ نہ آیا... رہے بے ہوش کے ہوش...“

مغلِ اعظم نے خفت سے کہا۔ ”مہارانی! اس گلاب میں سے تو ”بروٹ“ کی خوشبو آرہی ہے... اور یہ نقلی ہے۔“

”ہاں میں نے تھوڑا سا اسپرے کرلیا تھا... پتا نہیں تمہیں اس موئے گلاب کی خوشبو ہی کیوں پسند ہے۔ مجھے تو زہر لگتی ہے۔ اس سے اچھا ہے تم گوبھی کا پھول ہاتھ میں رکھو... ٹی وی میں نظر تو آئے گا۔“

”میرا خیال ہے اب دربار کی کارروائی شروع کی جائے۔ آج تو سلیم اور انارکلی کیس کی سماعت ہے... سارا میڈیا موجود ہے۔“

”دیکھو اپنا شیخو تو بہت بھولا ہے اور یہ ماسی جو ہمارے محل میں کام کرتی ہے... انارکلی... بڑی حرافہ ہے... اس نے پھانس لیا ہے سلیم کو...“

”جیسے تم نے ہمیں پھانس لیا تھا۔“ مغلِ اعظم نے آہستہ سے کہا۔

”میں کہتی ہوں کچھ شرم کرو... یہ عمر ہوگئی... لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ ایسی سزا دو ماسی کو کہ دوسری عبرت پکڑیں... سب بگڑ گئی ہیں... کل وہ دتو رام کچن سے ڈالڈا کا ڈبا لے گئی...“

مغلِ اعظم نے کھنکھار کے کہا۔ ”ملزم سلیم اور انارکلی کو عدالت میں پیش کیا جائے... اوہ... وہ تو سامنے کھڑے ہیں ہمارے۔“

دربار کے عالم ڈیوک ملا دو پیازہ نے ایک درخواست پیش کی۔ ”حضورِ والا! بطور اٹارنی جنرل کے میں پرنس سلیم کی طرف سے پیش ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔“

”میں مس انارکلی کی طرف سے وکیلِ صفائی ہوں۔“ لارڈ ٹوڈرمل نے کبوتر کی طرح سینہ نکال کے کہا۔

دونوں بڑے حریف آمنے سامنے تھے۔ بیربل فالم تھا تو ڈیوک اینڈ ملا دو پیازہ خود کو عالم قرار دیتا تھا کیونکہ اس نے خربوزے جتنے سر پر تربوز جتنی پگڑی لپیٹ لی تھی اور اصلی روغن زلف بنگال کشنم مار کا اپنی داڑھی میں لگا کے اس کی لمبائی گھٹنوں تک کرلی تھی۔

لارڈ ٹوڈرمل نے کہا۔ ”مائی لارڈ! اس کیس کا فیصلہ تو پہلے ہی فلم مغلِ اعظم میں موجود ہے جس میں آخری گانا انارکلی گاتی ہے تو ہال میں رونے والوں کی ہچکی بندھ جاتی ہے... نوشاد نے کیا دھن بنائی تھی اور پھر لتا کی آواز...“

ڈیوک اینڈ ملا دو پیازہ نے احتجاج کیا۔ ”جنابِ والا! اس فلم میں جو ہوا، عدلِ جہانگیری کا نمونہ نہیں تھا۔ آپ فیصلے پر نظرِ ثانی فرما کے تاریخ میں اپنا نام روشن کرسکتے ہیں۔“

لارڈ بیربل نے چلا کے کہا۔ ”عالم پناہ! یہ عالم نہیں جاہل ہے... جہانگیر تو حضور کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔ آپ عدلِ جہانگیری کا نمونہ کیسے پیش کرسکتے ہیں؟“

”ہم اپنا وہی فیصلہ برقرار رکھتے ہیں۔“ مغلِ اعظم نے گرج کے کہا۔

شاہ رخ خان نے چلا کے کہا۔ ”یہ ظلم ہے... ناانصافی ہے... میں یہ فیصلہ قبول نہیں کرتا۔“

اس کے باپ نے ہاتھ پکڑ کے اسے سیدھا بٹھا دیا۔ ”دیکھو ذرا اس کے کچھن... دس بجے اٹھانے پر بھی کہتا ہے ظلم ہے۔“

اس نے گلوگیر لہجے میں فریاد کی۔ ”فیصلہ پہلے ہی کرلیا گیا تھا۔“

باپ نے گلاس میں بچا ہوا تھوڑا سا پانی اس پر اچھال دیا۔ ”ابے پھر خواب دیکھ رہا تھا کوئی... جاگ جا گدھے کے بچے... ورنہ ایسی دولتی ماروں گا کہ چارپائی سے اڑتا ہوا باتھ روم میں جاکے گرے گا۔“

شاہ رخ خان کی ماں نے لاڈ سے کہا۔ ”اٹھ جا میرے شہزادے۔ جاکے ہاتھ منہ دھو... ناشتا کر۔“

”میں جا رہا ہوں دکان پر۔“ باپ کے پیٹ میں تھل تھل ہوئی اور پھر ایک ڈکار برآمد ہوئی... ”ہاضمہ خراب ہو رہا ہے للو کی ماں... بھوک مرگئی ہے۔“

”شکر کرو چار پراٹھے کھا کے تم خود زندہ ہو۔“ للو کی ماں بڑبڑائی۔

”پھر وہی نحوست میرے گھر سے جاتے وقت... اب جو گاہک آئے گا اس سے منہ ماری ہوگی... ایسی نظر لگاتی ہے بڑھیا...“ وہ جھلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کی بیوی چلائی۔ ”مجھے بوڑھا ہونے کا طعنہ کیوں دیتے ہو... دل آگیا ہے نا اس کمینی ماسی پر... بڑی انارکلی بنی پھرتی ہے... آج ہی چٹیا پکڑ کر نکال باہر کرتی ہوں۔“

شاہ رخ کو سب یاد آگیا۔ وہ مغلِ اعظم کے سامنے اپنی انارکلی کے ساتھ دربار میں ملزم بنا کھڑا تھا۔ یہ جیسے مغلِ اعظم کا پارٹ ٹو تھا جس میں وہ یعنی شاہ رخ خان ہیرو تھا... بالکل اسی طرح جیسے دیوداس میں پہلی بار ہیرو تھا کندن لال سہگل، دوسری میں دلیپ کمار تھا تو تیسری میں شاہ رخ خان... یا پہلے امراؤ جان ادا میں ریکھا تھی تو دوسری میں ایشوریا رائے... اس کے خواب سیریل میں انارکلی کا رول کررہی تھی دیپکا پیڈوکون... کیسی جچ رہی تھی ان کی جوڑی... جودھا بائی بن گئی تھی اس کی ماں... خواب میں اور بھی بہت گڑبڑ تھی... جیسے کہ خوابوں میں ہوجاتی ہے۔

”ارے اب گھس کے بیٹھ گیا اندر... پھر سو گیا نیستی مارے وہیں بیٹھے بیٹھے...“ ماں نے باہر سے پھنکارنا شروع کیا تو اس نے منہ تولیے سے پونچھ کے خود کو آئینے میں دیکھا اور قدرت کی اس کاریگری پر حیران رہ گیا... اس کے سامنے دوسرا شاہ رخ خان تھا جیسے سانچے میں ڈھال کے نکالا گیا ہو... وہی ہیئر اسٹائل... وہی صورت... مگر بات صورت کی کہاں تھی... نصیب کی تھی... اس نے ایک آہ بھری اور باہر نکل آیا۔

”جلدی سے ناشتا کرکے جا دکان پر...“ ماں نے کہا۔

”یہ ناشتا ہے؟“ اس نے سامنے رکھی ہوئی چنگیر کو دیکھا جس میں ایک ٹھنڈی روٹی تھی کہ اس پھر پری سے چمک رہی تھی جو ماں نے بڑے اہتمام سے رکھی تھی۔ اس کے ساتھ سلور کے پرانے پیالے میں رات کا بچا ہوا شوربا رکھا تھا۔ ”اس کو کہتے ہیں ناشتا؟“

ماں کا پارا چڑھ گیا۔ ”للو... میرے منہ نہ لگ... جب تو کما کے لائے گا نا تو ٹیبل پر سجا دوں گی انڈے، ڈبل روٹی، مکھن... تیرے ابا کو منڈی جانا تھا آج... جلدی سے چلا جا دکان پر...“

”دکان پر جا کے ایک ایم بی اے مونگ کی دال تولے... آٹا تولے... تو بھوت بن جائے... لال مرچیں تولے تو چھینکتا رہے... اور ٹکے ٹکے کی حیثیت کے گاہکوں کے سامنے پوری بتیسی دکھائے... ادھار مانگنے والوں کے کھاتوں میں سب لکھے... کسی کو ناراض نہ ہونے دے، خواہ وہ کتنی ہی غلط بات کیوں نہ کرے... کیونکہ گاہک بھی محلے کا ہے اور ہم منڈی میں نہیں بیٹھے ہیں۔“

”ارے باؤلا ہوگیا ہے، اکیلا ہی بولے جا رہا ہے... اتنا برا لگتا ہے دکان پر بیٹھنا تو کرلے نا نوکری... ہم نے تو اپنا سب لگا دیا اسی آس میں کہ کچھ بن جائے گا تو ہمارے بھی اچھے دن آئیں گے۔“

”اب میں کیا کروں ماں اگر کوئی نوکری نہیں ملتی ڈھنگ کی۔“

”ڈھنگ تجھ میں ہوں تو نوکریاں مل ہی رہی ہیں ملنے والوں کو... دماغ تو خراب کر رکھا ہے ان موئی فلموں نے... شاہ رخ خان بنے گا... فلمیں چلتی نہیں یہاں اور یہ بننے چلا ہے شاہ رخ خان... ہمارے تو نصیب پھوٹ گئے... ایک انڈا وہ بھی گندا۔“

اب شاہ رخ خان نے بہتر سمجھا کہ وہ واک آؤٹ کر جائے۔ گو وہ ایسی باتوں کا اور ایسی بے عزتی کا بھی عادی ہو گیا تھا اور وقت ہوتا تو وہ ماں کے طعنوں کے جواب میں اپنے شاندار مستقبل کے پلان پیش کرتا... اگر پاکستان میں فلمیں نہیں بن رہی ہیں تو کیا ہوا... کتنے لوگ بالی ووڈ گئے اور کامیاب ہوئے۔ اپنی وینا ملک کو ہی لے لو... کیسا تہلکہ مچا دیا وہاں جاتے ہی۔ جو یہاں نہیں پوچھتے تھے اب تلملا رہے ہیں... اور بہت نام بنے... عدنان سمیع خان سے راحت علی خان تک... مگر جب وہ جائے گا تو گویا قیامت آجائے گی... کیونکہ پھر شاہ رخ خان کا چراغ گل ہوجائے گا... جیسے نیا پرنٹ آتے ہی پرانی لان کو پوچھتا کوئی نہیں... تو شاہ رخ خان ماڈل 2013ء آنے کے بعد پرانا شاہ رخ خان دو کوڑی کا ہوجائے گا۔ آج یہاں مذاق اڑانے والے جتنا مذاق چاہیں اڑا لیں... ساری دنیا آئیڈیا پر لپکتی ہے۔ اس کے مغلِ اعظم پارٹ ٹو کے آئیڈیا کو کیش کرانے والے پروڈیوسر کے تو وارے نیارے ہوجائیں گے... ایک تو ہٹ بلکہ سپر ہٹ... جس کا ابھی ایک ری میک بنانے کا خیال بھی کسی کو نہیں آیا حالانکہ شعلے اور ڈان سے لے کر مرڈر ٹو اور عاشقی ٹو تک سب نے کروڑوں کما لیے پہلے ہی مہینے میں۔ اس کے علاوہ... شاہ رخ خان دس پندرہ کروڑ میں ملتا ہے... ایک نیا اس سے آدھے میں مل رہا ہو تو ڈبل

ٹیم... اور میرا کیا ہے... بونی کے کم بھی لے سکتا ہوں... پانچ بھی بہت ہیں... دو کروڑ بھی کم تو نہیں ہوتے... بس چانس مل جائے... پھر وارے نیارے۔

گھر سے ''ماے دی ہٹی'' تک سو گز کا فاصلہ مردار قدموں سے طے کرنے میں شاہ رخ خان کو دس منٹ لگ گئے لیکن ان دس منٹوں میں اس نے تصور میں ایک سنہرے مستقبل کا پورا سفر کیا۔ اس نے کل کی حقیقت کو آج ایسے دیکھا جسے اس کا پرچون فروش باپ دیکھنے سے قاصر تھا۔

وہ اپنے جانشین کے دیر سے آنے پر سخت برافروختہ تھا۔ ''میرا آدھا دن برباد کر دیا... دال چنا ختم ہے... نیاز کی دیگ کے لیے کرتل دھما کا چاہیے... کہاں سے دوں گا شام کو... رات ہو جائے گی آتے آتے...'' وہ غصے میں جھاگ اڑاتا رکشا میں بیٹھ گیا۔ اس کی آواز رکشا سے کم کرخت نہ تھی۔

پہلا غلط گاہک بھی فوراً نمودار ہو گیا۔ وہ ماسی مصیبتے تھی جو اس محلے کیا، دنیا میں ہی نہ ہوتی تو بڑا سکون ہوتا۔ یہ خیال اس کی خاصی شوخ طرار بہو کا تھا جو آتی تھی تو شاہ رخ خان کی نئی فلموں پر بات کرتے کرتے کسی نہ کسی مرتبان میں سے ٹافی نکال کے کھاتی رہتی تھی۔ ابا بھی شاہین کی نظر رکھتا تھا۔ یہ خورد برد فوراً تاڑ جاتا تھا اور شاہ رخ خان کو الزام اپنے سر لینا پڑتا تھا۔ اس کی مجبوری تھی۔ مذکورہ بہو کرینہ کپور سے ملتی تھی۔ بس وہ کپڑے زیادہ پہنتی تھی۔

☆☆☆

قریب تھا کہ دیپکا پیڈوکون ناراض ہو کے دوبارہ شہرۂ آفاق ویگن ڈبلیو گیارہ پر سوار ہو کے اپنے میکے واقع نیو کراچی کا ٹکٹ کٹا لے کہ اس ''چن چی'' کو روک لیا۔ ''خفا کیوں ہوتی ہو بلبلِ جاں... نہیں جاتے ہم رکشا میں... چن چی میں پیچھے بیٹھ کے جائیں گے اکیلے... آگے بھی کوئی نہیں ہو گا ڈرائیور کے سوا... پورے کے پیسے دوں گا میں...''

وہ ایسے بیٹھ گئی جیسے احتجاجی مظاہرین گرفتاری کے بعد پولیس موبائل میں بیٹھتے ہیں۔ روٹھ کر جانے کا ڈراما ضروری تھا ورنہ وہ بنیے کا بچہ شاہ رخ خان گرہ سے دام ڈھیلے نہ کرتا۔ ''تمہیں کم سے کم ٹیکسی لینی چاہیے تھی۔''

شاہ رخ خان نے کہا۔ ''ٹیکسی ہے کہاں سویٹ ہارٹ۔''

''رینٹ اے کار سے دن بھر کے لیے گاڑی مل جاتی تو آج کا پورا دن گھومتے پھرتے... خیر...''

شاہ رخ خان نے اپنی خودی کو بلند رکھا۔ ''ارے دیکھنا ایک دن تمہیں اپنی بی ایم ڈبلیو میں ساری دنیا کی سیر کراؤں گا... ابھی تو کلفٹن ہی جانا ہے۔''

تجربہ کار رکشا والا محبت کرنے والے نوجوان جوڑے کی منزل کے بارے میں پہلے سے جانتا تھا۔ ''کلفٹن جانا ہے نا سر... آنے جانے کے ہزار لیتے ہیں ویسے تو... آپ سو کم دے دو۔''

سر کہنے کا مقصد اسے بانس پر چڑھانا تھا مگر شاہ رخ بھی بنیے کی اولاد تھا۔ ''دیکھو... تم صرف جانے کی بات کرو۔''

رکشا والے نے عیاری سے کہا۔ ''سر پیٹرول کی قیمت پھر بڑھا دی ہے ان چوروں نے... پانچ سو تو جائز ہیں۔''

شاہ رخ خان نے اس کے پیروں میں رکھے ہوئے سلنڈر کو دیکھا۔ ''مگر تم تو چلا رہے ہو سی این جی پر... آج گیس کھلی ہے۔''

''سر ایک میل لمبی لائن میں لگ جائیں تو دیہاڑی نکل جاتی ہے... چلو آپ چار سو دے دو۔''

دیپکا پیڈوکون کو اس بحث سے الجھن ہو رہی تھی جو ایک زنخا بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا اور بکواس بھی کر رہا تھا۔ ''آئے اللہ تجھے چاند سے دو بیٹے دے ایک ساتھ... تیری ساس پر بجلی گرے۔''

بیک وقت غصہ اور ہنسی آنے کے باوجود دیپکا پیڈوکون نے اسے دس کا نوٹ دے کر ٹالا۔ اس نے نقاب ہٹا کے شاہ رخ خان کو گھورا۔

شاہ رخ خان بولی دے چکا تھا۔ ''دو سو فائنل۔''

رکشا والے کا لہجہ ہی نہیں، چہرہ بھی بدل گیا۔ اس نے خون آشام نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ابے پیدل چلا جا... یہ بھی بچ جائیں گے۔''

دیپکا نے جھلا کے کہا۔ ''چلو باقی دو سو میں دے دوں گی۔''

رکشا والا مسکرایا۔ اس کی حکمتِ عملی کامیاب رہی تھی۔ جوس نکالنے کے لیے کینو کو دبانا ہی پڑتا ہے۔ یہ سالے آج کل کے ہھکو عاشق... چمڑی جائے پر دمڑی نہ جائے... مگر جسے دیکھو مجنوں بنا پھر رہا ہے... ساری خرابی ٹی وی اور موبائل فون کی ہے۔ کیا پچھلی صدی میں لوگ عشق نہیں کرتے تھے؟

دوپہر کے وقت ساحل پر ان جیسے ہی زیادہ تھے۔ چن چی سے اتر کے وہ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ دور جا کے اس نے اپنا برقع اتار کے ہینڈ بیگ میں ٹھونسا۔ ہاتھ سے اپنے بالوں کو سیٹ کیا پھر آئینے میں لپ اسٹک درست کی اور اپنے عاشق صادق پر سچی محبت کی ترچھی نظر ڈالی۔ ''اب کیا کیماڑی تک پیدل ہی لے جاؤ گے چلا کے؟ پیاس سے جان نکلی

جا رہی ہے میری۔''

شاہ رخ خان نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا جو یہاں معیوب نہ تھا۔ ''بس جانِ من... وہ سامنے ہے اپنے باپ کلو کا ریسٹورنٹ... جانتی ہو نا اسے... نیو کراچی کا دادا ہے... کہتا تھا کہ للو... کوئی سالا...''

''افوہ... کئی بار بتا چکے ہو... اپنی بات کرو۔'' وہ جھنجلا گئی۔

وہ سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے ساتھ لگی میز پر بیٹھ گئے۔ شاہ رخ خان نے بنیان اور نیکر والے ویٹر کو دو کوک لانے کا آرڈر دیا۔ ''ٹھنڈی ہوں... اور اصلی... اور ذرا جلدی۔''

''ہم کسی ائر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں بھی تو جا سکتے تھے۔'' دیپکا نے پسینے کو ٹشو پیپر میں جذب کیا جو اس کا میک اپ خراب کر رہا تھا۔

شاہ رخ خان نے کہا۔ ''گئے تو تھے ابھی عید کے بعد... پچھلے سال...''

''اب پھر عید آنے والی ہے للو... اگلے مہینے رمضان ہیں۔'' وہ طنز سے بولی۔

شاہ رخ خان کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''ائر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں بوتل پی کے آ جاتے... یہاں تم اسپیشل برگر بھی کھا سکتی ہو چمپئن گل...''

اس نے ناراضی سے کہا۔ ''تم مجھے پیار سے کچھ اور کہتے تھے۔''

''تمہارے باپ دلاور خان نے بھی بڑے پیار سے تمہارا نام رکھا ہو گا... سفید پھول... تم کالی بھی نہیں ہو اور وہ نام... دیپکا پیڈوکون بہت مشکل بھی ہے... جب تم مجھے للو کہہ سکتی ہو...''

''تم بھی شاہ رخ خان نہیں ہو... باپ نے تمہارا نام لال حسین رکھا تھا مگر نام میں کیا رکھا ہے۔''

''پھر تم مجھے لال کہا کرو... میں تمہیں سفید کہوں گا... انگریزی میں مسٹر ریڈ اور مس وائٹ۔''

''مذاق میں مت ٹالو میری بات... تمہیں اب سنجیدہ ہو جانا چاہیے... مانا کہ تمہاری صورت سو فیصد شاہ رخ خان سے ملتی ہے... اور میری صورت میں تمہیں دیپکا پیڈوکون دکھائی دیتی ہے... لیکن زندگی ان بے تکے خوابوں کے ساتھ تو نہیں گزاری جا سکتی جو تم دیکھتے رہتے ہو... دن رات...''

''خواب دیکھے بغیر تعبیر کہاں ملتی ہے۔ اب کیا سر پر کھڑا ہو گیا ہے آ کے... جا دو برگر لا انڈے والے اسپیشل... ایک میں کھٹی میٹھی املی کی چٹنی۔'' اس نے نیکر والے بدتمیز ویٹر سے کہا۔

وہ گل کو گھورتا ہوا مسکرا کے چلا گیا۔

''آج میں تم کو خبردار کرنے آئی تھی۔'' گل نے جھنجلا کے کہا۔ ''دیکھو... ہماری زندگی اس فلمی محبت کے آسرے پر نہیں گزر سکتی... یہاں میں آتی ہوں تو جان ہتھیلی پر رکھ کے...''

''مجھے معلوم ہے... تمہارا وہ اسلحہ بردار خونخوار باپ مجھے بھی قتل کر دے گا... چھ وہ پہلے کر چکا ہے... کہتا ہے سات خون معاف ہیں مجھے...''

''تمہیں میری فکر نہیں... کتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے میرے لیے بہانے کر کے گھر سے نکلنا... یہ اتفاق ہے کہ جس کے لیے مجھے مانگ لیا گیا تھا، بچپن میں وہ ڈرون حملے میں مارا گیا۔''

''اللہ امریکیوں کو جزائے خیر دے۔''

''اس کا تعلق انتہا پسندوں سے نہیں تھا۔ وہ بے گناہ ہی مارا گیا اور ہم کو یہاں آئے اتنا عرصہ ہو گیا کہ اس علاقے سے اور اپنے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں رہا ورنہ قبیلے کا کوئی بڑا مجھے کسی کے پلے بھی باندھ دیتا۔''

''پھر بھی پٹھان تو ہے وہ۔''

''مگر اسے میرے لیے کسی غیر قوم کا رشتہ بھی قبول ہو گا... مجھے معلوم ہے بشرطیکہ وہ پڑھا لکھا، شریف اور برسرِ روزگار ہو۔''

''تین میں سے دو شرطیں میں پوری کرتا ہوں... تیسری پر میرا اختیار نہیں ہے۔ میں دن رات کوشش میں لگا ہوا ہوں... حساب نہیں رکھا میں نے لیکن اب تک ان درخواستوں کی سنچری مکمل ہو گئی ہو گی جو میں نے ادھر اُدھر ہر جگہ ارسال کیں... سی وی کی سو کاپیاں اب بھی پڑی ہیں میرے پاس...''

وہ متفکر ہو گئی۔ ''آخر کیا وجہ ہے... تم نے کبھی سوچا... کیوں آفر نہیں آئی تمہیں؟''

''آفر آتی ہے... پندرہ ہزار سولہ ہزار... ایک دفعہ بیس بھی مل رہے تھے مگر نہ جانے کون تھا جس نے خود کو دو ہزار کم پر پیش کر دیا۔ ہو گا کوئی بہت ہی مجبور... جاب اسے مل گئی... مارکیٹ کا تو یہ حال ہے کہ ہر شخص ایم بی اے کی ڈگری لیے پھر رہا ہے۔ ایک ہزار ایک یونیورسٹیاں ہیں... شہر میں، ملک میں اور ملک سے باہر... سب ڈھول پیٹ کے ڈگریاں بانٹ رہی ہیں... انھی میں نقلی ڈگریوں والے بھی

بڑی شان سے گھوم رہے ہیں... ملک میں صنعت اور کاروبار دونوں کا بھٹا بیٹھا ہوا ہے۔ بجلی، گیس ہے نہیں... اوپر سے بھتے ہیں... ایسے میں نوکریاں کہاں سے نکلیں گی... اور جاب دینے والے یہودی سارے... مجھے بیس کی بولی دے کر اٹھارہ والا لے لیا... سترہ میں آجاتا کوئی تو اسے بھی رکھ لیتے... صاف کہتے ہیں کہ ایم بی اے بہت... پھر کام لیتے ہیں کولھو کے بیل کی طرح... تم کیا سمجھتی ہو کہ میں حرام خوری کر رہا ہوں...؟"

"پھر... ایسے کب تک چلے گا؟"

"تم بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟"

وہ سمندر کو دیکھنے لگی۔ "جو سب کرتے ہیں، ابتدا کرو کہیں سے... محنت اور قسمت سے آدمی ترقی کرتا ہے۔"

"سب کہنے کی بات ہے۔ ترقی کرتا ہے آدمی سفارش سے... آج بھی ہیں مواقع مگر میرے لیے نہیں۔ یہ جاب اسی طرح چلتے ہیں کہ جانے کا ٹائم ہے آنے کا نہیں اور سال کے سال انگریمنٹ کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ وہ بھی جب تک کنٹریکٹ چلے... مجھے بتاؤ کیا اس آمدنی میں ایک فیملی کو سپورٹ کیا جاسکتا ہے؟ تم رہ سکتی ہو؟"

"میں مثال دوں گی تو بُرا لگے گا تمہیں... جانے والے کہاں کہاں چلے گئے..."

"تمہارا مطلب ہے باہر چلا جاؤں میں؟ چلا گیا میں اور لوٹ کے نہ آیا... شادی کر لی وہاں... پھر؟"

"پھر میں بھی شادی کر لوں گی یہاں۔" وہ بگڑ گئی۔

"یہاں تمہارے کرنے کے لیے کچھ نہیں، بس محبت کرتے ہو اور خواب دیکھتے ہو الٹے سیدھے... کرنے والوں نے خالی ہاتھ بہت کچھ کیا بالکل اَن کوالیفائیڈ لوگوں نے..."

"ہاں، فراڈ کیے... ڈاکے ڈالے..." اس نے تلخی سے کہا۔

"یار بزنس کیا... سنگاپور، ہانگ کانگ اور بینکاک کے چکر لگاتے لگاتے امپورٹر ایکسپورٹر بن گئے... تم بھی بزنس کرو۔"

"ایک بزنس میرے باپ کا ہے۔ دوسرا تمہارے باپ کا... میں کدھر جاؤں... دال، چاول کا آڑھتی بن جاؤں یا تمہارے ابا کی طرح شیر شاہ میں پرانے موٹر پارٹس کا امپورٹر... کباڑی... نہیں... یہ نہیں کر سکتا میں... تم ذرا صبر کرو... ایک بندہ ملا تھا مجھے... اس نے کہا کہ تمہارا ایک فوٹو سیشن ہو تو پروفائل بالی وڈ کے کسی پروڈیوسر کو بھیجا جاسکتا ہے... براہِ راست بھی اور کسی ایجنٹ کے ذریعے بھی...

مجھے بریک تھرو ملے گا۔"

"کیونکہ تم ہو بہو شاہ رخ خان ہو؟" وہ برہمی سے بولی۔

"اس میں شک کی کون سی بات ہے؟"

"وہاں پہلے ہی ہوگا اس کا کوئی ڈپلی کیٹ جو خطرناک سین کرتا ہوگا۔ سب کے ہوتے ہیں... اگر تم ڈپلی کیٹ بن گئے تب بھی کیا ہوگا... اور یہ سب کیسے ہوگا؟ تمہارا فوٹو سیشن... اس کا کسی کو پسند آنا یا تمہارا بالی وڈ جانا... وہ چھوڑو للو... تمہارے اس خواب کے آسرے پر میں بیٹھی نہیں رہ سکتی۔"

"تمہیں بہت جلدی ہے شادی کی؟"

"مجھے نہیں... میرے باپ کو ہے۔ بی اے کر لیا میں نے، چار سال ہو گئے... وہاں ہوتی میں... قبائلی علاقے میں تو چار بچے ہوتے میرے... تیرہ سال میں شادی ہو جاتی... تم کچھ نہیں کر سکو گے... یہ بے وقوفی یا بدقسمتی تھی میری کہ تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی۔"

ایک شخص نے قریب آ کے کہا۔ "ایکسکیوزمی!"

لال حسین نے کہا۔ "جی... مجھ سے کام ہے آپ کو...؟"

"آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ میں بہت دیر سے آپ کو دیکھ رہا تھا، وقت کم ہے اس لیے میں مزید انتظار نہیں کر سکتا... میرا نام آصف خان ہے۔" وہ ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

گل کے ساتھ اس کی نظر بھی تو وارد پر سوالیہ انداز میں ٹھہر گئی۔ وہ چالیس پینتالیس کا بھاری بدن، گہرے سانولے رنگ اور درمیان سے بے بال سر والا سنجیدہ صورت آدمی تھا۔ اس کا لباس، کلائی کی گھڑی اور موبائل فون سب اس کی دولت مندی کے مظہر تھے۔

آصف نے خود ہی بات شروع کی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ ادھر آرہے تھے تو اتفاق سے میں نے آپ کو دیکھا۔ میں ادھر شوٹنگ میں مصروف تھا۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"شوٹنگ؟" لال حسین نے کھڑکی سے دیکھا تو کچھ فاصلے پر اسے تیس چالیس افراد کا چھوٹا سا گروپ نظر آیا۔ ان میں لڑکیاں کم تھیں۔ ایک فرلانگ دور سے بھی وہ فوٹو گرافرز کے کیمرے اور دوسرا ساز و سامان دیکھ سکتا تھا۔

"ہاں، میرا یونٹ صرف ایک شاٹ کے لیے یہاں آیا تھا۔ تماشائیوں کی وجہ سے خاصی پرابلم ہوئی۔ پولیس نے آ کے سب کلیئر کیا۔ دراصل یہاں تو اب فلمیں بنتی نہیں

اس لیے کسی فلم یونٹ کو شوٹنگ کرتے دیکھنا پبلک کے لیے نیا تماشا ہوتا ہے۔ ادھر ہمارے ممبئی میں یہ روز کی بات ہے تو نوٹس کوئی نہیں لیتا۔"

جس طرح اس نے "ہمارے ممبئی" کہا تھا اس کے بعد یہ پوچھنا غیر ضروری ہو گیا تھا کہ کیا وہ ممبئی سے فلم یونٹ کے ساتھ کراچی آیا ہے؟ مگر یہ سوال بے اختیار ان دونوں کے لبوں پر آگیا۔ "ممبئی سے آئے ہیں آپ؟"

وہ مسکرایا۔ "براہِ راست تو نہیں... پہلے ہم دبئی میں مصروف رہے پھر کچھ شاٹ سمندر کے تھے... پرسوں کراچی پہنچے تھے۔ میں نے آپ کو گزرتا دیکھا... یہ اس وقت برقع میں تھیں۔"

گل کچھ شرمائی۔ فلمساز بڑی گہری نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی دو کیمرے ہیں جو اس کے جسم کے ایک ایک انچ کی تھری ڈی تصویر اتار رہے ہیں۔ ان حصوں کی بھی جو سامنے ہیں اور ان کی بھی جو نظر سے اوجھل ہیں مگر قابلِ دید ہیں... اسے اپنے بدن میں سوئیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی تھیں...

آصف خان نے مزید کہا۔ "اس وقت میں بزی تھا۔ اب شاٹ ختم ہوا تو میں نے کہا کہ تم لوگ پیک اپ کرو... میں آتا ہوں... میں نے دیکھ لیا تھا کہ تم لوگ یہاں بیٹھے ہو۔"

شاہ رخ خان کا دل اب اس کے سینے میں قلابازیاں کھانے لگا تھا اور ممبئی کے کسی فلمساز کو اچانک سامنے پا کے جیسے اس میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ "ایسی کیا بات کرنی تھی آپ کو سر؟"

"یونہی... جب تم پر نظر پڑی تو میں شاٹ کو بھول گیا۔ یہ بھی بھول گیا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ میری آنکھیں تم پر فوکس ہو گئی تھیں اور شاک نے جیسے مجھے پیرالائز کر دیا تھا۔ تمہیں میں آواز دیتے دیتے رہ گیا۔ اچھا ہوا کہ تمہاری طرف لپکا نہیں ورنہ سب حیران ہوتے... اور دیکھ لیتے۔"

"کیا دیکھ لیتے سر؟"

"وہی جو میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دیکھے۔ میں تو چکرا گیا تھا کہ گاڈ... میں کراچی میں ہوں یا ممبئی میں... مجھے لگا کہ میرے سامنے شاہ رخ خان جا رہا ہے۔ وہاں تو ایسا نظر آنا کوئی شاکنگ بات نہیں ہوتی... مگر وہ یہاں کہاں؟ وہ بھی ایک برقع پوش لڑکی کے ساتھ..."

شاہ رخ نے جب گل کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سارے سوئے ہوئے خواب یوں جاگ اٹھے جیسے سوئی ہوئی چنگاری چیخ کے تاریکی میں شرارے بکھیر

دے، اس نے خوشی کو دبا کے کہا۔ "لوگ ایسا کہتے تھے مجھ سے... مجھے لگتا تھا کہ مذاق ہے۔"

"مذاق... خود شاہ رخ دیکھ لے تو پاگل ہو جائے۔ سمجھے کہ آئینے کے مقابل کھڑا ہے لیکن یہاں آ کے تو میں واقعی پاگل ہو گیا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں نشے میں نہیں ہوں۔ کام کے وقت میں ہاتھ بھی نہیں لگاتا ڈرنک کو... وہ کیا کہتے ہیں یک نہ شد دو شد... پلیز یہ نہ سمجھنا کہ میں سیریس نہیں ہوں۔ اب یہ لڑکی بغیر برقع کے مجھے دیپکا پیڈوکون نظر آرہی ہے۔ آخر میں کیا کروں؟ اپنے یونٹ کے فوٹو گرافر کو بلا کے دکھاؤں... وہ دیکھتا ہے کیمرے کی طرح..."

"آپ بنا رہے ہیں مجھے۔" گل نے شرما کے بڑی مشکل سے کہا۔

"دیکھو... آج کام ختم ہو گیا... کل ہم واپس چلے جائیں گے۔"

شاہ رخ خان نے ہمت کر کے پوچھا۔ "یہ کون سی فلم ہے جس کی شوٹنگ چل رہی تھی؟"

"ابھی نام فائنل نہیں ہوا... چار مہینے میں اس کی ریلیز متوقع ہے... ڈائریکٹ تو خیر میں ہی کر رہا ہوں لیکن نام رمیش بھٹ کا دیا جائے گا... بڑے نام کی پبلسٹی ضروری ہے۔"

"کون کون ہے فلم میں؟" گل نے دلچسپی سے پوچھا۔

"لیڈ رول میں تو سوناکشی ہے اور اس کے مقابل ہے جان ابراہام... لیکن اس شاٹ کے لیے ایکسٹرا ہیں... ذرا خطرناک سین تھے... سائڈ رول میں ایک نئی لڑکی ڈالی ہے... یہ سیکوئنس ہے... مرڈر فور سمجھ لو... ابھی فائنل نہیں ہوا... ایک آئٹم کے لیے وینا ملک راضی ہو جائے۔"

وہ بے تابی سے بولی۔ "وینا ملک... ہمارے پاکستان کی...؟"

وہ مسکرایا۔ "ہاں مگر وہ ڈرتی ہے یہاں کے لوگوں سے... کام تو کام ہے مگر یہاں اس پر کریکٹر کے فیصلے ہونے لگتے ہیں... سروج خان کا ڈانس نمبر ہوگا تو زیادہ فائدہ اسے ہوگا... اچھا، یہ میرا کارڈ رکھو... ابھی تو یونٹ روانگی کے لیے تیار ہے، میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہاں آجائے اور میرا اتنا بڑا سیکرٹ آؤٹ ہو جائے... آج رات ملو مجھ سے آواری میں... گیارہ بجے لاؤنج میں... اور پرمت آنا۔"

"میں ضرور آؤں گا۔" وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"لیکن سر... کیا آپ مجھے پانچ منٹ دیں گے... ایک آئیڈیا ڈسکس کرنے کے لیے۔"

آصف نے گھڑی دیکھی۔ "او کے... لیکن پانچ کا

مطلب ہے پانچ منٹ۔"
شاہ رخ نے سر ہلایا۔ "سر! ابھی تک مغلِ اعظم کا نہ ری میک آیا ہے اور نہ پارٹ ٹو... ڈان یا شعلے یا دبنگ اور مرڈر کی طرح..."
آصف خان کی دلچسپی ایک دم بڑھ گئی۔ "ری میک مغلِ اعظم کا؟"
"جی سر... آپ تو جانتے ہیں کہ دلیپ کمار کی "دیوداس" کیسی سپرہٹ تھی مگر شاہ رخ خان کی کیا کم ہٹ تھی... ایشوریا رائے کے ساتھ..."
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"
"یہی... کہ اس مغلِ اعظم میں دلیپ اور مدھو بالا تھے... اب اگر وہی فلم بنائی جائے شاہ رخ خان اور دیپکا پیڈوکون کے ساتھ۔" اس نے بڑے یقین کے ساتھ گل کو دیکھا جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔
آصف کی نظر اس پر جم کے رہ گئی۔ پھر وہ ایک دم اٹھا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ "او گاڈ! تم تو ایک جینئس ہو... واٹ آ آئیڈیا... تم نے کسی اور سے تو اس کا ذکر نہیں کیا ہے؟ کرنا بھی مت... یہ ایک گریٹ سپرڈوپرہٹ فلم کا آئیڈیا ہے... بالکل لیک نہیں ہونا چاہیے... بلین ڈالر باکس آفس پر کرے گی... میں شرط لگا سکتا ہوں لیکن یہ سیکرٹ اگر آؤٹ ہو گیا تو سب ختم... کہیں بات بھی مت کرو... یوسی... جو بات منہ سے نکل جائے وہ اپنی نہیں رہتی۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں شاہ رخ خان... اور دیپکا... ڈارلنگ! تم اسے کنٹرول کرنا... یہ ہم سب کے مستقبل کا سوال ہے... رائٹ... اب میں چلتا ہوں۔"
اس کے ڈارلنگ کہنے پر دیپکا چونکی مگر شاہ رخ نے بُرا نہیں مانا کیونکہ یہ محض اعتماد اور بے تکلفی کا مظاہرہ تھا۔ "آپ مجھ پر بھروسا رکھیں سر۔"
آصف خان نے بڑے جوش کے ساتھ شاہ رخ سے مصافحہ کیا اور پھر گل کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے گل کی ہتھیلی کو اپنی ایک انگلی سے کھجایا اور بڑے فحش انداز میں آنکھ بھی ماری... گل کا چہرہ گلنار ہو گیا لیکن اس نے نہ احتجاج کیا اور نہ شکایت... اس نے ایک اندازِ محبوبی کے ساتھ آصف کو دیکھا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ فلمی دنیا میں اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جس کے لیے اس کو ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہیے۔ ایک پروڈیوسر تو ہر نئی لڑکی کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے اور ایک ہی کام کے لیے چانس دینے کے لیے... اس نے شاہ رخ سے آصف کی اس بدتمیزی کا ذکر نہیں کیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد وہ دونوں انتہائے حیرت سے گنگ بیٹھے رہے۔ ان دونوں کے سامنے شہرِ طلسمات کا ایک ہی منظر تھا جو انہوں نے ایک ساتھ دیکھا تھا اور اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ بہت دیر تک وہ ساکت بیٹھے اس کارڈ کو گھورتے رہے جو ان کے درمیان میز پر رکھا ہوا تھا... کسی پوشیدہ خزانے کی چابی کی طرح...
پھر گل نے جواب یقین کر چکی تھی کہ وہ دیپکا پیڈوکون کی ڈپلی کیٹ ہے تو دیپکا اس کی ڈپلی کیٹ... "یہ آدمی تو ٹھیک ہی لگتا تھا۔"
"شک کی کون سی بات ہے نام بتا، فون ای میل سب کچھ تو دیا ہوا ہے۔" شاہ رخ خان نے کارڈ کو کسی مقدس نقش کی طرح اٹھا لیا۔
"فلم کا یونٹ بھی دیکھا ہے ہم نے۔" دیپکا بولی۔
"ابھی تو وہ پیک اپ کر رہے ہیں... سامان کو ٹرک میں لوڈ کر رہے ہیں... چلو ہم انہیں قریب جا کے دیکھیں... لوگوں سے ملیں۔"
شاہ رخ مسکرایا۔ "پاگل مت بنو... ہمیں کون قریب جانے دے گا... دیکھ رہی ہو سیکیورٹی کتنی سخت ہے... سی آئی ڈی والوں کی نظر بھی ہوگی ان پر... انڈیا سے آنے والوں پر سی آئی ڈی والے نظر رکھتے ہیں، سب ڈرتے ہیں... کتنے لوگ دور سے حلقہ بنائے دیکھ رہے ہیں۔"
"آج مجھے یقین آگیا کہ تم شاہ رخ خان ہو۔"
"جیسے تم دیپکا پیڈوکون... اور اب وہ سب سچ ہونے والا ہے جو میں آج تک خواب میں دیکھتا رہا... اور مذاق بنتا رہا... تم چلوگی نا میرے ساتھ رات کو جب میں اس سے ملنے جاؤں گا۔"
"کیسی باتیں کرتے ہو... بابا مجھے قتل کر دے گا۔" وہ مایوسی سے بولی۔
"اور اگر میں ممبئی گیا... پھر کیا تم نہیں جاؤ گی میرے ساتھ؟"
وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "ممبئی تمہارے ساتھ... بھاگ کے... بہت مشکل ہے شاہ رخ... مگر دیکھوں گی۔"
دیپکا کا ڈرنا غلط نہ تھا۔ جب وہ اس کے باپ کا تصور کرتا تھا تو اس کے بدن میں خوف کی جھرجھری پھیل جاتی تھی۔ اپنے ساڑھے چھ فٹ قد کے ساتھ اس کی ساڑھے چھ انچ چوڑی کلف لگی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں ہر وقت جیسے بھنگ کے نشے میں ڈوبی رہتی تھیں اور وہ پشتو میں خیریت بھی دریافت کر رہا ہوتو لگتا تھا کلاشنکوف چل رہی ہے۔ ایک مرد

مومن۔۔۔ اور غیرت مند باپ اپنی دختر نیک اختر کو سنیما کے پردے پر شرمناک غیر شرعی لباس میں ناچتا گاتا اور عشق کرتا دیکھنے سے پہلے ۔۔۔ اسے ہی نہیں، ہیرو سے فلمساز اور فلم دیکھنے والوں تک سب کو قتل کر دیتا۔ وہ شاہ رخ خان سے محبت بھی جان ہتھیلی پر رکھ کے کر رہی تھی۔

☆☆☆

شاہ رخ خان پھر ماے دی ہٹی پر دال، چاول، صابن تیل اور مسالوں سے گھرا ہوا اس دولھا کی طرح منہ لٹکائے اداس بیٹھا تھا جو باجے گاجے کی دھوم دھام کے ساتھ برات لے کر پہنچا ہو تو پتا چلا ہو کہ اس کے سپنوں کی رانی دلہن کا تو پورا میکا غائب ہے۔ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔۔۔ کہاں گئے؟ کوئی نہیں جانتا۔

بات پرانی ہو گئی تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ یار دوست اور آتے جاتے محلے کے گاہک سب اس پر خندہ زن ہیں۔۔۔ ہر نظر اٹھتی ہے تو اس کا تمسخر اڑانے کے لیے۔ آج اتنے دن بعد بھی جو زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے، ان کی نظر اس کا مذاق اڑاتی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ سارے محلے دار تھے اور ابا کے پکے گاہک۔۔۔ ان کو منہ توڑ جواب دینے کا مطلب تھا دکان داری کا بھٹا بٹھانا۔ جو ساکھ ابا نے برسوں میں قائم کی تھی، وہ چند دن میں ختم ہو جاتی اور دکان ان کی روزی تھی۔۔۔ اس کا ابا دوٹوک کہتا تھا۔ ”کھوتے دے پتر۔۔۔ گاہک محلے سے نہیں آئیں گے تو کیا دوسرے شہروں سے آئیں گے؟ اور ہمیں گھر بٹھا کے تو کھلائے گا ہڈ حرام۔“

وہ حاجی مولا بخش جس کی سوافٹ کی داڑھی بہت گھنی تھی مگر سر پر ایک بال نہ تھا، سب کو ہر وقت میٹھا بولنے کی تلقین کرتا۔۔۔ لیکن سب سے زیادہ زہر افشانی بھی وہی کرتا تھا۔ اس کے نزدیک تو آج کل کے سب نوجوان لڑکے لڑکیاں جہنمی تھے جن کو کوڑے پڑتے اگر دور ہوتا اس مردِ مومن کا جس کو آخری فلائٹ نے دنیا سے جنت میں پہنچا دیا۔ اس نے بڑی لعن طعن کی کہ پڑھ لکھ کے ڈبویا تو نے لال حسین۔۔۔ بدبخت ماں باپ کو چھوڑ کے ممبئی جا رہا تھا اپنی عاقبت خراب کرنے۔

وہ خون کے گھونٹ پی کے سب سننے پر مجبور تھا کیونکہ حاجی صاحب کو جواب دینے کا مطلب ہوتا سوشل بائیکاٹ۔۔۔ وہ مسجد میں اس کے خلاف تقریر کرتے تو اسے غدار تک ثابت کر دیتے جو پاک سرزمین کو چھوڑ کر کافر ملک بھارت جا رہا تھا۔

آتے جاتے وہ سب کے ریمارکس سنتا رہتا۔ گلی میں کرکٹ کھیل کے شاہد آفریدی بننے والے ایک لڑکے نے کھیل روک کے کہا۔ ”یار! شاہ رخ خان نہ آتا تو اس بال کو بھی میں چھکا مار کے ممبئی پہنچا دیتا۔“

دوسرا بولا۔ ”یار! اسے بنا لو پیٹرسن۔۔۔ اور نام رکھ لو اپنا کلکتہ نائٹ رائیڈر۔“

اس کا کپتان دور کے رشتے سے کزن بھی ہوتا تھا مگر میٹرک سے آگے پڑھ نہیں سکا تھا تو حسد میں اس پہ پنگا لیتا تھا۔۔۔ صبح صبح آ کے کہنے لگا۔ ”یار شاہ رخ خان! تو کب آیا ممبئی سے؟“

اس نے ضبط سے کام لیا کیونکہ وہ دکان پر موجود خالہ حمیدن کے لیے ریٹھا آملہ اور سیکا کائی کی پڑیاں بنا رہا تھا۔

خالہ حمیدن کے کان کھڑے ہوئے۔ ”ہائے تو ممبئی گیا تھا! مجھے حاجی علی کی درگاہ پر ملنے والا سمندری جھاگ منگوانا تھا۔“

اس کے کزن نے کہا۔ ”اب تو یہ جاتا رہے گا خالہ۔۔۔ فلموں میں کام کرنے لگا ہے۔“

خالہ ریشہ خطمی ہو گئی۔ ”سچ؟ ہائے میری رشیدا اس کو کتنا شوق ہے فلموں کا۔۔۔ شاہ رخ خان کی تو کوئی فلم نہیں چھوڑتی۔۔۔ اسے پتا چلے گا تو کتنی خوش ہو گی۔“

خالہ کے جانے کے بعد وہ اپنے کزن سے لڑ پڑا۔ ”تُو باز آ جا بکواس کرنے سے ورنہ۔۔۔ میں سب کو بتا دوں گا کہ تُو حاجی صاحب کی بہو کو کہاں کہاں لے کے جاتا ہے۔۔۔ وہ جس کا میاں دبئی میں ہے۔“

”بتا دے گا تو اچھا کرے گا۔ وہ جان ہی نہیں چھوڑ رہی ہے اب۔“

ایک دن تو حد ہو گئی۔۔۔ قریب سے گزرنے والی دو برقع پوش لڑکیوں میں سے ایک نے کہا۔ ”ہے نا بالکل شاہ رخ خان؟“

”پتا ہے ممبئی بلایا تھا اسے فلموں کے لیے۔۔۔ ابا نہیں مانا۔“

پتا نہیں کون کون کس نمبر سے اسے فون کرتا تھا۔

”آپ شاہ رخ خان ہو۔۔۔ میں بی بی سی کا نمائندہ ہوں۔ انٹرویو لینا تھا آپ کا۔“

ایک فون تو کسی لڑکی نے کر دیا تھا۔ ”آپ کی میری فلم ”اوم شانتی اوم“ کتنی ہٹ گئی تھی میری وجہ سے۔۔۔ آپ دوسری دیپکا کیوں لا رہے ہیں میرے مقابلے میں؟“

ساری غلطی اس کی تھی۔ یہ نہیں کہ اس نے اپنی اور آصف خان کی ملاقات کا سارے زمانے میں ڈھنڈورا پیٹ دیا تھا۔ جس دن اس کی ملاقات آصف خان سے ہوئی تھی، وہ بڑے شش و پنج میں تھا۔ رات کو وہ اکیلا اس سے ملنے ہوٹل گیا۔ وہ باہر ہی مل گیا تھا اور ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن

وہ سخت مصروف تھا۔ کچھ پاکستانی فلمساز جو اس کے ساتھ مشترکہ فلمسازی کرنا چاہتے تھے، ڈنر پر آئے ہوئے تھے۔ آصف خان نے کہا کہ شاید یہ ڈیل فائنل کرنے کے لیے اگلے ہفتے وہ پھر ایک دن کے لیے کراچی آئے گا۔

پھر اس نے اچانک کہا۔ ”تم اکیلے کیوں آئے ہو؟ دیپکا کیوں نہیں آئی؟“

شاہ رخ خان نے محسوس کیا کہ آصف پر کچھ نشہ غالب ہے۔ اس کے لیے یہ نہ حیرانی کی بات تھی، نہ صدمے کی۔ اس دنیا میں یہ خرابی نہیں سوشل ایٹی کیٹس کا حصہ تھی۔ نہ پینا البتہ معیوب تھا۔ ”وہ نہیں آسکی۔“

”آسکی کیا مطلب؟“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”اس کا آنا بہت ضروری تھا۔۔۔ مسٹر شاہ رخ خان۔“

”دراصل وہ ایک بہت قدامت پرست سوچ رکھنے والے باپ کی بیٹی ہے۔“

”جہنم میں ڈالو باپ کو۔۔۔ وہ تمہاری ذمے داری تھی۔۔۔ اور اگر فلمی دنیا میں قدم جمانے ہیں تو اس کا تمہارے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ کیا تم جانتے نہیں ایک حسین سہارا ہونا چاہیے ورنہ۔۔۔ خیر۔۔۔ اگلی دفعہ اس کو آنا ہو گا۔۔۔ تم آؤ نہ آؤ۔“

شاہ رخ کو اس کا رویہ عجیب سا لگا۔ بھلا اس کی کامیابی کے لیے گل کا ساتھ ہونا کیوں ضروری ہے؟ سنا اس نے بھی تھا کہ فلمی دنیا میں کامیابی کے لیے حسین سہارا چاہیے مگر وہ عام آدمی کی بات تھی۔ اسے شاہ رخ خان بننے کے لیے کسی ڈپلی کیٹ دیپکا پیڈوکون، کترینہ یا کرینہ کی کیا ضرورت ہے۔۔۔ گل کا کچھ پتا نہیں۔۔۔ ساتھ جائے نہ جائے۔۔۔ وہ چانس ضرور لے گا۔ ابھی آصف پر نشہ غالب تھا، صبح جب ہوش میں آئے گا تو خود ہی سمجھ لے گا کہ شاہ رخ خان کے ساتھ مغلِ اعظم کا ری میک بنانے کا سپر ڈوپر آئیڈیا خود اس کے لیے خوش قسمتی کی لاٹری ہے۔

تیسرے دن اس نے کارڈ کے ممبئی نمبر والے فون پر کال ملائی۔ آصف خان کے ممبئی والے آفس کا ایڈریس بھی اس پر درج تھا۔ اس کے دل میں اگر ایک فیصد بھی شک تھا تو وہ اس کال کے بعد دور ہو گیا۔ گھنٹی تین بار بجی پھر کسی لڑکی نے ریسیور اٹھا کے کہا۔ ”ہیلو!“

”مجھے آصف خان سے بات کرنی ہے۔ یہ انہی کا آفس ہے؟“

”یس۔۔۔ اپنا نام بتائیے پلیز۔۔۔ ہولڈ کریں۔۔۔ وہ ابھی کسی سے بات کر رہے ہیں۔“

شاہ رخ خان سمجھ گیا کہ وہ آصف کی سیکریٹری ہو گی۔

”میں شاہ رخ خان بول رہا ہوں پاکستان سے۔“

”جی؟۔۔۔ کون؟“

”شاہ رخ خان۔۔۔ اس میں مذاق کوئی نہیں۔۔۔ جب وہ کراچی کے ساحل پر اپنی فلم کی شوٹنگ کر رہے تھے تین دن پہلے تو ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ دیپکا پیڈوکون ساتھ تھی میرے۔۔۔ نام تو اس کا چین گل ہے۔۔۔ خیر، وہ سمجھ جائیں گے۔ انہوں نے ایک کارڈ بھی دیا تھا۔“

”جسٹ اے منٹ پلیز۔“

شاہ رخ خان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اب اسے مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک منٹ کیا، وہ ایک گھنٹا انتظار کر سکتا تھا۔ اس نے بالآخر آصف خان کی آواز سنی۔ ”ہیلو۔۔۔ کون؟“

”میں شاہ رخ خان سر! آپ آئے تھے کراچی میں میرے پاس۔۔۔ جب میرے ساتھ دیپکا پیڈوکون بھی تھی۔ ساحل کے اس ریسٹورنٹ میں۔۔۔ آپ وہاں شوٹنگ کر کے فارغ ہوئے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ تم سے کسی فلم کی بات بھی ہوئی تھی۔“

”جی۔۔۔ میں نے آپ کو مغلِ اعظم کے ری میک کا آئیڈیا دیا تھا۔“

”مغلِ اعظم کا ری میک؟ اس وقت تم کہاں ہو؟“

”ابھی تو کراچی میں ہوں سر۔۔۔ نیو کراچی۔۔۔ انڈا موڑ۔“

”کون سا موڑ؟“

”انڈا موڑ۔۔۔ ناگن چورنگی سے آگے۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ جہاں وہ مینٹل اسپتال ہے۔۔۔ یا شاید چڑیا گھر۔“

”نہیں سر۔۔۔ غلط بتایا کسی نے آپ کو۔۔۔ انشاء اللہ میں جلد پہنچ جاؤں گا ممبئی۔۔۔ چین گل۔۔۔ میرا مطلب ہے دیپکا کا پتا نہیں ابھی کچھ۔۔۔ آپ نے تو کہا تھا کہ اسے ضرور لانا ہے۔۔۔ مسئلہ ہو گا ویزا کا۔۔۔ اس میں آپ کی مدد درکار ہو گی۔ اگر انڈین ایمبیسی میں کسی سے کہہ دیں۔۔۔“

”وہ کوئی پرابلم نہیں۔ تم انڈین ایمبیسیڈر کو اپنا نام بتا کے میرا حوالہ دینا۔۔۔ وہ بلائے گا تمہیں اور ہاتھ کے ہاتھ ویزا۔۔۔ او کے۔۔۔ سی یو۔“

اب معلوم نہیں شاہ رخ سے بات کرتے وقت آصف خان نشے میں تھا پہلے کی طرح۔۔۔ یا تفریح کے موڈ میں۔۔۔ لیکن اس سے بات کر کے لال حسین یعنی شاہ رخ خان کے اعتماد کا گراف آسمان کو چھونے لگا اور اس کا دل مستقبل کے سنہرے خوابوں میں گم ہو گیا تو غلط نہ تھا۔ کارڈ جینوئن تھا۔

آصف خان، اس کا پتا، فون نمبر سب جینوئن تھے اور اس نے ایک ڈیل کی توثیق کردی تھی۔

گل کا فون آیا تو اس نے یہ خوش خبری سب سے پہلے اسے ہی دینا ضروری سمجھا۔ ”بس اب تم تیاری پکڑلو... ہمیں ممبئی جانا ہے۔“

وہ بوکھلا گئی۔ ”ممبئی؟ کب جانا ہے؟“

”دیپکا! میری ممبئی میں خان آصف... میرا مطلب ہے آصف خان سے آج ہی بات ہوئی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب جلد از جلد آجاؤ۔“

”شاہ رخ... اتنی جلدی... نہیں نہیں... میں نہیں جا سکتی۔ ابا قتل کردے گا مجھے۔“

”ہاں، پتا چلے گا تو ضرور ایسا کرے گا۔“

”شاہ رخ! میرا دل گھبرا رہا ہے یہ سوچ کے... میں تمہارے ساتھ ممبئی... وہ تو بہت دور ہے۔ کرایہ بہت لگے گا اور ویزا... میرے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہے ابھی...“ وہ سخت نروس ہوگئی۔

”جانِ من... سب ہو جائے گا، میں سب کرلوں گا... ارجنٹ پاسپورٹ بھی بن جاتا ہے... اور ویزا کے لیے تو بھارتی سفیر کے پاس جا کے صرف آصف خان کا نام لینا کافی ہے۔“

”ہائے شاہ رخ... میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ میرا ہارٹ فیل ہو رہا ہے۔“

”اچھا تم پانی پیو... آرام سے بیٹھو... تمہیں اطلاع دینا ضروری تھا... پھر بات کریں گے۔“

اس روز شاہ رخ نے کھانے کے بعد ڈرتے ڈرتے یہ بات ماں کی موجودگی میں کی۔ ”دیکھو ابا! پہلے میری پوری بات سن لو... پھر کچھ کہنا۔“

سب کی نظریں اس پر جم گئیں جیسے وہ ٹوپی میں سے خرگوش نکال کے دکھانے والا ہے... ”اچھا بول۔“

اس نے ماں کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں ماں... اور نہ پاگل ہوا ہوں... میں ممبئی جا رہا ہوں فلموں میں کام کرنے۔“

اس کی چھوٹی بہن نے ایک چیخ ماری۔ ”سچ بھیا!“

اس کے لیے اصل مشکل کام اپنے باپ کو قائل کرنا تھا۔ بہن تو خیر جذباتی نوجوان مخلوق تھی اور ماں گائے کی طرح معصوم اور ان دونوں کو فلم کے بارے میں اس سے زیادہ معلوم نہ تھا کہ وہ سنیما میں دکھائی جاتی تھی مگر اب ٹی وی پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ باپ کو جوڑیا بازار کی منڈی کے سارے بھاؤ معلوم تھے اور وہ اپنی بیوی، بیٹی کے مقابلے میں یقیناً قالم تھا کیونکہ بچپن کی نادانیوں اور جوانی کی غلط کاریوں میں جو گناہِ کبیرہ اس سے سرزد ہوئے تھے، ان میں چھپ چھپ کر فلمیں دیکھنا بھی شامل تھا۔ اب وہ ایک ذمے دار باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کو روکتا تھا اور وہ بدستور نا خلفی پر چلتے ہوئے فلمیں دیکھتے تھے۔ پہلے یہ سیاہ و سفید اور رنگین ہوتی تھیں مگر اب نیلی بھی آگئی تھیں۔ اسے اندازہ تھا کہ ٹی وی نے اس بدعت کو گھر گھر پہنچانے میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اخباروں میں پوسٹر بھی دیکھتا تھا اور آتے جاتے سنیما کے سائن بورڈ بھی چنانچہ وہ فلموں، اداکاروں اور ہیروئنوں کے نام بھی جانتا تھا اور یہ بھی کہ آج کل وہ کس قسم کے لباس پہنتی ہیں اور نہ پہننے کا کیا معاوضہ وصول کرتی ہیں۔

اب اس نے غور کیا تو اسے لگا کہ بیٹا زیادہ غلط بھی نہیں کہتا۔ اس کی صورت میں شاہ رخ خان کی شباہت موجود تھی، بیٹے کی تقریر مدلل تھی۔ زیادہ قائل اسے ان اعداد و شمار نے کیا جو لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں جاتے تھے۔ بیٹا اسے یقین دلا چکا تھا کہ ”مامے دی ہٹی“ میں تو ان کی حالت ایسے ہی ابتر رہے گی لیکن وہ ممبئی چلا گیا تو ہو سکتا ہے کامیاب ہو جائے اور وہ کروڑوں میں کھیلنے لگیں۔ ہر کامیابی کے لیے کوشش تو شرط ہے... خامی نصیب سے ہے... یہاں وہ کون سے کامیاب ہیں۔

جب بالآخر اس کے باپ نے پوچھا۔ ”ممبئی جانے کا تو بڑا خرچہ ہے۔“ تو شاہ رخ نے جان لیا کہ وہ اسے قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ خرچہ، فاصلہ، خطرات، خدشات... اور ان تمام کے مقابلے میں ایک تابناک خوش حال مستقبل کے امکانات نے ابا کو بیٹے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لاکھوں کروڑوں کے تصور میں اتنی روشنی تھی جس نے اس کی نظر کو چندھیا دیا تھا۔ وہ عین ناک کے نیچے کا اندھیرا دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

باقی دو فریق جذباتی طور پر اس کے ساتھ تھے۔ ماں اپنی ممتا میں بیٹے کے لیے سب اچھا ہی اچھا دیکھ سکتی تھی۔ بہن ناتجربہ کار اور بچی تھی۔ شاہ رخ خان نے آسانی سے سب کو قائل کرلیا کہ ممبئی آنا جانا تو ایسا ہی ہے جیسے راولپنڈی آنا جانا... کیونکہ ویزا کا مسئلہ نہیں ہے۔

فیملی سپورٹ یعنی ابا کی رضامندی حاصل کرنے کی خوشی میں وہ بھول گیا کہ ماں اور بہن کو اس خبر کو نشر کرنے سے روکے... انہوں نے تو فرض کرلیا تھا بلکہ یقین کہ اب ان کا بیٹا شاہ رخ خان ہوگا اور وہ جو آج کا شاہ رخ خان ہے اس کا دور

ختم... اس سے پہلے کہ شاہ رخ خان کو خیال آتا، یہ خبر گھر گھر اور گلی گلی پھیل چکی تھی۔ اس کی ماں اور بہن ایسے چینل تھے جو دن رات ایک ہی بریکنگ نیوز کو دہرائے جا رہے تھے۔

شاہ رخ نے بڑی کوشش سے ارجنٹ فیس اور رشوت دے کر اپنا اور دیپکا کا پاسپورٹ بنوایا۔ اس عرصے میں وہ گل کو قائل اور مجبور کرتا رہا کہ وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے۔ ظاہر ہے اس کے لیے یہ فیصلہ آسان نہ تھا لیکن اچانک ایک واقعہ ایسا ہوا کہ اس کے سوا چارہ نہ رہا۔ اس کے باپ نے روایتی انداز میں اس کی مرضی جانے بغیر بیٹی کا رشتہ شیر شاہ کے کباڑی بازار ہی کے ایک اپنے جیسے ہم وطن کے بیٹے سے طے کر دیا جو دبئی سے اسکریپ پاکستان بھیجتا تھا۔ یہ اس کی واحد کوالیفکیشن تھی کہ وہ لکھ پتی باپ کا کروڑ پتی بیٹا بنا تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا اور اس کی دبئی میں رہنے والی بیوی کے چار بچے تھے۔ ابھی وہ ایک شادی کراچی میں دوسری لاہور میں اور تیسری پشاور میں کرلیتا تو یہ اس کا شرعی حق تھا۔ گل گریجویٹ تھی اور وہ ان پڑھ تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کی عمر گل سے دگنی تھی تو اس سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا... اور گل کو وہ منظور نہیں تھا، اس سے بھی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اس سے گل کے فیصلے میں فرق پڑ گیا۔

اچانک اس نے شاہ رخ خان کو مطلع کیا کہ وہ اس کے ساتھ خوابوں کے سفر پر جانے کے لیے تیار ہے۔

اب اس ایڈونچر کے اخراجات بھی مسئلہ نہ رہے۔ گل کے گھر میں روپیا تجوری میں ہی نہیں، الماریوں میں بھی بھرا رہتا تھا۔ اس کا باپ حوالے کا کام بھی کرتا تھا۔ دبئی سے پیسا بھیجنے والے ادائیگی وہاں کرتے تھے۔ ایک گھنٹے میں رقم کراچی کے پتے پر پہنچا دی جاتی تھی۔ یہ کالا دھن تھا جس کو بینک میں رکھنا غیر محفوظ تھا۔ چور، ڈاکو گھر میں آتے تو وہ ان کو گولی مار سکتا تھا۔ سرکاری کارندے بن کے ڈاکا ڈالتے تو وہ مارا جاتا۔ گھر میں کون تھا گل یا اس کی ماں کے سوا... ایک بیٹا اس کے ساتھ کاروبار سنبھال رہا تھا۔ گھر میں موجود رقم لاکھوں میں ہوتی تھی اور دس بیس لاکھ دلاور خان کی کاروباری ضرورت تھے۔ اس سے زیادہ وہ کہیں اور رکھتا تھا۔ گھر جو کراچی کی گنجان آبادی میں گمنام جگہ پر تھا اور کسی حد تک غریبانہ نظر آتا تھا۔ یہ حفاظتی نقطۂ نظر سے ضروری تھا کہ اس کے رہن سہن سے، شان و شوکت کا مظاہرہ نہ ہوتا کہ لٹیرے متوجہ نہ ہوں۔ معمولی کپڑے پہننا بھی اس کے لیے ضروری تھا۔ پرانے آٹو پارٹس کے بزنس میں ہاتھ اور کپڑے سب کالے ہوتے تھے۔ اس کے گھر کی عورتیں بھی گھر سے جسم پر سونا لاد کے نہیں نکل سکتی تھیں۔

شاہ رخ خان کو گل کی پیشکش سے ایسا لگا کہ قدرت اس پر مہربان ہے اور اس کے لیے کامیابی کے راستوں کی ہر رکاوٹ دور کرتی جا رہی ہے۔ اس نے گل کا نام پتا، ولدیت سب غلط لکھوایا تھا اور اس بات کا امکان نہ تھا کہ کوئی ممبئی کی کسی فلائٹ میں جانے والے ان دونوں مسافروں کے درمیان کسی قسم کا تعلق ثابت کرسکے۔ شاہ رخ خان نے دس لاکھ بہت سوچ سمجھ کے بتائے تھے اور گل نے یوں او کے کر دیے تھے جیسے پہلی خواندگی میں بجٹ پاس ہو جائے۔

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند... کمند کو ٹوٹنا ہی تھا۔ مفروضات اور تصورات کے اڑن کھٹولے میں ایندھن نہیں ہوتا۔ اس کو کریش ہونا ہی تھا۔ ممبئی کی فلائٹ پرواز سے پہلے کریش کر گئی۔

پاسپورٹ ہاتھ میں آجانے کے بعد اگلا مرحلہ ویزا کے حصول کا تھا۔ اسے یاد تھا کہ صرف دس دن پہلے ہی آصف خان نے اس کو یقین دلایا تھا کہ یہ مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل ہو جائے گا۔ بس وہ اسلام آباد جا کے بھارتی سفیر کو اس کا نام بتائے۔ اسے فوراً بلا کے ویزا تھما دیا جائے گا۔ اب شاہ رخ خان کو خیال آیا کہ وہ پھر آصف خان سے بات کرلے۔ اسے کہے کہ وہ بھارتی سفیر سے فون پر بات کرلے۔ اسے بتا دے کہ اس کا نام لے کر کون ویزا مانگنے آئے گا تو اس کا کام فی الفور کر دیا جائے۔

شاہ رخ نے ممبئی کا نمبر ملایا جو اب اسے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ آصف خان کی سیکریٹری نے فون اٹھا کے کہا۔ ”ہیلو۔“

”دیکھیے مس... میں کراچی سے شاہ رخ خان بول رہا ہوں... مجھے آصف خان سے بات کرنی ہے۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ بولی۔ ”تم نے پہلے بھی فون کیا تھا؟“

”ہاں، ابھی دس دن ہوئے۔“

”آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کیا تم پاگل ہو؟“

شاہ رخ خان کو شاک لگا۔ ”کیا مطلب ہے اس بات کا آخر؟“

”تم یقیناً پاگل ہو۔ باتوں سے لگتے نہیں... مگر تم ہو پاگل۔“

”فضول بکواس مت کرو۔ میں آصف خان سے تمہاری شکایت کروں گا... بات کراؤ میری ان سے۔“

”ابھی بکواس تم بند کرو اور میری بات سنو۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ صرف ہمدردی کی وجہ

سے میں تمہیں سمجھا رہی ہوں ورنہ میرے پاس بھی وقت نہیں ہوتا۔ باس ابھی آئے نہیں ہیں اس لیے ٹائم ہے... یہ تم سے کس الو کے پٹھے نے کہا ہے کہ تم شاہ رخ خان ہو... یہ تمہارا اصل نام نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا... ویسے نام تو لال حسین ہے۔“

”سنو لال حسین! ضرور تمہاری صورت ملتی ہوگی شاہ رخ خان سے... بھارت، پاکستان اور دنیا بھر میں نہ جانے کتنے اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں گے۔ خود اپنی صورت آئینے میں دیکھ دیکھ کے خود کو شاہ رخ خان سمجھتے ہوں گے، جیسے کہ پہلے ماتھے پر بال گرا کے سب دلیپ کمار بنے پھرتے تھے۔ مگر دلیپ کمار ایک ہی تھا اور ہے... ایسے ہی شاہ رخ خان دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں۔ ایک اس کے ڈپلی کیٹ کا پارٹ کرتا ہے... کوئی تمہیں بانس پر چڑھا رہا ہے۔“

”مگر یہ مجھے خود آصف خان نے کہا تھا۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”کب؟ خواب میں... پھر تو تم واقعی نفسیاتی مریض ہو۔“

”خواب میں نہیں مس... وہ کراچی میں شوٹنگ کے لیے آئے تھے تب انہوں نے دیکھا تھا مجھے اور خود بات کی تھی مجھ سے... ان کی ایک ڈیل بھی ہو گئی تھی۔ تم پوچھ سکتی ہو ان سے... جب گزشتہ بار میری بات ہوئی تھی تو انہیں یاد تھا۔“

”لال حسین! کوئی بے وقوفی مت کرنا یہاں آ کے خوار ہونے کی... اس روز باس اچھے موڈ میں تھے۔ ویسے بھی ہنسی مذاق کرتے ہیں سب سے... میں نے ان کو بتایا تو بہت ہنسے... بولے کہ چلو تھوڑی سی دل لگی ہی سہی اس پاکستانی شاہ رخ خان سے... میں نے سب گفتگو وہیں کھڑے ہو کر سنی تھی۔“

شاہ رخ کا دل ڈوبنے لگا۔ ”انہوں نے مذاق کیا تھا میرے ساتھ؟“

”گزشتہ ماہ کا بھی بتا سکتی ہوں۔ وہ آخری بار شوٹنگ پر ماریشس گئے تھے۔ آج کل اسی فلم کی ریلیز میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے پاکستان جانے کا کیا سوال... اور پھر کراچی جہاں اتنا خون خرابا اور مار اماری چل رہی ہے... کوئی کرکٹ کھیلنے تو آتا نہیں، فلم کی شوٹنگ کے لیے کیوں آئے گا؟ خود سوچو... کراچی سے اچھا ساحل تو جو ہو کا ہے۔“

”پھر... وہ کون تھا جس نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا اور کہا تھا کہ میں آصف خان ہوں... شوٹنگ ختم ہو رہی تھی اس وقت۔“

”شوٹنگ کا میں کیا بتاؤں... لیکن وہ شخص آصف خان نہیں تھا۔ کارڈ کوئی شناختی کارڈ ہوتا ہے؟ وہ تو تعارف کے لیے ہوتا ہے اور ہر شخص دوسرے کو دیتا ہے۔ آصف خان نے بھی ہزاروں کو دیا ہوگا۔ شاید اس نے وہی استعمال کیا۔ اس لیے یہ نمبر مل گیا تمہیں۔“

”مگر کیوں؟ کیوں کیا اس نے ایسا؟“

”یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ ہوگا کوئی فراڈ، دھوکے باز... تم کو لوٹنا چاہتا ہوگا۔ یہاں تو بہت ہوتا ہے یہ... گاؤں دیہات اور شہروں کے لڑکے لڑکیاں روز غول کے غول ممبئی آتے ہیں۔ ان کو چانس کے بہانے لوٹنے والے قدم قدم پر ملتے ہیں اور وہ ایکسٹرا تک نہیں بن پاتے۔ خدا کا شکر کرو تم بچ گئے... تم نے تو اس آصف خان کو دیکھا تھا... کیسا تھا وہ؟“

”اس کا حلیہ... تھا وہ چالیس پینتالیس کا... گہرا سانولا رنگ... سر صاف... مونچھیں... درمیانہ جسم...“

وہ ہنسی۔ ”اچھا، تمہارا کوئی ای میل ایڈریس ہے؟ میں تمہیں آصف خان کی تصویر بھیج دیتی ہوں۔ وہ پستہ قد... گول مٹول اور گورا ہے... تمہارا ایک ایکٹر تھا... ننھا... اس کے جیسا... میں یہ سب کیوں بتا رہی ہوں تمہیں؟ یہاں تو سیکڑوں ہزاروں خوار ہونے آتے ہیں... لیکن ایک رشتہ ہے تم سے... دور کا ہی سہی... میں بھی کراچی کی ہوں۔“

”تم کراچی کی ہو... کہاں رہتی تھیں؟“

”ناظم آباد میں... فلمی دنیا کے چکر میں گھر سے نکلی تو پہلے لاہور میں خوار ہوئی پھر ایک دھوکے باز یہاں لے آیا۔ ایک سال تک کس کس کے ہاتھ بکا... ہر قسم کے لوگ تھے۔ کالے پیلے شریف موالی... مجھے بھی ایک ایسی ہی لڑکی نے بچا لیا جو لاہور سے آئی تھی۔ اس نے یہ نوکری دلوا دی تو اب عزت کی... میرا مطلب ہے اپنی مرضی کی زندگی گزار رہی ہوں... چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ مہینے کے مہینے اچھی تنخواہ دیتا ہے آصف خان... جس نے مجھے بچایا تھا، اس نے کہا تھا کہ موقع ملے مفت کی نیکی کا تو مت گنوانا... تو میں تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔“

لائن کٹ گئی کیونکہ شاہ رخ خان کے موبائل میں بیلنس نہیں رہا تھا۔ وہ خلا میں دیکھتا رہا... یکلخت دنیا وہ نہیں رہی تھی جو اس کال سے پہلے تھی۔ اجلی روپہلی اور رنگوں سے دمکتی۔ اس کے سامنے ایک اندھی تاریک اور کالی رات جیسی دنیا تھی۔ حالانکہ بدلا کچھ نہیں تھا، وہ جہاں تھا وہیں تھا۔ فرق اس کی نظر میں آ گیا تھا۔

وہ بہت دیر سوچتا رہا کہ آخر اس جعلساز نے یہ چکر کیوں چلایا تھا؟ کیا چاہتا تھا وہ اتنا بڑا جھوٹ بول کے؟ کیا تھا اس کے پاس جو وہ لوٹ کر لے جاتا... شاید وہ اجنبی پاکستانی لڑکی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی... میں لٹنے سے بچ گیا... مگر کون سی دولت تھی جو لٹ جاتی... کیا تھا میرے پاس؟

جواب بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا۔ اس کی دولت تھی دیپکا پیڈوکون... چین گل... وہ بچ گئی تھی۔ جس رات وہ اس جعلساز آصف خان سے ملنے گیا تھا، وہ باہر ہی مل گیا تھا۔ یقیناً وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا نہیں تھا اور وہ بہت گرم ہوا تھا کہ شاہ رخ خان اپنے ساتھ دیپکا پیڈوکون کو لے کر کیوں نہیں آیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ سوچ کے اس کا لہو رگوں میں جمنے لگتا تھا۔

اس نے اپنی ہمدرد کو ایک دوست کا ای میل ایڈریس بتا دیا تھا۔ بعد میں جب اس نے اصل آصف خان کی تصویر دیکھی تو بھونچکا رہ گیا۔ ان میں مشرق اور مغرب کا فرق تھا، وہ سوچتا رہا کہ آخر اس شخص کو اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید اسے یقین ہوگا کہ فلم میں چانس کے لیے شاہ رخ خان اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ ”ماے دی ہٹی“ والا لال حسین ہے جو مدت سے روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس کا سب کچھ چین گل تھی جسے اس نے اپنی بے وقوفی سے واقعی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر وہ آصف خان سے ملنے اس کے ساتھ چلی جاتی تو آج نہ جانے کہاں ہوتی... آصف خان کا بھانڈا پہلے بھی پھوٹ سکتا تھا۔ تصدیق میں دیر خود شاہ رخ خان نے کی تھی۔ وہ یقیناً اس سے پہلے بھی دھوکا دہی، فراڈ اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے پولیس کے پاس اس کا ریکارڈ ہو مگر ان سے معلومات لینے جانا تو ایسا ہی تھا جیسے سانپ کے ڈسے کا اژدہے سے پنگا لینا۔ ہو سکتا ہے کبھی وہ پکڑا جائے تو تصویر کے ساتھ اس کے کارناموں کا ذکر اخبار میں آ جائے۔

شاہ رخ خان کے لیے زیادہ باعثِ حیرانی ساحل پر کسی فلمی یونٹ کا شوٹنگ میں مصروف ہونا تھا۔ فلم سیٹ حقیقی تھا اور غالباً آصف خان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن اس چکر باز نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھا لیا۔ اس نے دیپکا کو دیکھا اور اس کے خالص... رنگ روپ اور بے مثل حسن و شباب پر کتے کی طرح زبان نکالے پیچھے پیچھے آ گیا۔

جگ ہنسائی اور رسوائی کا طوفان بھی اب گزر چکا تھا۔ یہ صرف اس کی ہی بے وقوفی نہیں تھی اگر اس کی پٹاخہ بہن اور

خواب دیکھنے والی ماں نے ڈھنڈورا پیٹنے میں اتنی عجلت کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو شاید وہ پورا خاندان محلے بھر کے مذاق کا نشانہ نہ بنتا۔

خادم حسین پروپرائٹر "ماے دی ہٹی" نے تو سخت طیش میں اپنے ہونہار سپوت کو عاق کرنے سے "ماے دی ہٹی" بند کر کے واپس ساہیوال میں اپنے گاؤں جا کے آباد ہونے کا بھی سوچا تھا وہاں ان کی تھوڑی سی زمین تھی۔ یہ سب ناقابلِ عمل تھا چنانچہ اس نے تردید یا اپنی صفائی میں یا بیٹے کے دفاع میں کچھ کہنے سے بہتر یہ سمجھا کہ سب کا ہم خیال ہو جائے... سب ٹھیک کہتے ہیں... وہ گدھے کا بچہ ہی پاگل ہے۔

☆☆☆

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلی مرتبہ اسے کہیں سے بھی بلاوا آئے گا، وہ آنکھ بند کر کے نوکری کے لیے حاضر ہو جائے گا۔ بارہ پندرہ ہزار میں مہینے بھر صبح سے شام تک کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر جما کے دونوں ہاتھوں کو کی بورڈ پر مصروف رکھنا آسان کام نہ تھا۔ اس نے سنا تھا کہ لوگوں کے شانے، کمر اور بازو مفلوج ہو گئے تھے۔ آنکھیں ٹیڑھی اور پھٹی ہوئی رہنے لگی تھیں اور وہ اعصابی مریض ہو گئے تھے۔ سیلز مین جو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے رہتے تھے، ان کی ٹانگیں سوج جاتی تھیں لیکن زندگی ایسی ہی تھی۔ یہ سوچنا بڑے دور کی بات تھی کہ اس رقم میں وہ آنا جانا اور کھانا پینا بھی کیسے کرے گا... شادی اور بیوی بچے پالنے کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

لیکن یہ دن بھر ماے دی ہٹی پر بیٹھ کے آٹا، چینی، دال چاول تول کر دینے سے بہرحال بہتر تھا۔ وہ اپنی ایم بی اے کی ڈگری کو کام میں لا سکتا تھا ورنہ وہ سب پڑھا لکھا بھول جائے گا۔ یہ نوجوانوں کی دنیا تھی جو کامیابی کے لیے دوڑ رہے تھے، لڑ رہے تھے۔ دن رات ایک کر رہے تھے مگر وہ آج کی دنیا میں تھے... ان کے ساتھ رہ کے ناکام ہو جانا بھی ماے دی ہٹی پر کامیابی سے کہیں بہتر تھا۔ ہر روز اسے ذاتی خرچ نکالنے کے لیے کم تولنا پڑتا تھا۔ حساب میں گھپلا کرنا پڑتا تھا اور حساب میں ڈنڈی مارنے کے علاوہ بھی کبھی ماں کے اِدھر اُدھر چھپائے ہوئے پیسے غائب کرنے پڑتے تھے اور ابا کی واسکٹ کی جیبوں کی تلاشی لے کر دیکھنا پڑتا تھا کہ اس میں کتنی دولت ہے اور اس میں سے کتنی غتربود کی جا سکتی ہے۔ وہ میلے شلوار قمیص پہننے پر مجبور تھا۔ جینز، جاگرز اور ٹی شرٹس کو وہ بھول گیا تھا۔ علی حیدر کا گانا سن کے اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

وہ جو چینی گل... سفید پھول... یا دیپکا پیڈوکون تھی صرف ایک یاد ہو کے رہ گئی تھی۔ شوخ ہونٹوں کا تبسم... ستارہ آنکھوں کی چمک... عارض کے گلابوں کی دمک... اس کی سحر آفریں ہنسی... اس کی دلدار برہمی... اس کے ہاتھوں کی نرم گرمی اور اس کے قرب کی مہک... یہ سب نقشِ فردا ہو چکے تھے۔

جب بھی اسے گل کی یاد آتی تھی اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھتی تھی جو اس سے زندگی کا احساس چھین لیتی تھی۔ اس کا قصور یقیناً ناقابلِ معافی تھا۔ اس نے گل کو مایوس کیا تھا۔ خوابوں کے فریب میں مبتلا وہ گل کو بھی خواب دکھاتا رہا اور وہ اس پر یقین کرتی رہی۔ ایم بی اے کرنے سے پہلے بھی اس نے بہت باتیں کی تھیں۔ بس اب سال بھر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ میں کسی ملٹی نیشنل کو ترجیح دوں گا... مارکیٹنگ کا شعبہ بین الاقوامی ہے... ایک جگہ کا تجربہ اور گڈول دوسری جگہ پہنچاتے ہیں... اوپر... اور اوپر... پانچ دس سال میں یہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی جگہ سی ای او ہو جاؤں، چیف ایگزیکٹو آفیسر۔ اسے ایم ڈی یا چیئرمین کہا جاتا تھا پہلے۔

دن گزرتے گئے اور خواب مرتے گئے۔ بارہ پندرہ ہزار کی ملازمت کسی طرح اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ پھر ایسی جگہ جہاں ترقی کے امکانات نہ ہوں۔ پاکستانی مالک ذہنیت کے اعتبار سے سیٹھ ہوتے تھے... چمڑی لے لو دمڑی نہ دو۔ اسے سخت دباؤ میں "ماے دی ہٹی" پر بیٹھنا پڑا۔ اس نے گل کو بہت سے خواب سنائے۔ میں انٹرنیشنل لیول کا فاسٹ فوڈ پوائنٹ بنا لوں۔ ساحل پر نیا شہر آباد ہونے جا رہا ہے۔ ہوم سپلائی اینڈ سروس ایک نیا آئیڈیا ہو گا۔ ہم آپ کے لیے سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ سلوگن بہت اپیل کرے گا۔ اس نے پیزا ہٹ یا میکڈونلڈ جیسے فرنچائز لینے کا بھی سوچا۔ ابھی تک پاکستان میں برگر کنگ نہیں پہنچا۔ فلاں برانڈ کے آؤٹ لیٹ کی گنجائش ہے۔

سرمائے پر آ کے خواب ٹوٹ جاتا تھا۔ یہ سب لاکھوں کے نہیں کروڑوں کے پراجیکٹ تھے۔ گل اکثر اس کا مذاق اڑاتی تھی اور اب تو اسے شیخ چلی کہنے لگی تھی۔ انڈوں کی ٹوکری سے پولٹری فارم بنانے کے پورے منصوبے کے امکانات یعنی فزیبلٹی رپورٹ وہ بنا سکتا تھا۔ تمام تفصیلات کے ساتھ۔ ہر گاڑی بلٹ ٹرین تھی۔ بس اس کو چلانے والا سرمائے کا ایندھن نہیں تھا۔

بالآخر خوابوں کا یہ محل زمیں بوس ہو کے ملبے کا ڈھیر رہ گیا۔ شاہ رخ خان سے مشابہت اسے لے کے بیٹھ گئی تھی۔ اس زلزلے میں اس کا سب کچھ چلا گیا تھا... عزت، اعتماد اور پیار... اور وہ جو چینی گل یا دیپکا پیڈوکون تھی۔ وہ شاید دبئی کے ایک اسکریپ ڈیلر کی دوسری بیوی بنی اسی شہر کے کسی گھر سے شٹل کاک برقع پہن کے نکلتی ہو گی۔ قیمتی ریشمی کپڑوں اور زیور سے لدی پھندی۔ چند سالوں میں وہ دو چار بچے جن دے گی اور گوشت کا چلتا پھرتا بے ڈھنگا پہاڑ بن جائے گی۔ اس سے آخری ملاقات کو دو مہینے گزر چکے تھے۔ تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو۔ ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو... اس نے پہلا راستہ چنا تھا مگر اس پر وہ اکیلی کیسے چلتی۔ وہ دوسرا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اے محبت ترے انجام پر رونا آیا۔

وہ تنگی حسن کی چورنگی کے درمیان مختصر سے باغیچے ہی میں اپنے آس پاس کی رونق کو دیکھ رہا تھا۔ کامیاب لوگ... ہنستے مسکراتے... صحت مند فیشن ایبل... خوب صورت لڑکیاں جو بدصورت مردوں کے ساتھ تھیں کیونکہ وہ قوتِ خرید رکھتے تھے۔ قیمتی کاروں میں بدصورت عورتیں پُرکشش مردوں کے ساتھ کیونکہ وہ سیٹھوں کی اولادیں تھیں جو گھر داماد خرید سکتے تھے۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ وہ قنوطی ہو گیا تھا۔

لیکن اس کا ایسا سوچنا بھی غلط نہ تھا۔ سارا کھیل ہی پیسے کا تھا۔ ڈگری لینے والے سولہ سال جھک مار کے اس کی طرح "برائے فروخت" کا بورڈ لٹکائے پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ مزدور چار سو روپے روز پر زیادہ کما رہے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک ہزار ہر روز کے کھرے کر لیتا تھا۔ ایک سبزی کی ریڑھی والے نے اسے بتایا تھا کہ آٹھ سو ہزار بچ جاتے ہیں روز... یہاں تک کہ سبزی منڈی میں ایک بڈھے بابا نے جو گلے میں ٹرے لٹکائے پھرتا تھا اور بدشکل گھر کی بنی ہوئی پیسٹریاں، کیک رس اور پاپے بیچتا تھا، اس سے کہا تھا کہ ڈھائی تین سو کی دہاڑی لگ جاتی ہے اور دوسرے دکان داروں نے تصدیق کی تھی کہ بڈھا اتنے کر لیتا ہے... نہاری فروش... کبابی... مٹھائی والے تو سونے کی کانوں پر بیٹھے تھے جن کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی۔ ان لوگوں نے ہیئر سیلون بنا لیے تھے جو ماڈرن ہو کے جینٹس بیوٹی پارلر بن گئے تھے۔ درزیوں کے بوتیک تھے۔ کاش اس نے بھی ایسا ہی کوئی کام سیکھا ہوتا۔

اس کے قریب آوارہ گردوں کا ایک ٹولہ آ کے بیٹھ گیا۔ وہ چرس بھرے سگریٹوں کا دھواں پھیلا رہے تھے اور زور زور سے ہنستے ہوئے گالیاں بک رہے تھے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ وہاں سے اٹھ جائے۔ چورنگی کو عبور کرنا ہر وقت ایک خطرناک کام ہوتا تھا۔ ہر طرف سے آنے والی گاڑیاں کسی قاعدے قانون کی پروا نہیں کرتی تھیں اور سب میں سب سے پہلے نکل جانے کا مقابلہ تھا۔ ایسے میں کوئی اناڑی یا بغیر بریک والی گاڑی چلانے کا ماہر کسی کو بھی ناک آؤٹ کر سکتا تھا اور فرار ہو سکتا تھا۔ کچلنے کے خواہش مندوں کو غچا دیتا وہ بالآخر جان بچا کے دوسری طرف پہنچنے میں کامیاب رہا۔

موبائل فون مارکیٹ کو دیکھ کے یوں لگتا تھا جیسے وہاں موٹر سائیکلوں کی نیلامی ہو رہی ہے۔ ہر سہ پہر سے نصف شب تک یہاں نئے پرانے چوری کے اور چھینے ہوئے موبائل فونز کا بزنس بڑے زور و شور سے ہوتا تھا۔ یہ رسد اور طلب کا کھیل تھا۔ خریدار نہ ہوتے تو چوری کے فون کیوں آتے... یہ سب پیسے کی جنگ تھی۔

اچانک اس کی نظر ایک میلے سے براؤن رنگ کے لفافے پر گئی۔ اس نے لفافہ اٹھا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ضرور یہ کسی کی جیب سے گرا تھا۔ اس نے لفافے میں جھانکا۔ یہ کسی مین پاور کمپنی کی طرف سے رفیق احمد نام کے کسی شخص کو انٹرویو کی کال تھی۔ انٹرویو اگلے دن تھا۔ اس کے ساتھ رئیس احمد کی اصل میٹرک کی... اور ایم بی اے کی ڈگریاں تھیں۔ ایک کریکٹر سرٹیفکیٹ تھا اور ایک کسی سابق جنرل کا سفارشی خط۔

وہ کچھ دیر منتظر رہا کہ رفیق احمد ان کاغذات کو تلاش کرتا آئے لیکن یا تو اسے ابھی تک اپنے نقصان کا علم ہی نہیں تھا یا وہ نہیں جانتا تھا کہ کاغذات کہاں گرے ہوں گے۔ اس نے ایڈریس دیکھا۔ یہ جگہ دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وہاں پہنچ کے وہ گلی اور مکان نمبر بھی معلوم کر سکتا تھا۔ وہ پیدل ہی اس پتے کی طرف چل پڑا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد اس نے انچولی کے علاقے میں ایک سو بیس گز والے ایک مکان کے باہر لگی ہوئی کال بیل بجائی۔

"مجھے رفیق احمد سے ملنا تھا۔"

ایک لڑکی نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کے کہا۔ "بھائی جان تو باہر گئے ہوئے ہیں... کیا کام ہے؟"

"دیکھیے... مجھے ایک لفافہ ملا ہے... اس میں ان کی اوریجنل ڈگریاں ہیں۔"

لڑکی نے چیخ مارنے کے انداز میں کہا۔ "امی... بھائی کی ڈگریاں مل گئیں... کوئی لے کر آیا ہے... ان کو فون کریں گھر آ جائیں۔"

بزرگوار آئے جو نروس ٹائپ تھے اور بیٹے کے نقصان پر کچھ زیادہ ہی نروس ہو گئے تھے۔ انہوں نے اسے اندر لے جا کے ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جہاں ایک

پرانے صوفے کے علاوہ کشن والا لمبا سا دیوان بھی تھا۔ رفیق احمد فوراً ہی آگیا۔ وہ لفافہ تلاش کرنے وہیں گیا ہوگا جہاں سے لال حسین پیدل آرہا تھا۔ موٹر سائیکل پر یہ دس منٹ کا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ اتنا پریشان تھا کہ ادب آداب بھی بھول گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے لفافہ چھین کر وہ ایک صوفے پر گر گیا اور تمام دستاویزات کو نکال کے اپنا اطمینان کیا۔

پھر اس نے کہا۔ ”میں کیا بتاؤں آپ نے کیسی اذیت سے بچالیا ہے مجھے... میں اتنا پریشان تھا۔ کس زبان سے میں آپ کا شکریہ ادا کروں... کیسے بتاؤں کہ میرا کتنا بڑا نقصان تھا...“

”مجھے اندازہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری نظر پڑگئی اس پر اور میں قریب ہی تھا... اچھا میں چلتا ہوں۔“

”چلتا ہوں... ایسے کیسے... بتائیے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں... کیا پیش کروں آپ کو؟“

”یہ کیا فضول بات ہے؟ کیا انعام کے لالچ میں یہ کیا تھا میں نے؟ اور انعام کتنا دیں گے آپ... دس ہزار... پچاس ہزار... ایک لاکھ... کیا آپ کے نقصان کی اتنی ہی قیمت ہے... میں خود بھی ایم بی اے ہوں اور سولہ سال میں یہ ڈگری مجھے بھی ملی ہے۔“ وہ ناراضی سے بولا۔

اسی وقت وہ لڑکی اندر سے ٹرے کے ساتھ آگئی۔

”امی آپ کا شکریہ ادا کررہی ہیں۔ چائے پیے بغیر تو آپ جا ہی نہیں سکتے۔ یہ مٹھائی ابھی منگوائی تھی... بھائی کو اپائنٹمنٹ لیٹر ملنے کی خوشی میں۔“

رفیق محبت سے مسکرایا۔ ”یہ میری باتونی بہن ہے۔ پڑھاتی ہے۔“

وہ اندر چلی گئی تو وہ بولا۔ ”میرا نام لال حسین ہے۔“

”کہاں جاب کرتے ہیں آپ؟ ایم بی اے کب کیا تھا اور کہاں سے؟“

”ایم بی اے گزشتہ سال کیا تھا، سرسید سے۔ جاب کے لیے کوشش کررہا ہوں دن رات مگر حالات بہت خراب ہیں۔“

”میں بھی بہت خوار ہوا... مگر یہاں کوئی اسکوپ نہیں۔“

”آپ کا تو اپائنٹمنٹ لیٹر دیکھا ہے میں نے۔“

رفیق نے کہا۔ ”وہ انٹرویو کی کال ہے۔ کامیاب ہوگیا تو چلا جاؤں گا آسٹریلیا ایم ایس کرنے کے بہانے... وہاں کام کروں گا اور کوشش کرتا رہوں گا مستقل رہائش کے لیے... برطانیہ، امریکا تو اب کوئی چانس نہیں۔“

اس نے تائید میں سرہلایا۔ ”چالیس لاکھ ہم جیسے بے روزگار کہاں سے لائیں... پھر پابندیاں۔“

”میرا خیال ہے کہ تم بھی باہر نکل جاؤ... کہیں بھی۔“

”تمہارا مطلب ہے غیر قانونی طور پر... کسی ایجنٹ کے ذریعے؟ جو مجھے ایران کے راستے میں گولی ماردے یا یونان کے ساحل پر ڈبودے... ماں، باپ ساری عمر راہ دیکھتے رہیں۔“

وہ مسکرایا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ ایسا مشورہ کسی تم جیسے تعلیم یافتہ آدمی کو دیا جاسکتا ہے؟ جیسے میں جارہا ہوں ایسے جاؤ... کسی ایجنٹ کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے... آج کل ایجوکیشن ایگزیبیشن ہوتی رہتی ہیں ہر شہر میں... وہاں مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندے خود تمام معلومات دینے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔“

”ہاں، اخبارات میں بڑے بڑے اشتہار دیکھے ہیں میں نے۔“

”ہماری جہالت اور پست معیارِ تعلیم کی وجہ سے دنیا کا ہر ملک ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور خوش حال مستقبل پانے کے لیے ہمارے پاس آؤ... پڑھو... کماؤ اور سیٹل ہو جاؤ... ہے تو یہ بھی تعلیم کی منافع بخش تجارت... فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مال بھی اچھا دے رہے ہیں... یہاں کی بہت سی یونیورسٹیوں کی طرح بے مقصد، بیکار اور جعلی ڈگریاں تقسیم نہیں کررہے ہیں۔“

”واقعی یہاں ایسا ہورہا ہے۔ ہر یونیورسٹی کا معیار عالمی اور سب سے اعلیٰ ہے... سب جھوٹ... وہ کلاس بھرتے ہیں... منہ مانگی فیس لیتے ہیں۔ اپنے سلیبس کے مطابق امتحان لے کر ڈگری پکڑاتے ہیں کہ چلو... دوسرے کے لیے سیٹ خالی کرو... نالج صفر... مارکیٹ صفر... سارا پڑھا لکھا صفر۔“

”باہر سب کا تقریباً ایک سا معیار تعلیم ہے۔ سوائے چند نیک نام یونیورسٹیوں کے... اور جو کام ہوتا ہے قانون کے مطابق... جاب ملے گی قانون کے مطابق... اجرت قانون کے مطابق... سلوک قانون کے مطابق... دو چار سال لگاؤ اور پھر مانگ لو شہریت۔“

”پھر وہی بات... ایک تو میں کس پر اعتبار کروں؟ دوسرے میرے لیے آنے جانے کا خرچ ہی بہت ہے... وہ کرلوں تو ایڈوانس فیس کیسے دوں؟ بینک ڈپازٹ کیا دکھاؤں؟“

”سب کی شرائط ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں بھی

ایڈوانس فیس دوں گا لیکن صرف پہلے سمسٹر کی... وہاں میرے لیے پہلے سے جاب کا انتظام ہوگا۔ جو اس سمسٹر کے دوران کماؤں گا اس میں سے اگلے سمسٹر کی فیس دوں گا اور اپنے اخراجات بھی پورے کروں گا۔ مجھے اسکالرشپ بھی مل سکتی ہے۔ پھر بھی پانچ لاکھ تو رکھو۔“

وہ مایوس ہوکے اٹھ گیا۔ پانچ لاکھ تو دور کی بات تھی، وہ باپ سے پانچ روپے مانگتے ہوئے ذلت محسوس کرتا تھا۔ وہ انکار نہیں کرتا تھا لیکن اس کی نظروں کا پیغام بہت واضح ہوتا تھا۔ حرام خور پڑھ لکھ کے ڈبویا تو نے... ابھی تک ہمارے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ اس رات وہ رفیق کی بات پر غور کرتا رہا جو سو فیصد درست تھی لیکن پانچ لاکھ پر آکے غلط ہو جاتی تھی۔

وہ گھر کی چھت پر چٹائی ڈالے واقعی اختر شماری کررہا تھا کہ سرہانے رکھے موبائل نے ایس ایم ایس کا سگنل دیا۔ آج کل تو اس کے پاس بیلنس لوڈ کرانے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ دکان پر نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ابھی وہ کال صرف ریسیو کرسکتا تھا۔ اس نے روشن اسکرین پر ایک نیا نمبر دیکھا۔ ”سی سائڈ پر وہیں ملو بارہ بجے۔“

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ یہ نمبر گل کا نہیں تھا لیکن اس قسم کا پیغام اور کون دے سکتا تھا؟ جگہ اور وقت دونوں سے یہی ثابت ہوتا تھا مگر وہ تو اس وقت سوئی پڑی ہوگی اس دبئی کے کباڑی کے ساتھ۔ کیا یہ اس کے شوہر کا موبائل فون نمبر تھا جو اس نے خاموشی سے اٹھا کے اسے پیغام دے دیا تھا؟

وہ بہت دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور اس خیال سے خود اپنی نظر میں ذلیل ہوتا رہا کہ اس کی ایک فون کال کرنے کی بھی اوقات نہیں رہی۔ ورنہ وہ کنفرم کرسکتا تھا کہ نمبر گل کا ہے یا فون بند ملتا یا اس کا شوہر محافظ کتے کی طرح غرا کے پوچھتا۔ ”کون ہے؟“ مگر گل کو پتا چل جاتا... اور کچھ نہیں تو وہ جواب میں ایک بے معنی ایس ایم ایس ہی کردیتا۔ اوکے... وہ دیکھتی تو سمجھ جاتی اور وہ دیکھتا تو کچھ نہ سمجھتا۔

تصدیق کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہ فیصلہ کرنا ہی دشوار تھا کہ اب اسے مزید ذلت اٹھانے کے لیے یہ سفر اختیار کرنا چاہیے یا نہیں... اگر وہ کسی طرح بارہ بجے سی سائڈ پر پہنچ جائے تو اسے ملے گا کیا؟ اس احساس کی اذیت کے سوا کہ وہ اپنی اس جنتِ ارضی کو دیکھ رہا ہے جو اب کسی اور کی ملکیت ہے کیونکہ وہ صرف محبت کے خواب دیکھ سکتا تھا۔ اس کو حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا اور وہ بھی کیا کرے گی، اسے مزید شرمندہ یا رسوا... وہ خود روئے گی دھوئے گی یا

اسے احساس دلائے گی کہ خدا نے اسے مفلسی کے عشق کے عذاب سے بچالیا۔ اب وہ کتنی خوش اور مطمئن ہے۔ وہ لاکھوں میں کھیلتی ہے۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتی ہے اور بڑے بڑے شاپنگ مال اس کی دسترس میں ہیں۔ وہ چچا مجنوں کا بھتیجا ابھی تک فراق کے صحرا میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا پھرتا ہے۔ کیا وہ دبئی کے پام بیچ میں ہوٹل اٹلانٹس کی لابی کا... اس کے پولز کا... ڈائننگ ہال اور لاؤنج کا تصور بھی کرسکتا ہے؟ کبھی ان کی تصویر بھی دیکھی ہے؟

صبح اس کا یہ عزم رات کو چھت سے لگے غبارے کی طرح نیچے فرش پر پڑا تھا۔ اس نے ماں کی وساطت سے ایک اور بڑا جھوٹ بول کے ابا کے سرکاری خزانے سے پانچ سو روپے نقد حاصل کرلیے اور اپنا واحد جینز اور شرٹ والا لباس پہن کے ویگن پر ویگن بدلتا ٹھیک پونے بارہ بجے منزلِ مقصود پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ لباس اس نے صرف انٹرویو کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور اگر اس میں شاہ رخ لگتا تھا تو جائز تھا۔ اس کے جاگرز... اس کے سن گلاسز اور بیلٹ سب باڈرن تھے۔ جو گھڑی اس نے باندھ رکھی تھی میڈ ان چائنا تھی مگر بہت قیمتی سوئس واچ لگتی تھی اور اس پر رولیکس لکھا ہوا بھی تھا۔

اس نے کھڑکی کے قریب بیٹھ کے رومال سے پسینا خشک کیا۔ سمندر کے کنارے کی ہوا مرطوب تھی۔ دھوپ میں تیزی تھی اور اس پر ملیریا جیسی گھبراہٹ اور کپکپی طاری تھی۔ اچانک اس نے گل کو سامنے بیٹھا پایا۔

”تم... کب آئیں... مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ بوکھلا گیا۔

”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم آؤ گے۔“ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے اقرار میں سرہلایا۔ ”وہ نمبر جو تمہارا نہیں تھا مگر دیکھ لو... دل کھینچ لایا... دماغ روکتا رہا۔“

”کیا ہوگیا ہے تمہیں... دو مہینے میں... بیمار ہو؟“ وہ اسے بڑی محبت اور تشویش کے ساتھ دیکھتی رہی۔

اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گل کے گلے لگ کے اس کے سینے پر سر رکھ کے خوب روئے۔ اتنا روئے کہ آنسوؤں کی نمی اس کے جسم کی خوشبو اور بھاپ میں مل جائے مگر اس نے سرہلا دیا۔ ”نہیں، میں ٹھیک ہوں... مگر شادی کے بعد تمہارا روپ نکھر آیا ہے۔“

گل اچانک ہنس پڑی۔ ”شادی... کس کی؟“

وہ سخت جھینپا۔ ”تم... تمہاری شادی... اس دبئی کے

کباڑی ہے۔"

"کیا کوئی دعوت نامہ ملا تھا تمھیں یا ٹی وی پر خبر نامے میں دکھایا تھا؟"

وہ خفت سے ہنسا۔ "تم نے کہا تھا نا... سب طے ہو گیا ہے اور تمہاری اس سے بہت جلد شادی ہو جائے گی۔"

"ایسا ہی ہوتا تمہاری دیپکا پڈوکون کے ساتھ... میرے ڈپلی کیٹ شاہ رخ خان... لیکن اللہ نے بچا لیا۔ اس کی بیوی نمبر ون نے کہا کہ وہ بچوں کو بھی زہر دے دے گی اور خود بھی کھالے گی لیکن مرنے سے پہلے بیان دے جائے گی کہ اسے شوہر نے قتل کیا ہے۔ شوہر نے کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے، میں آج ہی پہلے تمھیں قتل کر دیتا ہوں... وہ قتل تو نہیں ہوئی... زخمی ہو کے اسپتال پہنچی۔ مجازی خدا اب جیل میں بیٹھے دعا کر رہے ہیں کہ وہ زندہ رہے... ورنہ ان کی گردن ماری جائے گی سب کے سامنے کسی مبارک جمعے کو..."

خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا پھر اس نے پوچھا۔ "پھر تم نے اتنا عرصہ خاموشی کیوں رکھی؟ بتایا کیوں نہیں مجھے؟"

"میں سخت ناراض تھی تم سے۔ سوچو ذرا کہ میں باپ کا مال چرا کے نکل آتی اور چلی جاتی تمہارے ساتھ ممبئی تو میرا کیا ہوتا؟"

وہ شرمندگی سے باہر دیکھتا رہا۔ "واقعی بہت بے وقوف بنا میں... پھر بھی معاف کر دیا تم نے اور ملنے آ گئیں۔"

گل نے ایک آہ بھری۔ "کیا کرتی... کب تک روکتی دل کو... تم بے وقوف ہی نہیں... جھوٹے بھی ہو۔ صرف ڈائیلاگ مارتے تھے فلمی... ایسی ہوتی ہے محبت؟ اتنی جلدی بھول گئے گل کو... خود ہی فرض کر لیا کہ وہ کہیں شادی کر کے... لعنت بھیج دی مجھ پر۔" آہستہ آہستہ وہ جذباتی ہوتی گئی اور بات کرتے کرتے رونے لگی۔

وہ اس کی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو دیکھ کے تڑپ گیا۔ "مجھے جتنا برا کہنا ہے کہو... مگر خدا کے لیے... یہ آنسو نہیں۔"

گل نے دوپٹے کے کونے سے آنسو صاف کر لیے۔ "بے غیرت میں ہی ہوں نا جو خود آ گئی... پیسے ہیں جیب میں تو کچھ منگوا لو۔"

اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ دور سے بولا۔ "ہاں ہاں لا رہا ہوں... وہی آرڈر ہے نا پرانا؟"

وہ مسکرائی۔ "یہاں سب پہچانتے ہیں ہمیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا یہاں آتے ہوئے۔ خیال تو ہر بار آتا ہے کہ یہ آخری ملاقات نہ ہو۔ آخر کب تک میں بجھتی رہوں گی کہ ماں باپ کی آنکھوں پر جھوٹ کی پٹی باندھ دی ہے میں نے... وہ کہاں دیکھ سکتے ہیں... تمھیں پتا ہی نہیں چلے گا اور وہ مجھے مار کے دفن کر دیں گے، تم اسی طرح بے خبر بیٹھے رہو گے۔"

"مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میں تو آج بھی تیار ہوں شادی کے لیے۔"

"اور شادی کے بعد؟ کہاں لے جاؤ گے مجھے؟ میں تو ابھی تیار ہوں تمہارے ساتھ جانے کے لیے... جہاں تم کہو۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اپنے ساتھ میں تمھیں خوار نہیں کر سکتا۔ آج تک میں نے خواب دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ میری ڈگری بھی ایک کاغذ کی ناؤ ہے جو مجھے کسی کامیابی کے ساحل پر نہیں اتار سکتی۔ اب تو واقعی میں سوچتا ہوں کہ میٹرک کے بعد یا اس سے پہلے ہی میں نے یہی کام کیا ہوتا جو تمہارا باپ کر رہا ہے اور وہ دہی والا... ریڑھی لگائی ہوتی... بریانی بھی رکھ کے بیچتا تو آج آسانی سے تمھیں اپنا لیتا۔"

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری شادی کا معاملہ تو ابھی ٹل گیا ہے، تم کچھ کر سکتے ہو۔"

"میں ایک اور خواب دیکھ رہا ہوں، آسٹریلیا جانے کا تاکہ وہاں پڑھنے کے بہانے کمائی کروں اور پھر وہیں سیٹل ہو جاؤں۔ وہاں جانے والے راستے نکال لیتے ہیں۔"

"اور تمھیں تو فرنگی دیپکا پڈوکون بھی مل جائے گی... جاؤ۔"

اس نے دونوں ہتھیلیاں دکھائیں۔ "بے زر عشق بھی ٹیں بس... خودکشی کرنی ہو تو زہر خریدنے کے لیے بھی پیسا چاہیے۔"

"سنو... کسی نے مجھے بھی یہ راستہ دکھایا ہے۔"

"یعنی تم آسٹریلیا چلی جاؤ پڑھنے کے لیے...؟"

وہ ہنس پڑی۔ "بے وقوف... پہلے تم جاؤ۔ آسٹریلیا ضروری نہیں... جہاں امیگریشن کے قوانین میں گنجائش ہو کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو بھی بلا لے۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "آدمی یعنی میں... اور بیوی تم؟"

"وہ جو طریقہ ہے نا... پہلے داخلہ لے کر پڑھنے کے بہانے داخل ہونا پھر کام کرنا اور شہریت مانگنا... وہ بڑا لمبا ہے... کئی سال لگ سکتے ہیں اس میں۔ تم کسی ایسے ملک جاؤ جہاں پڑھنے کے ساتھ تمھیں اپنے خرچ پر بیوی کو بلانے اور رکھنے کی اجازت مل جائے۔ داخلے کی اجازت کے ساتھ ہی نکاح نامہ جمع کرا دو۔ ڈیکلریشن دے دو کہ میں شادی شدہ ہوں۔ یہ شارٹ کٹ ہے مجھے نکالنے کا۔"

"تم... نکاح کر لو گی میرے جانے سے پہلے؟"

وہ ہکلایا۔ "اور پتا ہے... اس میں بھی دس لاکھ تو لگ جاتے ہیں۔"

"دس لاکھ تو میں پہلے بھی داؤ پر لگا رہی تھی، تمھیں شاہ رخ خان بنانے کے لیے..." وہ آگے جھک کر بولی۔ "سوچو جرم گناہ یا برائی کیا ہے؟ ایک لڑکی کا ایک لڑکے کے ساتھ ممبئی بھاگ جانا فلمی دنیا میں... یا بیوی کا قانونی طور پر کسی دوسرے ملک چلے جانا جہاں شوہر تعلیم حاصل کرنے جا رہا ہو؟ پاسپورٹ تو تم نے میرا ابھی بنوا لیا تھا۔ ایک اور بنوا لینا جو جعلی نہ ہو۔"

شدت جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا۔ "شاید میں دنیا کا سب سے نکما اور کم ہمت شخص ہی نہیں... سب سے زیادہ بے غیرت مرد بھی ہوں۔"

گل نے آہستہ سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی۔ "کس کی نظر میں؟"

"خود اپنی نظر میں... دنیا کی نظر میں۔"

"تمھیں کس کی پروا زیادہ ہے... میری یا دنیا کی؟ جو مستقبل صرف میرا اور تمہارا ہے اس کے لیے جو میں کر سکتی ہوں... کیا مجھے نہیں کرنا چاہیے؟ بولو۔"

"مگر میں کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں۔"

"تم کوشش کر سکتے ہو... وہ تم کر رہے ہو اور مجھے بھروسا ہے تم پر کہ ایک نہ ایک دن وہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی جو ابھی خواب کی بات لگتی ہے... اچھا، میں چلتی ہوں۔"

"پھر کب ملو گی؟"

"ڈیٹ نہیں دے سکتی۔ میرا نیا نمبر تمہارے پاس ہو گا۔ اس پر تم صرف ایس ایم ایس کر سکتے ہو۔ بات میں خود کر لوں گی جب موقع ملے گا۔ پرانا موبائل اماں کے ہتھے چڑھ گیا تھا لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سب ڈیلیٹ کر دیتی ہوں میں۔"

"پھر یہ دوسرا کیسے مل گیا؟"

"ابا کی دکان پر ایک لڑکا ہے۔ وہ کھانا لے جاتا ہے گھر سے... دل کے ہاتھوں مجبور ہے بے چارہ... مجھ پر مرتا ہے۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ خاموش محبت کرتا ہے مجھ سے۔ لیکن میں کہوں تو جان بھی دے سکتا ہے۔" وہ ہنسی اور بیگ میں سے برقع نکال کے روپوش ہو گئی۔ صرف وہی نہیں، انھیں سرو کرنے والا ویٹر بھی دیکھتا رہا پیار و محبت کا یہ فلمی ڈراما۔ اس کی نظر کے سامنے دن رات ہوتا تھا مگر یہ دونوں جب تک بیٹھے رہتے تھے وہ انھیں ڈسٹرب کیے بغیر بڑی محویت سے دیکھتا رہتا تھا۔

دراصل ان کی صورت شاہ رخ خان اور دیپکا پڈوکون سے ملتی تھی جن کی فلم "اوم شانتی اوم" اس نے اتنی بار ٹی وی پر دیکھی تھی کہ اس کا ہر ڈائیلاگ یاد ہو گیا تھا۔ دونوں کی تصویریں اس نے اپنے کمرے کی دیواروں پر پھیلا رکھی تھیں۔

☆☆☆

زندگی نے ایک بار پھر اسے دھوکا دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ بہت محتاط تھا۔ معلوم نہیں بار بار اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ تقدیر نے اسے کھلونا بنا لیا تھا اور جیسے بچے بے معنی باتوں اور فضول حرکتوں سے خوش ہوتا ہے، ایسے ہی سب اس کے پلان اور اس کے مستقبل کے شاندار منصوبوں پر ہنستے تھے۔ وہ بے اعتبار ہو گیا تھا۔ ایک انڈے سے پولٹری فارم بنا کے دولت مند بن جانے والا شیخ چلی... مشہور ہو رہا تھا۔ مامے دی ہٹی پر بیٹھنے والے باپ سے اب کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ سب کو اس سے ہمدردی تھی۔

اب کوئی لال حسین کو شاہ رخ خان کہتا تھا تو اسے گالی کی طرح لگتا تھا۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار یہ سمجھتا تھا کہ وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ گل کو بھی جس کے دس لاکھ روپے اس نے گٹر میں ڈال دیے تھے۔

وہ کئی دن سے گھر نہیں گیا تھا۔ رات کو وہ کہیں بھی سو جاتا تھا۔ مسجدوں کے دروازے تو اب بند ہو گئے تھے لیکن دو کروڑ کی آبادی کے اس شہر کراچی میں لاکھوں بے گھر تھے جو کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ ایسے کئی ٹھکانے تھے جہاں سے وہ پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے، وہ میلے اور بدبودار ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر شیو بڑھ کر خشخشی داڑھی بن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور وحشت تھی۔ پولیس اسے آوارہ گرد یا ہیروئنچی قرار دے کر حوالات میں بند کر دیتی تو اسے تعجب نہ ہوتا۔

گل سے آخری ملاقات کے بعد اگلے ہی دن اس نے شہر میں منعقد ہونے والی ایک تعلیمی نمائش کا پوسٹر دیکھا تو وہ نئے عزم کے ساتھ وہاں پہنچا۔ نمائش حسن اسکوائر پر جاری تھی اور یہ آخری دن تھا۔ نمائش گاہ میں بہت رش تھا۔ باہر کی کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند لڑکے اور لڑکیاں شہر بھر سے امڈ آئے تھے۔ ان میں اکثریت ان کی تھی جو صورت اور حلیے سے وہ نہیں لگتے تھے جو باہر کی تعلیم

پاکے یا پھر وہیں ملازمت کرتے ہیں اور پھر باہر کی شہریت حاصل کر کے واپس وطن آتے ہیں تو کسی سرکاری یا تجارتی ادارے اور کارپوریشن میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہو کے ملکی خزانوں کو بے دریغ اور بلاخوف وخطر لوٹتے ہیں... اور پھر اپنی اگلی نسل کو انہی خطوط پر پروان چڑھاتے ہیں، شاید ایسی نمائشوں پر حقارت کی نظر بھی نہیں ڈالتے۔

اکثریت اس جیسوں کی تھی، گو باہر سیکڑوں کی تعداد میں کھڑی گاڑیاں اس کے خیال کی نفی کرتی تھیں۔ وہاں کم سے کم پچاس مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں کے اسٹال یا کیمپ آفس قائم تھے۔ وہ سب پچاس قسم کے کورس پیش کر رہی تھیں۔ آپ وہ سب علوم، فنون اور سائنس جو اکیسویں صدی کی ضروریات کے مطابق تھے، پڑھ سکتے تھے۔

اس نے سارا دن میں درجن بھر اداروں سے معلومات لیں۔ ہر یونیورسٹی کے نمائندے بڑی خوش اخلاقی اور وضاحت سے ہر بات بتاتے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ دنیا کے ہر شعبے میں کامیابی بہت آسان ہے۔ اگر آپ مطلوبہ تعلیم حاصل کر لیں اور اس کے لیے تمام اخراجات پورے کر سکتے ہوں... پہلے لگائیے پھر کمائیے... خرچہ ہر جگہ لاکھوں کا تھا۔ دس لاکھ سے پچاس لاکھ تک۔ جیسا نام ویسے دام۔ اسے تین ممالک کے تعلیمی اداروں کی پیشکش معقول لگی۔ تقریباً ویسی ہی جیسی رفیق نے بیان کی تھی۔ دس لاکھ سے کم میں وہ یورپ کے کسی ملک میں سیٹل ہو سکتا تھا یا آسٹریلیا اور کینیڈا میں... اتنا کما سکتا تھا کہ پڑھ سکے اور اپنے ساتھ گل کو بھی رکھ سکے۔ بڑا مسئلہ یہی تھا کہ وہ گل کو بھی بلانا چاہتا تھا۔

اگلے دن نمائش ختم ہو گئی تو وہ ایک یونیورسٹی کے کیمپ آفس پہنچا جہاں اسے امید کی روشنی زیادہ نظر آئی تھی۔ وہ خود جلدی گیا تھا تاکہ بات اطمینان سے کی جا سکے۔ اس وقت وہاں اور کوئی نہیں تھا چنانچہ سیکریٹری ٹائپ ریسیپشن آفیسر نے اسے انتہائی خوش اخلاقی سے ایک ذمے دار افسر کے کمرے تک پہنچا دیا۔

غیر ملکی نے اٹھ کے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”میں گورڈن براؤن ہوں۔ یونیورسٹی کا نمائندہ برائے پاکستان... واٹ کین آئی ڈو فار یو مسٹر حسین۔“ اس نے خاصی بہتر اردو میں کہا۔ ”اگر انگلش کا پرابلم ہے تو آپ اردو میں بات کر سکتا ہے۔“

اس نے مسکرا کے کہا۔ ”تھینکس... مجھے انگریزی آتی ہے۔ میرے آنے کا مقصد داخلہ لینا ہی ہے لیکن میری ایک پرابلم ہے... بلکہ دو۔“

”پہلے ایک بتائیں۔“

”مسٹر براؤن! میں اپنی بیوی کو پاکستان میں چھوڑ کے نہیں آ سکتا۔ داخلہ یونیورسٹی میں صرف میرا ہوگا۔ کیا میری وائف کو ملک میں داخلہ ملے گا؟“

”وجہ معقول ہونی چاہیے۔“

”وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اکیلی ہے اور یہاں انتہائی غیر محفوظ ہو گی۔ ہم نے لو میرج کی تھی چنانچہ کچھ لوگ ہمیں قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بارے میں جانتے ہیں نا آپ؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بہت کچھ... آپ دونوں کو شادی کے ثبوت کے ساتھ ایک حلف نامہ داخل کرنا ہوگا۔ اس کی تصدیق پولیس کا کوئی آفیسر کرے یا کورٹ کہ آپ کی جان کو یہاں واقعی خطرہ ہے۔“

لال حسین کو ملک کے رشوتی نظام کی طاقت پر بھروسا تھا۔ ان دونوں جگہ سے کسی ایجنٹ یا اندر کے آدمی کے ذریعے ہر سرٹیفکیٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ملک میں شناختی کارڈ تو سب ہی نے حاصل کر لیے تھے۔ کیا افغانی اور کیا بھارتی۔ پھر انہوں نے پاسپورٹ بھی بنوا لیے تھے۔ ہر جگہ صرف قوت خرید کام آتی تھی۔

”کس سوچ میں پڑ گئے آپ مسٹر حسین...؟“

وہ چونکا۔ ”کچھ نہیں، کیا کورٹ سے تصدیق کے بعد میری بیوی کا آپ کے ملک میں داخلہ یقینی ہو جائے گا؟“

اس نے کچھ وقت لیا۔ ”یقینی کیا ہے... مسٹر حسین... آپ بھی امید کر سکتے ہیں اور میں بھی... لیکن ایسے کیس کافی ہیں... دوسری پرابلم؟“

”مسٹر براؤن! ابھی جو کچھ ہمارے پاس ہے، داخلہ فیس اور سفر کے اخراجات میں اٹھ جائے گا۔ یہ صرف ایک سمسٹر کے لیے ہوگا۔ دوسرے سمسٹر اور وہاں زندگی گزارنے کے لیے مجھے ملازمت کی ضرورت ہو گی۔“

”اس کا بندوبست پہلے سے کر دیا جائے گا۔ آپ کے لیے پڑھنا اور وہاں رہنا ممکن ہوگا۔ وہ دن بھر گھر میں اکیلی رہ کے کیا کرے گی؟“

”میری بیوی... کیا اسے بھی جاب مل سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں... اس کی کوالیفکیشن کے مطابق جاب ہو گی۔“

”وہ گریجویٹ ہے۔“

”پھر بہت آسان ہوگا۔ آپ آرام سے رہیں گے۔“

گورڈن براؤن نے وہاں کے معیارِ زندگی کے مطابق جو اخراجات بتائے، وہ آمدنی سے کم ہی تھے۔ لال

حسین نے حساب لگایا تو وہ خاصی خوش حالی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ کار رکھ سکتے تھے اور ایک بیڈ والا اپارٹمنٹ لیز پر لے سکتے تھے۔ میاں بیوی کے لیے شہریت ملنے کے امکانات بہت زیادہ تھے اور اگر ان کا بچہ ہو گیا تو وہ پیدائشی شہری ہوگا۔ اس کے والدین کو بچے کے لیے وہاں رہنے کی اجازت دینا لازمی ہوگا۔ اس کے بالغ ہونے تک ماں باپ کو مستقل شہریت بھی مل جائے گی۔

لال حسین کو اس تفصیل سے بہت اطمینان اور اعتماد حاصل ہوا۔ شاید یہی اس کے تمام مسائل کا حل اور اس کے اچھے مستقبل کا راستہ تھا۔

”مسٹر گورڈن براؤن... مجھے بتائیں میں کہاں سے شروع کروں؟“

”گویا آپ نے فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔ آپ مجھ سے داخلہ فارم لے لیں۔ اپنا پاسپورٹ مجھے دیں اور وائف کا۔“

”پاسپورٹ... وہ تو ابھی میرے پاس نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں... آپ کل لے آئیں۔“

اس نے کہا۔ ”فیس وغیرہ مجھے کہاں جمع کرانی ہو گی اور کب تک؟“

”یہ سب فارم میں دیا ہوا ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا جس کا مطلب تھا کہ اب تم جا سکتے ہو۔

سپین گل کا پاسپورٹ اس کے اصل نام پر نہیں تھا کیونکہ اس کا شناختی کارڈ بھی جعلی تھا۔ اب صورتِ حال مختلف ہو گئی تھی۔ بہت جلد اسے گل سے نکاح کرنا تھا۔ نکاح نامہ بھی جعلی بن سکتا تھا مگر اسے یہ منظور نہ تھا اور نہ گل اس پر رضامند ہوتی کہ وہ زندگی بھر کی رفاقت کا عہد نامہ بھی جعلی نام سے بنوائے۔ یہ معاملہ صرف قانونی نہیں مذہبی بھی تھا۔

کسی مفتی کے پاس جانے سے پہلے اس نے خود گل سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔ اسے نئی پیش رفت سے آگاہ کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ فارم جمع کرانے کے بعد اگلا مرحلہ فیس جمع کرانے کا آئے گا۔ اس نے ایک ایس ایم ایس کے ذریعے ملاقات کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا۔ ہر ملاقات کے لیے وہ اپنی کسی سہیلی سے مدد لیتی تھی۔ وہ گل کے گھر جا کے اسے کسی تقریب میں مدعو کرتی تھی اور پھر اسے اپنے ساتھ ہی لے جاتی تھی۔ وہ شادی شدہ تھی اور اس کا شوہر صبح سے رات تک آفس میں رہتا تھا۔ گھر میں اس کے ماں باپ، بھائی بہن بھی ساتھ رہتے تھے مگر وہ اوپر کی منزل پر تھے۔ نیچے کون آتا ہے کون جاتا ہے، اس کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ سہیلی کے شوہر کو البتہ علم تھا کہ اس کی بیوی اپنی کسی سہیلی کی مددگار ہے لیکن اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ ایسی ویسی کوئی بات ہوگی تو وہ صاف مکر جائے گا کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔

گل کو تین دن بعد آنے کا موقع ملا۔ وہ پہلے سے ریسٹورنٹ میں موجود تھا جب اس نے گل کو ایک نئی مہران کار سے اتر کے اندر آتے دیکھا۔ کار کو ایک نوجوان اور فیشن ایبل بے پردہ عورت چلا رہی تھی جو گل کو ڈراپ کر کے واپس چلی گئی۔

”یہ شاہینہ تھی۔ اس کے گھر سے میں آتی تھی۔ اب اس کے شوہر نے گاڑی لے لی ہے۔ وہ مجھے واپس پک کرنے بھی آئے گی دو بجے۔ تم بتاؤ ایمرجنسی کیا ہو گئی؟“ وہ بولی۔

”بتاتا ہوں، ذرا پُرسکون ہو جاؤ اور ایک بات ہے جو میں پہلے کہنا چاہتا ہوں۔“

ویٹر نے آرڈر لیے بغیر کولڈ ڈرنک کی دو بوتلیں لا کے ان کے درمیان رکھ دیں اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

گل اسے دیکھتی رہی۔ ”پہلے کیا ضروری ہے؟“

”تمہیں یہ بتانا... کہ آج تم بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔ تمہارا یہ ڈریس بہت ماڈرن ہے اور تمہارا میک اپ... تم برقع کے بغیر آئی ہو... اور قیامت خیز لگ رہی ہو۔“

وہ ہنسی۔ ”یہ سب شاہینہ کا کمال ہے۔ کپڑے بھی اس کے ہیں، میک اپ بھی اس نے کیا ہے۔ برقع اس کے گھر پر چھوڑ دیا۔ اب کام کی بات کرو۔“

اس نے تفصیل سے سب بتا دیا۔ ”تم کیا کہتی ہو؟“

”اور سب تو ٹھیک ہے۔ تم فارم بھرو اللہ کا نام لے کے اور جو فیس ہے وہ بھی جمع کرا دو۔ شاہینہ مجھ سے لے جائے گی۔ تم شاہینہ سے لے سکتے ہو۔“ اس نے اپنے بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا۔ ”اس پر شاہینہ کے گھر کا پتا اور فون نمبر سب ہے۔ کارڈ اس کے شوہر کا ہے۔“

”تم نکاح کے لیے تیار ہو؟“

”اگر اس کے بغیر چارہ نہیں تو... بس... میں تیار ہوں... میرا دل تو کہتا ہے کہ شناختی کارڈ کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے جب میں نے تمہیں قبول کر لیا مگر معاملہ دل کا نہیں... قانون کا ہے۔ دیکھو... تم بہت کچھ رشوت دے کر بنواؤ گے۔ پولیس رپورٹ لو گے اور کورٹ آرڈر... اس جعلی کارڈ کو ضائع کر دو اور پاسپورٹ کو بھی... میں تمہیں اپنا اصلی شناختی کارڈ دیتی ہوں... پاسپورٹ اصلی بنوا لو۔ پھر تو کوئی بات غیر قانونی اور غیر شرعی نہیں رہے گی۔“

وہ مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔ ”تم بہت بہادر لڑکی ہو۔“

''بہادر یا پاگل۔''

''جو قدم تم اٹھانے جارہی ہو... وہ جان کی بازی لگانے والی بات ہے۔ ہماری سوسائٹی میں یہ کتنا بڑا اخلاقی جرم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ تمہاری خاندانی روایات میں ناقابل معافی جرم ہے۔''

''ایک امید یہ ہے کہ میں باہر نکل جاؤں گی تو محفوظ ہو جاؤں گی۔''

''یہ ہوسکتا ہے کہ ائرٹریول ریکارڈ سے تمہارا سراغ مل جائے... تم کس تاریخ کو کس فلائٹ سے کہاں گئیں۔''

''تم تو محفوظ رہو گے۔ تم پر الزام نہیں آئے گا کہ میں تمہارے ساتھ گئی تھی۔''

''شاید ایسا نہ ہو۔ تمہاری ازدواجی حیثیت کا بھی پتا چل جائے گا۔ تمہارے یورپ کے اس ملک اور شہر جانے کی وجہ خودبخود سامنے آجائے گی مگر میں انجام سے نہیں ڈرتا۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں ڈرتی ہوں؟''

ایک بار پھر ویٹر آیا اور دو اسپیشل برگر انڈے والے... کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ... رکھ کے مسکراتا اور گاتا چلا گیا۔ ''پیار کیا تو ڈرنا کیا... جب پیار کیا تو...''

''بہت بدمعاش ہے یہ بھی۔'' وہ ہنسا۔ گل بھی جھینپ کے مسکرا دی۔

ایک بجے شاہینہ اچانک اندر آگئی۔ ظاہر ہے وہ لال حسین سے خود... مل کر دیکھنا چاہتی تھی کہ جس سے اس کی سہیلی اتنی استقامت کے ساتھ محبت کررہی ہے، وہ کون ہے اور کیسا ہے... گل نے ان کا تعارف بھی کرایا اور شاہینہ کو اپنے مستقبل کے پروگرام سے بھی آگاہ کردیا۔ اس کے گھر سے لال حسین کو گل کا شناختی کارڈ بھی لینا تھا اور وہ رقم بھی وصول کرنی تھی جو ان کی نئی دنیا میں نئے مستقبل کی بنیاد تھی۔

شاہینہ نے جاتے وقت کہا۔ ''میرا خیال ہے گل کوئی غلطی نہیں کررہی۔ اس کی جگہ میں ہوتی تو اتنی ہی مجبور ہوتی مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔''

گل نے اسے شرمندہ کرنے والی غصیلی نظر سے دیکھا۔ ''اب کیا ہے... تو چلی جا میری جگہ۔''

''چلی جاؤں گی... اگر تجھے میرا شوہر قبول کرلے... اور یہ مجھے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کو بے شرم کہتی اور ہنستی ہوئی نکل گئیں۔

تیسرے دن وہ شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے ساتھ فارم لینے گیا تو گورڈن براؤن نے نام لے کر بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔ اس نے گھر آکے فارم کو بھرنے سے پہلے اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس میں کوئی بھی بات شبہ پیدا کرنے والی نہیں تھی۔ ہر چیز واضح تھی اور ہدایات مکمل تھیں۔

یونیورسٹی کے چھپے ہوئے چار صفحات کے فارم پر تمام ضروری معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ انتظامی عہدے داروں کے نام، فون نمبر اور ای میل ایڈریس تھے۔ وہ تمام شعبے تھے جن میں داخلہ لیا جاسکتا تھا لیکن تدریسی عملے کے ارکان کے نام نہیں تھے۔ یہ درج تھا کہ آپ ویب سائٹ پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے چند ہی ویب سائٹ دیکھی تھیں اور اس کی معلومات وہی تھیں جو فارم میں موجود تھیں مگر ضروری حد تک۔

اپنی پرسنل تفصیلات میں اس نے سب لکھ دیا جو سچ تھا۔ شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور پتا، فون نمبر اور ای میل ایڈریس... ازدواجی حیثیت میں خود کو شادی شدہ دکھانا ضروری تھا۔ بچوں کی تعداد صفر تھی۔ قریبی عزیزوں میں اس نے ماں باپ اور بہن کے نام لکھے اور گھر کا پتا اور فون نمبر دیا۔

اس میں ہوسٹل کے اخراجات الگ دیے ہوئے تھے مگر اس کو اپنی رہائش کا بندوبست خود کرنا تھا۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں لکھا کہ وہ ''سیلف فنانس'' کرے گا۔ ابھی ایک سمسٹر کی فیس دے گا۔ بس... وہ جاب کرے گا اور اس کی وائف بھی... بعد میں وہ ریگولر فیس دے گا۔

ساری تفصیلات درج کرنے کے بعد دوسرا حصہ اس کی بیوی سے متعلق تھا۔ اس نے وہ سب لکھا جو درست تھا یا درست ہونے والا تھا۔ بیوی کا نام، شناختی کارڈ، پاسپورٹ کے سامنے اس نے لکھا کہ وہ اپلائیڈ فار ہے۔ شادی کے ثبوت اور پولیس رپورٹ یا کورٹ آرڈر کے بارے میں بھی اس نے کہا کہ یہ دستاویزات داخلے کے بعد لیکن سفر سے پہلے فراہم کردی جائیں گی۔

آخری حصے میں فیس کا حساب تھا۔ کس مد میں اسے کتنی ادائیگی کرنی ہوگی۔ سب کچھ ڈالرز میں تھا جو وہ مقامی مارکیٹ سے حاصل کرکے جمع کراسکتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کو ابھی نو لاکھ سے کچھ اوپر جمع کرانے تھے۔ اس نے حساب لگایا کہ شاید بعد میں سفری اخراجات کی مد میں اسے مزید دو تین لاکھ درکار ہوں گے۔ خیر، گل ساتھ جائے گی تو یہ بھی کر لے گی۔ تمام رقوم جمع کرانے کے لیے بڑے شہروں کے اکاؤنٹ نمبر تھے یا وہ پے آرڈر اور بینک ڈرافٹ اسلام آباد میں ایک بینک کی برانچ کے نام ارسال کرسکتا تھا۔

اس نے بینک ڈرافٹ بنوایا اور فارم بھر کے گورڈن براؤن کے پاس پہنچا۔ اس نے بڑی باریک بینی سے تمام

اندراج دیکھے... ایک دو سوال کیے اور ایک دو جگہ اسے کچھ لکھنے کو کہا۔ پھر اس نے اپنی اسسٹنٹ کو بلایا اور وہ فارم لے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹ کے آئی تو فارم کا ایک حصہ اسے دے دیا جس پر مہر تھی اور تاریخ وصولی۔ اس نے اصل پر بینک ڈرافٹ نمبر... تاریخ اور بینک کی برانچ کے نام کا اندراج کیا۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے تمام دستاویزات اور اسناد کی فوٹو کاپیاں جو وہ ساتھ لایا تھا، فارم کے ساتھ نتھی کردیں۔

وہ ہر طرح سے مطمئن تھا کہ بیرون ملک جانے کے معاملے میں کوئی ٹریول ایجنٹ یا تھرڈ پرسن ملوث نہیں ہے۔ اس نے ڈائریکٹ ایڈمیشن لیا تھا اور داخلے کی اطلاع یونیورسٹی سے آتی اس پر متعلقہ سفارت خانہ ویزا جاری کرنے کی رسمی کارروائی کرتا۔ کلاسز شروع ہونے سے پہلے وہ اور گل فلائی کر جاتے۔ یہاں کے بینک اکاؤنٹ بھی محفوظ تھے لیکن پے آرڈر جو اسلام آباد گیا تھا، سیدھا اس یونیورسٹی کے اکاؤنٹ میں جمع ہوگیا تھا۔ وہ بینک یقیناً اسلام آباد کے ڈپلومیٹک انکلیو میں ہوگا جہاں تمام سفارت خانے تھے۔

فارم اور بینک ڈرافٹ بھیج دینے کے بعد اس نے یوں محسوس کیا جیسے کوہِ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو سر کرنے کے لیے وہ اس کے دامن میں بیس کیمپ تک تو پہنچ گیا ہے۔

ایس ایم ایس کے ذریعے گل کو مطلع کرنے کے بعد اس کے سامنے بہت سے چیلنجز تھے۔ کسی صورت اسے پولیس میں رپورٹ درج کرانا تھی کہ اس کی اور بیوی کی جان کو خطرہ ہے کیونکہ انہوں نے اپنے خاندان کی روایات کے خلاف اپنی مرضی سے شادی کرلی ہے۔ عام طور پر پولیس یہ کام نہیں کرتی، وہاں بھی اسی قدامت پرست سوسائٹی کے نمائندے بیٹھے ہیں جو اسے اخلاقی جرم سمجھتے ہیں اور ان کی جذباتی ہمدردی ان ماں باپ کے ساتھ ہوتی ہے جن کی بیٹی گھر سے بھاگ کے شادی کرلے۔ یہی رویہ کورٹس کا ہوتا ہے اور اگر کوئی جوڑا عدالت سے تحفظ فراہم کرنے کے احکامات حاصل کر بھی لے تو فائدہ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ عدالت میں نہ مارے جائیں تو بعد میں مار دیے جاتے ہیں۔

جینوئن کیس میں خطرہ تھا مگر جعلی کام میں مسئلہ صرف معاوضے کا ہوتا۔ اب گل کا معاملہ بھی جینوئن ہوگیا تھا۔ اس مہم کی ابتدا میں پہلا قدم ہی سب سے دشوار تھا۔ اس نے گل سے شاہینہ کے گھر پر بات کی۔ ''داخلہ تو سمجھو ہوگیا۔ اب چلنے کی تیاری کرو۔''

''میں کیا کروں... تم نے پاسپورٹ بنوا لیا میرا...؟''

''گل... نئے پاسپورٹ میں تمہاری ازدواجی حیثیت میری منکوحہ کی ہوگی اور اس کے لیے نکاح نامے کی ضرورت پڑے گی۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی سنجیدگی بتاتی تھی کہ امتحان کی گھڑی آگئی ہے تو اس کے قدم ڈگمگا رہے ہیں۔ ''نکاح نامہ...''

''ہاں، میں نے فارم میں بھی لکھ دیا ہے کہ مجھے بیوی کو بلانا ہے۔ تمہارے کہنے پر... ورنہ میں اکیلا جاسکتا تھا ہزاروں طلبا کی طرح...''

''لال... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈر تو مجھے بھی لگ رہا ہے مگر اب تو جینا مرنا ساتھ ہے۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ابھی صرف نکاح ہوگا۔''

''ظاہر ہے، ہم شاہینہ کے گھر پر بھی کرسکتے ہیں۔'' وہ بولا۔

اس نے گھبرا کے کہا۔ ''نہ بابا، بعد میں مصیبت پڑی تو میں ماری جاؤں گی۔ شوہر مجھے قتل کردے گا۔''

''کیوں، اس میں نہ تمہارا نام آئے گا نہ پتا۔ گواہ وکیل سب دوسرے ہوں گے۔''

''پھر بھی، میرے گھر میں... میں بات کرکے دیکھتی ہوں اپنے شوہر سے کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

انہیں خلافِ توقع شاہینہ کے شوہر کی مدد حاصل ہوگئی۔ اس نے اپنے گھر کے بجائے ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں انتظام کردیا۔ یہ ان کی کمپنی کا ریسٹ ہاؤس تھا اور سب کے استعمال میں رہتا تھا۔ یہ محفوظ جگہ تھی، باقی انتظامات لال حسین نے خود ہی کیے تھے۔ مقررہ وقت پر قاضی، دو گواہ اور وکیل صرف دستخط کرانے کی کارروائی کرنے کے لیے آتے اور چلے جاتے... یہ شادی ضرور تھی لیکن نہ اسے دولہا بن کے آنا تھا اور نہ گل کو دلہن بن کے لیکن وہ مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شاہینہ کے شوہر نے کلفٹن کے ایک مشہور ریسٹورنٹ سے کھانا منگوا لیا ہے اور مٹھائی بھی لے آیا ہے۔

گل اس قدر اپ سیٹ اور نروس تھی کہ لگتا تھا بے ہوش ہوجائے گی۔ رسمی کارروائی اس نے بڑی مشکل سے پوری کی۔ کھانا وہ کیا کھاتی... شاہینہ نے اسے زبردستی مٹھائی کھلائی اور کھانا بھی اس کے منہ میں ٹھونسا۔ وہ مسلسل ایک بات کہتی رہی۔ مجھے گھر پہنچا دو... میرا دل گھبرا رہا ہے۔ لال

سے اس نے نظر ملا کے بات بھی نہیں کی اور ساتھ بیٹھ کے تصاویر بنوانے سے صاف انکار کر دیا۔

اس نے گل کا ہاتھ تھاما تو وہ برف ہو رہا تھا۔ ''تھینک یو گل!'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ گل نے ہاتھ نہیں چھڑایا اور نظر اٹھائے بغیر بولی کہ بس اب مجھے جانے دو... اس پر سخت گھبراہٹ طاری تھی، شاہینہ کی اسے روکنے کی کوشش بھی رائگاں گئی۔ زبردستی شاہینہ نے اس کے منہ میں لڈو ٹھونس کے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ جب اس نے دھمکی دی کہ وہ اکیلی واپس چلی جائے گی تو شاہینہ بھی مجبور ہو گئی۔

لال حسین کا دماغ جیسے خلا میں پرواز کر رہا تھا اور اس کے قدم زمین پر کسی مدہوش شرابی کی طرح ادھر سے اُدھر پڑ رہے تھے۔ دنیا کا نظارہ اسے بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ یہ دنیا وہ نہیں تھی جس میں وہ آج تک جیا تھا۔ جب اسے تنہائی میسر آئی تو اس نے اپنے بے سمت بھٹکنے والے خیالات کو اور دن میں نظر آنے والے رنگین خوابوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور پھر دماغ کو ایک نکتے پر فوکس کرنے میں کامیاب رہا۔ نکتہ صرف یہ تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے جو ایک شادی شدہ شخص ہے۔

پہلا مرحلہ اس اعلان کے بعد گھر میں اٹھ کھڑے ہونے والے طوفانِ بلاخیز کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس کے لیے ایک حکمتِ عملی کی ضرورت تھی۔ وہ پہلے کسے بتائے... کیا بتائے اور کیسے بتائے؟ قدرتی طور پر اس کی کم عمر بے وقوفی کی حد تک سادہ اور اس پر جان دینے والی چھوٹی بہن کو اپنی قسم دے کر ساتھ ملایا جا سکتا تھا یا کم از کم خاموش کیا جا سکتا تھا۔ پھر آتی تھی ماں کی باری جو بیٹوں کے مقابلے میں اتنی کمزور اور رقیق القلب ہوتی ہیں کہ دل دہلا دینے والے ڈائیلاگ اثر نہ کریں تو ایک دردناک جذباتی ڈرامے کا پہلا سین کام کر جاتا ہے۔ وہ جیب سے ملٹی وٹامن کی گولیاں نکالے اور ہتھیلی پر رکھ کے پانی کا گلاس بھرے کہ یہ نیند کی گولیاں کھا کے میں اپنے تمہارے مصائب کا خاتمہ کرتا ہوں۔ تم میرے بغیر جی لو گی لیکن میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا... وغیرہ وغیرہ... ماں کو بھی ناک آؤٹ کیا جا سکتا تھا۔

ناقابلِ تسخیر چٹان۔۔۔ ابا صاحب تھے... پروپرائٹر ماے دی ہٹی... اگر اس نے بھی جوانی میں دو چار سچے عشق کیے ہوں گے تو وہ ایسی کسی ڈرامے بازی سے متاثر نہیں ہوگا۔ شاید الٹا کہے گا کہ بیٹا گولیاں کم مت کھانا ورنہ عالمِ فانی اور عالمِ جاودانی کے درمیان کہیں لٹکتے رہ جاؤ گے۔ یہ تو ہوا زیادہ مشکل مرحلہ نمبر ایک... دوسرے مرحلے میں پردیس سدھارنے کا اعلان ہوگا تو نہ بہن پر کوئی جادو چلے گا نہ ماں پر... الٹا وہ ایسے ایسے ڈائیلاگ بولیں گی، ایسی آہ و زاری اور سینہ کوبی کریں گی کہ اس کے سارے عزائم کے غباروں کی ہوا نکل جائے گی۔ شادی تو ہو چکی۔ عمرِ عزیز کے باقی دن اسے کسی ایک جگہ بیٹھنا پڑے گا... یا ماے دی ہٹی یا سسر کی دکان۔

پھر جیسے خدا کو اس کی حالتِ زار پر رحم آ گیا اور اس پر مشکل فیصلے کا ایک آسان حل نازل ہوا۔ آخر ابھی اسے عقدِ مسنونہ کی خوش خبری کا دھماکا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ فی الحال وہ بم کے دھماکے کو کریکر بنا کے پیش کرے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ سال بھر کے لیے اسکالرشپ ملی ہے اور وہ ایم ایس کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس جھوٹ میں سفید جھوٹ کا تڑکا یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ایک آسٹریلین کمپنی میں اس کو دو لاکھ... نہیں... یہ زیادہ ہے... ایک لاکھ... پچاسی ہزار بہتر ہے۔ پچاسی ہزار ماہانہ کی نوکری ملی ہے مگر اس کی ٹریننگ ایک سال آسٹریلیا میں ہوگی جس کے اخراجات کمپنی دے گی اور واپسی پر اس کی تقرری ہو جائے گی۔ ویری گڈ... یہ جھوٹ چلے گا... بلکہ دوڑے گا، نہ رونا دھونا نہ شور شرابا۔ سب اسے ہنسی خوشی رخصت کریں گے۔ ایک سال کیا ہوتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے گزر جائے گا۔

جھوٹ کو اس نے مزید پالش کیا اور اس کی غیر اہم تفصیلات کو بھی تقریر میں شامل کر لیا۔ پھر اس نے اللہ سے دعا کی کہ وہ نیتوں کا حال جانتا ہے تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دوسروں کو تکلیف سے بچانے اور خود تکلیف سے بچنے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے۔ اہلِ خانہ سال بھر میں جدائی سہنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ٹریننگ میں سال بھر کی توسیع ہو جائے تو صبر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ پھر یہ کہ کمپنی کے ہیڈ آفس میں ایک سال کی ٹریننگ ضروری ہے۔ تین سال بعد وہ نہ لوٹے تو پھر انتظار میں راہ تکنے اور آہیں بھرنے کے سوا وہ کیا کر سکتے ہیں۔ انہیں کیسے پتا چل سکتا ہے کہ وہ گل سے شادی کر کے وہاں سیٹل ہو چکا ہے اور اب اس کے تین بچے ہیں بحساب ایک سالانہ... اور جب وہ اس کی واپسی کی آس بھی گنوا دیں تو انہیں یہ شاک دیا جا سکتا ہے۔ میں نے شہریت حاصل کرنے کے لیے یہاں شادی کر لی ہے۔ بہت جلد سب کو بلا لوں گا۔۔۔ انشاء اللہ... ہر ماہ کی طرح سو ڈالر ارسال ہیں۔ والدہ کی خدمت میں آداب... فقط آپ کا فرمانبردار بیٹا۔ اس وقت وہ شاک پروف ہو چکے ہوں گے۔

اس فیصلے سے مطمئن ہو جانے کے بعد اس نے اگلی شام یہ بریکنگ نیوز دمکتے چہرے اور مٹھائی کے ایک ڈبے کے ساتھ پیش کی۔ ''اماں... ایک بہت اچھی خبر ہے... مگر تھوڑی سی بری بھی۔''

بہن اور ماں کے چہرے تو... سوالیہ نشان بن گئے مگر ابا صاحب نے لیڈر آف دی اپوزیشن کے لہجے میں فرمایا۔ ''تو پہلے برائی بتا... اچھائی کی توقع رکھنا ہم نے چھوڑ دیا ہے تجھ سے۔''

اس نے لہجے کی شگفتگی برقرار رکھی۔ ''ابا! مجھے نوکری مل گئی ہے اور معلوم ہے تنخواہ کتنی ہوگی... پچاسی ہزار... بعد میں ہو جائے گی لاکھ سے اوپر۔''

باپ نے اسے عینک کے اوپر سے گھورا۔ ''یہ برائی بتائی ہے تو نے؟''

وہ ایسے بولتا رہا جیسے وزیرِ خزانہ اپوزیشن کے شور شرابے میں بھی بجٹ کی تقریر پڑھتا رہتا ہے۔ ''ایک آسٹریلیا کی کمپنی ہے۔ سال بھر کے لیے پہلے سڈنی جانا پڑے گا۔''

''تو کیسے جائے گا؟ پیدل یا سائیکل پر...؟''

اب والدہ کی ممتا اپنے سپوت کے دفاع میں اٹھی۔ ''اسے بات تو کرنے دو... پیچھے پڑ گئے ہو لٹھ لے کر۔''

''سارا خرچہ کمپنی دے گی۔ آنے جانے کا اور وہاں رہنے کا... اسکالرشپ میں تنخواہ کا نصف ملے گا۔ واپسی ایک سال بعد اور یہاں کمپنی میں چیف مارکیٹنگ منیجر کی حیثیت سے تقرری... کمپنی کراچی میں ہی ہے۔ تقریر ختم ہوئی۔ محترم سامعین... مٹھائی نوش فرمائیے۔''

خلافِ توقع اسے زیادہ بحث نہیں کرنی پڑی۔ خواتین کچھ افسردہ ہوئیں مگر اس نے اپنے لہجے کی شگفتگی سے ان کی حوصلہ افزائی کی اور تسلی دی کہ ایک سال تو یوں گزر جائے گا۔ سمجھو میں یوں گیا اور یوں آیا مگر اس کے بعد... ریڈی میڈ خواب... کسی اچھی سی سوسائٹی میں جہاں معزز لوگ رہتے ہیں ایک کوٹھی۔ ایک کار... نوکر... بہن کی کسی اچھے گھر میں شادی... ابا کے لیے بھی آرام... یہ ماے دی ہٹی خلاص... بس بہن کی شادی ہو جائے پھر آپ دونوں کو میں حج پر بھیجوں گا۔ اپنی شادی کا کوئی ذکر نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ترسی ہوئی زندگی گزارنے والے خوابوں کے سحر میں گرفتار ہو گئے۔ اسے متوقع کامیابی جھوٹ سے حاصل ہوئی۔ سچ دنیا میں اب کہاں ہے۔

اس کے باقی کام آسان ہو گئے۔ اس نے خاصی دوڑ دھوپ کے بعد نکاح نامے کے علاوہ پولیس رپورٹ حاصل کی۔ شاہینہ کے شوہر کا ایک حوالہ کام آیا۔ اس نے انسپکٹر کو پورا سچ بتا دیا کہ اسے رپورٹ کس کارِ خیر کے لیے چاہیے۔ انسپکٹر قائل ہو گیا اور منشی نے اس کی مرضی کے مطابق ایف آئی آر لکھ کے نقل اسے دے دی۔ اس میں لکھا تھا کہ مرضی کی شادی کرنے پر اسے بیوی کے سخت روایت پسند اور غیرت کے نام پر قتلِ عام کرنے والے خاندان سے جان کا خطرہ ہے۔ اس رپورٹ کے مقابلے میں کورٹ کے جعلی احکامات (اصلی مہر والے) حاصل کرنا زیادہ آسان مگر مہنگا ثابت ہوا جس میں پولیس کو تاکید کی گئی تھی کہ فریادی کو تحفظ فراہم کیا جائے۔

سفر کے تمام انتظامات دس دن میں مکمل ہو گئے۔ اس نے گل کو بھی روز کی پروگریس سے باخبر رکھا تھا کہ وہ اپنی تیاری مکمل رکھے۔ اس کی طرف سے گرین سگنل بھی مل گیا کہ میں بھی تیار ہوں اور زادِ راہ میں یعنی مال و زر کافی اکٹھا کر لیا ہے۔ سونا اس کا اپنا اور ماں کا شاید کلو میں ہوگا۔ مال پاکستانی کرنسی میں تھا جو کہیں بھی بدلوائی جا سکتی تھی۔ ائرپورٹ پر بھی... اصل فنانسر تو وہ کباڑی تھا جس کے گھر میں مال بھی کباڑ خانے کی طرح پڑا رہتا تھا اور اسے فکر نہیں ہوتی تھی۔ بیوی یا بیٹی شک و شبے سے بالاتر تھیں۔

اب ویزا اس کے سنہرے مستقبل کی کنجی تھی جو اب تک اس کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ فیس جمع کرانے اور داخلہ فارم بھیج دینے کے بعد وہ امید رکھتا تھا کہ جواب چند روز میں موصول ہو جائے گا۔ داخلہ ہو جانے کے بعد وہ ویزا کے لیے اپلائی کر دے گا اور یہ برطانیہ، امریکا کا سیاحتی ویزا تو ہے نہیں کہ سفارت خانے کا اہلکار نفی میں منڈی ہلا دے تو پھر نہ داد کہ فریاد... کہیں اور جاؤ گھومنے پھرنے... کورس شروع ہونے سے پہلے اس کا آسٹریلیا پہنچنا لازمی ہوگا ورنہ نقصان کی صورت میں وہاں تو ہرجانے کا کیس ہو جاتا ہے۔ کورس آٹھ دن بعد شروع ہوتا تھا۔

اس نے گورڈن براؤن سے رجوع کیا جس سے گزشتہ دس دن میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ فون پر اس کی طرف سے انگیج کی ٹوں ٹوں سنائی دیتی تھی۔ موبائل فون کا نمبر اس نے دیا نہیں تھا۔ وہ خود اس کے آفس جا پہنچا، وہاں نقشہ بدلا ہوا تھا۔ اندر بہت سے لوگ کام کر رہے تھے، رنگ ساز... الیکٹریشن... کارپینٹر... وہ آفس کا نقشہ بدل رہے تھے اور کوئی انٹیریئر ڈیزائن کا ماہر ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظر سے تو وارد کو دیکھا۔ گورڈن براؤن کے نام پر اس کا سر دائیں بائیں ہلنے لگا۔

''کون ہے گورڈن براؤن؟''

لال حسین نے اسے بتایا۔ ”وہ جو یونیورسٹی کے پاکستان میں نمائندے ہیں۔“

ڈیزائنر مزید حیران ہوا۔ ”کون سی یونیورسٹی؟“

لال حسین نے اسے کچھ تفصیل سے بتایا۔ سننے والے کی دلچسپی ایک پُرتمسخر مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔ ”لگتا ہے تم کسی چکر میں آگئے ہو۔ یہاں پہلے تھے کوئی ایسے ہی کنسلٹنٹ... جیسے کہ آج کل گلی گلی دکان کھولے بیٹھے ہیں۔ باہر داخلہ دلوانے اور بھجوانے والے... تین دن پہلے یہ جگہ چارٹرڈ اکاؤنٹس کی ایک فرم نے لی ہے... آڈٹ فرم ہے۔“

لال حسین کا دل ڈوب گیا۔ ڈیکوریٹر سے بحث یا جھگڑا کرنا لاحاصل تھا۔ اس نے جگہ کرائے پر دینے والوں سے رجوع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو پریشان ہوگئے ہیں۔ دن رات تم جیسے بے وقوف بننے والے لڑکے لڑکیاں ہم سے پوچھنے آجاتے ہیں۔ ہم کس کس کو جواب دیں۔ سب کو جواب ایک ہی ہے کہ جاؤ کورٹ میں... ہم کورٹ کو بتا دیں گے۔ ہمیں نہیں معلوم وہ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے کہاں گئے۔

وہ سخت دل برداشتہ اور مشتعل باہر نکلا تو باہر اسمارٹ قسم کے لڑکے لڑکیوں کا ایک غول اسی مسئلے پر شور کر رہا تھا۔ وہ سب چوٹ کھائے ہوئے سانپوں کی طرح پھنکار رہے تھے اور غصے میں انگریزی بول رہے تھے۔ پھر ایک مدبر اور سیاست داں نے اس مجمع کی کمان سنبھالی اور انہیں بلڈنگ کے کیفے ٹیریا میں لے گیا۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے نام اور فون نمبرز وغیرہ لکھوائے اور ایک مشترکہ ایجنڈے کے مطابق طے کیا کہ وہ اپنے اپنے وسائل استعمال کرکے ان فراڈ کرنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے اور ایک دوسرے کو بتائیں گے۔

لال حسین کا مستقبل پھر سیاہی میں ڈوب گیا تھا۔ ایک بار پھر اس کی کامیابی کا ڈھول محلے میں پیٹا جاچکا تھا۔ آسٹریلیا کی کمپنی میں ملازمت... سڈنی میں ٹریننگ... پچاسی ہزار کی تنخواہ جو مناسب مبالغہ آمیزی کے ساتھ ایک لاکھ پندرہ ہزار بتائی گئی اور سب کو جلانے کے لیے مستقبل کے پلان... کار، کوٹھی والے۔

صرف ایک ہفتے میں فریب خوردہ مظلومین کمپنی نے سب معلوم کرلیا۔ مجرم لاپتا تھے۔ ان کا اکاؤنٹ جعلی تھا جو ظاہر ہے بینک والوں کی ملی بھگت سے کھلوایا گیا تھا۔ اس نام کی یونیورسٹی ضرور تھی اور ان کے فارم بھی ایسے ہی تھے۔ یہ انٹرنیٹ سے کاپی کیے گئے تھے۔ ریکروٹنگ ایجنٹوں نے کسی یونیورسٹی کے نمائندے بن کے ہر ایجوکیشن ایگزی بیشن میں اپنی دکان سجانی شروع کردی تھی۔ شاید گورڈن براؤن بھی اصلی گورا نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کسی دوسری نمائش میں وہ کالا بھوت بن کے افریقا کی کسی یونیورسٹی کا نمائندہ بنا بیٹھا ہو۔ بزرگ تو کب سے کہہ رہے تھے کہ چودھویں صدی ہے... قربِ قیامت کے آثار ہیں... بنے ہیں کھلاڑی بھی سارے جواری... نیا جال لائے پرانے شکاری۔

لال حسین کی نظر میں دنیا تیرہ و تار ہوگئی۔ گل کے بیوی ہونے کا خیال نہ ہوتا تو وہ ضرور خودکشی کرلیتا۔ اس کے لیے یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ پہلے صرف اماں ابا اور محلہ تھا۔ اب ایک بیوی بھی تھی جس کو سب سچ بتانے سے خودکشی کرنا واقعی زیادہ آسان تھا۔ اس کی نیند... بھوک سب اڑ گئی۔ وہ خود کو کوستا رہا۔ اپنی جان کا عذاب کم تھا کہ ایک بیوی بھی پکڑلی۔ اب وہ گھر سے بھاگنے کے لیے برقع پہنے بیٹھی ہے اور غالباً گا رہی ہے... چل چلیے دنیا دے اس نکرے...

ہفتہ بھر در بدر اور بیزار پھرنے کے بعد اس نے شاہینہ کو شریکِ راز کیا۔ وہ تو صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔ اس کے شوہر نے حواس بحال رکھے۔ بیوی کے اوپر پانی ڈالا اور لال حسین کو مفت مشورے دینے لگا جو خطرناک، دہشت ناک، خوفناک بھی ہوسکتے تھے۔ اس نے لال حسین کو دو آپشن دیے۔ نمبر ون یہ کہ اس نے جتنی خاموشی سے نکاح کیا تھا، اتنی ہی رازداری سے گل کو طلاق دے اور آدھا بوجھ کم کرے۔ اس میں گل کی خودکشی کے امکان کو نہ بھولے۔ نمبر دو... گل کے والد کے سامنے جا کے کہے، مرے قاتل مرے دلدار... میں ہوں تمہارا اکلوتا داماد۔ جس دنیا میں چاہو رکھو... دنیائے فانی میں یا دنیائے جاودانی میں... اپنی بیوی کو میری بیوی کا درجہ دو یا بیوہ کا... دی چوائس از یورس... زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ دنیا دار آدمی تمہیں تھوڑا ساٹھوک بجا کے معاف کردے گا کیونکہ اپنا کباڑ خانہ چھوڑ کے جیل خانہ آباد کرنا اسے کب قبول ہوگا۔ وہ بالآخر تمہیں اپنی بغل میں بٹھا کے کہے گا کہ اب یہ کباڑ خانہ تم چلاؤ... پرانے پرزے بیچو، ایم بی اے کباڑی ہونے کا اعزاز حاصل کرو۔ کل کو تم ہی شیر شاہ کباڑی ایسوسی ایشن کے صدر بنو گے... پاکستان کے صدر تو بننے سے رہے۔

چنانچہ تمام امکانات... جن میں کورٹ کچہری سے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں شکایت کرنے اور گل کے ساتھ بھاگ کر افریقا کے کسی جنگلی قبیلے میں جابسے جہاں حضرات و خواتین کا جدید ترین فیشن جسم پر صرف پر سجا کے

پھرنا ہوگا... استطاعت کے مطابق مرغی کا پر... سرخاب کا پر... یا مور کا جو قبائلی ڈانس میں بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر وہ دونوں کالے نہیں تھے چنانچہ یہ امکان تھا کہ قبیلہ ان کی یخنی بنا کے پی جائے اور گوشت کا باربی کیو کرے... متبادل جگہ ماؤنٹ ایورسٹ بھی ہوسکتی تھی مگر ہر شخص کی طرح قاتل سسر پاکستان کا جھنڈا لہراتے وہاں بھی پہنچ سکتا تھا۔ پاکستان کا پہلا ایم بی اے کباڑی ہونے کا یا شہیدِ محبت ہونے کا اعزاز حاصل کرنا اب اس کی واحد چوائس رہ گیا تھا۔

وہ ایک پارک کی بینچ پر لیٹا تھا اور اس کے کانوں میں ترانہ گونج رہا تھا۔ اے مردِ مجاہد جاگ ذرا... اب وقتِ شہادت ہے آیا... وہ اللہ اکبر کہہ کر اٹھا اور قتل گاہ کی طرف چلا ہی تھا کہ اس کی نظر کچھ کاغذات پر پڑی جو نہ جانے کون غائب دماغ بینچ پر چھوڑ گیا تھا۔ یہ مختلف قیمتوں کے پرائز بونڈ تھے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھ کے انہیں فوراً جیب میں ڈال لیا۔ وہ بالکل پھکڑ ہو رہا تھا چنانچہ اس دولت کو غیبی امداد سمجھنا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ وہیں بیٹھ کے مالک کی واپسی کا انتظار بھی کرسکتا تھا۔ وہ وہاں سے رفوچکر ہوگیا اور جائے واردات سے بہت دور آجانے کے بعد اس نے اپنے خزانے کا جائزہ لیا۔

یہ سب آٹھ پرائز بونڈ تھے۔ سو روپے سے ہزار... دس ہزار تک کی مالیت والے۔ پچیس ہزار والا صرف ایک تھا۔ اس وقت وہ کیماڑی کے پل پر تھا۔ یہاں وہ آیا تو شرم سے ڈوب مرنے کے لیے تھا مگر پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی یہ کوشش بھی ناکامی کا شکار ہوسکتی ہے۔ اگر پانی اتنا گندا نہ ہوتا یا پل مزید بیس فٹ اونچا ہوتا اور وہاں اسے بچانے والے نہ ہوتے تو وہ کوشش ضرور کرتا۔ اب ٹاور سے دو راستے تھے۔ ایک اس کے قاتل سسر کی طرف جاتا تھا۔ دوسرا موتن داس مارکیٹ کی طرف جہاں پرائز بونڈ اور دنیا بھر کی کرنسی کا دھندا کرنے والے فٹ پاتھ پر بیٹھ کے لاکھوں کا بزنس کرتے تھے۔

اسے ہزار والا ایک پرائز بونڈ کیش کراتے ہوئے ندامت ضرور ہوئی مگر یہ دنیا ایسی ہی تھی۔ خود اس کے ساتھ اتنے دھوکے ہوچکے تھے کہ اب شرافت یا ایمانداری پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ رام رام جپنا پرایا مال اپنا... یہ نیچے سے اوپر تک سب کا اصول بن گیا تھا۔ اس نے نہ چوری کی تھی اور نہ ڈاکا ڈالا تھا۔ دولت خود چل کے اس کے پاس آگئی تھی۔

فٹ پاتھ پر اسے کئی پرانی بہت سے تلی ڈرا کی چھپی ہوئی فہرستیں بھی نظر آئیں۔ ان میں انعام یافتہ پرائز بونڈوں کے نمبر تھے۔ اس نے ایک خرید کے جیب میں ڈال لی اور ایک ہوٹل میں جا بیٹھا جس کی چکن کڑاہی کھانے کا شوق امریکی صدر اوباما نے بھی ظاہر کیا تھا۔ دروغ برگردنِ راوی... سالم مرغی کو اپنے پیٹ کے دوزخ میں ٹھنڈی بوتل کے ساتھ ڈالنے کے بعد اسے دنیا بدلی ہوئی نظر آنے لگی۔ مایوسی اور کم ہمتی جیسے جذبات کی جگہ اس میں بہادری اور دور اندیشی جیسے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ مثلاً اسے خیال آیا کہ بزدلوں کی طرح ایک قاتل سسر کے سامنے جا کے گردن جھکا دینے سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ وہ پہل کرتے ہوئے اس کو دنیا سے چلتا کرے کہ بس کافی جی لیے... اب ہمیں چانس دو۔ وہی تو ہے خطرناک دشمن۔ دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے نہ کہ اس کے سامنے لیٹ جانا چاہیے۔ اور قتل کے ایک سو ایک طریقے ہیں جو جاسوسی ناولوں میں درج ہیں۔ اگر وہ عقل، ذہانت سے کام لے تو یہاں پولیس میں کون سے شرلاک ہومز بیٹھے ہیں۔

پھر اسے پرائز بونڈ یاد آئے۔ اس نے جیب سے نکال کے حساب کیا تو وہ تقریباً چالیس ہزار کے تھے۔ امید کے اس روشن لمحے میں اسے یہ خیال بھی آیا کہ شاید کسی پر انعام نکلا ہو تو اس کے مالِ غنیمت کی مالیت بڑھ جائے۔ دوسری جیب سے انعام یافتہ بونڈز کی فہرست نکال کے اس نے باری باری ہر فہرست میں اپنے پرائز بونڈ کے نمبر تلاش کرنے شروع کیے۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما کام تھا جو ویٹر برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ٹیبل خالی کرانے کے لیے اس نے بل کو زور سے اس کے سامنے پٹخ دیا۔

لال حسین نے غرا کے کہا۔ ”ایک چائے دودھ پتی اسپیشل ملائی والی... ہر پندرہ منٹ بعد۔“

وہ چوتھا کپ پی چکا تھا اور ساتویں لسٹ ملاحظہ فرما رہا تھا جب اس کے حلق سے ایسی آواز نکلی جو عموماً لیبر روم کے باہر سنائی دیتی ہے۔ ادھر اُدھر کے لوگوں نے اسے گھورا پھر بیرا دوڑا ہوا آیا۔ گزشتہ ہفتے چھپکلی والے دودھ کی چائے پی کے ایک گاہک جاں بحق ہوگیا تھا۔ اس نے بھی ایسی ہی آواز نکالی تھی۔

لال حسین نے اپنے جذبات پر قابو پا کے ویٹر سے کہا۔ ”ایک کپ اور کیوں نہیں لایا ابھی تک... سولہ منٹ ہوگئے ہیں۔“

پھر آنکھیں مل کے اور حواس پر قابو پا کے اس نے ایک پرائز بونڈ کے نمبر کو دوسری بار چیک کیا پھر تیسری بار پھر چوتھی بار... ہر بار اس کے دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہوتی گئی۔

یہاں تک کہ اسے اپنی حرکتِ قلب کے بند ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ وہ فوراً اٹھا اور بدحواسی میں بل دیے بغیر نکل رہا تھا کہ ویٹر نے اسے پکڑ لیا۔ ''مجھے پہلے ہی یہ شک تھا کہ اس کی شکل تو ہے فقیروں جیسی۔''

اس نے آنکھیں نکال کے ہزار کا نوٹ بیرے کے ہاتھ پر رکھا۔ ''ابے یہ پکڑ ایک کروڑ... ہزار... باقی رکھ ٹپ...''

''خدا کی شان ہے۔'' ویٹر اسے جاتا دیکھتا رہا۔ ''سالے فقیر بھی اسپیشل کڑاہی کھا کے دو بوتلیں اور پانچ کپ دودھ پتی پیٹ میں انڈیل لیتے ہیں اور پھر تین سو روپے ٹپ دے جاتے ہیں... کہتے ہیں ہزار کو کروڑ۔''

لال حسین کے دماغ میں کروڑ کا لفظ بم کے دھماکوں کی طرح گونج رہا تھا۔ ایک ہجوم نعرے لگاتا گزر رہا تھا، ایک کروڑ... آوے ہی آوے... ایک زنخے نے اس کی ناک کے سامنے تالی بجا کے اور مٹک کے کہا۔ ''ایک کروڑ پر میں صدقے جاؤں۔'' مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہونے لگا۔ ''جناب لال حسین صاحب جن کا ایک کروڑ کا پرائز بونڈ نکلا تھا، حرکت قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے ہیں۔''

وہ دوڑ کے اپنے ابا کی ہم عمر ایک کروڑ کی بس میں چڑھ گیا۔ اس کی پچھلی سیٹ خالی تھی۔ سامنے فرش میں خاصا بڑا سوراخ تھا جس سے سڑک چلتی نظر آتی تھی۔ اس پر ویسا ہی باتھ روم بنایا جاسکتا ہے جیسا ٹرین میں ہوتا ہے اور لکھا ہوتا ہے جب ٹرین کھڑی ہو تو استعمال نہ کریں۔ جب وہ کار خریدے گا تو اس میں یہ انتظام رکھے گا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک کروڑ کا پرائز بونڈ نکلنے پر اس کا دماغ چل گیا ہے۔ اب وہ کسی اچھے سے پاگل خانے میں رہ سکتا ہے۔

شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کو نمبر ایسے یاد ہوگیا تھا جیسے گل کا فون نمبر... وہ لسٹ میں بار بار دیکھتا رہا کہ کہیں فرق ہوگا مگر فرق نہیں تھا۔ ہر ہندسہ وہی تھا۔ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگا۔ شاید وہ زیادہ کھا گیا تھا۔ اس کی نظر پھر فرش کے سوراخ پر گئی تھی مگر بس رک گئی۔ یہی اسٹاپ تھا جہاں اسے اترنا تھا۔ اس نے بونڈز کو جیب میں ہاتھ ڈال کے پکڑ رکھا تھا کہ کہیں نکل نہ جائیں۔ کوئی چھین نہ لے۔ اس کے آس پاس سب لٹیرے پھر رہے تھے جو موبائل چھینتے تھے اور پرس... وہ پرائز بونڈ بھی لے جاسکتے تھے۔ ایک حاسد قسم کے سوار نے موٹر سائیکل اس کی ٹانگوں میں سے گزارنے کی کوشش کی۔ وہ اس کو ہلاک کرنا چاہتا تھا مگر وہ بک بک کرنے لگا۔ ''اندھوں کی طرح سڑک پار کررہا ہے سالے چرسی... مرنا ہے تو ٹرک کے نیچے آکے مر... ٹرین کے آگے لیٹ جا۔''

گھر پہنچ کے اس نے بڑی مشکل سے خود کو نارمل کیا اور پہلا کام یہ کیا کہ پرائز بونڈ کو ایک ایسی جگہ چھپا دیا جہاں اس کے کسی اور کو نظر آنے کا بالکل امکان نہ تھا۔ اس کے باوجود لال حسین کے اندر بے چینی، اضطراب اور انہونی کا جو خوف بھوت کی طرح گھس کے بیٹھ گیا تھا، وہ موجود رہا اور اس نے کئی مرتبہ پرائز بونڈ کو... جو پلاسٹک کے صاف شفاف چھوٹے سے بیگ میں اور پھر ریگزین کی ڈبل واٹر پروف تہ کے درمیان چھپا ہوا تھا، ایک سے دوسری جگہ شفٹ کیا۔ وہ پانی سے خراب نہ ہوجائے۔ اسے دیمک نہ کھا جائے۔ چوہا نہ کترے اور آگ نہ جلائے۔ یہ سب سیکیورٹی انتظامات ضروری تھے۔

رات کے وقت دیگر مسائل سامنے آئے۔ نیند تو خیر اس کی آنکھوں سے اڑ کے پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ دماغ میں خواب بھر گئے تھے جو اب تعبیر رکھتے تھے۔ خیالی پلاؤ پکانے، کھانے اور کھلانے کا خیال اس کے دماغ کا فتور نہیں رہا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک کمپیوٹر چل پڑا تھا جو ایک کے بعد دوسرا منصوبہ پیش کرتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک کروڑ میں وہ حبیب بینک پلازا نہیں کھڑا کرسکتا تھا، یا اپنی پی آئی اے اور ریلوے خرید کے منافع بخش طریقے سے چلا کر خود کو بزنس مینجمنٹ کا جینئس ثابت نہیں کرسکتا تھا مگر ایک سو ایک کام ایسے تھے کہ ایک انڈے سے پولٹری فارم بنانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ پولٹری فارم خرید سکتا تھا۔

صبح تک اس نے خود ہی محسوس کیا کہ رات بھر میں ایک سے ایک منصوبوں کی تفصیلات جمع ہوجانے سے اس کا دماغ ایک اوون بن گیا ہے اور اتنا گرم ہے کہ سر منڈا کے اس پر انڈا توڑا جائے تو فرائی ہوجائے گا۔ مغز فرائی اسے بھی بہت اچھا لگتا تھا مگر اپنا مغز نہیں۔ اس نے سارے منصوبوں کی فائلیں ایک طرف رکھ کے دوسرے فوری توجہ طلب مسائل پر غور کرنا شروع کیا۔ جیسے نئی حکومت دیگر ترقیاتی منصوبے چھوڑ کے ساری توجہ بجلی کے بحران پر دے رہی ہے۔ پہلا مسئلہ تو ایک کروڑ حاصل کرنے کا اور ان کو چوروں، ڈاکوؤں یعنی انکم ٹیکس والوں سے بچا کے رکھنے کا تھا۔ ورنہ ہوگا یہ کہ انکم ٹیکس وہ ہولڈنگ ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، یہ ٹیکس وہ ٹیکس سب کاٹ کے اسے دس روپے کا نوٹ پکڑا دیں گے کہ جاؤ بیٹا عیش کرو۔ یہ تمہاری نیٹ انکم ہے اور بالکل وائٹ ہے۔ کالا دھن تو ہم نے رکھ لیا۔

اسے کسی ماہر کے مشورے اور مدد کی ضرورت تھی جس پر اعتماد بھی کیا جا سکتا ہو۔ بہت غور فرمانے کے بعد اس نے شاہینہ کے شوہرِ نامدار کا نام اسی طرح فائنل کیا جیسے ملک کے صدر کا نام ہوتا ہے۔ خرم آئین کی دفعہ باسٹھ تریسٹھ پر بھی پورا اترتا، یعنی صاحب کردار، ایماندار، شریف اور بھروسے کے قابل تھا۔ اس کے پاس تجربہ تھا اور ذاتی عقل بھی تھی جس کی کمان اس نے شاہینہ جیسی بیوی کے ہاتھ میں بھی نہیں دے رکھی تھی۔

خرم کے سامنے بھی اس نے اصل بونڈ نہیں رکھا۔ آنکھ بند کر کے کسی پالتو شیر پر بھروسا کرنا چاہیے، نہ برسوں کے آزمودہ محافظ پر... انڈیا پاکستان دونوں طرف کے حاکم خود اپنے محافظوں کے ہاتھوں ہی قتل ہوئے تھے۔ ابھی اس نے خرم کے سامنے بونڈ کی فوٹو کاپی رکھی بھی نہیں تھی کہ پہلے اس کی بیوی کا اسپیکر آن ہوگیا۔

''آہ آہ دولھا بھائی۔'' اس نے اپنی آواز اور لہجے کو زہر میں بجھی ہوئی تلوار کی طرح استعمال کیا۔ ''ہم تو اخباری اشتہار اور تصویر اخبار میں دینے والے تھے کہ یہ دولھا نکاح کے بعد سے روپوش ہے۔''

اس نے خفت سے کہا۔ ''ایسی بات نہیں بھابی۔''

''اچھا تو گویا تم نظر آرہے تھے روز مگر ہم عقل کے بھی اندھے ہیں... اور وہ بدبخت جو تمہاری پوشیدہ منکوحہ بن چکی ہے، وہ بلاوجہ اپنی جان رو رو کے ہلکان کر رہی تھی۔ کسی نے گن پوائنٹ پر تم سے نکاح کے وقت اقرار نہیں کرایا تھا اور اب پچھتا رہے ہو تو دے دو اسے طلاق... تمہاری بھی جان چھوٹے اور اس کا عذاب بھی ختم ہو...''

اس مرحلے پر خرم نے ایمرجنسی بریک لگائے۔ ''ارے شاہینہ! خدا کے لیے اسے بھی بولنے دو۔ ابھی وہ آکے بیٹھا ہے۔ اس کی بھی سن لو... چلو جاؤ تم چائے بنا کے لاؤ۔''

''اس میں زہر مت ڈال دینا۔'' لال حسین نے کہا۔

''ہوتا تو ضرور ڈالتی۔'' وہ اس پر ایک قہر کی نگاہ ڈال کے اندر چلی گئی۔

''اور کپ ادھر سے اُدھر ہو جاتا... پھر...؟'' وہ بولا۔

خرم نے کہا۔ ''چھوڑو میاں مجنوں... مجھے بتاؤ اب کیا کر رہے ہو... کون سا خواب دیکھ رہے ہو اور کیوں...؟''

''مجھے شرم آتی ہے اب کچھ بتاتے ہوئے۔''

''چلو یہ بھی غنیمت ہے... ذرا مجھے بتاؤ کہ اس کا تم کیا کرو گے مسٹر شاہ رخ خان! اپنی دیپکا پیڈوکون کا... وہ تو اب تمہارے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے، اسے کب بجاؤ گے... کیسے بجاؤ گے... زمانہ بڑا خراب ہے... ڈھول ایسے ہی رکھا نظر آئے تو کوئی بھی بجانے لگتا ہے۔''

''خرم صاحب! آپ بھی کم نہیں اپنی زوجہ محترمہ سے... نہ وہ مجھے بولنے دے رہی تھی، نہ آپ کی نان اسٹاپ رک رہی ہے۔''

''اچھا چلو بولو... بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔'' وہ ہنسا۔

لال حسین نے بونڈ کی فوٹو کاپی اس کے سامنے رکھ دی۔ خرم اسے کچھ دیر یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے سامنے میز پر سوکھا ہوا بینگن، پھٹا ہوا جوتا یا ایسی ہی کوئی فضول چیز رکھ دی گئی ہو۔ ''کیا ہے یہ...؟''

''پرائز بونڈ... اس کی فوٹو کاپی۔''

''یار! وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے کہ یہ اصلی نہیں ہے۔ کیا اسے تم ابھی میرے سامنے کسی جادو منتر سے اصلی بنا دو گے؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ایسا ہی ہو گا خرم صاحب! پھر اس پر مجھے کتنا انعام مل جائے گا۔''

خرم نے اسے بے یقینی اور تشویش سے دیکھا۔ ''تم واقعی اس قابل ہو کہ تمہیں پاگل خانے میں بند کرا دیا جائے ورنہ کسی دن تم سڑک سے پتھر اٹھا کے کسی جیولر کے پاس لے جاؤ گے اور کہو گے کہ یہ کوہِ نور ہیرا خرید لو۔''

''تم سمجھ رہے ہو کہ خواب دیکھتے دیکھتے میرا دماغ چل گیا ہے؟''

''ہاں، اگلی بار تم کہو گے مجھے کسی مدفون خزانے کا سراغ مل گیا ہے۔ اب میں جہاز خریدوں گا اور گل کو اڑا کے سوئٹزرلینڈ لے جاؤں گا۔''

''اس کی اصل میرے پاس ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور یہ ہے ایک فہرست... اس میں انعام یافتہ بونڈز کے نمبر ہیں۔ میں نے جس نمبر کو ہائی لائٹ کیا ہے، اس کا موازنہ اس فوٹو کاپی سے کرو۔''

خرم نے دونوں پر سرسری نظر ڈالی۔ ''نمبر ایک ہیں... دیکھ لیا۔ اب مجھے اصل کا دیدار بھی کرا دو۔''

اس نے کہا۔ ''اصل لاکر میں محفوظ ہے۔ میں دکھا دوں گا تمہیں... یہ غلط ہو تو مجھے ضرور پاگل خانے میں داخل کرا دینا۔ جو سچ ہے وہ کوئی بھی قسم کھانے سے مزید سچ نہیں ہو سکتا۔ ورنہ میں خدا رسولؐ سے لے کر گل اور شاہینہ کے سر تک ہر قسم کھاتا۔ میری اسٹوری سن لو... یہ جھوٹی نہیں ہے

اور نہ میرا خواب ہے۔ تم پہلے آدمی ہو جس کو میں بھروسا کر کے بتا رہا ہوں۔''

چائے کے ساتھ شاہینہ بھی آکے بیٹھ گئی تھی۔ اس نے بھی چہرے پر شدید غم و غصے کے جذبات طاری رکھتے ہوئے پرائز بونڈ ملنے کی کہانی سنی اور بالکل متاثر نہیں ہوئی۔ اس کے نفرت کے جذبات زیادہ شدید ہوگئے۔

''میں نے گل کو بلایا ہے۔'' اس نے دھمکی کے انداز میں کہا۔ ''وہ آجاتی باپ کا ریوالور لے کر اور ختم کرتی یہ زندگی بھر کا روگ تو اچھا تھا... مگر وہ نہیں آسکتی۔''

خرم نے لال حسین کی صورت پر غور جاری رکھا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ شاید اس بار یہ احمق خوابوں کا سوداگر جھوٹ نہ بول رہا ہو، اسے ایک چانس اور دینے میں کیا جاتا ہے۔

''کوئی مشورہ دینے یا تمہارا کوئی پلان سننے سے پہلے میں وہ بونڈ دیکھوں گا جو اصلی ہے اور جو کہانی تم نے سنائی، وہ خواب نہیں تھی۔ ورنہ یہ فوٹو کاپی لے کر پھرو...''

وہ خاصا مایوس ہوا مگر اس کے پاس یقین دلانے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ ''ٹھیک ہے، چلو میرے ساتھ۔''

شاہینہ کے منع کرنے کے باوجود ناخلف شوہر کھڑا ہوگیا اور لال حسین کے ساتھ گاڑی لے کر چل پڑا۔ ''کون سے بینک کا لاکر ہے؟''

اس نے سر کھجا کے کہا۔ ''بونڈ میرے گھر میں رکھا ہے۔''

خرم نے اسے خون آشام نظروں سے گھورا۔ ''گھر جا کر تم کہو گے کہ وہ تو چوہا کھا گیا۔ دھوبی کے کپڑوں میں چلا گیا۔''

''نہیں خرم صاحب! جہاں میں نے اسے چھپایا ہے سوائے میرے کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا اور میری جگہ آپ ہوتے تو یہی کرتے۔'' اس نے برہمی سے کہا۔

خرم نے اسے کار میں گلی کے موڑ پر پہنچا دیا۔ لال حسین اکیلا گیا اور دس منٹ بعد واپس آیا۔ ''چلو... کسی محفوظ جگہ بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔'' اس نے خرم کو بونڈ کی ایک جھلک دکھائی۔

خرم نے اسے اچک لیا۔ لال حسین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ بالآخر اس نے بونڈ اسے واپس کر دیا تو لال حسین کی جان میں جان آئی۔

''جاؤ اسے واپس وہیں رکھ دو جہاں سے لائے تھے۔''

اس نے سر ہلایا اور دس منٹ بعد پھر ساتھ آبیٹھا۔ خرم

سالگرہ

بیوی۔ ''پچھلے سال آپ نے ہماری شادی کی پہلی کی سالگرہ پر لوہے کا بیڈ گفٹ دیا تھا۔ اس سال ہماری شادی کی دوسری سالگرہ پر آپ مجھے کیا گفٹ کرنا چاہتے ہیں؟''

شوہر۔ ''اس سالگرہ پر اس بیڈ میں کرنٹ چھوڑ کر گفٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ اس کے یقین کا آئینہ دار تھا۔ اس نے مان لیا تھا کہ پھکو شاہ رخ خان اب واقعی ایک کروڑ کا مالک ہے۔ وہ اسے واپس گھر لے گیا۔

شاہینہ نے حسبِ توقع ان دونوں پر طنز کا ایک ہی تیر چلانا کافی سمجھا۔ ''لے آئے ایک کروڑ... کس جیب میں ہیں؟''

''بک بک نہ کرو... اپنے کروڑ پتی مہمان کے لیے پرتکلف لنچ کا اہتمام کرو اور گل سے کہو کہ جان ہتھیلی پر رکھ کے ابھی آجائے۔'' خرم نے سرکس کے شیر کی طرح گرج کے کہا۔

شاہینہ خوں خوار بلی کی طرح غرائی۔ ''میں بک بک کر رہی ہوں؟''

شیر فوراً چوہا بن گیا۔ ''جانِ من... اگر تم کہو گی تو میں کسی جگہ سے فون پر کھانا منگوا لوں گا۔ غصے میں تم کتنی حسین لگ رہی ہو۔ لال جوڑا... لال دوپٹا اور لال چہرہ... ''ریڈ اونین'' کا پیزا ٹھیک رہے گا۔''

ریڈ اونین کا پیزا کھاتے ہوئے شاہینہ کا چہرہ پھر لال ہوگیا مگر اس بار شرم اور ندامت سے... اور کچھ ریڈ چلی ساس کھانے سے... مگر وہ ایک کروڑ کا سچ سنتی رہی۔ جیسے ٹی وی پر ''لاکھوں کا سچ'' دیکھتی تھی یا ''کون بنے گا کروڑ پتی''۔ اس کے سامنے جو پتی بیٹھا تھا، اس کی بیوی کو کروڑ ملنے والے تھے۔ سہیلی سے محبت اور ہمدردی کا سارا جذبہ اب رشک اور حسد میں ڈھل چکا تھا۔

''ابھی چلتے ہیں ڈیلر کے پاس۔'' خرم بولا۔ ''ایک کروڑ وصول کرنے بینک جاؤ گے تو دس چکر ہوں گے۔ ضابطے کی کارروائی الگ ہوگی... ٹیکس الگ کٹے گا۔''

''ڈیلر کیا کرے گا؟'' یہ سوال شاہینہ نے کیا۔

''وہ ابھی سوا کروڑ گن کے پکڑا دے گا اور کہے گا جاؤ۔''

''ایک کے ڈیڑھ؟'' شاہینہ نے شوہر کو شک کی نظر سے دیکھا جیسے اس پر بھی نکمے دولھا عرف خوابوں کے سوداگر کا اثر ہو گیا ہے۔

خرم نے سر ہلایا۔ ''کچھ لوگ بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے پرائز بونڈ کے زیادہ دے دیتے ہیں۔ سوا نہ سہی دس لاکھ اوپر تو پکے ہیں۔ تمہارے بہنوئی صاحب کو جو فائدہ ہوگا، وہ پچیس تیس کا ہوگا۔ بینک تو ان سے پورا حساب کرے گا ہر ٹیکس کا۔''

اس کا دماغ جو پہلے ہی گھوما ہوا تھا، مزید گھوم گیا۔ لیکن خرم تجربہ کار، ذہین اور کاروبار کی اونچ نیچ کو سمجھنے والا آدمی تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور انہوں نے ایک ڈیلر تلاش کر لیا۔ راستے میں لال حسین نے اپنے گھر سے بونڈ اٹھا لیا تھا اور اسے جسم کے مخصوص حصے میں چھپائے بیٹھا تھا۔ ڈیلر کا نمائندہ شکل سے اٹھائی گیرا لگتا تھا اور فٹ پاتھ پر چوکڑی مارے بیٹھ کر آوازیں لگا رہا تھا اور ہاتھ میں ڈالر، پونڈ اور پتا نہیں کون کون سی کرنسی کے نوٹ لہرا رہا تھا۔ وہ انہیں ایک خطرناک اور مشکوک نظر آنے والی پرانی عمارت میں لے گیا جو کھارادر کی ایک تنگ گلی میں تھی۔

وہ کلمۂ شہادت پڑھتا جیسے خود اپنے جنازے کے ساتھ چلتا رہا۔ اس کے اعمال ہی ایسے تھے کہ وہ زور سے قدم رکھتا تو قدیم عمارت اس پر آ گرتی۔ ڈیلر نے ایک دروازے پر دستک دی اور اندر سے کتے کے غرانے کی آواز آئی جو درحقیقت نیم تاریک کمرے میں عام تخت پر تختِ طاؤس کی طرح بیٹھے خوف ناک شخص کے حلق میں سے نکلی ہوگی۔ اس دیوقامت شخص کی داڑھی گولڈن تھی اور ہونٹوں پر دونوں جانب شاخِ گل کی طرح پھیلی ہوئی مونچھوں سے میچ کرتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور جب وہ بولا تو انہیں یوں لگا جیسے کسی نے خالی دیگ میں فولادی چمچہ نما کفگیر ہلائی ہو۔ وہ پشتو بول رہا تھا۔

جواب میں ڈیلر نے کہا۔ ''پرائز بونڈ ہے ان کے پاس... یہ بیچنا چاہتے ہیں۔''

کفگیر نے دوبارہ دیگ میں ٹن ٹن کی۔ اس نے پوچھا تھا کہ ان کو کتنے دینے ہیں۔ ڈیلر ایک مترجم کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔

''یہ کروڑ کے سوا مانگ رہے ہیں۔ پندرہ کہا ہے میں نے۔''

اب جن کے حلق سے جو آوازیں برآمد ہوئیں، وہ ایسی تھیں جیسے دیگ میں پتھر بھی ہلائے گئے ہوں۔ مترجم نے گالیوں کو سلیس اردو میں ترجمہ کر کے بتایا کہ مندی چل رہی ہے۔ دس اوپر لینے ہوں تو لے لو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔ انکار کی گنجائش کہاں تھی۔ دیو کے سامنے انتہائی خطرناک قسم کی کلاشنکوف نما توپ رکھی تھی۔

خرم کے سر ہلانے پر ڈیلر نے تخت کے نیچے سے نوٹوں کے بنڈل نکالے اور گن کر تخت پر ڈھیر کرنے لگا اور پھر بولا۔ ''لے جاؤ... بونڈ دو پہلے... شمریز خان دیکھے گا۔''

لال حسین نے خفیہ مقام سے بونڈ برآمد کیا اور شمریز خان کے حوالے کیا جس کا نام چنگیز خان سنائی دیتا تھا۔ اس نے بونڈ کو تخت پر بچھی دری کے نیچے رکھا اور پھر اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے بونڈ کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں۔ غالباً اس کا کارندہ سب تصدیق کر چکا تھا۔ خرم نے نوٹ اٹھانے میں کچھ پریشانی کا اظہار کیا تو انہیں ایک شاپنگ بیگ دیا گیا جس پر کسی شو اسٹور کا نام چھپا ہوا تھا۔ لال حسین کو اس وقت تک پورا یقین تھا کہ وہ لٹ گیا اور اب مرے گا۔ نوٹ جعلی ہوں گے اور جب وہ چنگیز خان کے مزار سے نکل جائیں گے تو باہر ملک الموت سے ملاقات ہوگی جو ان کا شکریہ ادا کرے گا کہ وہ مرنے کے لیے صحیح جگہ پر آ گئے۔ گل اور شاہینہ بیوہ ہو جائیں گی۔

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ شاپنگ بیگ میں ایک کروڑ دس لاکھ ڈالے یوں نکلے جیسے لائٹ ہاؤس سے پرانے جوتے خرید کر آئے ہوں۔ کسی نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ لال حسین حیران ہوتا رہا کہ یہ کیسی دنیا اور کیسے لوگ ہیں۔ ہر روز ہر وقت یہاں کرنسی میں کروڑوں کے سودے نقد ہوتے ہیں اور کوئی بھی کسی کو نہیں لوٹتا۔ کاغذ کے ایک پرزے کی حفاظت کے خیال سے اس کی نیندیں حرام تھیں، یہاں ایسے ہزاروں پرزے ردی کی طرح پڑے رہتے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہونے کے بعد بھی پوری طرح اس کا خوف دور نہیں ہوا۔ اب اسے یقین تھا کہ یہاں سے جو لوگ پیچھے لگ چکے ہوں گے، وہ راستے میں یا گھر کے دروازے پر اپنے نوٹ واپس لے جائیں گے اور صرف دو گولیاں خرچ کر کے... مگر یہ بھی نہیں ہوا۔ ایک عظیم دانشور نے ایک بار کہا تھا کہ دیکھنے میں سب مرد ایک سے لگتے ہیں مگر کچھ اندر سے نامرد ہوتے ہیں۔ اس تجربے نے لال حسین کو مرد بنا دیا۔

وہ گھر لوٹے تو اس کی اکلوتی منکوحہ جو ابھی تک بیوی

نہیں بنی تھی، اس کے لیے چشم براہ تھی۔ دونوں سہیلیوں کا خیال بھی یہی تھا کہ ان کے سرتاج ابھی ہوا نکلی فٹ بال جیسی شکل بنائے واپس آئیں گے۔ جب خرم نے میز پر نوٹ الٹ کر ڈھیر کیے تو بے یقینی سے ان کی نظریں پتھرا گئیں۔

''مبارک ہو گل... تمہارا میاں اب اصلی کروڑ پتی ہے... خیالی نہیں... گن لو... یہ ایک کروڑ دس لاکھ ہیں۔'' خرم نے کہا۔

گل غالباً نوٹوں کے ایسے ڈھیر دیکھنے کی کچھ عادی تھی۔ اس کا باپ بھی چنگیز خان کی طرح ہلاکو خان تھا اور اب اس کا سسر بھی۔ شاہینہ کے حلق سے ایک چیخ سی نکلی۔ ''یہ کیا... سب گھر اٹھا لائے... یا میرے خدا! اس شخص کو کچھ عقل بھی دی ہوتی... پیچھے آ رہے ہوں گے ڈاکو... وہ نوٹوں کی خوشبو سونگھتے کتوں کی طرح آتے ہیں۔''

''بک بک کرنے کے بجائے اب تم گل کی رخصتی کا سوچو۔ یہ کام کیسے ہوگا۔'' خرم ہنسا۔

خوابوں کا سوداگر شاخ پر بیٹھے الو کی طرح دیدے گھما کے کبھی اپنی دولت کو دیکھتا تھا اور کبھی محبت کو۔ اب وہ پریشان تھا کہ اس دولت کو کہاں رکھے اور کیسے... اسے معلوم نہ ہو سکا کہ گل سچ مچ میں باپ کا ریوالور لے کر آئی تھی کہ آج ادھر یا اُدھر... تخت یا تختہ... نہ اسے کنواری بیوہ رہنے کا عذاب منظور تھا اور نہ حقیقی بیوہ ہونے کا... اب اس کے لیے ریوالور کو نکالنے کی صرف ایک وجہ ہو سکتی تھی کہ اپنے خاندان کی روایت کے مطابق وہ خوشی میں ہوائی فائرنگ کرے... وہ خوش تھی اور اس خوشی کا اظہار اس کے چہرے سے بھی ہوتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے دل میں تشویش اور خوف کا آتش فشاں دھواں دینے لگا تھا۔ ایک بار پھر اس کی رخصتی کا وقت آ رہا تھا لیکن یہ روایتی رخصتی نہیں تھی۔ پہلے وہ بدنامی کا بار اٹھائے بھاگ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی بدنامی کی سیاہی اپنے باپ کے چہرے پر چھوڑ کے جا رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ جب کسی کی دسترس میں نہیں ہوگی تو اس کی ازدواجی زندگی محفوظ ہوگی۔

گل ایک حساس لڑکی تھی اور جرأت مند بھی... اسے باپ کے فیصلے پر بڑا صدمہ پہنچا تھا جو اسے دگنی عمر کے مرد کی دوسری بیوی بنا کے رخصت کر رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ دولت مند تھا اور دبئی میں اس کا بزنس پارٹنر بن سکتا تھا۔ اس کا نکاح کے بعد آسٹریلیا فرار ہونے کا فیصلہ اپنے باپ کی خود غرضی کے خلاف ایک احتجاج بھی تھا کہ جب تمہیں میری زندگی تباہ کرنے کی پروا نہیں تو مجھے تمہاری بدنامی کی فکر کیوں ہو۔

اب اسی شہر میں رخصتی زندگی کا وہ جوا تھا جس میں ان دونوں کا ہار جانا یقینی تھا۔ انہیں آسانی سے تلاش کر کے مار دیا جائے گا۔ ابھی تک لال حسین نے اس خطرے کو اہمیت نہیں دی تھی جو ایک کروڑ کے انعام سے زیادہ حقیقی تھا۔

وہ خرم کے ساتھ مختلف بزنس پروپوزل ڈسکس کر رہا تھا۔ بالآخر شاہینہ نے مداخلت کی۔ ''دولھا بھائی! کاروبار جو چاہو کرنا... پیسا تو اب آ گیا تمہارے ہاتھ میں... کچھ گھر بسانے کی بات بھی کرو۔ گل کو کب لے جاؤ گے اور کہاں...؟''

''بہت جلد میں کوئی اچھا سا گھر بھی لے لوں گا اور گل کو لے جاؤں گا۔ اب کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ اب زیادہ سنگین ہے۔'' گل نے کہا۔ ''کیا میں اس شہر میں تمہارے ساتھ تمہاری بیوی بن کے رہ سکتی ہوں؟ میرا باپ مجھے ہنسی خوشی اجازت دے سکتا ہے؟ روپوش ہو کے آسٹریلیا جا سکتے تھے ہم... یہاں کیسے رہیں گے؟''

''دیکھو، میں نے اس مسئلے پر بھی بہت سوچا اور میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا میں تمہارے باپ کو رضامند کر لوں... دوبارہ نکاح کوئی گناہ کی بات تو نہیں... شادی زیادہ پکی ہو جائے گی۔''

''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔''

''نہیں، ہرگز نہیں... مجھے امید ہے کہ تمہارے باپ کو راضی کیا جا سکتا ہے... یہ ناممکن نہیں ہے... پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ میں اسے منا لوں گا... لیکن وہ نہ مانا... تو پھر ہم غائب ہو جائیں گے۔ جیسے پہلے ہو رہے تھے۔ اب آسٹریلیا جانے کی مجبوری بھی نہیں۔ ہم کہیں بھی جا کے سیٹل ہو سکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔''

گل کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ایک دم ختم ہو گئی۔ اس کے لہجے میں اتنی امید تھی اور اتنا اعتماد تھا کہ گل کا سارا خوف دور ہو گیا۔ مستقبل کی طرف سے مایوسی اور بے یقینی کے تمام عذاب کی جگہ ایک امید آ گئی۔ اعتماد آ گیا اور وہ خوشی آ گئی جو وہ مانگتی تھی... خدا سے ہر دعا میں۔

''میں اب جاؤں گی۔ شاہینہ تم مجھے گھر چھوڑ دو گی۔'' گل نے برقع اٹھا لیا۔

وہ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ کے نکلی تو اس کی نظر سڑک سے دور ہٹ کے کھڑی ہوئی ایک گاڑی پر گئی۔

''شاہینہ۔'' اس نے ایک دم اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میرا خیال ہے... میں نے ابا کو دیکھا ہے۔''

''کہاں؟'' شاہینہ نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

''ادھر... ایک گاڑی کھڑی تھی۔ پرانی ٹویوٹا... گرین کلر کی، ماڈل ہے 74۔''

''بڑی پہچان ہے تمہیں۔''

''میرا خیال ہے وہ ابا کی ہے۔ وہ گھر میں نہیں رکھتا... موٹر سائیکل پر پھرتا ہے لیکن اکثر لے آتا ہے یہ گاڑی... جب ہمیں کہیں جانا ہو۔''

''کیا وہ اس میں موجود تھا؟''

''ہاں، میں نے دیکھا ہے اسے... مجھے لگتا ہے کہ اسے شک تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ میں تمہارے گھر آئی ہوں یا نہیں... اس نے لال کو بھی دیکھا ہوگا۔''

''بے وقوف... ڈرنے کی کون سی بات ہے اس میں... وہ تھا خرم کے ساتھ... خرم کا دوست ہے... کولیگ ہے۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ آخر اسے شک کیوں ہوا؟ میں تو آتی رہتی ہوں تمہارے گھر۔''

''گھبراؤ نہیں... میں ہوں تمہارے ساتھ... ابھی تو ایسی کوئی بھی بات نہیں ہوئی... ہوئی تو میں نمٹ لوں گی۔''

گل کا باپ گھر پر نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر بعد آیا۔ ''او اپنا شاہی بیٹا آیا ہے... بہت دن بعد۔'' وہ خوش ہو کے بولا۔

''چاچا... آپ کو دیکھا تھا میں نے۔'' شاہینہ نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہاں بیٹا... ہم ایک سودا کرنے گیا تھا تمہارا گھر کی طرف... جب تمہارا گھر گیا تو ادھر کوئی بھی نہیں تھا۔ خرم کدھر ہے؟'' وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''وہ بھی پھر رہے ہیں اپنے کاروباری چکر میں... ایک دوست کے ساتھ۔'' شاہینہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اب چلتی ہوں۔''

''ارے گل تمہارا سہیلی ایسے ہی چلا جائے گا... چائے کافی نہیں پوچھے گا تم... بڑا شرم کی بات ہے...''

شاہینہ نے گل کو آنکھ ماری۔ ''نہیں چاچا! آپ نے پوچھ لیا پیار سے... یہی کافی ہے... اور چائے بھی...''

☆☆☆

سیاہ توے جیسے جسم پر تیل ملے اور سفید بطخ کے پروں کا تاج پہنے... لباس کی جگہ صرف لومڑی کی کھال پہنے تقریباً ننگ دھڑنگ بھوت جیسے چوب دار نے تھرکتے ہوئے ایک لمبوترے ڈھول کو پیٹنا شروع کیا۔ وہ بہ آوازِ بلند کچھ چلا بھی رہا تھا اور دھم دھم اس امپورٹڈ نقارے کو کوٹ رہا تھا۔

حرم سے دربار کی جانب قدم بڑھاتے مغلِ اعظم نے رک کر اس رقص کرتے دیوزاد کو دیکھا اور ملکہ عالیہ سے مخاطب ہوئے۔ ''یہ کیا چیز ہے اور یہ کس قسم کے بے ہودہ لباس میں رقص کر رہا ہے... کیا کہہ رہا ہے؟''

''جہاں پناہ! ہم نے اسے جمیکا سے امپورٹ کیا ہے... جو یہ بجا رہا ہے افریقی کانگو ڈرم ہیں... انگریزی میں آپ کی آمد کا اعلان ہو رہا ہے... جو پہلے فارسی میں ہوتا تھا... باادب باملاحظہ ہوشیار۔''

''وہ قدیم نمک خوار کہاں گیا ملکہ؟''

''اس کا بائی پاس کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی عمر بہت تھی۔ حلق سے آواز بھی ایسے نکلتی تھی جیسے نزع کا عالم ہو۔''

''اچھا اچھا...'' مغلِ اعظم خود بخود ڈرم کی تال پر تھرکنے لگے۔ ''خوب ہے... خوب ہے۔''

''حضور! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ دربار کی جانب چلیے۔''

''اوہ سوری ڈارلنگ۔'' مغلِ اعظم نے اپنی وائف کا ہاتھ تھام لیا۔

دربار کا نقشہ بھی بدلا ہوا تھا۔ دونوں طرف درباری اور ان کے نورتن بلیک اٹالین سوٹ پہنے کھڑے تھے۔ درمیان میں سرخ کارپٹ کا تین فٹ چوڑا حصہ خود بخود آگے جا رہا تھا۔

''یہ کیا... ہمارے قدموں کے نیچے سے زمین کیوں نکل رہی ہے ملکہ عالیہ؟'' مغلِ اعظم نے کہا۔

''افوہ... کیوں درباریوں کے سامنے اپنی جہالت کا اعلان کرتے ہو۔ یہ ایس کلیٹر ہیں... آپ کو خود تخت تک جانے کی زحمت نہیں کرنی ہوگی۔'' ملکہ نے آہستہ سے کہا۔

مغلِ اعظم منہ کے بل گرتے گرتے سنبھل گئے۔ ''ہماری ٹانگیں ابھی سلامت تھیں ملکہ... ہم چل سکتے تھے خود بھی... مگر چلو۔''

مغلِ اعظم کو دربار میں خاصی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ بیربل نے آگے آ کے عرض کی۔ ''حضور! ہم نے دربار میں سینٹرل ائر کنڈیشنر کا نظام نصب کر دیا ہے۔''

''گستاخ... یہ قدرت کے موسم میں صریح مداخلت ہے۔'' مغلِ اعظم نے ایک چھینک ماری۔ ''سردی میں گرمی... گرمی میں سردی... اف...''

''آپ ایک شہنشاہ کا رول کر رہے ہیں عالم پناہ... آپ کی ناک سرِ دربار بہہ رہی ہے اور ذرا یہ تاج ٹھیک سے رکھیے... نیچے سے آپ کا گنجا سر چمک رہا ہے۔''

''یہ سب تمہارے اس شاہی حکیم کے طلسمی ہیئر آئل

شاہی کا کمال ہے۔'' مغلِ اعظم نے برہمی سے کہا۔ ''شاہی حجام کو طلب کیا جائے۔ وہ سرِ دربار حکیم کا سر مونڈے۔''

''حضور! انارکلی کیس زیادہ اہم ہے آج... میڈیا لائیو نیلی کاسٹ کرے گا۔'' راجا مان سنگھ نے عرض کی۔

''پھر انارکلی کیس... غالباً ہم نے اسے دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا ملکہ عالیہ...'' مغلِ اعظم نے زور سے ناک صاف کی۔

''اجی وہ شیخو... اپنا سلیم چالاکی سے اسے نکال لے گیا تھا۔ سامنے دیوار چنی جا رہی تھی۔ پیچھے اس کے غلام اینٹوں کو نکال چکے تھے۔ انارکلی کو نکال کے انہوں نے پھر دیوار برابر کر دی تھی۔''

''مگر... اس کا تو مزار ہے ادھر سیکریٹریٹ میں... کچہری روڈ پر۔''

''حضور والا... وہ سب ڈراما ہے جیسے کہ بہت سے مزار ہوتے ہیں... انہوں نے سول میرج کر لی تھی۔ پر اب بہتر ہے آپ اسے باعزت بری کر دیں ورنہ وہ سپریم کورٹ میں جانے کی دھمکی دے رہا ہے۔''

''سپریم کورٹ؟ یہ کیا ہوتی ہے؟'' مغلِ اعظم نے سر کھجا کے کہا۔

''قاضی القضا... سمجھ لیں آپ... ان دونوں نے اب کلفٹن پر سپر اسٹور کھول لیا ہے۔ یورا ون شاپ... ہر چیز ملتی ہے... چیونٹی سے جہاز تک۔''

''کٹ... کٹ... کٹ۔'' ڈائریکٹر کی آواز آئی۔ ''یہ نہیں تھا اسکرپٹ میں... مہارانی اپنے بیٹے کا کمرشل مت لگائیں بیچ میں... یہ مغلِ اعظم کا ری میک ضرور ہے، ٹی وی ڈراما مت بنائیں اسے۔''

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ لاحول ولا قوۃ... پھر وہی خواب... مغلِ اعظم کا ری میک اب تک اس کے دماغ سے نہیں نکلا اور بیچ میں آ گئی یورا ون شاپ... اس نے گھڑی دیکھی... رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح ہونے میں ایک گھنٹا باقی تھا۔ وہ چھت پر ٹہلنے لگا۔ رات بھر اس کو مچھروں نے کاٹا تھا پھر اسے بار بار یوں لگا جیسے ساتھ والے گھر کی چھت پر سے کچھ لوگ ان کی چھت پر کودے ہیں۔ ڈاکو... انہیں ضرور گھر میں ایک کروڑ دس لاکھ کی خوشبو کھینچ لائی تھی۔ بے شک یہ اس کا وہم تھا مگر پھر بھی اس نے نیچے جا کے اپنے خزانے کی سلامتی کا یقین کیا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے ابا کا حقہ الٹ گیا جو پتا نہیں کیوں درمیان میں رکھا تھا۔ جواباً اسے ابا کا خطاب سننا پڑا۔

بہتر یہی تھا کہ اب وہ اس راز پر سے پردہ اٹھا دے۔ آخر وہ کب تک اپنے گھر والوں کو نہیں بتائے گا کہ ان پر خوش نصیبی کے در کھل گئے ہیں۔ ان کا نکما نکھٹو بیٹا کروڑ پتی بن گیا ہے۔ لیکن یہ مرحلہ بھی اسے پورا دن گزر جانے کے بعد ملا۔ صبح صبح اٹھ کے ابا ''مامے دی ہٹی'' پر جا بیٹھا تھا۔ ماں نے بھی اس سے بات نہیں کی تھی۔ صرف بہن اسے چائے دے گئی تھی۔ سب اس سے مایوس اور بدظن تھے۔

بالآخر رات کے کھانے پر وہ سب کے ساتھ جا بیٹھا۔ کھانا جیسے ہی ختم ہوا، وہ اندر گیا اور چارپائی کے نیچے سے شاپنگ بیگ نکال لایا جس میں نیچے اس کے میلے کپڑے تھے، درمیان میں نوٹ اور پھر اوپر دودھ کے اور جوس کے ڈبے... یہ دولت کو کیموفلاج کرنے کی بہت موثر ترکیب تھی۔ چور، ڈاکو بھی اسے دیکھتے اور رکھ دیتے۔

لال حسین نے پلاسٹک کے شاپنگ بیگ کو سب کے درمیان دسترخوان پر الٹ دیا۔ کھانا ختم ہو چکا تھا اور اس کی بہن نے برتن سمیٹ لیے تھے۔ وہ دسترخوان اٹھانے لگی تو اس نے روک دیا۔ ''ٹھہرو... یہاں بیٹھو... ایک تماشا دیکھو۔''

اب وہ پلک جھپکائے بغیر دسترخوان پر ڈھیر کی صورت پڑے نوٹوں کو دیکھ رہے تھے اور صرف لال حسین تھا جس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ باقی سب تو جیسے سانس لینا بھی بھول چکے تھے۔

بالآخر اس کے باپ نے کہا۔ ''یہ... کیا ہے یہ سب؟''

''ڈریں نہیں، اٹھا کے دیکھیں... چیک کریں... ساری عمر آپ ایسے ہی نوٹ سمیٹتے رہے ہیں... یہ وہی کرنسی ہے اپنے ملک کی۔''

اس کے باپ نے ایک گڈی اٹھالی۔ ''نقلی تو نہیں لگتے... مگر یہ کس کے ہیں؟''

''اپنے گھر میں کوئی بینک تو ہے نہیں کہ لوگوں نے جمع کرائے ہوں... یہ سب کچھ اپنا ہے... میرا آپ کا... ہم سب کا۔''

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔ پھر اس کی ماں نے نظر اٹھائی۔ وہ سخت پریشانی، تشویش اور خوف میں مبتلا تھی۔ ''لال! سچ بتا کس کا ہے یہ پیسا... تیرے پاس کیوں ہے اور ہمارے گھر میں...''

''ماں... نہ چوری کی ہے میں نے، نہ ڈاکا ڈالا ہے اور نہ کسی کو مار کے یہ رقم چھینی ہے... یہ ایک کروڑ دس لاکھ روپے اپنے ہیں۔''

''اپنے ہیں؟'' اس کے باپ نے دہرایا۔ ''ایک

کروڑ دس لاکھ!''

''ہاں، اس میں ایک پیسا بھی کسی کا نہیں۔ چوری کا نہیں۔ ناجائز طریقے سے حاصل کیا ہوا نہیں۔''

باپ چلایا۔ ''سور کے بچے... کیا بھونک رہا ہے۔''

''سور کا بچہ بھونکتا نہیں ابا۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''یہ قدرت کا انعام ہے۔ ان سارے خوابوں کی تعبیر ہے جو میں آج تک دیکھتا رہا اور وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ میں شیخ چلی کی طرح ایک انڈے سے پولٹری فارم بناتا تھا۔ شاہ رخ خان بننا چاہتا تھا۔ تعلیم کے لیے آسٹریلیا جا کے سیٹل ہونا چاہتا تھا۔ اب میں سب کچھ کر سکتا ہوں... ہم چھوڑ دیں گے یہ مرغی خانے جیسا گھر... یہ مامے دی ہٹی جو آپ کو بیس سال پہلے آپ کے سالے نے یعنی میرے ماما نے کھلوا کے دی تھی۔ تب سے آپ یہاں بیٹھ کے دکانداری کر رہے ہو لیکن بیس سال بعد بھی وہیں ہو... آج تک مامے کا قرض نہیں اتار سکے۔ کیونکہ آپ نے مجھے بھی پالا... اچھی تعلیم بھی دلوائی... گھر بھی چلایا۔''

اس کا باپ آبدیدہ ہو گیا۔ ''کولہو کا بیل تھا میں... کیا کرتا؟''

اس کی ماں نے کہا۔ ''یہ دکان بھی نہ کراتا میرا بھائی تو کیا ہوتا... تم خود تو کچھ کرتے نہیں تھے باتوں کے سوا... جیسے تمہارا یہ نکھٹو بیٹا کرتا ہے۔ ہے نا تمہاری ہی اولاد... تمہاری طرح ہی خواب دیکھتا ہے... سب جھوٹے۔''

اس نے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''چل چھوڑ پرانی باتیں ماں۔''

اس کے باپ نے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ ''اب بتا دے یہ پیسا تیرے پاس کہاں سے آیا؟ میرے دل کو دھڑکا لگا ہوا ہے کہ ابھی دستک ہوگی اور پولیس آ جائے گی اندر... اچانک ایک کروڑ دس لاکھ چوری ڈکیتی ہی سے آتے ہیں... کس بینک کو لوٹا ہے اور کس کے ساتھ مل کے؟''

وہ باپ کو دیکھتا رہا۔ اس کی بات نے ماں کے چہرے پر دکھ کی لہر کو مزید گہرا کر دیا تھا۔ اس نے اپنی تمام عمر صرف خواب دیکھے تھے۔ وہ خواب جو پہلے اسے شوہر دکھاتا رہا اور پھر بیٹا۔ اس کے اپنے خواب تو شادی کے بعد ہی دھواں بن کے اڑ گئے تھے مگر وہ لال حسین کی چھوٹی بہن کی آنکھوں میں اتر کے منجمد ہو گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کاغذ کے پرزوں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ بظاہر صرف کاغذ کے پرزے مگر الٰہ دین کے چراغ کے جن سے زیادہ طاقتور جو ہر خواہش، ہر فرمائش پوری کر سکتے تھے۔

لال حسین نے سب بتا دیا۔ اول تا آخر... کسی ردوبدل کے بغیر... بونڈ ملنے سے کیش کرانے کی ساری روداد... یہ وہی طلسمی غار کی الف لیلوی کہانی تھی جو علی بابا سن رہا تھا اور الٰہ دین سنا رہا تھا۔ ایک نظر نہ آنے والے جن نے ان کے سارے خوابوں کو تعبیر دے دی تھی۔ شاید اس جن کا نام تقدیر تھا۔ اب الٰہ دین دوسرا خواب دیکھ رہا تھا اور دکھا رہا تھا۔

''ہم یہاں کیوں رہیں گے ابا... ہم چلے جائیں گے گلشن... اس کابک جیسے مکان سے چار گنا بڑے کسی بنگلے جیسے مکان میں... ابھی ہم ڈیفنس یا کلفٹن کی کسی کوٹھی میں نہیں جا سکتے۔ ہم کرائے پر رہیں گے فی الحال مگر انشاء اللہ بہت جلد اپنا گھر خرید لیں گے۔ اسے اپنی مرضی سے سجائیں گے۔ ماں اس میں پھولوں کے پودے لگائے گی اور گرمیوں میں لان پر بیٹھ کے چائے پیے گی... ہمارے پاس ایک گاڑی بھی ہوگی۔ نئی تو نہیں مگر نئی جیسی کرولا... میں گلشن میں ایک بہت بڑا کیش اینڈ کیری سپر اسٹور کھولوں گا۔ وہ بہت کامیاب ہوگا۔ ابا باہر جانے والے شیشے کے دروازے کے قریب کاؤنٹر پر بیٹھ کے کیش وصول کرے گا اور بس۔ کام کریں گی ہیلپرز... ہر قسم کا سامان شیلف میں ہوگا جو گلیوں کی طرح قطار میں رکھے ہوں گے۔ کسٹمر خود ٹرالی میں اپنی پسند کی چیز اٹھا کے ڈالتے جائیں گے ہر جگہ... سیلز گرلز ان کی مدد اور نگرانی کریں گی۔ ویسے تو اوپر کلوز سرکٹ کیمرے بھی ہوں گے جو چوری کرنے والوں پر نظر رکھیں گے۔ ہم بل بنانے والوں کو الیکٹرانک مشینوں کے ساتھ بٹھا دیں گے اور یہ مشینیں قیمت پڑھ کے بل پرنٹ کریں گی۔ لوگ کریڈٹ کارڈز اور ویزا ڈیبٹ کارڈ سے ادائیگی کریں گے۔ پھر پیسا برسے گا۔ دو چار سال میں ہم ڈیفنس کی کوٹھی خرید لیں گے اور یہ چڑیل... اسے بھی دھوم دھام سے رخصت کریں گے۔''

وہ سب اس خواب کا ہر سین کسی فلم کی طرح دیکھ رہے تھے اور انہیں یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں اور ان کا خوابوں کا سوداگر بیٹا جو کہہ رہا ہے وہ خواب نہیں ہے۔ ان کی آنکھوں سے بہنے والے خاموش آنسو اس کے تعبیر ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ یہ آنسو بھی حقیقی تھے اور خوشی کے آنسو تھے۔

☆☆☆

اب آہستہ آہستہ اس کا اشتیاق کم ہوتے ہوتے مایوسی میں بدلنے لگا تھا۔ آج سے پہلے تو کبھی اس نے اتنی دیر نہیں کی

تھی۔ کئی بار وہ اس سے بھی پہلے پہنچ جاتی تھی۔ یہ بہت پریشان کرنے والا خیال تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں وہ سمندر دکھانے والی کھڑکی کے پاس بیٹھا گل کے تصور میں گم ہے، آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی اور دل بے قرار کو تسلی دینے والا خیال... لیکن اب ہجر کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں۔ دوسری طرف وہ کسی ویران سنسان قبرستان میں مٹی کے ایک ڈھیر کے نیچے خاک ہو رہی ہو اور قبر پر پڑے پھول سوکھ چکے ہوں۔

ویٹر چڈی نما نیکر اور بنیان میں بدتمیزی سے گاتا نمودار ہوا۔ ''جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا... ابے جا... اپنے بستر پر چادر بچھا کے سو جا۔''

''کیا بات ہے تان سین کی اولاد...'' اس نے غرا کے کہا۔ ''یہ مرتے ہوئے کتے کی آواز میں یہاں کیوں گا رہا ہے؟''

''سیٹھ بولتا ہے ٹیبل خالی کرو۔'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

''کیا مطلب؟ جب ٹیبل ساری خالی ہیں۔''

''وہ پھوکٹ میں آرام کرنے والوں کے لیے نہیں رکھی ہیں۔ کھانا پینا کچھ نہیں تو باہر دیوار پر جا کے بیٹھو۔''

''تم جانتے ہو میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''پتا ہے، پتا ہے۔ شاہ رخ خان انتظار کر رہا ہے اپنی دیپکا پیڈوکون کا... مگر پیارے اب وہ نہیں آنے والی... چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

لال حسین نے ضبط سے کام لیا۔ ''اچھا دو اسپیشل انڈے والے برگر لاؤ... دو کوک کے ساتھ۔''

وہ سر ہلاتا، گاتا ہوا پلٹ گیا۔ ''ابھی ہم تو محبت کرے گا... چاہے یہ زمانہ کہے ہم کو دیوانہ۔'' اس کے واپس آنے تک لال حسین نے اپنا پلان فائنل کر لیا تھا۔

ویٹر دونوں برگر میز پر پٹخ کے جانے والا تھا کہ لال حسین نے اسے روک لیا۔ ''ابھی کام تو نہیں ہے تمہیں کوئی... بیٹھو ادھر۔''

وہ کچھ حیران سا بیٹھ گیا۔ ''سیٹھ مائنڈ کرے گا۔''

''ابھی بات کرتے ہیں اس سے بھی... تم یہ برگر کھاؤ۔''

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''میں کھاؤں؟ میں نہیں کھا سکتا۔''

''کیوں؟ کبھی ان کا ذائقہ چکھا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اپن کے الیف سی جاتا ہے۔ وہ ہوتا ہے برگر۔''

''اس کا مطلب ہے بہت کمائی ہے تمہاری... اچھا جو یہ برگر بناتا ہے اسے اور اپنے سیٹھ کو بلاؤ... شکل مت دیکھو میری... جاؤ۔''

''یہ کیا لفڑا ہے؟'' کاؤنٹر پر بیٹھنے والا سیٹھ کچھ دیر بعد نمودار ہوا۔ ''ابھی نہیں کھاتا تو پیسا دو... برگر ڈال دو کتے کے سامنے۔''

''تمہارے سامنے ہے نا... کھاؤ... میرا خیال ہے یہ کتا بھی نہیں کھا سکتا جو ہم یہاں کھاتے رہے۔''

وہ گرم ہو گیا۔ ''فالتو بات نہیں کرنے کا... اپنا ہوٹل کھولو پھر پتا چلے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ میں تم سے سودا کروں... اگر یہ ریسٹورنٹ خریدنا چاہوں میں تو... قیمت کیا لو گے... نہ میں نشے میں ہوں اور نہ مذاق کر رہا ہوں۔''

اس نے پانچوں انگلیاں کھول کے پنجہ لال حسین کی ناک کے سامنے ہلایا۔ ''ابھی مجاق نہیں ہے، پانچ لاکھ کا بزنس ہے۔ کبھی دیکھیں ہیں خواب میں... پانچ لاکھ... خریدے گا؟''

لال حسین نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں... بیٹھو سامنے... اگر پانچ لاکھ تمہیں کل مل جائیں تو قبضہ کب دو گے؟''

ویٹر اور پروپرائٹر نے افسوس اور تشویش سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بے چارہ مجنوں... پاگل ہو گیا خواب دیکھتے دیکھتے۔

لال حسین نے جیب میں سے ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی جو اس کا کل نقد سرمایہ تھی۔ باقی وہ بینک میں جمع کرا چکا تھا۔ ''ابھی میں ایک لاکھ کا بیعانہ دیتا ہوں... تم رسید لکھو... قانونی کارروائی بعد میں ہوتی رہے گی۔ میں اسے ایک اچھا ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ بنانا چاہتا ہوں۔''

گل آئی اور خاموشی سے سامنے بیٹھ کے اس گفتگو کو سنتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لال حسین نے بیٹھے بٹھائے ریسٹورنٹ کا سودا کیا سوچ کے کر لیا۔ تاہم اس نے دخل اندازی سے گریز کیا۔

لال حسین بولتا رہا۔ ''دراصل ہم تو آتے تھے مجبوری میں... مگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے محبت کرنے والے یہاں آئیں تو انہیں سب کچھ ملے۔ پُرسکون ماحول... تحفظ... بہترین فاسٹ فوڈ... اور ساحل پر آنے والے یہاں اسی طرح اپنی محبت کو پروان چڑھائیں جیسے ہم نے کی... اب ہماری شادی ہو چکی ہے۔ ہم اس کا نام رکھیں گے لو نیسٹ LOVE NEST... محبت کا آشیانہ۔''

سیٹھ کے منہ سے آواز بھی بڑی مشکل سے نکلی۔ ”سر! ہم سے غلطی ہوا... مافی دو... مگر یہ جگہ تمہارا... جب مرضی قبضہ لو۔“

لال حسین نے ویٹر کی طرف دیکھا۔ ”تم کو میں اس ریسٹورنٹ میں منیجر مقرر کرتا ہوں۔ آج تک تمہیں ٹپ نہیں دی۔ اب حساب برابر ہوگا... مگر دیکھو... برگر جو ادھر ملے گا، وہ کے ایف سی سے کم نہیں ہوگا... تم بھی یہاں کھاؤ گے... اور ہم بھی... اس برگر بنانے والے سے بولو کہ ایک دم ٹاپ کلاس برگر بنا سکتا ہے تو ٹھیک... ورنہ چھٹی کرے۔“

جب سابق مالک اور منیجر چلے گئے تو گل نے کہا۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا... یہ کیا سودا کرلیا بیٹھے بٹھائے؟“

”کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا... تمہارے لیے تو زندگی کا سودا بھی کرلیا تھا۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”یہ محبت کی یادگار بھی تمہارے نام۔ جب تک ہم زندہ رہیں گے، ہمارے پیار کی یہ نشانی بھی رہے گی... ہاں، زندہ رہنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔“

”صرف اس لیے بلایا تھا مجھے... یہ تماشا دکھانے کے لیے؟“

”نہیں... تمہیں بتانا تھا کہ آج وا ں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں... شیر شاہ کے کباڑی بازار۔“

”ابا سے ملنے... ایسا مت کرو... خود بات کی تو واقعی وہ شوٹ کردیں گے تمہیں... اپنے اماں ابا کو بھیجو۔“ وہ پریشان اور بدحواس ہوگئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر تم دیپکا پیڈوکون ہو تو میں بھی شاہ رخ خان ہوں۔ ایسی جذباتی اداکاری کروں گا کہ اوم شانتی اوم تو کچھ نہیں۔ جیسی اس نے ابھی چنائے ایکسپریس میں کی ہے۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہے گا کہ اب تک صرف ایک بار میں نے کسی سے قبول کہا۔ اب تم سے کہہ رہا ہوں اور پھر مجھے گلے لگا لے گا... اس کے بعد لکھا ہوا آجائے گا... دی اینڈ اور ہماری محبت کی زندگی کا پارٹ ٹو شروع ہوگا۔“

گل نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”خدا کے لیے... اب تو چھوڑ دو یہ خواب دیکھنا۔“

”گل! میں کیا کروں... میں خوابوں کا سوداگر ہوں اور کوئی کام مجھے نہیں آتا مگر میں ایک کامیاب سوداگر ہوں۔ تم نے دیکھا میں نے تمہیں جیت لیا۔ میں نے محبت کی اس یادگار کو حاصل کرلیا جو ہمارا لونیسٹ تھی۔ میں نے ”مامے دی ہٹی“ کی جگہ ابا کو ”یور اون شاپ“ دے دی۔ معلوم ہے آگے والے خواب کے ٹریلر میں مجھے کیا نظر آرہا ہے۔ کم سے کم نصف درجن بچے... یہ خواب بھی سچ ہوگا... تم دیکھنا۔“

وہ چینی گل یعنی سفید پھول سے سرخ گلاب بن گئی۔ نہ جانے کیوں اسے یقین آگیا کہ لال حسین غلط نہیں کہتا۔ وہ خوابوں کا سوداگر ضرور ہے مگر ہر خواب کو تعبیر بھی دیتا ہے۔

☆☆☆

محنت تو سب ہی کرتے ہیں۔ آپ نے بھی کی ہوگی۔ شاید آپ ساحل کے اس خواب ناک ماحول والے ریسٹورنٹ لونیسٹ میں بھی گئے ہوں۔ نہیں گئے تو اب جا کے اس اسمارٹ منیجر سے ملیں جو عموماً کالا سوٹ پہنے، بو لگائے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوتا ہے۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کے ہال میں چکر لگاتا ہے اور سب سے پوچھتا ہے... آپ کو برگر پسند آیا؟ مگر اس سوال کا جواب کسی کو نہیں دیتا کہ بین الاقوامی معیار کا یہ برگر وہ برائے نام قیمت پر کیسے دیتے ہیں... یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ ”لونیسٹ“ ان محبت کرنے والوں کے لیے ہے جن کی جیب خالی ہوتی ہے مگر دل میں محبت یوں رہتی ہے جیسے کوہ نور ہیرے میں آب و تاب۔

اور ہاں... کبھی آپ نے ”یور اون شاپ“ سے بھی خریداری کی ہے؟ وہاں تو وہ بھی آتے ہیں جو ”مامے دی ہٹی“ پر آتے تھے اور اس کا مالک انہیں اتنی ہی خندہ پیشانی سے ریسیو کرتا ہے۔ وہاں آپ کو سب کچھ ملے گا۔ وہ اپنایت بھی جو کسی اور سپر اسٹور پر نہیں ملتی۔ اکثر آپ کو وہاں دو عمر رسیدہ افراد بحث کرتے اور لڑتے نظر آئیں گے۔ ان میں ایک پنجاب کے دور افتادہ گاؤں سے کراچی آیا تھا اور وہ ”مامے دی ہٹی“ پر بیٹھتا تھا۔ دوسرا سرحد کے علاقہ غیر کا خوفناک مونچھوں والا ہے جس کی شیر شاہ کے کباڑی بازار میں دکان پر اب اس کا ایم بی اے کوالیفائیڈ داماد بیٹھتا ہے اور اس سال پاکستان کا پہلا ایم بی اے کباڑی ایسوسی ایشن کا صدر ہوگا۔

زبان اور قومیت کا یہ اختلاف ان کی دوستی اور رشتے پر اثر انداز نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود کو صرف پاکستانی سمجھتے ہیں۔ اس رشتے کے علاوہ بھی ان میں ایک رشتہ ہے۔ وہ آپس میں سمدھی ہیں۔

وہ اس وقت بھی لڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ اس کا پوتا عمران خان جیسا ہوگا... دوسرا کہتا ہے کہ وہ نواسی ہوگی... بے نظیر جیسی... وہ شاہ رخ خان اور دیپکا پیڈوکون کا نام ہی نہیں جانتے۔

مہلک ہتھیار

مریم کے خان

سزا اور جزا کا اختیار خالق کائنات کو ہے... مگر اس کی تخلیق کردہ اس کائنات میں کچھ مغرور متکبر لوگ اس اختیار کو صرف اپنے ہاتھوں میں رکھنا پسند کرتے ہیں... ہر طاقت ور اپنے سے کمزور پر ظلم ڈھاکے سمجھتا ہے کہ وہ وہی صاحب اختیار ہے... ایسے ہی لوگوں کے بھید کھولتی کہانی... جو زندہ ہونے کے باوجود مردوں سے زیادہ بے حس اور مردار تھے۔

ایک نوجوان کی زندگی کے ورق در ورق جو آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تھا

دونوں کا نام قادر بخش تھا۔ دونوں ایک ہی گاؤں بدوا میں پیدا ہوئے اور اتفاق سے ایک ہی سن میں پیدا ہوئے تھے۔ قادر بخش موچی، قادر بخش جاگیردار سے دو مہینے بڑا تھا اور بس اسی معاملے میں وہ آگے تھا کیونکہ وہ ذات کا موچی تھا اس لیے پورے نام کے بجائے قادو موچی کہلاتا تھا۔ قادر بخش جاگیردار گھرانے کا سپوت تھا اور ہر معاملے میں اس سے آگے تھا۔ حسب نسب، دولت، مقام مرتبہ، عزت اور طاقت... اس لیے وہ قادر بخش کہلاتا تھا۔

کسی میں جرأت نہیں تھی کہ اس کا نام بگاڑ کر لے سکے۔ کسی بھی معاملے میں قادو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مقابلہ تو ایک طرف رہا، وہ اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قادو کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں وسطی پنجاب کے اس زرخیز علاقے میں زمیندار ہوتے تھے۔ پھر انگریزوں کی مخالفت کے جرم میں ان سے ان کی زمینیں چھین لی گئیں اور یہ زمینیں انگریزوں نے اپنے وفاداروں میں تقسیم کر دیں۔ قادر بخش کا خاندان بھی انگریزوں کے وفاداروں میں شامل تھا۔ وہ معمولی مزارعے ہوا کرتے تھے۔ قادو کے آباؤ اجداد کی زمینوں پر کام کرتے تھے مگر انہوں نے ہوا کا رخ دیکھ کر انگریزوں سے وفاداری کا دم بھرا اور صلے میں وہ زمینوں کے مالک بن گئے۔ یوں مالک محکوم اور محکوم مالک بن گئے تھے۔

جنگِ آزادی میں ناکامی نے جہاں برصغیر سے ہزار سالہ مسلم راج کا خاتمہ کر دیا، وہاں بے شمار ذی حیثیت مسلمانوں کو آن واحد میں آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔ ان میں ایک خاندان قادو کا بھی تھا۔ ان کو مزید ذلیل اور پست کرنے کے لیے ان کو موچی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ایک نسل بعد یہ مجبوری سچ مچ پیشہ بن گئی اور مزید ایک نسل بعد یہ ان کی ذات بن گئی۔ قادر بخش کے بزرگوں کو زمین اور اقتدار ملا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ زمین پر سونے والے یک دم مخمل پر سونے لگے تو اسے اللہ کی مہربانی کے بجائے اپنے سفید فام آقاؤں کی مہربانی سمجھا۔ اس لیے انہوں نے وہی کیا جو ان کے آقا چاہتے تھے۔ یعنی اپنے ہی ہم مذہبوں اور ہم قوموں کو ذلیل کرنا۔ ممکن ہے اس کا آغاز مجبوری میں ہوا ہو لیکن ایک نسل بعد یہ ان کی عادت اور مزید ایک نسل بعد فطرت بن گیا۔ وہ عزت اور حیثیت کو ضد کے معنوں میں لینے لگے۔ وہ کسی کو ذلیل کر کے سمجھتے کہ اب ان کی عزت بنی ہے۔ ان کے نزدیک رعایا کا ماتحت ہونا نہیں بلکہ جوتوں تلے ہونا ضروری تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ انگریز راج ایک صدی سے بھی پہلے گزر گیا لیکن جانے سے پہلے وہ اس طبقے کو اتنا مضبوط کر گیا کہ آج تک ہم پر جاگیردار اسی کروفر اور ذہنیت کے ساتھ حکمران ہیں۔ وہ اگر زمین کے لحاظ سے کمزور ہوئے ہیں تو انہوں نے کچھ اور شعبوں میں خود کو بہت مضبوط کر لیا ہے۔ وہ سیاست اور حکومت پر اسی طرح حاوی ہیں۔ یہ گاؤں دیہات سے نکل کر اب شہروں میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے ہیں۔ کچھ خوش فہم سمجھ رہے ہیں کہ وطنِ عزیز جاگیرداروں کے چنگل سے نکل رہا ہے مگر بد سے بدتر ہوتے حالات بتا رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ملک آج بھی جاگیرداروں کے قبضے میں ہے۔ ان کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ اس ملک میں جو جاگیرداروں کے خلاف نعرہ لگا کر حکومت میں آیا، وہ جلد ان کے رنگ میں رنگ گیا۔ جس نے ان کے کس بل نکالنے کی کوشش کی، اس کے اپنے کس بل نکل گئے۔ راج کرے گا جاگیرا باقی رہے نا کو۔

قارئین سے معذرت کہ کہانی سے ذرا بھٹک گئے۔ بات ہو رہی تھی قادو موچی اور قادر بخش جاگیردار کی۔ دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو چیونٹی اور ہاتھی کا۔ جب ہاتھی چلتا ہے تو اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کے پیروں تلے آ کر کتنی چیونٹیاں روندی گئی ہیں۔ مگر یہ ہاتھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے پیروں تلے کتنی چیونٹیاں آ رہی ہیں کیونکہ وہ جان بوجھ کر ان جگہوں پر قدم رکھتا تھا جہاں چیونٹیاں ہوں۔ اگر وہ عام ہاتھی ہوتا تو اسے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن قادر بخش عام ہاتھی نہیں تھا اس لیے اسے اپنے آپ کو ہاتھی ثابت کرنے کے لیے چیونٹیاں کچلنا پڑتی تھیں۔ تبھی اسے ہاتھی تسلیم کیا جاتا۔ جب وہ صرف چھ سال کا تھا، تب اس نے پہلی بار قادو کو دیکھا۔ وہ دونوں کھیتوں کی منڈیر پر آمنے سامنے آ گئے تھے۔ صرف ایک فرد کے گزرنے کا راستہ تھا۔ قادو چھوٹا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ راستہ اس کے لیے نہیں بلکہ قادر بخش کے لیے ہے۔ اس لیے وہ کھڑا رہا حتیٰ کہ پاس آ کر قادر بخش نے اسے دھکا دے کر راستے سے ہٹایا تو وہ کھیتوں میں گھٹنوں تک موجود پانی زدہ کیچڑ میں جا گرا۔

اس دن پہلی بار اسے اپنی اوقات کا پتا چلا۔ اسے معلوم ہوا کہ نام اور ایک جیسا انسان ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس میں اور قادر بخش میں زمین آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ اس پہلی ملاقات میں دونوں نے اپنے اندر ایک دوسرے کے لیے ناپسندیدگی پال لی تھی۔ پھر جیسے جیسے قادو بڑا ہوتا گیا، اسے اس فرق کا بہتر پتا چلتا رہا۔ اس نے پانچویں تک اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے گاؤں میں یہ واحد اسکول مڈل تک تھا۔ غریب غربا کے بچے یہاں پڑھتے تھے لیکن قادر بخش کے باپ کی اجازت سے۔ وہ جس بچے کے لیے اجازت دیتا، وہی اسکول میں پڑھ سکتا تھا اور جس کی اجازت نہیں ملتی اسے گھر بیٹھنا اور کام کرنا پڑتا تھا۔ قادو کو پڑھنے کا شوق تھا۔ جب سے اس کے باپ نے جوتیاں گانٹھتے ہوئے اسے اپنے بزرگوں کا قصہ سنایا تھا جو عالم تھے اور کسی دوسرے ملک سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے، ان کی علمی خدمات کے صلے میں انہیں یہ زمینیں دی گئی تھیں، تب اس نے سوچا کہ وہ بھی اپنے بزرگوں کی طرح پڑھے گا۔ وہ عالم

بنے گا۔ ممکن ہے اس کی تقدیر بھی بدل جائے۔

مگر وہ بھول گیا تھا کہ اس وقت بادشاہ اور امراء عالموں کی قدر کرنے والے تھے۔ قادو ان سب باتوں سے بے خبر تھا اس لیے وہ دل لگا کر پڑھتا۔ کتابیں نایاب اور لکھنے کے لیے صرف ایک تختی میسر تھی۔ استاد زبانی کلامی پڑھا دیتے تھے مگر وہ اسے بھی یاد کر لیتا۔

جب اس نے پرائمری کے امتحان میں پورے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کی تو سب چونک گئے۔ شہر میں کوئی غریب بچہ پوزیشن حاصل کرے تو لوگ کم سے کم ظاہری طور پر سراہتے ہیں مگر گاؤں میں ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہاں سب کے منہ بن گئے ان کے بھی جو مالی لحاظ سے قادو کے گھر جیسے تھے لیکن ان کا حسب نسب بہتر تھا اور ایک موچی کا بچہ ان کے بچوں سے آگے نکل جائے، یہ ان کو بھی گوارا نہیں تھا۔ اس لیے کھل کر کہا جانے لگا کہ ان کمینوں کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ کام تو انہوں نے وہی کرنا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ مطالبہ اللہ بخش تک پہنچا جو قادر بخش کا باپ تھا۔ فیصلہ معززین کے حق میں ہوا۔ اس پر کمیوں نے احتجاج کیا کہ ان کا کیا قصور ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اصل قصوروار کو سزا دی جائے۔ اس لیے اللہ بخش نے فیصلے میں ترمیم کی اور اصل قصوروار یعنی قادو کو اسکول سے نکال دیا اور اس کے آگے پڑھنے پر پابندی لگا دی۔ قادو بہت تڑپا لیکن اس کے باپ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اللہ بخش کے فیصلے سے انحراف کرے۔ اسے اسی گاؤں میں رہنا تھا۔ اگر وہ جرأت کرتا تو بھی اسکول والے قادو کو کہاں داخلہ دیتے۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اللہ بخش کے فیصلے کے خلاف کچھ کرتے۔

یوں قادو گیارہ سال کی عمر سے جوتیاں گانٹھنے لگا۔ وہ کام سے لگا تو اس کے باپ کو آسانی ہوئی اور وہ نئے جوتے بنانے لگا جو میلوں اور تہواروں کے موقع پر بک جاتے تھے۔ اس سے اضافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ قادو کی دو بہنیں بھی تھیں اور وہ عمر میں اس سے بڑی تھیں بلکہ سب سے بڑی امینہ پندرہ سال کی تھی اور اس نے جوانی کی حدود میں قدم بھی رکھ دیا تھا۔ گاؤں میں لڑکیوں کی شادی سولہ سترہ سال یا حد سے حد بیس سال تک کر دی جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ تصور کیا جاتا تھا کہ لڑکی کی عمر نکل گئی ہے۔ اس کے بعد اسے کوئی رنڈوا یا دوہاجو ہی ملتا تھا۔ جن کو کوئی نہیں ملتا تھا، وہ غلط راہوں پر چل نکلتی تھیں۔ لوگوں کی دل بستگی کا سامان بن جاتیں اور بالآخر قتل و خون کے مقدمات پر ان کی کہانی ختم ہوتی تھی۔ قادو کے ماں باپ چاہتے تھے کہ ایسا وقت آنے سے پہلے بیٹیوں کو ان کے گھر کا کر دیں۔ قادو کے کام کرنے سے یہ موقع جلد آ گیا۔ رشتہ تھا... قادر بخش کا چچا زاد بھائی جو شہر میں بھی کام کر رہا تھا، وہ امینہ کو بیاہ کر شہر لے گیا۔ اب زرینہ رہ گئی تھی۔

زرینہ صورت شکل کی اچھی نہیں تھی۔ عام سے نین نقش تھے۔ ساری جوانی اس کے جسم پر آئی تھی۔ اس لیے رشتہ تو نہیں آیا، ہاں ہوس کی نظریں آنے لگیں۔ ماں اس کے غم میں گھل کر چالیس سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئی اور غوث بخش قبل از وقت بوڑھا اور بیکار ہو گیا۔ کھانسیں پکاتے پکاتے اس کے پھیپھڑے گل گئے تھے اور وہ ہمہ وقت کھانستا رہتا تھا۔ اس لیے کام مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ چمڑا کاٹنا اور سلائی کرنا، دونوں باریک بینی کے کام تھے اور وہ کھانستا تو کٹ یا ٹانکا غلط لگ جاتا تھا۔ کام خراب ہوتا تو جوتی کی قیمت گر جاتی۔ جب کھانسی حد سے بڑھی تو مجبوراً اسے کام چھوڑنا پڑا۔ اب ساری ذمے داری قادو پر تھی۔ اسے کمانا تھا، گھر چلانا تھا۔ زرینہ اور پھر اپنی شادی کرنا تھی۔ اس کی شادی مسئلہ نہیں تھا۔ وٹے سٹے میں چچا زاد بہن اسے ملتی۔ پر وہ ابھی چھوٹی تھی اور شادی کی عمر کو نہیں پہنچی تھی ورنہ قادو اسے بیاہ کر لے آتا۔ وہ قادر بخش سے نو سال چھوٹی تھی اور ابھی گیارہ سال کی تھی مگر دو سال بعد جب غوث بخش کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور اسے لگا کہ اس کا آخری وقت قریب آ گیا ہے تو اس نے قادو کی شادی کر دی۔ وہ اپنی زندگی میں بہو لے آیا۔ اس کے فوراً بعد وہ زندگی سے دست بردار ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد قادو اپنے گھر کا سربراہ بن گیا۔

عجیب اتفاق تھا کہ انہی دنوں اللہ بخش بھی اچانک بیمار ہوا اور شہر کے اسپتال میں دم توڑ گیا۔ اس کی بیماری کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ افواہ یہ تھی کہ اس کی تیسری بیوی جو عمر میں اس سے تیس سال چھوٹی تھی، اس کے اور قادر بخش کے بیچ کچھ چکر تھا اور اللہ بخش اسی چکر کی لپیٹ میں آ کر دنیا سے رخصت ہوا۔ اللہ بخش کی دوسری بیوی اس کی زندگی میں گزر گئی تھی۔ اس کی تینوں اولادیں اس کی پہلی بیوی سے تھیں۔ ان میں قادر بخش بڑا تھا اور ایک بھائی اور پھر ایک بہن اس سے چھوٹی تھی۔ یوں قادر بخش بھی اپنے گھر کا سربراہ بن گیا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کو شہر والی جائداد دے دی۔ اس سے افواہ کو تقویت ملی کہ سچ مچ کوئی چکر تھا۔ قادر بخش جب شہر جاتا تو وہیں ٹھہرتا تھا۔ البتہ حویلی پر اس کی ماں کی حکومت تھی۔ اگلے سال قادر بخش کی بھی شادی ہو گئی۔

زرینہ چوبیس کی ہو رہی تھی۔ اس کی شادی کی امید

تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ ایک تو اس کی شکل صورت خاص نہیں تھی، دوسرے قادو کے پاس اس کی شادی کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ جو کماتا تھا، اس سے گھر بڑی مشکل سے چلتا تھا۔ بہن کے لیے کہاں سے رقم جوڑتا۔ ایسے میں وہی ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔ زرینہ کے قدم غلط راستوں کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ گھر سے غائب ہو جاتی اور جب واپس آتی تو کسی سے نظریں ملائے بغیر اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ قادو کی بیوی بتول میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے پوچھتی۔ ہمت تو قادو میں بھی نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ لیکن ابھی یہ ڈھکا چھپا ہو رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے ایک بار زرینہ سے بات کی اور اس پر سختی کی تو یہ پردہ بھی چاک ہو جائے گا اور پھر سب کو پتا چل جائے گا۔

مگر کب تک؟ جب ایک رات زرینہ غائب رہی اور صبح کے قریب واپس آئی تو مشتعل قادو نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ ''کہاں تھی تو... کیا کرتی رہی ساری رات...''

زرینہ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے آرام سے بغیر کوئی آواز نکالے قادو کے تھپڑ برداشت کیے اور پھر سکون سے بولی۔ ''لال ڈیرے پر تھی... اور وہاں کیا کر رہی تھی، ہمت ہے تو جا کر پوچھ لے...''

قادو کا ہاتھ اٹھا مگر اٹھا رہ گیا۔ زرینہ اندر چلی گئی اور وہ تھکے تھکے انداز میں صحن میں پڑی چارپائی پر ڈھے گیا۔ آج سب کھل گیا تھا اور کھلا بھی ایسا تھا کہ اس کے پاس بہن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔ لال ڈیرا قادر بخش کا ڈیرا تھا۔ اس کی زمینوں کے وسط میں یہ ڈیرا اس کی عیاشیوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں باہر سے عورتیں آتیں، اٹھائی جانے والی اور اپنی مرضی سے آنے والی بھی یہیں آتی تھیں۔ یہ سب قادر بخش اور اس کے ساتھیوں کے حصے میں آتی تھیں۔ قادو نہیں جانتا تھا کہ زرینہ اس ڈیرے تک کیسے پہنچی لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ اب وہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں۔ صرف ایک راستہ تھا کہ وہ بدنامی کی اس آگ کو اپنے ہاتھ سے بجھا دے مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ وہ صرف سوچ سکتا تھا، عمل کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اس کے مقدر میں جو ذلت تھی، وہ اسے بھگتنا ہی تھی۔ پھر زرینہ کو اس کی بے بسی پر ترس آ گیا۔ آخر ماں جائی تھی نا۔ ایک دن وہ گاؤں کے کنوئیں میں اتر گئی جہاں سے اس کی لاش نکالی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جس راستے پر چل رہی ہے وہ بالآخر اسی طرح بند گلی میں ختم ہوتا ہے۔ شاید اس کی بھی بند گلی آ گئی تھی۔ خودکشی کی وجوہات کا پتا تو اسکاٹ لینڈ یارڈ والے بھی نہیں چلا سکتے تھے، ہماری بے چاری پولیس کہاں سے پتا چلاتی۔ ہاں اندرونِ خانہ گاؤں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ زرینہ نے کیوں خودکشی کی۔

قادو دکھی تھا لیکن اب سکون بھی تھا۔ بدنامی کی وہ بیری ہی ختم ہو گئی تھی جس پر ذلت کے پتھر آتے تھے۔ زرینہ کی خودکشی کے چند دن بعد اس کے گھر پہلی بیٹی ہوئی۔ قادو نے اس کا نام سکینہ رکھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زرینہ رکھ دے مگر اس نام کی بدنامی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس لیے اس نے سکینہ رکھا۔ دوسرے سال دوسری بیٹی روبینہ ہوئی۔ قادو کو بیٹے کی خواہش تھی لیکن لگاتار دو بیٹیوں نے اسے مایوس کر دیا۔ پھر نہ جانے بتول کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا وہ ماں نہیں بن سکی۔ قادو نے کوشش کر کے ایک لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ دوسری بچی کی پیدائش پر بتول کا کیس غلط ہینڈل ہوا تھا، اس وجہ سے وہ اب ماں نہیں بن سکے گی۔ صبر کرنا اب مجبوری تھی۔ وہ دوسری شادی کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اور پھر اس کی بہن، بتول کے بھائی کی بیوی تھی۔ اگر وہ مالی حالات اور بہن کی پروا کیے بغیر دوسری شادی کرتا تب بھی امکان یہی تھا کہ بہن چار بچوں سمیت اس کے گھر آ بیٹھے گی اور وہ اتنے لوگوں کو نہیں پال سکتا تھا۔

قادو صبح سورج نکلنے کے بعد سے سورج غروب ہونے تک کام کرتا تھا کیونکہ اس کے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ گاؤں میں معدودے چند گھروں میں بجلی تھی اور یہ وہ گھر تھے جنہیں قادر بخش کی طرف سے بجلی استعمال کرنے کی اجازت ملی تھی۔ باقی لوگ اس سے محروم تھے۔ اس گاؤں بدوا میں نصف زمینیں قادر بخش کی ملکیت تھیں۔ اگرچہ براہِ راست اس کے نام نہیں تھیں تب بھی اس کا ہی قبضہ تھا۔ ایک بار جو زمین اس کے تصرف میں آ جاتی، اسے چھڑانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ جنہوں نے اپنی زمین واپس لینے کی کوشش کی، ان کو منہ کی کھانا پڑی۔ کچھ دربدر ہوئے اور کچھ دنیا بدر ہو گئے۔ تھانے کچہری کرنے والوں کے ہاتھ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں آیا۔ فتح ہر بار قادر بخش جاگیردار کے خاندان کی ہوئی تھی۔ قادر بخش تک آتے آتے یہ جاگیرداری ایسی مافیا کا روپ دھار چکی تھی جس کے خلاف کچھ کہنا تو کیا، سانس لینا بھی محال تھا۔ ایسا کرنے والوں کی سانس فوری طور پر بند کر دی جاتی تھی۔ جس سال قادو کی دوسری بیٹی ہوئی، اسی سال قادر بخش نے صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیتا۔ ایسا لگ رہا تھا قدرت قادر بخش کی ایک کامیابی کے ساتھ قادو کو ایک ناکامی عطا کرتی تھی، کم سے کم قادو یہی محسوس کرتا تھا۔

زرینہ کے حوالے سے وہ ذاتی طور پر قادر بخش کا زخم خوردہ تھا مگر اس کی نفرت کا اصل سبب یہی تھا کہ جب وہ اس سے اپنا موازنہ کرتا، اسے لگتا قدرت نے اس سے بہت بڑی ناانصافی کی ہے... ایک ہی سال اور ایک ہی نام کے انسانوں کی تقدیر بالکل مختلف بنا کر۔ چھ سال کی عمر میں پہلے دھکے سے شروع ہونے والی نفرت ہر سال اور ہر واقعے کے بعد بڑھ جاتی تھی۔ زرینہ کے واقعے میں اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا تھا کہ اصل قصور زرینہ کا تھا۔ وہ نہ گھر سے نکلتی اور نہ قادر بخش اور اس کے ساتھیوں کی دل بستگی کا سامان بنتی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ طفل تسلی ہے جو اس نے خود کو دی ہے۔ اگر زرینہ عفت مآب ہوتی اور اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوتی، تب بھی وہ قادر بخش کے خلاف کچھ کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

بیٹا نہ ہونے پر صبر آیا تو قادو کو اب بیٹیوں کی فکر لاحق ہو گئی۔ یہاں بیٹی پیدا ہوتے ہی اسے رخصت کرنے پر غور شروع کر دیا جاتا تھا کیونکہ وہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں جوان ہو جاتی تھیں اور یہ عمر آنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ سارے سال جو کماتا تھا اس سے تو گھر کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ سال میں بس دو عیدوں اور ایک گندم کٹائی کے تہوار کے موقع پر کمائی ہوتی تھی جب لوگوں کے پاس پیسے آتے تھے یا وہ خرچ کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ان تہواروں سے جو آمدنی ہو گی وہ اسے بیٹیوں کے لیے جوڑے گا تاکہ ان کے جوان ہوتے ہی انہیں اپنے گھر کا کر دیا جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ وٹہ سٹہ نہیں کر سکتا تھا، اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اب وہ کچھ جہیز دے سکتا تو اس کی بیٹیوں کے رشتے آتے ورنہ وہ یونہی بیٹھی رہ جاتیں۔

چار پانچ سال قادو نے جو کمایا، وہ بچا کر رکھا اُس سے بیٹیوں کے لیے کچھ چیزیں جوڑ لیں۔ سونے کی استعداد نہیں تھی، اس نے چاندی کا زیور بنا لیا۔ ایسی چیزیں لے لیں جو رکھی جا سکتی تھیں اور فیشن کی وبا انہیں کھاتی نہیں تھی۔ گاؤں دیہات میں اس کا اثر کسی قدر کم ہوتا ہے۔ اب فیشن نامی وبا ہر جگہ پہنچ گئی ہے۔ کسی دور دراز وادی میں اکیلا جھونپڑے میں رہنے والا خاندان بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ سکینہ نے آٹھ سال کی عمر میں خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ قادو کو لگتا کہ وہ ہر کچھ دن بعد لمبی ہو رہی تھی۔ اسے ہول آنے لگا کہ کہیں وہ جلدی جوان نہ ہو جائے اور اس کی شادی کا وقت قبل از وقت نہ آ جائے۔ بتول بھی پریشان تھی، اس نے سکینہ کی خوراک کم کر دی۔ وہ بھوکی رہ جاتی مگر بتول اسے مزید روٹی نہیں دیتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی بڑھوتری رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے پانی بھی لگتا تھا۔

قادو کو اس مسئلے کا ایک ہی حل سمجھ آ رہا تھا کہ وہ زیادہ کام کرے اور زیادہ کمائے اور بیٹی کو جلد رخصت کر دے۔ اس بار اس نے اپنی مختصر جمع پونجی سے کچھ اچھا چمڑا خرید لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ جوتیاں اور نئے ڈیزائن والی بنائے تاکہ زیادہ کما سکے۔ ابھی وہ فارغ اوقات میں جوتیاں بنانے کا سوچ رہا تھا کہ پہلی بار اسے قادر بخش کی حویلی سے بلاوا آ گیا۔ اس سے پہلے قادر بخش نے اس سے کبھی کوئی جوتی نہیں لی تھی اور نہ ہی اس سے مرمت کا کام لیا تھا۔ یہ کام ایک دوسرا موچی کرتا تھا۔ قادر بخش کیونکہ قادو کو پسند نہیں کرتا تھا، اس لیے اس سے کام بھی نہیں لیتا تھا۔ قادو یہ بات جانتا تھا اس لیے بھی یہ بلاوا حیران کن تھا۔ بہرحال اسے جانا تھا۔ وہ حویلی پہنچا تو قادر بخش نے اسے ملنے سے پہلے دو گھنٹے انتظار کرایا اور ساتھ ہی ایسا بندوبست بھی کیا کہ وہ اٹھ کر نہ جا سکے۔ قادر بخش کا ایک گرگا اس کے سر پر مسلط تھا۔ ایک بار قادو نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے قادو کا شانہ دبا کر بٹھا دیا اور غرا کر بولا۔

''جلدی کس بات کی ہے... انتظار کر ذرا۔''

''مجھے کام کرنا ہے۔'' قادو نے کسمسا کر کہا۔

''تجھے یہاں کام کے لیے ہی بلایا ہے، تیری صورت دیکھنے کے لیے نہیں بلایا۔''

دو گھنٹے بعد قادر بخش نے اسے طلب کیا اور اس کے منشی نے قادو کے سامنے کوئی ایک درجن جوتیاں اور چپلیں رکھ دیں۔ اس نے کہا۔ ''ان کے دو دو جوڑے تیار کرنے ہیں۔ بالکل ایسے ہی۔''

قادر بخش خاموشی سے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس نے قادو سے بات کرنا تو کیا، اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ سفید اجلے کرتے دھوتی پر اس نے سفید ہی شملہ پہن رکھا تھا۔ قادو پریشان ہو گیا۔ ''دو درجن... پر میرے پاس اتنا وقت اور مال نہیں ہے۔''

منشی غرایا۔ ''تیرا دماغ ٹھیک ہے، چودھری جی کے کام کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے جی۔'' قادو گڑبڑا کر بولا۔ ''میں سیزن کا مال تیار کر رہا ہوں۔''

''یہ بھی سیزن کا مال ہے اور عید سے پہلے چاہیے۔'' منشی نے یوں کہا جیسے اس نے کام لے لیا ہے۔ ''کام ایک نمبر ہو۔ ڈنڈی نہیں مارنی، پوری صفائی سے کام کرنا۔''

”میرے پاس مال نہیں ہے جی۔“ قادو نے جان چھڑانے کی کوشش کی تو منشی غرایا۔
”زیادہ بکواس نہ کر... چودھری جی تجھے عزت دے رہے ہیں اور تجھے نخروں کی سوجھ رہی ہے۔ لگتا ہے تُو اپنی چمڑی کی جوتیاں بنوانا چاہتا ہے۔“
قادو کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”میں نے انکار نہیں کیا ہے، یہ کہا ہے کہ اس وقت مال کم ہے۔ عید کے قریب کارخانے والے لے جاتے ہیں۔“
قادر بخش اچانک کھڑا ہو گیا۔ اس نے منشی سے کہا۔ ”اس سے بول ساری جوتیاں عید سے دو دن پہلے مل جانی چاہئیں۔“
قادر بخش اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد منشی بولا۔ ”سن لیا تُو نے... اب یہ جوتیاں اٹھا اور دفع ہو جا اس سے پہلے کہ چودھری جی کا موڈ بدل جائے۔“
قادو نے جوتیوں کا گٹھر بنا کر سر پر رکھا اور جھکے قدموں سے گھر لوٹ آیا۔ بتول کو پتا چلا تو اس کا منہ بھی لٹک گیا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ اس بار سکینہ کے لیے گدے اور تکیے لے لوں گی۔“ پھر وہ پُرامید ہو گئی۔ ”قادر بخش پیسے والا ہے، ہو سکتا ہے وہ زیادہ ہی دے دے۔“
”زیادہ...“ قادو نے تلخی سے کہا۔ ”مال کی قیمت مل جائے یہی بہت ہوگا۔ تُو جانتی نہیں ان لوگوں کو۔“
قادو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ قادر بخش اور اس کے خاندان کے پاس جتنی دولت تھی، دوسروں کا حق دینے میں ان کا دل اتنا ہی تنگ تھا۔ خاص طور سے اپنے زیرِ نگیں لوگوں کا حق وہ اپنی حاکمیت جتانے کے لیے مارتے تھے۔ مصیبت قادو کے گلے پڑ چکی تھی اور اسے جوتیاں بنانی ہی تھیں، ورنہ سچ مچ اس کی کھال کی جوتیاں بھی بن سکتی تھیں۔ بے دلی کے ساتھ وہ جوتیاں بنانے میں لگ گیا۔ وقت کم تھا اور کام بہت زیادہ۔ اس چکر میں اسے روزمرہ کا بہت سا کام جس سے اس کا گھر چلتا تھا، وہ بھی چھوڑنا پڑا۔ جیسے تیسے اس نے دن رات ایک کر کے چاند رات سے دو دن پہلے جوتیاں تیار کیں۔ اس نے پوری مہارت استعمال کی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس کا کام پسند کیا جائے گا اور صلے میں شاید اسے کچھ بہتر معاوضہ مل جائے۔ وہ تیار جوتیاں لے کر قادر بخش کی حویلی پہنچا۔ قادر بخش نے پہلے کی طرح بے نیازی سے جوتیوں کا معائنہ کیا اور سر ہلا کر بولا۔
”منشی... اسے ہزار روپے دے دے۔“
قادو اچھل پڑا۔ ”چودھری جی بس ہزار روپے؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”یہ کم سے کم ڈھائی ہزار کی جوتیاں ہیں۔“
لیکن قادر بخش ان سنی کر کے اندر جا چکا تھا۔ منشی نے نوکروں کو اشارہ کیا، وہ جوتیاں اٹھا کر لے گئے اور قادو منہ دیکھتا رہ گیا۔ منشی نے ہزار روپے منہ پر مارنے کے انداز میں دیے اور بولا۔ ”جا عیش کر۔“
”عیش؟“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”منشی! اس میں مال کی قیمت بھی پوری نہیں ہوگی۔ یہ ظلم ہے۔ اپنے روپے لو اور میرے جوتے دے دو۔“
اس پر منشی نے اپنے گرگوں کو بلا لیا اور انہوں نے دھکے مار کر قادو کو حویلی سے باہر نکال دیا۔ وہ ان سے لڑ نہیں سکتا تھا اس لیے اپنی قسمت کو برا بھلا کہتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ قادر بخش اور اپنی تقدیر دونوں سے نہیں لڑ سکتا تھا، بس انہیں بُرا بھلا کہہ سکتا تھا۔ اس بار عید پر وہ کچھ جمع کرنا تو ایک طرف رہا، اپنے بیوی بچوں کو نئے جوڑے اور چیزیں بھی نہیں دلوا سکا تھا اور اس کی ذمے داری قادر بخش پر عائد ہوتی تھی۔ جب اس کی بچیاں کپڑوں اور چیزوں کے لیے رو رہی تھیں تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ قادر بخش کو قتل کر دے یا پھر خودکشی کر لے مگر اس میں دونوں کاموں کی ہمت نہیں تھی۔
غریب کی نفسیات ہوتی ہے کہ اسے غم اور خوشی دونوں شدت سے محسوس ہوتے ہیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا ہے دونوں جذبے یوں معدوم ہو جاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ کیونکہ اس کے سامنے دوسرے مسائل منہ پھاڑے چلے آتے ہیں اور اسے ان سے نمٹنا ہوتا ہے۔ قادو کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ چند دن بعد وہ اس صدمے کو فراموش کر بیٹھا۔ غمِ روزگار نے سب بھلا دیا تھا۔ وہ دوبارہ سے جوتیاں گانٹھنے میں لگ گیا مگر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ وہ قادر بخش کے لیے کام نہیں کرے گا۔ زیادتی کی بھی حد ہوتی ہے۔ جب اس کی برادری کے لوگوں کو پتا چلا تو انہوں نے بھی قادر بخش کی مذمت کی لیکن جب یہ سوال سامنے آیا کہ اگر قادر بخش نے کام دیا تو کوئی نہیں لے گا تو سب کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنے والی بات ہے۔ قادر بخش خود بھی کم طاقت ور نہیں تھا، اب تو اس کے ساتھ حکومت کی طاقت بھی شامل ہو گئی تھی۔
اگلی عید پاس آئی تو قادو کو پھر قادر بخش کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک بار پھر اس کے ساتھ وہی سب ہوگا اور وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ قادر بخش اور اس کے بزرگ خسیس تھے لیکن اتنے نہیں تھے کہ آدمی کا خون پی

جائیں۔ قادو سمجھ رہا تھا کہ قادر بخش اس سے ذاتی عناد کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نہیں جائے گا۔ دوسرے دن قادر بخش کا منشی خود چلا آیا۔ ”کیا بات ہے قادو... تیرے بڑے نخرے ہو گئے ہیں۔ تجھے چودھری جی کا بلاوا نہیں ملا؟“
”ملا پر میں کام کر رہا تھا۔“
”اوئے...“ منشی نے ایک غلیظ گالی دی۔ ”تیری اتنی ہمت کہ تُو نہ آئے۔ لگتا ہے تجھے یہاں سے نکلنا ہے۔“
”اگر نکالنا ہے تو ایسے ہی نکال دو، اس طرح تنگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ قادو نے ذرا دلیر بن کر کہا۔ ”خدا کی زمین بڑی ہے، کہیں اور چلا جاؤں گا۔“
”تجھے قبر ملے گی۔“ منشی بولا اور اسے دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔
قادو جس چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا، یہ مشکل سے تین مرلے کا تھا اور پشتوں سے اس کے خاندان کی ملکیت چلا آ رہا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ قادر بخش نے اسے گاؤں سے نکالنے کا فیصلہ کیا تو کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ وہ اس مکان کو بیچنا چاہے گا تو کوئی خریدار نہیں ملے گا۔ سب سے بڑھ کر وہ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ اس کے پاس اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نزدیک ہی ایک اور گاؤں کٹھالی تھا۔ بتول کے ماں باپ اور بہن بھائی وہیں رہتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ وہاں جا سکتا تھا۔ شہر جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ شہر کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایک دو بار اس نے بتول کے بھائی اور امینہ کے شوہر سے کہا کہ وہ بھی شہر آنا چاہتا ہے لیکن اس نے ڈرا دیا کہ وہاں کام تو ہے لیکن بہت مسائل بھی ہیں۔ امن و امان کا مسئلہ ہے اور سب سے زیادہ روز کے کام کرنے والے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسے لگا کہ بتول کا بھائی اسے ٹال رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ قادو شہر آئے اور اس پر بوجھ بنے۔ جب منشی اسے دھمکی دے کر گیا تو اسے پھر خیال آیا کہ وہ کسی طرح یہاں سے چلا جائے۔
خلافِ توقع قادو کو گھر بدری کا پروانہ نہیں ملا۔ نہ ہی قادر بخش کی طرف سے دوبارہ بلاوا آیا۔ کئی دن اسے دھڑکا لگا رہا کہ ابھی قادر بخش کے کارندے آئیں گے اور اسے سامان اور بیوی بچوں سمیت گاؤں سے باہر پھینک دیں گے۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ قادر بخش نے اسے نظرانداز کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بھول گیا کہ کسی سے عناد ہو جائے تو اسے بھولنا ان لوگوں کی سرشت ہی نہیں ہے۔ وہ سب بھول سکتے ہیں لیکن اپنی رعایا کے اس فرد کو نہیں بھول سکتے جو ان سے ذرا بھی سرکشی اختیار کرے۔ قادو نے جو کیا تھا، وہ سرکشی کے زمرے میں آتا تھا۔ کچھ دن بعد قادو کو احساس ہوا کہ لوگوں نے کام کرانے کے لیے اس کے پاس آنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ دوسرے موچیوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ اس سے کام کراتے تھے، وہ بھی اب نہیں آتے تھے۔ قادو نے ایک دو لوگوں سے پوچھا لیکن کسی نے تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ سب ٹال گئے مگر قادو کو احساس ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے اپنے بچپن کے ایک دوست اور واقف کار جاوید کو پکڑا۔
”جیدے! کیا بات ہے... آج کل تُو میرے پاس کیوں نہیں آ رہا؟“
”بس ایسے ہی...“ اس نے ٹالنے کی کوشش کی مگر قادو اس کے سر ہو گیا تو مجبوراً جاوید کو اگلنا پڑا۔ اس نے کہا۔ ”قادو! تیرے لیے چودھری صاحب کا حکم ہے کہ کوئی تجھ سے کام نہ کرائے اور نہ ہی تجھ سے تعلق رکھے۔“
”قادر بخش نے؟“ وہ بولا۔
”ہاں، تُو جانتا ہے کہ اس کی بات نہ مانی تو وہ کیا کرے گا... پر قادو! وہ تیرا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟“
”حالانکہ مجھ سے اسے کبھی نقصان نہیں ہوا۔“ قادو نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہمیشہ اس سے مجھے نقصان ہوا ہے۔ وہ مجھے تباہ کرنا چاہتا ہے۔“
جاوید کو تعجب ہوا کہ قادر بخش ..... جب قادو کا اتنا ہی دشمن بنا ہوا تھا تو اسے تباہ کرنا اس کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔ اس کے اشارے پر قادو کو گاؤں بدر کر دیا جاتا۔ قادو نے کہا۔ ”وہ جانتا ہے کہ مجھے یہاں سے نکالا تو میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ مجھے مشکل تو ہوگی پر میں اس کے چنگل سے نکل جاؤں گا۔ اس لیے اس نے نکالنے کے بجائے یہ حربہ آزمایا ہے۔ میں بھوکوں مروں گا، اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔“
”دیکھ قادو... تو اس سے نہیں لڑ سکتا۔ بہتر ہوگا جا کر اس سے معافی مانگ لے۔“
”میں معافی مانگوں گا، تب بھی وہ معاف نہیں کرے گا۔ وہ مجھے نہ جانے کس بات کی سزا دینا چاہ رہا ہے۔“
جاوید جھجکا پھر اس نے کہا۔ ”قادو! بات یہ ہے کہ گاؤں میں سب کہتے ہیں کہ تو نے زرینہ کو مار کر کنوئیں میں پھینکا تھا۔ تبھی قادر بخش تیرا دشمن ہو رہا ہے۔“
”میں نے زرینہ کو نہیں مارا۔“ قادو کو غصہ آ گیا۔ ”اس کی موت کے ذمے دار بھی یہی لوگ ہیں۔“

یہ سب جانتے تھے کہ زرینہ، قادر بخش اور اس کے ساتھیوں کی دل بستگی کا سامان تھی۔ وہی اس کی موت کی اصل وجہ تھے لیکن وہ اس کا الزام بھی قادو پر لگا رہا تھا۔ قادو کا غصہ جلد اتر گیا کیونکہ روٹی کا سوال سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اگر اسے کام نہیں ملتا تو وہ بیوی بچوں کا پیٹ کیسے بھرتا؟ لوگ اسے کام نہیں دیتے تھے، منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ اسے قرض ادھار کہاں سے دیتے؟ جلد نوبت فاقوں تک آگئی اور پھر گھر کا سامان بکنے لگا۔ جو اس نے بیٹیوں کے لیے جمع جتھا کیا تھا، وہ بکنے لگا۔ یہ بہت مشکل وقت تھا۔ ویسے تو قادو نے زندگی میں کبھی آسانی نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت اسے صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ سختی کسے کہتے ہیں۔ یہ صبح روٹی مل جاتی تو شام کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ بتول گھبرا گئی تھی، اس نے قادو سے کہا۔

''لعنت بھیجو اس جگہ پر جہاں آدمی دو وقت کی روٹی نہ کما سکے... کہیں اور چلو۔''

''یہاں سے کہاں جائیں؟ یہاں کم سے کم سر چھپانے کی جگہ تو ہے... کہیں اور یہ بھی نہیں ملے گی۔''

''پر کام تو نہیں ہے... خالی گھر لے کر کھانا ہے کیا؟''

قادو سمجھ رہا تھا گھر چھوڑنا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ کہاں جاتے؟ پھر ایک حل سمجھ میں آیا۔ اس نے اپنے سسرال والوں سے بات کی۔ وہ رشتے دار بھی تھے اور کٹھالی کا گاؤں قادر بخش کے حلقۂ اثر سے باہر تھا۔ اس نے وہاں کام شروع کر دیا۔ اس کے دو سالے ایک چھوٹا کارخانہ چلا رہے تھے جس میں دیسی ساخت کے جوتے اور چپلیں بنتی تھیں۔ مگر وہ سارے سال مال بنا کر عیدوں پر شہر میں سپلائی کرتے تھے۔ قادو کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ ان کے ساتھ شامل ہوتا اس لیے وہ کاریگری کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس کا [illegible] ے سالوں سے بہتر تھا مگر وہ اسے زیادہ اجرت نہیں دے سکتے تھے۔ بہر حال، اتنا ضرور مل جاتا تھا کہ اس کے گھر کا چولہا [illegible] لگا۔ اب فاقے نہیں ہو رہے تھے۔ آنے والے کئی سال تک قادو کٹھالی میں کام کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس نے کچھ جمع کیا اور پھر ایک سیزن میں سالوں کے ساتھ کام میں شامل ہو گیا۔

اس سال اس نے اچھا خاصا کمایا۔ وہ خوش تھا کہ وہ بدوا میں کام نہیں کر رہا ورنہ وہ کبھی اتنا نہیں کما سکتا تھا۔ سکینہ تیرہ سال کی ہو رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ ایک دو سال میں اس کی شادی کر دے گا۔ ا[illegible] تھی کہ وہ رقم جمع کر لے گا اور جہیز دے سکے گا تو رشتہ ملنے [illegible] نہیں لگے گی۔ اگلے سال اس نے نفع میں حاصل ہونے والی رقم بھی کاروبار میں لگا دی اور اس سال پہلے سے زیادہ نفع حاصل کیا۔ اس کے پاس پیسا آیا تو بتول نے سکینہ کے لیے سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی رشتے بھی آنے لگے۔ گاؤں دیہات میں ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں، لوگ خود تشہیر کرتے ہیں۔ قادو اور بتول نے ایک مناسب رشتہ دیکھ کر ہاں کر دی۔ لڑکا ان کی ذات کا تھا مگر وہ زمین پر کام کرتا تھا۔ ایک چھوٹے زمیندار نے اسے اپنی زمین کے لیے مستقل رکھا ہوا تھا۔ رہائش کے لیے گھر کی جگہ بھی دی ہوئی تھی۔ فضل کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ سکینہ سولہویں سال میں تھی اور وہ بائیس کا تھا۔ اس لحاظ سے بھی جوڑی مناسب تھی۔ سکینہ اس رشتے سے خوش تھی۔ قادو اور بتول نے طے کیا کہ آنے والی چھوٹی عید کے بعد وہ اس کا بیاہ کر دیں گے۔ فضل کا گھرانا بڑا نہیں تھا، بس ایک ماں تھی اور باقی دور پرے کے رشتے دار تھے۔ انہیں امید تھی کہ سکینہ وہاں خوش رہے گی اور اسے ان مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جن کا عموماً بھرے پرے سسرالوں میں جانے والی لڑکیوں کو کرنا پڑتا ہے۔ پھر سکینہ خوش شکل تھی۔ قادو اور بتول کو امید تھی کہ فضل اسے خوش رکھے گا۔

اس بار قادو نے بہت دل جمعی سے کام کیا۔ کٹھالی میں بجلی کی سہولت تھی اور دیہات میں اٹھارہ بیس گھنٹے کی... لوڈشیڈنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا اس لیے وہ رات میں بھی کام کرتے رہے۔ قادو کے سالے بھی اس سے خوش تھے۔ اس کے آنے سے نہ صرف کام اچھا ہوا تھا بلکہ معیار بھی بہتر ہوا تھا۔ قادو نئے ڈیزائن بنانے میں مہارت رکھتا تھا اور نئے ڈیزائن زیادہ قیمت پر بکتے تھے۔ اس سے ان کے مجموعی نفع میں اضافہ ہوتا تھا۔ اگرچہ سالے اسے نفع میں زیادہ حصہ نہیں دیتے تھے لیکن اسے جتنا ملتا تھا، وہ اس سے خوش تھا کیونکہ بدوا میں کام کر کے اس نے کبھی اتنا نہیں کمایا تھا۔ اس بار بھی اسے اچھا منافع ملا۔ وہ سکینہ کی شادی زیادہ اچھے انداز میں کر سکتا تھا اور برادری کو اچھا کھانا کھلا سکتا تھا۔

شادی عید کے بعد دوسرے ہفتے میں تھی۔ زندگی میں پہلا موقع تھا جب قادو کو محسوس ہوا کہ سب اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ مگر شادی سے دو دن پہلے آنے والی رات نے اس کے اس احساس کو فنا کر دیا۔ وہ اور بتول چارپائی پر صحن میں سو رہے تھے اور بچیاں اندر تھیں۔ اچانک قادو کو محسوس ہوا کہ آس پاس کچھ لوگ حرکت کر رہے ہیں۔ اس نے اٹھنا چاہا کہ کوئی چیز اس کے سر پر لگی اور وہ چارپائی پر ہی بے ہوش ہو گیا۔ آخری احساس یہ تھا کہ کچھ لوگوں نے بتول کو دبوچا ہوا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کی جمع پونجی لٹ چکی تھی۔ آنے والے ڈاکو تھے۔ وہ نہ صرف سکینہ کے جہیز کا سارا سامان لے گئے تھے بلکہ قادو نے جو کمایا تھا اور جس سے وہ شادی کے دوسرے اخراجات پورے کرتا وہ بھی... سمیٹ کر لے گئے تھے۔ بتول اور سکینہ کا برا حال تھا۔ سکینہ کو تو سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ نہ سن رہی تھی اور نہ بول رہی تھی۔ ہوش میں آکر جب قادو کو حقیقت کا پتا چلا تو اس کے ہوش بھی اڑ گئے۔

بتول نے بتایا کہ آنے والے چار تھے۔ انہوں نے قادو کے سر پر لاٹھی مار کر اسے بے ہوش کیا اور پھر بتول کو بے بس کر کے باندھ دیا۔ اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا۔ پھر انہوں نے بچیوں کو بھی باندھا اور سارا سامان اور رقم لے کر چلتے بنے۔ بتول اور قادو چیزوں اور رقم کے صدمے میں تھے اور انہیں یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں فضل کی ماں شادی سے انکار نہ کر دے۔ انہوں نے غور نہیں کیا کہ سکینہ کی کیا کیفیت تھی اور وہ کس صدمے سے گزر رہی تھی۔ وہ سمجھے کہ وہ انہی کی طرح غم اور خوف سے دوچار ہے، اسے بھی شادی کا خدشہ ہے۔ اگلی صبح فضل کی ماں آئی تو ان کے خدشات بھی سچ مچ سامنے آگئے۔ اس نے رشتے سے انکار کر دیا۔ بتول اور قادو اس کے سامنے گڑگڑانے لگے کہ وہ انہیں کچھ مہلت دے اور رشتے سے انکار نہ کرے۔ وہ جلد دوبارہ سب کر لیں گے۔ ابھی فضل کی ماں سے بات جاری تھی کہ سکینہ اندر سے نکلی۔

''اماں ابا... میں شادی نہیں کروں گی۔'' اس نے کہا اور جیسے آئی تھی، ویسی ہی چلی گئی۔

''دیکھی اپنی بیٹی کی زبان اور بے حیائی۔'' فضل کی ماں نے طنز کیا۔ ''اپنے رشتے سے خود انکار کر رہی ہے۔ اب تم کس منہ سے کہو گے؟''

وہ طعنہ دے کر چلی گئی۔ وہ دونوں میاں بیوی شکست خوردہ سے بیٹھے رہ گئے۔ بتول نے قادو کے سر کے زخم پر ہلدی لگا کر پٹی باندھ دی تھی۔ اچانک اندر سے روبینہ کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ روتے ہوئے ماں باپ کو آواز دے رہی تھی۔ وہ اندر کی طرف لپکے جہاں سکینہ چھت سے دوپٹا باندھ کر لٹک گئی تھی۔ اسے لٹکے ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کیونکہ اس کا جسم گرم تھا لیکن اس کی روح پرواز کر گئی تھی۔ بتول دھاڑیں مار کر رونے لگی اور قادو لرزتے ہاتھوں سے بیٹی کی لاش اتارنے لگا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب وہ صرف ایک جسم رہ گیا ہے تو وہ بھی دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ روبینہ بھی رو رہی تھی اور گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ کچھ دیر میں سارا گاؤں قادو کے گھر

کے اندر اور سامنے جمع تھا۔ شام تک سکینہ گھر سے رخصت ہو کر قبرستان میں اپنے ابدی گھر چلی گئی تھی۔

سکینہ کے سوئم والے دن بتول نے ایک عجیب سی بات بتائی۔ اس نے قادو سے کہا۔ ''سکینہ کو غسل دینے والی عورت کا کہنا ہے کہ وہ کنواری نہیں تھی۔''

قادو چونکا۔ ''کیا... کیا بکواس کر رہی ہے؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں، تجھے نہیں بتایا۔ اس وقت ہوش نہیں تھا۔ پر اس نے کہا تھا کہ سکینہ مرنے سے چند گھنٹے پہلے اپنا کنوارا پن کھو چکی تھی۔''

دونوں کے ذہن میں ایک ہی خیال آیا کہ ڈاکوؤں نے صرف مال نہیں، سکینہ کی عزت بھی لوٹ لی تھی۔ وہ دونوں باہر پڑے تھے اور انہیں پتا نہیں چلا کہ اندر بیٹی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ جب بتول نے روبینہ سے سختی سے پوچھا تو اس نے قبول لیا کہ دو ڈاکوؤں نے بندھی ہوئی سکینہ کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس دوران میں ایک ڈاکو کا چہرہ کھل گیا تھا اور اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ منیر نامی نوجوان تھا جو قادر بخش کے خاص کارندوں میں سے ایک تھا۔ یہ جان کر قادو کا غم و غصے سے بُرا حال ہو گیا۔ ایک بار پھر اس کی بربادی میں بھی قادر بخش کا ہاتھ تھا۔ وہ جوان نہیں رہا تھا، کمزور تھا اور قادر بخش جیسے طاقتور آدمی سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اس نے بتول سے کہا۔

''میں تھانے میں پرچہ لکھواؤں گا۔''

''اپنے منہ پر خود کالک مل لو گے۔'' بتول بولی۔ ''جو بات ابھی ہم جانتے ہیں، وہ سارا گاؤں جان جائے گا... اور تھانے والے قادر بخش یا اس کے کسی آدمی کے خلاف پرچہ لکھ لیں گے؟''

قادو جانتا تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں تھا مگر ایک یہی کام تھا جو وہ قادر بخش کے خلاف کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ''میں لکھواؤں گا۔''

''تب مجھے اور بتول کو میرے بھائی کے گھر چھوڑ آؤ۔ یہاں تو وہ ہمیں بھی سکینہ کی طرح بے آبرو کر کے مار دیں گے۔''

اس وقت قادو کسی کی سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ سود و زیاں کی حد سے گزر چکا تھا۔ وہ تھانے جا پہنچا۔ اس نے جب بتایا کہ وہ کس کے خلاف پرچہ لکھوانا چاہتا ہے تو تھانے دار اچھل پڑا۔ ''اوئے موچی کی اولاد... تیرا دماغ ٹھیک ہے؟ چودھری صاحب کے خلاف پرچہ لکھوانے کا تو نے سوچا کیسے؟''

''وہی میرے گھر ڈاکے اور میری بیٹی کی موت کا ذمے دار ہے۔'' قادو نے اصرار کیا۔ ''اس کا خاص آدمی منیر

اس ڈاکے میں شامل تھا۔ میری بیٹی نے اسے دیکھا تھا۔"

"تیری بیٹی کی کسی سے یاری تھی۔ اس نے آشنا کے ساتھ مل کر ڈاکے کا ڈراما کیا اور تو نے اسے پھانسی دے دی اور اب الزام چودھری صاحب پر لگا رہا ہے۔" تھانے دار نے منٹوں میں کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے کہا اور اسے دھکے دے کر تھانے سے نکلوا دیا۔ سپاہیوں نے اسے مارا بھی۔ وہ خستہ حال گھر آیا تو بتول اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی۔

"قادو! یہ تیرے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

جب قادو نے بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے تو بتول نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس کے ساتھ نہیں رہے گی۔ اس نے اپنا اور روبینہ کا سامان لیا اور بھائی کے گھر روانہ ہو گئی۔ قادو نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے جو کرنا چاہا تھا، وہ ہوا نہیں تھا لیکن اس کا ردعمل ضرور ہوگا۔ وہ اکیلا نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے خیال میں یہ اچھا ہوا کہ بتول روبینہ کو لے کر چلی گئی تھی۔ بیوی بچی کے جانے کے بعد وہ گھر میں اکیلا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بسا بسایا گھر محض تین دن میں اجڑ گیا تھا۔ ویسے اس کی زندگی اتنی اچھی نہیں گزری تھی لیکن کچھ عرصے سے اس میں سکون آ گیا تھا اور جب اسے لگ رہا تھا کہ سب ٹھیک رہے گا تو اچانک ہی سب برباد ہو گیا تھا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رات چہرے پر ڈھاٹے باندھ کر آنے والے اب دن میں دہاڑتے ہوئے آئے اور قادو کے ساتھ اس کے گھر کا سامان بھی نکال کر گلی میں پھینکنا شروع کر دیا۔

قادو نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا فائدہ بھی نہیں ہے۔ مگر آنے والے صرف اسے گاؤں سے نکالنے نہیں آئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ مزاحمت نہیں کر رہا ہے تو وہ اسے ساتھ لے گئے۔ اگلی صبح گاؤں والوں نے قادو کو نیم مردہ حالت میں سڑک کے کنارے پڑے پایا۔ اس کی کئی ہڈیاں توڑ دی گئی تھیں اور پورا جسم تشدد سے کٹا پھٹا ہو رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے نزدیکی اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی جان بچ گئی لیکن اسے بہت دن تک اسپتال میں رہنا پڑا۔ اس دوران میں بتول یا اس کا کوئی رشتے دار اسے دیکھنے تک نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ان کے لیے مر گیا ہو۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ وہ سب قادر بخش سے کتنے خوف زدہ تھے۔ اس سے تعلق رکھ کر وہ قادر بخش سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اسپتال کے عملے کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ اس کی کہانی نے ان کے دل موم کر دیے تھے اس لیے انہوں نے اسپتال سے رخصت کرتے وقت اسے کپڑے، دوسری چیزیں اور کچھ پیسے بھی دیے۔

وہ بس سے اترا تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ ایک طرف بدوا تھا اور دوسری طرف کٹھالی۔ بس اسٹاپ کے ساتھ والی دکانوں پر خیر مقدمی بینرز لگے تھے۔ قادر بخش نے حالیہ ہونے والے انتخاب میں کامیابی حاصل کی تھی۔ پہلے وہ صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا اور اب قومی اسمبلی کا ممبر منتخب ہو گیا تھا۔ قادر بخش کو ایک کامیابی اور ملی تھی، جبکہ اسے ایک ناکامی ملی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس کے قدم بدوا کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں داخل ہوا تو لوگوں نے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی مردہ قبر سے اٹھ کر آ گیا ہو۔ جاننے والے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ کوئی اس سے ملنا تو درکنار، اس کی طرف دیکھنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ لوگوں کا خوف محسوس کر رہا تھا۔ قادو سست قدموں سے چلتا ہوا اپنے مکان تک آیا تو یہاں ایک اور تازیانہ اس کا منتظر تھا۔ مکان گرا دیا گیا تھا اور اس کی جگہ اب خالی پلاٹ تھا جس میں لوگوں نے کچرا ڈال رکھا تھا۔ مکان کا سامان نہ جانے کہاں گیا تھا۔ وہ کس سے پوچھتا؟ پوچھنے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔ جب مکان اور اس کے مکین نہیں رہے تھے تو سامان کا کیا کرنا تھا؟ اس نے جان لیا کہ اب بدوا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے جن قدموں سے آیا تھا، انہی سے واپس لوٹ گیا۔ اب اس کا رخ کٹھالی کی طرف تھا جہاں اس کی بیوی اور بچی تھی۔

کٹھالی دور تھا، وہ کچے راستوں پر چلتے چلتے تھک گیا۔ بالآخر وہ گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کا سسرال ایک ہی گلی میں تھا۔ وہ پہلے اپنے سسر کے گھر پہنچا۔ دستک کے جواب میں اندر سے اس کا بڑا سالا نمودار ہوا لیکن قادو کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ قادو کو بولنا پڑا۔ "اکرم! میری بیوی بچی کہاں ہیں؟"

"اب ان سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اکرم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بہتر ہے یہاں سے چلا جا۔"

"کیوں... بتول میری بیوی ہے۔ روبینہ میری بیٹی ہے۔"

"بے شک وہ تیری بیوی اور بیٹی ہیں لیکن اب تیرا ساتھ ان کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ تو مشکل میں رہے گا اور جو تیرے ساتھ ہوگا وہ بھی مشکل میں رہے گا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تیری بیوی اور بچی مشکل میں رہیں؟"

قادو جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اگر وہ بتول اور بچی کے ساتھ رہے گا تو اس پر آنے والی مشکل میں وہ بھی حصے دار ہوں گی۔ قادر بخش اسے سکون سے زندگی گزارتے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کے پیچھے پڑا رہتا اور شاید موت ہی قادو کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلاتی۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، میں بتول اور روبینہ سے دور رہوں گا۔ لیکن کیا میں ان سے مل نہیں سکتا؟"

اکرم نے سوچا اور سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ "ٹھیک ہے، رک جا... میں پہلے بتول سے پوچھ لوں۔"

اکرم اندر گیا اور قادو اس بھکاری کی طرح امید باندھ کر دروازے پر کھڑا ہو گیا جیسے امید ہو کہ شاید اسے بھیک مل جائے۔ اکرم کچھ دیر بعد اندر سے نکلا اور اسے اندر لے گیا۔ بتول اور روبینہ اندر الگ کمرے میں تھیں۔ دونوں کے چہرے ستے ہوئے تھے اور بتول اپنی عمر سے پندرہ سال بڑی لگ رہی تھی۔ روبینہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ بتول اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ قادو نے پُرامید نظروں سے اسے دیکھا۔ "بتول! تو میری بیوی ہے... میرے ساتھ چل۔"

"کہاں؟" بتول نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "تو خود دربدر ہے، ہمیں کہاں رکھے گا؟"

"ہم یہیں رہ لیں گے۔ میں محنت کروں گا۔"

بتول نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ قادر بخش نے تیرے لیے حکم دیا ہے کہ تو اس علاقے میں نہیں رہ سکتا۔ اسے خبر ہو گئی ہوگی اور تیری تلاش کی جا رہی ہوگی۔ وہ پھر تجھے ماریں گے۔ یہاں رہنے کی اجازت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"بابا! ہم تیرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔" روبینہ بولی۔ "قادر بخش نے ماموؤں اور نانا سے کہا ہے کہ تم سے دور رہیں ورنہ وہ بھی اس گاؤں میں نہیں رہ سکتے۔"

اب قادو کی سمجھ میں اکرم کا رویہ آیا۔ بے شک کٹھالی قادر بخش کی زمینوں سے دور تھا لیکن یہ اس کے حلقۂ اثر سے باہر نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو پچ اس کے سسرال والوں کو یہاں سے بے دخل کر سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، تم لوگ یہاں رہو لیکن تو ان لوگوں پر بوجھ بن جائے گی۔"

"میں نے ایک بھینس پال لی ہے۔" بتول بولی۔ "سکینہ کی چیزیں اور زیور بیچ دیا ہے۔ اس سے ہمارا گزارہ ہو جائے گا۔ ابھی ابا بھی ہے۔"

قادو کو معلوم تھا کہ بتول اور روبینہ کی زندگی آسان نہیں ہوگی لیکن اس کے ساتھ وہ زیادہ مشکل میں پڑ جائیں گی۔ وہ یہاں نہیں ہوگا تو قادر بخش ان سے تعرض نہیں کرے گا۔ یہاں وہ محفوظ بھی تھیں۔ بدوا میں تو روبینہ بھی محفوظ نہیں تھی۔ اس کی بہن اور بیٹی پہلے ہی ان درندوں کا شکار ہو چکی تھیں۔ وہ رونے لگا۔ اسے روتے دیکھ کر بیٹی بے قرار ہو گئی۔ "ابا! میں تیرے ساتھ چلوں گی۔"

"نہیں، تو ماں کے ساتھ رہ... مجھے اپنا کچھ پتا نہیں ہے۔" قادو نے آنسو صاف کیے۔ "میں سب سے چھپ کر یہاں آیا ہوں۔ کیا میں ایک رات یہاں رہ سکتا ہوں؟"

اکرم اور اس کے دوسرے سسرالی تیار نہیں تھے مگر بتول نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر انہیں راضی کر لیا کہ قادو کو ایک رات رکنے کی اجازت دے دی جائے۔ بتول نے اس کے لیے کھانا بنایا۔ اس کے پاس کچھ رقم بھی تھی، وہ اس نے قادو کو دینا چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ "مجھے ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ بھی تم رکھ لو۔" اس نے اپنے پاس موجود رقم نکال کر بتول کو دے دی۔ "اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

بتول خوف زدہ ہو گئی۔ "قادو! کیسی باتیں کر رہا ہے؟"

"تو فکر مت کر... میرا دماغ نہیں چلا ہے۔"

اس رات قادو، بتول اور روبینہ جاگتے رہے۔ وہ انہیں سامنے بٹھا کر باتیں کرتا رہا۔ یادیں دہراتا رہا۔ اس کے پاس بھی کچھ اچھی یادیں تھیں۔ کبھی کبھی وہ رونے لگتا تو بتول اور روبینہ بھی رو دیتے۔ صبح کے قریب قادو نے بتول سے کہا۔ "مجھے ایک چادر دے دے، بے شک پرانی ہو۔"

بتول نے اسے چادر لا دی۔ "قادو! تو کہاں جائے گا؟"

"ابھی سوچا نہیں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا سسر گھر میں کام کرتا تھا اور سالوں نے ایک دکان لے لی تھی۔ وہ سسر کے کام والی جگہ آیا۔ اسے مطلوبہ چیز مل گئی جو اس نے اٹھا کر چادر تلے چھپا لی۔ بتول نے ناشتا بنانے کو کہا لیکن اس نے منع کر دیا اور صرف ایک پیالہ چائے لی۔ روشنی ہوتے ہی وہ آخری بار بیوی اور بیٹی سے مل کر وہاں سے نکل آیا۔ اس کے سسرال میں کسی نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے ان لوگوں سے گلہ بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اس کی بیوی اور بیٹی کی ذمے داری قبول کر رہے تھے۔ قادو نے باہر آ کر چہرہ چادر میں چھپایا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا کٹھالی سے باہر آ گیا۔ اس کا رخ اب بدوا کی طرف تھا۔ وہ قادر بخش کی حویلی کے قریب پہنچا۔ حویلی گاؤں کے آخر میں تھی اور اس کے آس پاس قادر بخش کی زمینیں تھیں اس لیے وہاں کوئی مکان نہیں بنا سکتا تھا یوں حویلی اکیلی شان سے کھڑی تھی۔

قادو ایک جگہ چند گھنے درختوں تلے رک گیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا اور وہ یہاں سے حویلی دیکھ سکتا تھا۔ سورج نکل آیا تھا اور گاؤں میں چہل پہل کا آغاز ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد سڑک کی طرف سے گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں آنے لگیں۔

یہ اخبار اور میڈیا کے لوگ تھے جو قادر بخش کی انتخابی کامیابی کی کوریج کرنے آئے تھے۔ اس دوران میں کئی افراد درختوں کے پاس سے گزرے لیکن کسی نے قادو پر توجہ نہیں دی۔ حالانکہ جب کوئی پاس آتا تو اس کے اعصاب تن جاتے تھے کہ ابھی اسے پہچان لیا جائے گا اور وہ پکڑا جائے گا اور وہ اپنے مقصد کو پورا نہیں کر سکے گا۔ وہ بار بار چادر تلے موجود چیز کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔ یہ ہتھیار نہیں تھا لیکن آج اس نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب حویلی کے دروازے پر ڈھول کا شور بلند ہوا اور قادر بخش اپنے آدمیوں کے جھرمٹ میں اندر سے برآمد ہوا۔ وہ ہار پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ فوٹو گرافر دھڑا دھڑ اس کی تصویریں لینے لگے۔ ٹی وی کیمرے ویڈیو بنا رہے تھے۔

وہاں کوئی ڈیڑھ دو سو افراد جمع تھے جو کچھ دیر بعد جلوس کی صورت میں گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی قادو بھی حرکت میں آ گیا۔ وہ تیز قدموں سے اور تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا گاؤں کے مرکزی بازار تک پہنچ گیا۔ جلوس لازمی یہیں سے گزرتا۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے تھے اور عورتیں بچے چھتوں پر چڑھے جلوس دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ قادو نے ایک مناسب جگہ دیکھ لی۔ یہاں رنگریز کی دکان تھی اور اس نے کپڑے رنگ کر ٹانگے ہوئے تھے۔ قادو یوں کھڑا ہو گیا کہ کسی کی نظر اس پر نہ پڑے۔ جلوس ست روی سے چلتا ہوا تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاؤں میں داخل ہوا۔ ڈھول کی آواز قریب آئی تو گلیوں سے مزید لوگ برآمد ہونے لگے۔ جلوس کے آگے قادر بخش کے گرگے ہجوم کو کنٹرول کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کو گالیاں دے کر پیچھے ہٹا رہے تھے مگر ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگ آگے آ جاتے تھے۔

بالآخر جلوس بازار کے اس حصے میں پہنچا جہاں قادو موجود تھا۔ قادر بخش کی پہلی جھلک دیکھتے ہی اس کا ہاتھ مضبوطی سے ہتھیار پر جم گیا تھا۔ قادر بخش آگے تھا۔ اس سے آگے فوٹو گرافر اور کیمرا مین تھے، وہ کوریج کر رہے تھے۔ قادر بخش کے دائیں بائیں مناسب فاصلے پر اس کے مسلح محافظ تھے مگر وہ منظر کی راہ میں حائل نہیں ہو رہے تھے۔ آج قادر بخش سب کو نظر آنا چاہتا تھا۔ اس کی صحت شاندار ہو رہی تھی اور چہرے سے خون کی سرخی چھلکی پڑ رہی تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ چالیس سے اوپر کا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور مسکراہٹ میں غرور تھا۔ وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ کامیاب ہوتا جا رہا تھا اور ناکامی اس کے پاس سے بھی نہیں گزرتی تھی۔ قادو نے اسے دیکھا اور سوچا۔ ’آج قادر بخش کے لیے ناکامی کا دن آ گیا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جو کرے گا وہ ساری دنیا دیکھے گی اور اسے یاد رکھے گی۔‘

قادو جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ نہیں بچے گا۔ اس کی بھی یہی خواہش تھی، وہ اب زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے پاس زندہ رہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے اس کا خون کھولنے لگا۔ اس کی ہر مشکل، ہر مصائب کا ذمے دار یہ شخص تھا جو اس کے سامنے سے سینہ تان کر گزر رہا تھا۔ اس نے قادو سے اس کا سب چھین لیا تھا۔ آج قادو کو اس سے بدلہ لینا تھا، اسے ادائیگی کرنی تھی۔ جیسے جیسے قادر بخش قریب آ رہا تھا، ہتھیار پر قادو کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ پھر قادر بخش رنگریز کی دکان کے سامنے پہنچ گیا۔ گاؤں کے کچھ لوگ اس سے جھک جھک کر مل رہے تھے۔ قادر بخش تنی ہوئی گردن کے ساتھ ان سے مل رہا تھا۔ قادو کے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا۔ اس نے جسم و جان کی تمام قوت جمع کی اور تیزی سے سوکھتے کپڑوں کے پیچھے سے نکلا۔ وہ تیر کی طرح محافظوں کے درمیان سے گزرا اور قادر بخش کے سامنے جا پہنچا۔ اس کی مداخلت سے چند لمحے کے لیے سب بھونچکے رہ گئے۔ تیزی میں اس کے چہرے سے چادر ہٹ گئی تھی اور جب وہ قادر بخش کے سامنے پہنچا تو اس کا چہرہ نمایاں تھا۔ قادر بخش ایک لمحے کو حیران ہوا پھر اس کی نظر چادر سے ابھری چیز پر گئی۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا مگر اس کا پاؤں اپنے ہی پائنچے میں الجھا اور وہ نیچے گر پڑا۔ اسی لمحے قادو نے چادر گرا دی۔ اس کا ہاتھ نمایاں ہو گیا۔ صرف ہاتھ نہیں، سب کچھ بہت نمایاں تھا۔ آس پاس سیکڑوں آنکھوں کو سب نظر آ رہا تھا۔ قادو نے ہاتھ بلند کیا اور نفرت بھرے لہجے میں بولا۔

”قادر بخش... یہ ان سب زخموں کے بدلے جو تو نے مجھے دیے ہیں۔“

قادر بخش کی پھٹی پھٹی آنکھیں قادو کے ہاتھ پر مرکوز تھیں جو تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔ قادو کا مہلک ہتھیار پوری قوت سے قادر بخش کے منہ سے ٹکرایا اور... پٹاخے جیسی آواز گونجی۔ پھر قادو پیچھے ہٹا اور اس نے مڑ کر فوٹو گرافرز اور کیمرا مین کے سامنے پھٹا پرانا جوتا لہرایا۔ آج اس نے برسوں کی تذلیل کا بدلہ اتار دیا تھا۔ قادر بخش منہ پر پڑنے والا یہ جوتا فراموش کرنا بھی چاہتا تو لوگ اسے فراموش نہیں کرتے۔ قادر بخش کی تمام کامیابیاں اور غرور اس جوتے تلے رہ جاتا۔ جب قادر بخش کے محافظوں نے اپنے آتشیں ہتھیار اس کی طرف کیے تو اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

چال باز

سلیم انور

ذہانت کسی کی میراث نہیں... بعض صورتِ حال میں عقل مندوں کی ذہانت بھی بے وقوفوں کی محتاج ہو جاتی ہے... ایک پیشہ ور مجرم اور شاطر عورت کا ملاپ... دونوں اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق داؤ کھیلنے کو تیار تھے...

چونکا دینے والے انجام سے مزین ایک چال باز کہانی کے پیچ و خم...

”تمہیں تلاش کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔“ اس عورت نے کہا جو میز پر اس کے مقابل بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ خاصی تیز طرار لگتی تھی۔ وہ نوجوان ضرور تھی لیکن اتنی جوان بھی نہیں تھی کہ اپنی آنکھوں کے نیچے پڑے ہوئے حلقوں کو میک اَپ سے چھپا سکتی۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہیں جس کی تلاش ہے، وہ میں ہی ہوں؟“ اس شخص نے بیئر کا گھونٹ لیتے ہوئے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

''اگر تمہارا نام جوزف ہے تو پھر تم ہی ہو۔''
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، میں ہی جوزف ہوں۔''
''میں ایک... کام کروانا چاہتی ہوں۔''
''کام؟''
''ہاں، ایک کام۔''
''تمہیں میرے بارے میں کس نے بتایا؟'' جوزف نے جاننا چاہا۔
''ایک شناسا نے۔ اس کا فرا سٹوریج کا کاروبار ہے... بلکہ تھا۔''
''ہوں اوں۔'' ابراہام، اس نے سوچا۔ اس نے چھ ماہ قبل اس کی بلڈنگ کو نذرِ آتش کیا تھا۔
''حقیقت میں اس نے نہیں، اس کی بیوی نے تمہارا حوالہ دیا تھا۔''
''کام کیا ہے؟'' جوزف نے پوچھا۔
وہ نروس زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا ہم یہاں بات کرسکتے ہیں؟''
''کیا یہاں تمہیں پولیس دکھائی دے رہی ہے؟''
وہ جواب دینے ہی والی تھی کہ اسے احساس ہوگیا جوزف مذاق کررہا ہے۔
''اتنا نروس ہونے کی ضرورت نہیں۔'' جوزف نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے سراپا پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد بولا۔ ''تم... تم مجھ سے اپنے لیے کسی کا کام تمام کروانا چاہتی ہو؟''
''نہیں۔'' اس کی پلکیں اٹھ گئیں۔ ''اوہ نہیں، اس قسم کا کوئی کام نہیں ہے۔''
''تو پھر کیا کام ہے؟''
''نقب زنی۔'' یہ لفظ ادا کرتے وقت اسے مشکل پیش آئی تھی جیسے یہ لفظ اس کے حلق میں اٹک گیا ہو۔
جوزف نے بیئر کی نصف بھری ہوئی بوتل کی جانب اشارہ کیا تو اس عورت نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''میں چاہتی ہوں کہ تم میرے گھر میں نقب لگا کر داخل ہو اور میری کچھ جیولری چرا کر لے جاؤ۔''
''تمہاری اپنی جیولری چرالوں؟ اس کا مطلب ہے کہ بیمے کا چکر ہے؟'' جوزف نے معاملے کی تہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔
''ہاں، مجھے رقم کی ضرورت ہے۔''
''اور اس کے بعد میں تمہیں تمہارے زیورات لوٹا دوں؟''
''ویل، ہاں۔''
''اور تم مجھے اس کا معاوضہ دوگی؟'' جوزف نے کہا۔
''ہاں۔''
''تم مجھے دس ہزار ڈالرز دوگی؟''
''یہ... میرے گمان سے زیادہ رقم ہے۔''
''تم دیکھ سکتی ہو کہ مجھے رسک لینا ہوگا۔ اگر رقم میں کمی ہوئی تو پھر میں کوئی رسک نہیں لے سکوں گا۔'' جوزف نے بتایا۔
''دس ہزار ڈالرز۔''
''میں عام طور پر زیادہ معاوضہ طلب کرتا ہوں لیکن آج کل کام میں ذرا مندی ہے... اس لیے۔''
''تمہیں نقد رقم چاہیے ہوگی؟''
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''ہاں، یقیناً۔''
''اوہ!'' وہ قدرے شرما سی گئی۔
''تمہاری رہائش کہاں ہے؟''
''میرین کورٹ۔ 1636'' اس عورت نے بتایا۔
جوزف نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میرین کورٹ شہر کے نواح میں پوش علاقہ تھا۔ وہاں پر بنے مکانات خاصے وسیع رقبے پر اور شاندار تھے۔
''وہاں اور کون رہتا ہے؟'' جوزف نے پوچھا۔
''صرف میرا شوہر۔''
''کیا وہ بھی اس میں شامل ہے؟''
''وہ... نہیں، وہ شامل نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے اس بارے میں پتا چلے۔''
''جب زیورات غائب ہوں گے تو اسے پتا چل جائے گا۔'' جوزف نے کہا۔
''میرا مطلب، میری تم سے اس ملاقات سے ہے۔''
''اس سے کیوں چھپانا چاہتی ہو؟''
''مجھے رقم اپنے کام کے لیے درکار ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے اس بارے میں کوئی ہوا لگے۔''
''ہوں۔''
''میں اس بارے میں بس یہی کہنا چاہتی تھی۔''
جوزف نے اپنے لیے مزید بیئر انڈیلی اور ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''ایک بار جب میں زیورات چرالوں گا تو تمہیں یہ یقین ہے کہ میں وہ تمہیں واپس کردوں گا؟''
''مجھے تم پر اعتبار کرنا ہوگا۔''

''میں ایک چور ہوں۔''
''اگر تم نے وہ زیورات اپنے پاس رکھ لیے تو میں پولیس کو بتادوں گی کہ وہ تم نے چوری کیے ہیں۔'' اس عورت نے تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا۔
''تب میں انہیں بتادوں گا کہ انہیں چرانے کے لیے تم نے میری خدمات حاصل کی تھیں۔''
''تم یہ بات ثابت نہیں کرسکو گے۔''
''تو پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ میں نے چرائے ہیں؟'' جوزف نے سوال کردیا۔
تب اس عورت کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ وہ قدرے پیچھے ہوکر بیٹھ گئی جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش میں ہو کہ آیا اسے میز پر سے اٹھ جانا چاہیے یا نہیں۔
''تم پریشان مت ہو۔'' جوزف نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''زیورات تمہیں واپس مل جائیں گے۔ میں نے اپنی شہرت اپنے کلائنٹس کو ڈبل کراس کرکے حاصل نہیں کی ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کہیں تم اپنا ارادہ تو نہیں بدل لوگی؟''
''میں اپنا ارادہ تبدیل نہیں کروں گی۔''
''گڈ... تو تم کب چاہتی ہو کہ یہ کام ہوجائے؟''
''کل رات۔''
''یہ تو بہت جلدی ہے۔'' عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''اوکے۔'' جوزف نے کہا۔ ''کس وقت؟''
''دو بجے رات۔ تم کچن کے دروازے سے اندر آجانا۔ میں اسے کھلا چھوڑ دوں گی اور دروازے میں تالا نہیں لگاؤں گی۔ زیورات میں خلوت گاہ کی میز پر رکھ دوں گی۔ یہ چھوٹا کمرا کچن کے ساتھ ہی ہے۔'' عورت نے بتایا۔
''کیا یہ بات تمہارے شوہر کے لیے عجیب سی نہیں ہوگی؟'' جوزف نے اندیشہ ظاہر کیا۔
''وہ ڈنر کے بعد کبھی بھی خلوت گاہ میں نہیں جاتا۔ جب تم جانے لگو تو کچن کے دروازے کا شیشہ توڑ دینا۔''
''کیوں؟''
اس بات پر عورت نے یوں سر خم کیا جیسے اسے اپنے اس آئیڈیے کو پیش کرنے پر فخر ہو۔ ''اس طرح یہ ظاہر نہیں ہوگا کہ جب تم نے اپنی کارروائی کا آغاز کیا تو کچن کا دروازہ بند نہیں تھا۔''
''تم بہت ہوشیار ہو۔'' جوزف نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہارے شوہر کو شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی نہیں دے گی؟''
''وہ ہمیشہ گہری نیند سوتا ہے اور اوپری منزل پر ہمارے بیڈرومز، مکان کی دوسری جانب واقع ہیں۔'' عورت نے بتایا۔
''کیا اس کے پاس ریوالور ہے؟''
''ریوالور... ہاں کیوں؟''
''اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ وہ بیدار ہوجائے۔

اصل رشتہ

ایک غریب خاندان کا لڑکا پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر بن گیا تو اس کے مزاج ساتویں آسمان پر پہنچ گئے۔ وہ ہر وقت امیروں جیسے رنگ ڈھنگ اختیار کیے رکھتا اور اپنی اوقات بالکل ہی بھول گیا۔ غریب لوگوں سے ملنا جلنا تو درکنار، ان سے بات چیت کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کا باپ گاؤں سے شہر میں اس کے دفتر اس سے ملنے آیا تو اس نے اپنے ساتھی سے اپنے باپ کا تعارف کچھ یوں کروایا۔ ''بیگ صاحب! یہ میرے بچپن کے دوست کا باپ ہے اور کچھ اسی کی نوکری ووکری کے چکر میں یہاں آیا ہے۔''
باپ نے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو غصے میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، بیٹے کو تین چار تھپڑ رسید کرتے ہوئے بیگ صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''میں اس کے دوست کا باپ نہیں بلکہ اس کی ماں کا دوست ہوں۔''
(مرسلہ: ناصر حسین، سکھر)

ڈنر

سردار جی کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ دوپہر ڈھلنے لگی تو انہوں نے مہمانوں سے کہا۔ ''آؤ سجنو! ڈنر کرلو۔''
ایک مہمان نے دھیرے سے ان کی تصحیح کی۔ ''ڈنر رات کو ہوتا ہے۔ یہ وقت لنچ کا ہے۔''
''اتنی انگریزی میں بھی جانتا ہوں۔'' سردار جی ناراضی سے بولے۔ ''بات یہ ہے کہ کھانا تازہ نہیں ہے، رات کا بچا ہوا ہے۔ یہ لنچ کیسے ہوسکتا ہے۔''

ہوسکتا ہے کہ اسے میری یا شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دے جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے بھی اپنا ریوالور ساتھ لانا ہوگا۔'' جوزف نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کہا۔

''نہیں، تمہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اسے تمہاری آمد کا پتا کبھی نہیں چلے گیا۔ اگر اس نے سن بھی لیا تو میں اسے بیڈروم تک ہی محدود رکھوں گی۔''

''آئی ایم سوری لیکن...''

''پلیز، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں گن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں اپنے شوہر کے ریوالور میں سے گولیاں نکال لوں گی۔''

''اپنا ریوالور ساتھ لانے کا میرا یہ مقصد نہیں کہ میں اسے استعمال بھی کروں۔'' جوزف نے کہا۔

''میں...''

''بس، حفاظتی تدبیر کی خاطر۔ اگر تمہیں معلوم ہوگا کہ میرے پاس ریوالور ہے تو تمہارا یہ یقین دگنا ہوجائے گا کہ مجھے اپنے کام کی تکمیل میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

جوزف کا لہجہ اسے دلاسا دینے والا تھا۔

یہ سن کر عورت ایک لمحے کے لیے پریشان سی ہوگئی پھر بولی۔ ''آل رائٹ... لیکن پلیز کوئی شوٹنگ نہیں ہوگی۔''

''نہیں، کوئی شوٹنگ نہیں ہوگی۔'' یہ سن کر عورت کا چہرہ پُرسکون ہوگیا۔

''گھر میں کوئی پالتو جانور تو نہیں ہے؟'' جوزف نے پوچھا۔

''نہیں۔''

جوزف نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

''بعد میں تم سے رابطہ کس طرح ہوگا؟'' عورت نے پوچھا۔

جوزف نے میز پر موجود رائٹنگ پیڈ کے..... کونے پر ایک فون نمبر لکھا اور اسے پھاڑ کر عورت کو تھماتے ہوئے بولا۔ ''اس نمبر پر فون کرلینا۔ اگر میں وہاں موجود نہ ہوا تو کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ وہ تمہیں بتادے گا کہ مجھ تک کس طرح پہنچا جاسکتا ہے۔ اس فون نمبر کو ذہن نشین کرلو اور یہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دینا۔''

عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور کاغذ کا وہ پرزہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ پھر جوزف کو یاددہانی کرواتے ہوئے بولی۔ ''1636، میرین کورٹ... دو بجے رات۔ تم بھولو گے تو نہیں؟''

''میں نہیں بھولوں گا۔''

☆☆☆

اگلی رات جوزف نے اپنی درمیانی سائز کی ڈارک بلیو سیڈان 1636، میرین کورٹ سے چار بلاک پہلے پارک کردی اور پیدل اس گھر کی جانب چل پڑا۔

اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوگیا کہ تمام مکانوں کے درمیان کم از کم پچاس گز کا فاصلہ ہے اور کہیں سے بھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، وہ 1636 نمبر کے مکان کے ڈرائیو وے پر چلتا ہوا..... مکان کے عقبی حصے میں چلا گیا اور کچن کے دروازے پر جا پہنچا۔

اس نے ہاتھوں پر دستانے چڑھالیے اور کچن کے دروازے کی ناب گھمائی۔

جیسا کہ اس عورت نے وعدہ کیا تھا، کچن کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ دروازہ اطمینان کے ساتھ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ اس نے کان لگائے لیکن مکان کے اندر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے کچن میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کردیا اور اپنی جیب میں سے ایک پین لائٹ نکال کر اس کی روشنی میں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔

اسے خلوت گاہ کا دروازہ جلد ہی نظر آگیا جو کچن کے بالکل برابر میں تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جوزف نے دروازے سے کمرے میں جھانکا تو اسے میز دکھائی دی جس پر چمڑے کا ایک براؤن بکس رکھا ہوا تھا۔ وہ خلوت گاہ کے اندر چلا گیا۔

اس نے میز پر موجود چمڑے کے بکس کا ڈھکن اٹھایا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ پین لائٹ کی روشنی میں بکس میں موجود جیولری جگمگا رہی تھی۔ ایسے مواقع پر اکثر اس کا جی للچانے لگتا تھا لیکن اس نے آج تک مغلوب ہوکر ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جو اسے بعد میں کسی پریشانی میں مبتلا کردیتی۔

البتہ اس وقت جو جیولری اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، اسے دیکھ کر اسے اپنی خواہش پر قابو پانے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔

اچانک اسے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ آواز لکڑی کے فرش پر چرچراہٹ کی تھی۔ جوزف بہ خوبی جانتا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ اور چرچراہٹ کی آواز میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس نے اپنی پین لائٹ کی روشنی فوراً گل کردی اور اس کا ہاتھ بغل میں موجود ہولسٹر میں رکھے ہوئے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور پر چلا گیا۔

''ہیلو؟'' قریب ہی سے ایک اونچی سرگوشی سنائی دی۔ ''کیا یہ تم ہو.... جوزف؟'' عورت نے کہا۔ اس نے جوزف کا نام اس انداز سے لیا تھا جیسے جانتی ہو کہ یہ ایک فرضی نام ہے۔

جوزف نے اپنی پین لائٹ کا رُخ آواز کی سمت کرتے ہوئے اسے روشن کردیا۔

وہ دروازے میں خالی ہاتھ کھڑی تھی۔ اس نے نائٹ گاؤن اپنے جسم پر لپیٹا ہوا تھا۔ جونہی پین لائٹ کی روشنی اس کی آنکھوں پر پڑی، وہ تیزی سے پلکیں جھپکانے لگی۔

''جیسی!'' جوزف نے حیرت سے کہا۔ ''تم یہاں کیا کررہی ہو؟''

''میں نروس تھی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔'' عورت نے کہا۔ ''جب مجھ سے برداشت نہ ہوسکا تو میں خود کو یقین دلانے کی خاطر یہاں آگئی کہ تمہارے کام میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی۔''

''بے شک سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں پروگرام کے مطابق اپنے شوہر کے پاس موجود رہنا چاہیے تھا۔'' جوزف نے کہا۔

''اوہ، وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔'' عورت نے میز پر موجود بکس کی جانب اشارہ کیا۔ ''تمام جیولری اسی میں ہے۔''

''میں اندازہ لگا چکا ہوں۔''

''اور ایک نیکلس اور ہے جو میں نے آج پہنا ہوا تھا لیکن اسے بکس میں رکھنا بھول گئی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے اس عورت نے اپنے گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا پستول باہر نکالتے ہوئے یکے بعد دیگرے دو فائر کردیے۔

دونوں گولیاں جوزف کے سینے پر لگیں اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کتابوں کی الماری کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں جو ریوالور پُراعتماد لیکن ڈھیلے انداز میں تھاما ہوا تھا، وہ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ پھر وہ الماری کے ساتھ کھسکتا ہوا نیچے فرش پر ڈھے گیا۔ الماری میں رکھی ہوئی کتابیں اس کے دونوں جانب گرنے لگیں۔

اسے اپنے جسم سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مر رہا ہے۔

پھر جس حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اس عورت نے اپنا پستول نکالا تھا، اسی سرعت سے وہ لپک کر دروازے کے پاس پہنچی اور نیچے جھک کر فرش پر سے جوزف کا گرا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور اٹھالیا۔

جوزف نے بھی اپنے ریوالور پر جھپٹا مارنا چاہا لیکن صرف اس کی انگلیوں نے حرکت کی اور وہ بھی بے حد سست رفتاری سے۔ اس کا جسم بے سدھ پڑا تھا۔

''کیوں؟'' جوزف نے جاننا چاہا تو اسے اپنی زبان پر خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔

''تمہیں پتا چل جائے گا۔ تم اسی کے مستحق تھے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ عورت دروازے کے پاس پہنچی۔ اس نے کمرے کی لائٹ آن کردی اور بلند آواز سے چیخی۔ ''ٹام!''

جواباً کوئی آواز نہیں آئی۔ وہ دوبارہ چیخی۔ ''ٹام!'' ساتھ ہی اس نے اپنے اس ہاتھ پر ایک رومال لپیٹ لیا جس میں ریوالور تھاما ہوا تھا۔ پھر مکان کے کسی حصے سے ایک دبی دبی سی آواز میں جواب دیا گیا۔

''ادھر آؤ، میں یہاں خلوت گاہ میں ہوں۔'' اس عورت نے پھر چیخ کر کہا۔

''کیا بات ہے؟ رات کے دو بج رہے ہیں۔''

''بس فوراً نیچے آجاؤ، یہاں کچھ گڑبڑ ہے...'' پھر وہ عورت اس جگہ پہنچی جہاں جوزف اس وقت کھڑا ہوا تھا جب اس نے جوزف کو نشانہ بنایا تھا۔

وہ جوزف کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب تمہاری سمجھ میں آگیا؟''

چند سیکنڈ بعد ٹام دروازے پر نمودار ہوا تو عورت نے جوزف کے اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور سے اس کی پیشانی پر فائر کردیا۔ ٹام کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

عورت نے اپنے پستول پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کرتے ہوئے وہ پستول اپنے مردہ شوہر کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''تمہارا ریوالور بھی ابھی ایک منٹ میں تمہیں واپس مل جائے گا۔'' اس نے کتابوں کی الماری کے پاس دم توڑتے ہوئے جوزف سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''لیکن پہلے مجھے ایک دو کام کرلینے دو۔''

پھر جوزف نے اسے کچن کے فون سے پولیس کو فون کرتے ہوئے سنا۔ اس وقت اس عورت کی آواز خوف سے بھرپور اور وحشت زدہ... لگ رہی تھی۔ پھر جو آخری آواز جوزف کو سنائی دی، وہ کچن کے دروازے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی تیز آواز تھی۔

یقیناً یہ شیشہ باہر کی جانب سے توڑا گیا تھا۔

اور پھر جوزف کا سر ایک طرف ڈھلک گیا!

مقصد کا حصول سخت سے سخت لمحات کو مسرت آفریں بنا دیتا ہے... کچھ ایسے ہی افراد کا احاطہ کرتی تحریر... ایک کو اپنے انتقام کی آگ سرد کرنی تھی... اور دوسرے کو اپنے دشمن کی کھوج تھی... وہ زندگی کی بازی ہار رہا تھا... مگر اسے ہر صورت اپنے دشمن کو جاننے کی خواہش برسرِپیکار رکھی ہوئی تھی...

سخت جان

بابر نعیم

سنسنی خیز لمحات کو مہمیز کردینے والی... لہو کو گرما دینے والی سخت جان کہانی

وہ کار ایک جھٹکے سے رکی اور اس کے ٹائر ریت میں پھسل گئے۔ کار کا انجن ایک لمحے کے لیے غرایا اور پھر ساکت ہوگیا۔ ڈرائیور نے کار سے نیچے اتر کر دروازہ... زوردار آواز سے بند کردیا۔ اس نے عمدہ تراش کا سوٹ اور قیمتی جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اور پولارائزڈ دھوپ کی عینک بھی لگا رکھی تھی۔

اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ خالی صحرا کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ درجۂ حرارت سو ڈگری سے

کم نہیں تھا۔ کار کے اندرونی ٹھنڈے ماحول سے باہر دن کی کھلی ہوئی گرم فضا میں قدم رکھتے ہی ڈرائیور کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھرنے لگیں۔

وہ گھوم کر کار کے پیچھے چلا گیا اور کار کی ڈکی کو کھٹکھٹانے لگا۔ جواب میں صرف گھٹی گھٹی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے ڈکی کھول دی اور اس میں موجود اپنے شکار کو دیکھنے لگا۔

ڈکی میں ایک شخص لیٹا ہوا تھا جس کے چاروں ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ ایک پھٹا ہوا کپڑا اس کے سر پر بندھا ہوا تھا۔ کپڑے کا ایک سرا اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا تھا اور دوسرے سرے سے اس کے سر کے پیچھے گرہ بندھی ہوئی تھی۔ اس شخص کا لباس بھی سوٹ ہی تھا، البتہ پیروں میں موجود جوتے سستے تھے۔

ڈرائیور نے ڈکی میں موجود بندھے ہوئے شخص کو دھیرے دھیرے ڈکی سے باہر کھینچا اور پھر یک لخت نیچے زمین پر گرا دیا پھر جھک کر اس کے سر پر بندھی ہوئی کپڑے کی پٹی کی گرہ کھول دی۔

"تم پر خدا کی مار ہو۔" بندھے ہوئے شخص نے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکلتے ہی کہا۔ "تمہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں، مجھے کتنی تکلیف ہو رہی ہے۔ تمہیں یہ سب ختم کرنا ہوگا۔ اگر اب تم میری یہ بندشیں کھول دو تو ہم اس بارے میں سب کچھ فراموش کر سکتے ہیں۔ اس کے عوض وہ تمہیں جو کچھ بھی ادا کر رہے ہیں، میں اس سے دگنا تمہیں ادا کروں گا۔ میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔"

ڈرائیور اس کے سر پر کھڑا ہو گیا اور بے رحمانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" زمین پر پڑے ہوئے شخص نے پوچھا۔

"سلیڈ۔"

"سلیڈ؟ یہ تمہارا مکمل نام ہے یا پہلا یا دوسرا حصہ؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"ہاں، میرے خیال سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سنو سلیڈ! میرا نام رابرٹ فلیکنین ہے اور میں..."

سلیڈ نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ "ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ تب تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ میرے پاس کتنی دولت ہے یا کم از کم سرسری اندازہ تو ہوگا؟" رابرٹ نے زبردستی ایک قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں... میں تمہیں ایک ملین ڈالرز دوں گا۔ تمہیں بس یہ کرنا ہوگا کہ میری بندشیں کھول دو اور مجھے شہر واپس لے چلو۔ تمہیں یہ پیشکش کیسی لگی؟"

سلیڈ ایک بار پھر نیچے جھکا اور اس رسی کی گرہیں کھولنا شروع کر دیں جس سے رابرٹ کے ہاتھ اور پیر باندھے ہوئے تھے۔

"اوہ... تھینک گاڈ۔" رابرٹ نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

سلیڈ نے رابرٹ کی بندشیں کھولنے کے بعد رسی کار کی خالی ڈکی میں اچھال دی۔

رابرٹ نے اٹھنے کی کوشش کی اور بولا۔ "تمہیں اس کا افسوس نہیں ہوگا۔ میں اپنے دوستوں کا اچھا خیال رکھتا ہوں۔"

سلیڈ نے رابرٹ کے پیٹ پر ایک ٹھوکر رسید کی تو وہ دوبارہ زمین پر گر پڑا۔

"تم نے یہ حرکت کیوں کی؟" رابرٹ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اس وقت تک پڑے رہو جب تک میں تمہیں اٹھنے کو نہ کہوں۔" سلیڈ نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

پھر وہ کار کی جانب پلٹا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول کر ایک بیلچہ اٹھایا جو عقبی نشست پر رکھا ہوا تھا۔ بیلچہ نکالنے کے بعد اس نے کار کا دروازہ بند کر دیا پھر واپس ادھر آ گیا جہاں رابرٹ زمین پر پڑا ہوا تھا۔

"اب تم اٹھ سکتے ہو۔" سلیڈ نے کہا۔

"تت... تمہیں اس بیلچے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" رابرٹ نے قدرے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اٹھ جاؤ ورنہ میں اس بیلچے سے تمہاری کھوپڑی کھول دوں گا۔" سلیڈ نے دھمکی دی۔

رابرٹ محتاط انداز میں اٹھنے لگا۔ البتہ اس کی نگاہیں بدستور بیلچے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم جو کچھ بھی کرنے کا سوچ رہے ہو، اس پر نظرثانی کر لو۔" رابرٹ نے کہا۔

"ڈیل یہ ہے۔" سلیڈ نے بتایا۔ "تمہیں یہ بیلچہ لے کر ایک بڑا عمدہ سا گڑھا کھودنا ہوگا۔ اگر تم نے انکار کیا یا کسی طرح سے بھی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو میں تمہارے جسم کی ہر ہڈی کو ایک ایک کر کے توڑ دوں گا۔ تم دھیرے دھیرے اور درد کی شدت سے موت کی وادی میں چلے جاؤ گے۔ آخر کار تم مجھ سے بھیک مانگو گے کہ میں تمہیں مار ڈالوں یا پھر تم

سسک سسک کر مرنے کے بجائے آسان طریقے کا انتخاب کر لو۔ مجھے گڑھا کھود کر دے دو، میں تمہیں فوری اور عمدہ موت فراہم کر دوں گا۔ وہ بلا تکلف اور بلا اذیت موت ہوگی۔ اب تمہاری مرضی کہ تم کون سی موت پسند کرتے ہو۔"

"یہ تو نہایت بے ہودہ ڈیل لگتی ہے۔" رابرٹ نے تبصرہ کیا۔ "ہر صورت ہار میری ہی ہوگی۔"

"ہاں لیکن ایک طریقہ دوسرے کے مقابلے میں بہت زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔" سلیڈ نے کہا۔

"میرے پاس دولت ہے..."

"مجھے تمہاری دولت کی پروا نہیں ہے۔" سلیڈ نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اب تمہاری جان بخشی نہیں ہوگی۔ تمہیں اس حقیقت کو قبول کرنا ہوگا۔ نہ تو تم باتوں سے اپنی جان بچا سکتے ہو اور نہ ہی دولت کے بل بوتے پر۔ اب تم خود اپنی موت کا انداز منتخب کر لو، ورنہ پھر مجھے منتخب کرنا پڑے گا۔"

"میری ایک فیملی بھی ہے۔" رابرٹ نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

سلیڈ نے بیلچہ گھماتے ہوئے رابرٹ کے شانے پر ایک ضرب لگا دی۔ رابرٹ درد سے کراہنے لگا۔ سلیڈ نے بیلچہ دوبارہ اوپر کیا تو رابرٹ چیخ پڑا۔

"ٹھہرو... ٹھہرو، میں گڑھا کھود دوں گا، حرام زادے۔"

"گڈ!"

سلیڈ نے بیلچہ زمین پر پھینک دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ اس ریوالور کے دستے پر چلا گیا جو اس کی کمر میں بندھے ہولسٹر بیلٹ میں رکھا ہوا تھا۔

رابرٹ نے جھک کر بیلچہ اٹھا لیا۔ اس کے شانے میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں جہاں سلیڈ نے بیلچے سے ضرب لگائی تھی۔

"میں گڑھا کہاں کھودوں؟" اس نے سلیڈ سے پوچھا۔

سلیڈ نے کار سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک جگہ کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ "وہاں۔"

"یہاں تو جھلسا دینے والی گرمی پڑ رہی ہے۔ تمہارے ہلاک کرنے سے پہلے ہی میں گرمی کی شدت سے مر جاؤں گا۔" رابرٹ نے کہا۔

"میرے پاس کار میں پانی موجود ہے۔" سلیڈ نے جواب دیا۔ "اب کھدائی شروع کر دو۔"

رابرٹ نے اپنا کوٹ اور ٹائی اتار کر نیچے زمین پر گرا دیے پھر بیلچہ اٹھا کر اس مقام کی جانب بڑھ گیا جس کی نشان دہی سلیڈ نے کی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ زمین کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ سورج ڈھلنے تک دن بھر کھدائی کرتا رہا، تب بھی اتنا گڑھا کھودنے سے قاصر رہے گا جس کے اندر وہ خود سما سکے لیکن اس کے باوجود اس نے گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔

ابھی کھدائی کرتے ہوئے اسے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ دس منٹ میں اس کی قمیص پسینے سے شرابور ہو گئی۔ بیس منٹ میں اس کے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے لیکن وہ مسلسل کھدائی کرتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جسم کی ہڈیاں ایک ایک کر کے توڑی جائیں۔

نصف گھنٹے کھدائی کرنے کے بعد سلیڈ نے اسے پانچ منٹ کے لیے ستانے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی پینے کے لیے ایک جگ میں سے تھوڑا سا گرم پانی بھی دے دیا۔

پانچ منٹ بعد رابرٹ نے دوبارہ گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے پانی کے وقفے کے ساتھ کھدائی کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخرکار رابرٹ نے پسینے میں تر اپنی قمیص بھی اتار پھینکی اور ننگے دھڑ کے ساتھ کھدائی جاری رکھی۔

سلیڈ کی قمیص بھی پسینے میں تربتر ہو رہی تھی لیکن اس نے قمیص اتارنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس دوران میں سورج بھی ڈھلنا شروع ہو گیا تھا اور گرمی کی شدت میں بھی کمی آ گئی تھی۔ رابرٹ کو قدرے ٹھنڈک کا احساس ہوا تو اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا پھر جب سورج افق پر پہنچ گیا تو رابرٹ نے کھدائی روک دی۔

"یہ نا کافی ہے۔" سلیڈ نے کہا۔ "مزید کھودو۔"

"میں نہیں کھود سکتا۔"

"کھودو۔"

"میں مزید نہیں کھود سکتا۔ میرے ہاتھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ میں بری طرح تھک چکا ہوں۔ میرے جسم کے ایک ایک عضو میں جیسے آگ لگی ہوئی ہے۔" رابرٹ نے کراہتے ہوئے کہا۔

سلیڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بس ان آنکھوں سے رابرٹ کی جانب دیکھتا رہا جو اب بھی دھوپ کی عینک کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ جب رابرٹ نے سلیڈ کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں کے تاثرات کے بجائے اسے عینک کے شیشوں میں اپنا عکس ہی دکھائی دیا۔

اپنے عکس میں وہ بے حد تھکا ماندہ اور ٹوٹا پھوٹا شخص

نظر آرہا تھا۔
''اب بھی دیر نہیں ہوئی۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''میری پیشکش اب بھی برقرار ہے۔ ایک ملین ڈالرز... نہیں دو ملین ڈالرز کرلو۔ ہم کار میں بیٹھ کر واپس شہر جاسکتے ہیں۔''
سلیڈ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ہاتھ بدستور ریوالور کے دستے پر تھا۔ گرم ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کو بکھیر رہے تھے اور وہ پتھر کی طرح خاموش کھڑا تھا۔
''میرا خیال ہے کہ مجھے مزید کھدائی کرنا ہی ہوگی۔'' رابرٹ نے مایوس لہجے میں کہا۔ سلیڈ نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ رابرٹ نے ایک بار پھر کھدائی شروع کردی۔
کچھ دیر کے بعد سلیڈ نے رابرٹ کے شانے پر تھپکی دی۔ رابرٹ نے کھدائی روک دی۔ اس وقت شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ نہ زیادہ روشنی تھی، نہ زیادہ تاریکی۔
''بس اتنا کافی ہے۔'' سلیڈ نے کہا۔
رابرٹ نے بیلچہ ایک طرف اچھال دیا۔ ''سنو!'' اس نے سلیڈ نے کہا۔ ''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''
''میرا وقت ضائع مت کرو۔'' سلیڈ نے جواب دیا۔
''مجھے صرف ایک سگریٹ چاہیے۔ اوکے؟... کیا میں تم سے کچھ بہت زیادہ طلب کررہا ہوں؟''
سلیڈ ایک لمحے کے لیے سوچنے لگا پھر بولا۔ ''نہیں، نہیں... میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں۔''
گڑھے میں موجود رابرٹ نے باہر آنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سلیڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گڑھے سے باہر نکلنے میں اس کی مدد کی۔
وہ گڑھا چار فٹ گہرا، ساڑھے چار فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ سلیڈ بھی اس بات سے خاصا متاثر تھا کہ رابرٹ نے ہمت ہارے بغیر آخرکار اتنا بڑا گڑھا کھود ہی ڈالا۔
ادھر رابرٹ کے بازو اور ٹانگیں شل ہوچکی تھیں۔ وہ درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہاتھ پیروں کی مالش کرنے لگا۔ اس کی کمر میں بھی شدید ٹیسیں... اٹھ رہی تھیں۔
سلیڈ نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور رابرٹ سے پوچھا۔ ''تم کیمل برانڈ کی سگریٹ پی لوگے؟''
''میں اس وقت تمباکو بھرا ٹائلٹ پیپر کا رول کیا، بکرا بھی پی لوں گا۔'' رابرٹ نے جواب دیا۔
یہ سن کر سلیڈ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ رابرٹ میں اب بھی حوصلہ باقی تھا۔
سلیڈ نے سگریٹ رابرٹ کو تھما دیا پھر اپنی جیب میں سے لائٹر نکالا اور اس کا شعلہ روشن کرتے ہوئے رابرٹ کا سگریٹ سلگا دیا۔
رابرٹ نے ایک لمبا کش لیتے ہوئے دھوئیں کو کچھ دیر تک منہ میں دبائے رکھا پھر ایک سانس میں سارا دھواں باہر اگل دیا۔ ساتھ ہی بولا۔ ''عمدہ سگریٹ ہے۔''
''بے شک۔'' سلیڈ نے جواب دیا۔
''جانتے ہو میری ایک فیملی ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''ایک بیوی اور دو بچے۔'' یہ کہہ کر رابرٹ انتظار کرنے لگا کہ سلیڈ اسے شٹ اپ کہے گا لیکن جب سلیڈ نے ایسا کچھ نہیں کہا تو رابرٹ نے دوبارہ بولنا شروع کردیا۔
''میرے بیٹے اسٹیو کی عمر تیرہ سال ہے۔ وہ کاؤنٹی لیگ میں فٹ بال کھیلنے کا خواہش مند ہے۔ میں نے اس سے کہ میرے خیال میں یہ ایک عمدہ آئیڈیا ہے لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ وہ کھیل کے لحاظ سے اچھا کھلاڑی بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ پاس نہیں دے سکتا، وہ کیچ نہیں لے سکتا اور کچھوے کی طرح حرکت کرتا ہے۔ اگر وہ تگڑا ہوتا تو دفاعی کھلاڑی کی حیثیت سے کھیل سکتا تھا لیکن وہ دبلا پتلا بھی ہے البتہ وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔'' سلیڈ بدستور خاموش رہا۔ رابرٹ نے سگریٹ کا ایک اور کش لگایا اور ڈھیر سارا دھواں اگل دیا۔
''میری بیٹی کا نام ماریہ ہے۔'' رابرٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی عمر سات سال ہے۔ ایک پیاری لڑکی شاید تم نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ وہ ہمیشہ میری تصویریں بناتی رہتی ہے۔ وہ ان تصویروں پر اپنے دستخط بھی کرتی ہے۔ حقیقی آرٹسٹ کی طرح۔ بعض اوقات میں سونے وقت اسے کہانی پڑھ کر سناتا ہوں لیکن اکثر ایسا نہیں ہو کیونکہ تم تو جانتے ہی ہو، میں کتنا مصروف رہتا ہوں لیکن جب بھی مجھے موقع ملتا ہے، میں یہ کام ضرور کرتا ہوں۔ اس سے وہ بہت خوش ہوتی ہے۔ میری بیوی... ویل، میں اب بھی اس سے پیار کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھ سے اپنے انداز میں پیار کرتی ہے۔ وہ اتنی... لعنت ہو، میں کسی بچے کی طرح رو رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے اپنے رخسار پر بہتے ہوئے آنسو پونچھ لیے پھر آہستگی سے بولا۔
''میں مرنا نہیں چاہتا۔''
''کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔'' سلیڈ نے جواب دیا۔ ''لیکن بالآخر ہم سب کو مرنا ہے۔''
''تم ایسا کیوں کررہے ہو؟'' رابرٹ نے کہا۔ ''میں تمہیں دو ملین ڈالرز کی پیشکش کررہا ہوں۔ جو کوئی بھی تمہیں اس کام کا معاوضہ دے رہا ہے، وہ معاوضہ اس پیشکش کے

قریب ہرگز نہیں ہوگا۔ تمہیں کتنی رقم مل جائے گی؟ بیس ہزار، تیس ہزار؟''
''یہ میرا معاملہ ہے۔'' سلیڈ نے کہا۔ ''یہاں رقم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہاں پر ہم معاملات کا تصفیہ کرنے نہیں بلکہ معاملے کو ختم کرنے کے لیے آئے ہیں۔''
''لیکن معاملہ اس طرح ختم نہیں ہونا چاہیے۔'' رابرٹ نے کہا۔ سلیڈ نے بے چارگی کے انداز میں شانے اچکاتے ہوئے ہاتھ لہرا دیے۔
''لعنت ہو۔'' رابرٹ نے جیسے ہار مان لی۔ ''میں نے تمہیں قائل کرنے کی تمام کوششیں کرڈالیں لیکن بات بنتی نظر نہیں آرہی۔ اگر تم دو ملین ڈالرز کی پیشکش کو ٹھکرا رہے ہو تو میں نہیں سمجھتا کہ تین ملین ڈالرز کی پیشکش سے بھی کوئی فرق پڑے گا یا چار ملین ڈالرز۔'' رابرٹ نے یہ کہہ کر توقف کیا۔
سلیڈ نے اب بھی کسی قسم کی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ ''سو اب بالآخر تم سمجھ ہی گئے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔''
''ہاں، اب میں واقعی سمجھ گیا کہ تم کیا چاہتے ہو۔'' رابرٹ نے جواب دیا اور سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد ٹوٹے کو دور پھینک دیا۔
''اب وقت آگیا ہے۔'' سلیڈ نے کہا۔
''تمہاری خدمات کس نے حاصل کی ہیں؟'' رابرٹ نے جاننا چاہا۔
''آؤ اب چلیں۔''
''میں جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے جاننے کا حق ہے۔'' رابرٹ نے ضد کرتے ہوئے کہا۔
''تمہیں کوئی حق حاصل نہیں ہے مسٹر رابرٹ۔''
''میں پھر بھی جاننا چاہتا ہوں۔''
تب سلیڈ نے رابرٹ کا بازو جکڑ لیا اور اسے گڑھے کی جانب کھینچ کر لے جانے لگا۔
''رک جاؤ پلیز... صرف ایک منٹ کے لیے۔'' رابرٹ نے ملتجی لہجے میں کہا۔ سلیڈ نے اسے کھینچنا چھوڑ دیا اور وہیں رک گیا۔
''میں تم سے ایک انسان ہونے کے ناتے یہ بات پوچھ رہا ہوں۔ پلیز، مجھے بتادو۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے ہلاک کرنے کے لیے تمہیں رقم کس نے ادا کی ہے؟'' رابرٹ نے کہا۔
سلیڈ نے ایک لمبی آہ بھرتے ہوئے پہلے گڑھے کی جانب دیکھا اور پھر واپس رابرٹ کے چہرے پر نظریں جمادیں۔
''کیا یہ بات تمہارے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہے... اس کے باوجود کہ تم اس بارے میں اب کچھ بھی نہیں کرسکتے؟'' سلیڈ نے پوچھا۔
''ہاں۔'' رابرٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات میرے لیے اتنی ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مرنے سے پہلے مجھے یہ تسلی تو ہونی ہی چاہیے کہ وہ کون شخص ہے جو میری موت کا باعث بنا ہے۔ اسے تم مرنے سے قبل میری آخری خواہش بھی کہہ سکتے ہو۔''
''آل رائٹ۔'' سلیڈ نے بالآخر اسے بتانے کی ہامی بھرلی۔
''وہ شخص کون ہے؟'' رابرٹ نے بے تابی سے پوچھا۔
''جس شخص نے میری خدمات مستعار لی ہیں، اس کا نام جینکو ہے... کلاڈ جینکو۔'' سلیڈ کے منہ سے یہ نام سنتے ہی رابرٹ ٹھٹک گیا۔
''کلاڈ...؟ جیسس کرائسٹ؟ میں تو اسے اپنا ایک اچھا دوست خیال کرتا تھا۔'' رابرٹ نے کہا۔
''تمہیں اپنے لیے بہتر دوستوں کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔'' سلیڈ نے کہا۔
''تو شٹ۔'' رابرٹ نے جواب دیا پھر ایک قہقہہ لگایا جس میں بے بسی کا عنصر شامل تھا۔
''اب تو تمہیں پتا چل گیا۔'' سلیڈ نے کہا۔ ''آؤ اب چلیں۔''
''آل رائٹ۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے جب وقت آگیا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔''
اس مرتبہ سلیڈ کو رابرٹ کو گھسیٹ کر لے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے تازہ کھودے گئے گڑھے کے کنارے تک جا پہنچے۔ رابرٹ چند لمحوں تک کنارے پر کھڑا اس گڑھے کے اندر دیکھتا رہا جو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کوئی گہری گھاٹی ہو جس کی تہ کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہو اور اس میں گہری تاریکی چھائی ہوئی ہو۔
افق پر بے حد مدھم سی روشنی باقی رہ گئی تھی۔
رابرٹ خود ہی گڑھے میں اتر گیا پھر نیچے پہنچنے کے بعد نگاہ اٹھا کر اپنے جلاد کو دیکھنے لگا جو کسی بھی لمحے اس کا کام تمام کردینے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اب اس شخص سے رقم یا فیملی کے بارے گفتگو کرنا فضول ہی تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اب اس کھیل کا انجام قریب آچکا تھا۔
سلیڈ نے اپنے ہولسٹر کے اسٹریپ کا بٹن کھول دیا اور

ریوالور باہر نکال لیا۔ ریوالور کی نال کا رخ زمین کی جانب تھا۔

''مجھے واقعی تم پسند آئے۔'' سلیڈ نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہوئی جو اب ہمارے سامنے ہیں۔''

''میرے بھی یہی تاثرات ہیں۔'' رابرٹ نے کہا۔

تب سلیڈ نے اپنے ریوالور کی نال اوپر اٹھانی شروع کی لیکن عین اسی لمحے اس کی پیشانی کا ایک بڑا حصہ سرخ رنگ کے بخارات کے ساتھ باہر کی جانب پھٹ پڑا اور وہ اینٹوں کی بوسیدہ دیوار کی طرح زمین پر گر پڑا۔

رابرٹ ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑا سلیڈ کے بے جان جسم کو دیکھتا رہا جو زمین پر ڈھیر تھا اور خون دھیرے دھیرے اس کے تباہ شدہ سر سے بہتا ہوا زمین پر پھیل رہا تھا۔ پھر رابرٹ اچھل کر گڑھے سے باہر نکل آیا اور سلیڈ کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال لیا۔

اس نے ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور دور فاصلے پر دیکھنے لگا۔ دو ہیڈ لائٹس تیزی سے اس کی جانب آرہی تھیں۔ اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے لائٹر جلایا اور اس کے شعلے کو ہوا سے بچائے ہوئے سگریٹ سلگا لیا پھر لائٹر واپس اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

ہیڈ لائٹس اس کے نزدیک آکر رک گئیں۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک اسپورٹس یوٹیلیٹی وہیکل (SUV) تھی پھر ایک شخص اس گاڑی سے اتر کر آگے آگیا۔ اس شخص کے کاندھے پر اندھیرے میں نشانہ لینے والی پاور فل ٹیلی اسکوپ رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور اسٹیئرنگ پر ہی بیٹھا رہا۔

''تم ٹھیک تو ہونا؟'' اس شخص نے رابرٹ سے پوچھا۔

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں البتہ تم نے قدرے وقت لے لیا۔ تمہیں اسی وقت اسے نشانہ بنالینا چاہیے تھا جب اس نے اپنا ریوالور ہولسٹر سے باہر نکالا تھا۔'' رابرٹ نے جواب دیا۔

''ہاں، ہاں۔ اگر تم مجھ سے پوچھو تو یہ سارا معاملہ ہی خراب تھا۔ یہ زیادہ آسان رہتا کہ ہم اسے شہر کے راستے میں کسی جگہ اچک لیتے۔ ایسٹن میں واقع اپنی فیکٹریوں میں سے کسی ایک میں لے جاتے اور ٹیزر گن سے اسے وقتی طور پر مفلوج کر کے اس وقت تک تشدد کا نشانہ بناتے رہتے جب تک وہ ہمیں وہ نہ بتا دیتا جو ہم جاننا چاہتے تھے۔''

''میں نے تم سے پوچھا نہیں ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اور جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں اس ٹائپ کے سخت جان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ مرتے وقت تک اپنی زبان بند رکھتا اور منہ سے کچھ نہ اگلتا، چاہے ہم اس پر کتنا ہی تشدد کیوں نہ کرتے۔''

''سو، تمہیں وہ پتا چل گیا جو تم جاننا چاہتے تھے؟''

''ہاں، میں جو معلوم کرنا چاہتا تھا وہ مجھے معلوم ہوگیا۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''اب اٹھنے میں میری مدد کرو۔''

اس شخص نے رابرٹ کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں سہارا دیا۔

''میرے کپڑے مجھے تھما دو۔'' رابرٹ نے کہا۔ اس شخص نے رابرٹ کی قمیص اور کوٹ اسے تھما دیے۔ رابرٹ نے وہ لباس پہن لیا۔

''فرینکی مجھے واپس شہر لے جائے گا۔'' رابرٹ نے اس شخص سے کہا۔ ''تم یہیں ٹھہرو اور قابل نفرت شخص کو اس گڑھے میں دفن کردو پھر اس کی کار لے کر شہر آجانا۔ میں سکستھ اور روزر روڈ کے چوراہے پر تمہارا انتظار کروں گا۔''

''پھر کیا کرنا ہوگا؟''

''پھر ہم میرے ایک پرانے دوست کے پاس چلیں گے... کلاڈ جینکو کے پاس۔'' رابرٹ نے کہا۔

''کلاڈ جینکو!''

''ہاں، امید ہے تم اس کو ہینڈل کرلو گے۔'' رابرٹ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''نو پرابلم، باس۔''

رابرٹ یہ کہہ کر SUV کے سامنے کی پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا اور ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گھماتے ہوئے اسے اسی راستے پر واپس ڈال دیا جہاں سے آئے تھے۔

جب رابرٹ نے اپنا سگریٹ ختم کرلیا تو شیشہ گرا کر ٹوٹے کو باہر اچھال دیا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ بند نہیں کیا۔ رات کی ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں کو بری طرح بگاڑ رہی تھی لیکن اسے یہ اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی شہر تک کا خاصا سفر باقی تھا۔

رابرٹ سوچنے لگا، دن بے حد کڑا گزرا تھا لیکن رات خوب صورت اور سہانی تھی۔

اور اس سہانی رات میں وہ اپنی جان کے دشمن اپنے دوست کلاڈ جینکو سے ہاتھوں ہاتھ انتقام لے کر بدلہ چکا دے گا۔ اس تصور سے اس کے ہونٹوں پر ایک تسکین آمیز مسکراہٹ ابھر آئی اور وہ اپنے جوڑ جوڑ میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو وقتی طور پر فراموش کر بیٹھا۔

جمال دستی

خیالی گھوڑا

انسانی ذہن پر ہزارہا خیالات و احساسات کی حکمرانی رہتی ہے... ذہن کی گتھیوں کو سمجھنا اور سمجھانا دشوار تر ہے... لاکھوں میں سے ایک شخص انہیں سمجھنے کی قابلیت و صلاحیت رکھتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی کتھا... جس کے خیال کی رو ایک گھوڑے پر جا اٹکی تھی...

نفسیاتی الجھنوں میں پھنسی جرم کی گرہ... لگانے اور کھولنے کا انوکھا ماجرا...

''اس شخص کو خاص طریقے سے قتل کیا گیا ہے۔'' جرائم سے متعلق مشہور وکیل جون میلون نے کہا۔ ''مسٹر ڈکسن کوان کے ماہرِ نفسیات نے اچانک خوف میں مبتلا کر کے ہلاک کیا ہے۔''

''نان سینس۔'' ہومی سائڈ کیپٹن فلیگ نے غراتے

مدرٹنگ

سردار جی اپنے صاحب زادے کو کالج میں داخل کرانے کے لیے فارم بھرنے میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ فارم انگریزی میں تھا۔ بیٹا پڑھ کر باپ کی ہدایت کے مطابق سارے خانے بھرتا جا رہا تھا۔

''اباجی! اب مدرٹنگ ہے، یہاں کیا لکھوں؟'' بیٹے نے ایک جگہ رک کر پوچھا۔

''ٹانگ تو ٹھیک ہے، یہ مدر کیا ہوتی ہے؟'' سردار جی نے تفکر آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''اباجی! ٹانگ نہیں، یہ ٹنگ ہے... مدرٹنگ یعنی ماں کی زبان۔'' بیٹے نے تصحیح کی۔

سردار جی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔ ''لکھ دے بیٹا، بہت لمبی ہے... یہ تو تو بھی جانتا ہے!''

(طیب اسد، ڈیرہ اسماعیل خان)

ہوئے کہا۔

پھر ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی کیونکہ ڈکسن کی لاش کو آپریشن روم سے باہر منتقل کیا جا رہا تھا۔ وہ دونوں اسے لے جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

''ویسے ڈاکٹر شیفرڈ اس وقت کہاں ہیں؟'' کیپٹن فلیگ نے پوچھا۔

''وہ آرام کر رہے ہیں۔'' نرس نے بتایا۔ اس کا چہرہ پھیکا پڑ رہا تھا۔ ''انہیں شاک پہنچا ہے۔ یقیناً ہمیں معلوم تھا کہ مسٹر ڈکسن دل کے مریض ہیں لیکن کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا... وہ تو بس ایک بے ضرر مذاق تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اسے ایک مذاق ہی سمجھنا چاہیے تھا...''

''اور مسز ڈکسن؟''

''وہ بھی ڈاکٹر شیفرڈ کے کمرے میں ان کے پاس ہیں۔'' نرس نے جواب دیا۔

جون میلون اور فلیگ نے ایک آخری نگاہ ڈکسن کی لاش پر ڈالی۔ وہ ایک لحیم شحیم آدمی تھا۔ اس کا چہرہ چوڑا اور سر کے بال چھدرے تھے۔ اس کے پیٹ پر چاک کیے جانے کا چھوٹا سا نشان تھا جو بہ مشکل ایک خراش کی طرح نظر آ رہا تھا۔

''انہوں نے اچانک حیرت سے منہ کھول کر ایک لمبا سانس... کھینچا اور مر گئے۔'' نرس نے کہا پھر آنکھیں بھینچتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر شیفرڈ اور مسز ڈکسن آپس میں گہرے دوست ہیں۔''

میلون نے تیز نگاہوں سے نرس کی طرف دیکھا۔ وہ سنہری زلفوں اور حسین چہرے والی دلکش عورت تھی۔

''آؤ، ڈاکٹر کے کمرے میں چلتے ہیں۔'' کیپٹن فلیگ نے کہا۔ ''میلون! یہ بتاؤ کہ تم اس معاملے میں کس طرح ٹپک پڑے؟''

''مسٹر ڈکسن میرے کلائنٹ تھے۔'' میلون نے جواب دیا۔

''انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس ماہر نفسیات کے پاس جا رہے ہیں جس کی سفارش ان کی بیوی نے کی تھی... اپنا آپریشن کروانے کے لیے کیونکہ انہوں نے ایک گھوڑا نگل لیا ہے۔''

''میلون!'' کیپٹن فلیگ نے کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''تم پیے ہوئے تو نہیں ہو؟''

''مسٹر ڈکسن کو پختہ یقین تھا کہ انہوں نے ایک گھوڑا نگل لیا ہے۔ وہ ایک نفسیاتی مریض تھے نا۔'' میلون نے خود سر لہجے میں کہا پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ وہ مزید بولا۔ ''مجھے یاد ہے ایک مرتبہ تم نے بھی یہ گمان کیا تھا کہ کوئی چوہا تمہارے منہ میں چلا گیا ہے۔''

کیپٹن فلیگ، میلون کی اس بات پر غرا کر رہ گیا اور ڈاکٹر شیفرڈ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

ڈاکٹر شیفرڈ کاؤچ پر چت حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ مسز ڈکسن اس کا ہاتھ تھامے اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی وہ چونک پڑیں اور اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ پھر روہانسے لہجے میں بولیں۔ ''یہ کسی کی بھی غلطی نہیں ہے۔''

ڈاکٹر شیفرڈ وضاحت پیش کرنے لگا۔ ''مسٹر ڈکسن کو یقین تھا کہ انہوں نے ایک گھوڑا نگل لیا ہے۔ ہم نے ایک بے ضرر بناوٹی کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے انہیں بے ہوش کر دینے والی دوا دی، پیٹ پر خراش نما معمولی سا چیرا لگایا اور ان کے ہوش میں آنے سے قبل آپریشن روم میں ایک گھوڑا لے آئے۔ اسے ایک رسمی طریقہ کار بھی نہیں کہہ سکتے۔ بہر حال، میں نے انہیں سمجھایا کہ ہم نے ان کے پیٹ کا آپریشن کر کے اس گھوڑے کو باہر نکال دیا ہے اور اب وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے ہیں۔ تب مسٹر ڈکسن نے ایک نگاہ کمرے میں موجود گھوڑے پر ڈالی... اور بس مر گئے۔''

''یہ قتل ہے۔'' میلون نے کہا۔ ''تمہیں ان کی دل کی کیفیت کے بارے میں معلوم تھا۔ تم جانتے تھے کہ ہلکا سا شاک انہیں ہلاک کر دے گا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو تمہارے اور مسز ڈکسن کے درمیان مستقبل کی کوئی منصوبہ بندی بھی ہے۔''

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے ثابت کرو۔'' مسز ڈکسن نے غصے سے کہا۔

''میں ثابت کر سکتا ہوں۔'' میلون نے جواب دیا۔ ''مسٹر ڈکسن نے مجھے ایک خط کے ذریعے اس بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس بیماری اور اس طے شدہ آپریشن کے بارے میں لیکن اس چال کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے جو تمہارے ذہن میں تھی اور وہی چال ان کے قتل کا باعث بنی۔''

☆☆☆

بعد میں جب وہ دونوں جوڈی انجلز سٹی ہال بار میں بیٹھے ہوئے تھے تو کیپٹن فلیگ نے حسب عادت غراتے ہوئے کہا۔ ''میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ وہ کہانی تم نے خود ہی گھڑی تھی۔''

''بے شک۔'' میلون نے ویٹر کو مزید دو جام لانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کہانی نے ڈاکٹر شیفرڈ کو ہراساں کر دیا تھا جو کہ مضبوط کردار کا حامل نہیں ہے۔ اس کی قوت مدافعت جواب دے گئی اور اس نے تمہارے روبرو سب کچھ سچ اگل دیا اور اس نے اعتراف جرم پر دستخط بھی کر دیے۔''

''اگر اس نے اپنا خیال بدل دیا تو پھر؟'' کیپٹن فلیگ نے قدرے برہم لہجے میں کہا۔ ''کسی جیوری کو اس کہانی پر یقین دلانا عذاب ہو جائے گا۔'' اس نے مشروب کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور تیوریاں چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سب سچ سچ بتا دو، میلون۔''

''میں نے سچ ہی بتایا ہے کیپٹن۔'' میلون نے جواب دیا۔ ''مسٹر ڈکسن کا حقیقتاً یہی خیال تھا کہ انہوں نے ایک گھوڑا نگل لیا ہے۔ یہ خیال بری طرح ان کے ذہن پر مسلط تھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ اس آپریشن کے ذریعے وہ پھر سے پہلے جیسے ہو جائیں گے۔''

''لیکن پھر گھوڑے کو دیکھتے ہی وہ اسی لمحے پٹ سے مر کیوں گئے؟'' کیپٹن فلیگ نے جاننا چاہا۔

''اس لیے کہ آپریشن روم میں جو گھوڑا موجود تھا، وہ سفید رنگ کا تھا۔'' میلون نے پرسکون لہجے میں بتایا۔ ''جبکہ مسٹر ڈکسن کے ذہن پر مسلط خیال کے مطابق انہوں نے جو گھوڑا نگلا تھا، اس کا رنگ کالا تھا...''

گدھے کی زبان

ایک دفعہ ملا دو پیازے کے پڑوسی نے ان سے گدھا ادھار مانگا۔ وہ اپنا گدھا دینا نہیں چاہتے تھے۔ سو انہوں نے در پر آئے ہوئے پڑوسی سے کہا۔ اس وقت گدھا تو نہیں ہے۔ اسی لمحے گدھے نے ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے گھر کے اندر اپنی موجودگی کا اعلان کیا۔

پڑوسی نے کہا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے گدھا نہیں دینا تھا تو ویسے کہہ دیتے... جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟''

ملا دو پیازے نے برملا کہا۔ ''افسوس مجھے بھی ہے کہ آپ نے میری بات کا اعتبار نہیں کیا... گدھے کی بات کا اعتبار کر لیا۔''

یوگا

ایک عادی شرابی کی بیوی کو کسی نے مشورہ دیا کہ اپنے شوہر کو یوگا کی مشق کی طرف راغب کرو۔ اس طرح شراب چھوڑنے میں آسانی ہوگی۔

دس ماہ کی طویل اور صبر آزما مشقت کے بعد وہ شخص یوگا میں ماہر ہو گیا۔ اس مشورہ دینے والے نے عادی شرابی کی بیوی سے پوچھا۔

''یوگا کا کوئی فائدہ ہوا؟''

''جی ہاں۔'' بیوی نے جل کر کہا۔ ''اب وہ سر کے بل کھڑے ہو کر بھی شراب پی سکتے ہیں۔''

کولڈ ڈرنک

ایک ضعیف آدمی جنگل سے گزر رہا تھا۔ اچانک ایک شیر سامنے آ گیا۔ ضعیف آدمی تھر تھر کانپنے لگا۔ شیر نے کہا۔

''میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

ضعیف آدمی نے کہا۔ ''میرا خون تو ٹھنڈا ہے۔ میرے پیچھے ایک نوجوان آ رہا ہے اس کا خون گرم ہے۔ تم اس کا خون پی لینا۔''

شیر نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''آج میرا کولڈ ڈرنک پینے کو جی چاہ رہا ہے۔''

(انتخاب، ریاض بٹ، حسن ابدال)

جواری

احمد اقبال

چوتھی قسط

زندگی کی بساط پر اندھا جوا کھیلنے والے کھلاڑی کی ہوش ربا داستان

شیکسپیئر کا کہا ہوا ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ زندگی ایک اسٹیج ہے جس پر ہم سب اداکار ہیں جو اپنا اپنا کھیل دکھا کے چلے جاتے ہیں... یہی اداکار زندگی کے آغاز سے انجام تک ایک جوا کھیلتا ہے... جس میں خطرات اور حادثات کی بازی پہلی سانس کے ساتھ لگتی ہے اور آخری سانس تک جاری رہتی ہے... تخلیق کے نقائص ہوں یا بیماریاں... وہ زندگی کے ہر نومولود کو شکست سے دوچار کرنا چاہتے ہیں مگر زندگی مقابلہ کرتی ہے اور یہ کھیل انسانی تدبیر اور نوشتۂ تقدیر کے ساتھ زندگی کے تمام اہم اور غیر اہم فیصلوں میں جاری رہتا ہے... خوشی... غم... نفع... نقصان... دوستی... دشمنی... محبت اور نفرت... سب ہار جیت کے وہ روپ ہیں جن سے ہر انسان ایک جواری بن کے سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے... جواری... انسانی جذبوں کے ردعمل سے جنم لینے والی وہ کہانی ہے جو نگر نگر گلی گلی اور گھر گھر نئی بھی لگتی ہے اور پرانی بھی... آپ بیتی بھی اور جگ بیتی بھی... تجسس اور حیرانی کے سارے رنگ دکھلاتی جادو اثر تحریر...

پہلی قسط کے واقعات

ایم اے پاس خاور سکھر جیل میں سزائے موت کا منتظر تھا۔ اس پر قتل کا جھوٹا الزام ایک گینگ لیڈر نادر شاہ کے ایما پر عائد کیا گیا تھا۔ وہیں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار گاما رستم بھی پھانسی کا منتظر تھا...... اس کے ساتھی جیل پر حملہ کر کے اسے چھڑا لے جاتے ہیں۔ گاما، خاور کو ساتھ لے جاتا ہے۔ خاور ایک پرانی غیر آباد حویلی میں پناہ لیتا ہے۔ خاور کو اس حویلی کے کھنڈر میں نورین ملی جو لباسِ عروسی میں تھی اور اپنے شوہر کو قتل کر کے آئی تھی۔ اس کی پرورش کرنے والے چچا نے نورین کی تمام جائداد اور دولت پر قبضہ کر لیا تھا اور زبردستی اس کو اپنے پاگل بیٹے سے بیاہ دیا تھا۔ پاگل چچازاد کی دست درازی سے بچنے کے لیے نورین نے اسے قتل کر دیا اور کھڑکی کے راستے آسیب زدہ مشہور حویلی میں آگئی۔ کسی نے اسے دیکھا تو بدروح سمجھ کے بھاگ گیا...... نورین یہاں سلمان خان نامی ایک شخص سے چھپ کر ملتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وعدے کے مطابق وہ یہاں موجود ہوگا لیکن وہ نہیں آیا تھا۔ نورین پریشان تھی کہ صبح پولیس اسے قتل کے الزام میں گرفتار کرلے گی۔ وہیں اس کی ملاقات خاور سے ہوئی۔ اس کھنڈر کی دوسری منزل پر خاور کو سلمان کی لاش نظر آئی۔ وہ اپنا وعدہ نبھانے پہنچا تھا لیکن قتل ہو گیا تھا۔ تلاشی پر خاور کو اس کی جیب سے دس لاکھ نقد ملے۔ خاور نے اپنے کپڑے اسے پہنائے اور خود اس کے کپڑے پہن کے رقم جیب میں ڈال لی۔ سلمان کے پاس ایک ریوالور بھی تھا جو خاور نے چھپا کے رکھ لیا۔ اس نے نورین سے یہ بات چھپائی، اپنا حلیہ بدلا اور نورین کو برقع میں چھپا کر لے گیا۔ وہ اکیلا نورین کے گھر گیا تو اسے علم ہوا کہ نورین پر شوہر کے قتل کا الزام ہے جبکہ نورین نے نکاح نہ ہونے کے باعث اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔ خاور نے نورین سے جھوٹ بولا کہ سلمان جو پہلے سے بے روزگار تھا نوکری مل جانے پر دبئی چلا گیا تھا۔ باہر جانے میں خطرہ تھا کیونکہ فریدالدین (خاور) کے جیل سے فرار کی اطلاع کے بعد نادر شاہ نے اپنے کارندے اسے تلاش کرنے پر لگا دیے تھے جو کتوں کی طرح ہر جگہ اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ دوسرا خطرہ پولیس سے تھا جن کو خاور کے علاوہ نورین کی بھی تلاش تھی۔ خاور، نورین کو لے کر نکلا اور ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا۔ تاہم وہاں غیر محفوظ ہوتے اور نورین کی اچانک طبیعت خراب ہونے پر وہ ایک اسپتال میں آگئے۔ نورین کو ایڈمٹ کرلیا گیا۔ اچانک وہاں پولیس آگئی۔ خاور اس صورتِ حال پر پریشان ہو گیا۔ پولیس کمرے سے آتی آوازوں کو سن کر آئی تھی تاہم انہیں کسی طرح کا شک نہیں ہوا اور وہ واپس چلے گئے۔ خاور اور نورین ہوٹل سے نکلے۔ ہر بڑے ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ اور ائرپورٹ پر وہ پکڑے جا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے پنجاب کا رخ کیا اور کئی مقامات پر ٹرین بدلتے رہے۔ اس کے باوجود نادر شاہ کے بندوں نے جو ویٹر کی وردی میں تھے، خاور کو پہچان لیا۔ ایک کو خاور نے چلتی ٹرین سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ دوسرے نے نورین اور خاور کو حفاظت اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس نے ایک تصویر دکھائی جو نورین کی لگتی تھی مگر وہ نازی کی بہن تھی۔ اسے کسی وڈیرے کے بیٹے نے اغوا کر کے اپنے پاس رکھا تھا اور آبروریزی کے بعد قتل کر دیا تھا۔ جذباتی نورین اسے اپنا بھائی تسلیم کر چکی تھی۔ خاور بھی اسے معاف کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ قتل، بلیک میلنگ اور غلط فہمی کا نتیجہ تھا، اس کا اصل دشمن نادر شاہ تھا۔ خانیور کے ویٹنگ روم میں رات گزار کے وہ دونوں ایک پرائیویٹ کیری ڈبے سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ نازی نے انہیں رات بھر کے لیے کسی اجنبی قصبے کے باہر ایک کچے خالی گھر میں رکھا اور انہیں تسلی دی کہ صبح وہ لاہور کے مضافات میں پہنچ جائیں گے۔ لیکن صبح جاگنے پر نورین اور خاور نے دروازے کو باہر سے مقفل پایا۔ خاور اور نورین بے یقینی کے ساتھ نیم روشن کمرے میں بیٹھ کر نازی کا انتظار کرنے لگے۔

اب آپ آگے پڑھیے

خوف اور گھبراہٹ سے نورین کا رنگ اڑ گیا تھا۔

”خاور! یہ دروازہ آخر کیوں بند ہے؟“

میں نے سر کھجا کے کہا۔ ”بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس سوال کا جواب تلاش کر لیا ہے۔ دروازہ مقفل ہے۔ وہ بھی باہر سے۔“

نورین کھسیانی خفگی سے بولی۔ ”تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ سوچو ہم باہر کیسے نکلیں گے؟“

میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ”یہ بھی سوچ لیا ہے۔ ایک طریقہ تو بہت آسان ہے۔ دروازہ کھل جائے... دوسرا کچھ مشکل ہے... ہم قدرت کے کسی کرشمے سے چیونٹی بن جائیں تو نیچے کافی جگہ ہے... اندر باہر نکل کے پھریں ایسے ہی۔“

یہ نورین کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو گیا۔ اس نے مجھے مجروح نظروں سے دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگی۔ ”بے وقوف سمجھتے ہو نا مجھے تم؟ عذاب بن گئی ہوں تمہارے لیے... بس یہاں سے نکل کے میں تمہاری جان چھوڑ دوں گی۔ مر جاؤں گی کسی دریا میں ڈوب کے... کسی ٹرین کی پٹری پر لیٹ جاؤں گی۔“

میں ہار کھا گیا۔ ایسے شدید جذباتی ردِعمل کی مجھے ذرا بھی توقع نہ تھی۔ ایک دم میں نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا مگر آگ اور بھڑک اٹھی۔ اس نے چلاتے ہوئے ایک وحشیانہ قوت کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مجھے دھکیل دیا۔ ”چھوڑ دو مجھے... مت کرو یہ ڈراما کہ تمہیں میرا بہت خیال ہے... بڑی فکر ہے میری۔“ وہ چلائی۔

میں نے اپنی گرفت برقرار رکھی اور چہرے کو اس کے لمبے لمبے ناخنوں کی خراشوں سے بھی محفوظ رکھا۔ ”نورین! نہ رو پلیز... آئی ایم سوری... غلطی ہوئی مجھ سے... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی نروس ہو، میں تو چاہتا تھا کہ تمہیں ایزی کردوں۔“

اس کی مزاحمت میں کچھ کمی آئی۔ ”میں تنگ آگئی ہوں اس محتاجی سے... میرے جیسی لڑکی کو زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے جس کے چہرے پر صرف رسوائی کی کالک ہے... جس پر قتل کا الزام ہے... جس کا دنیا میں کوئی نہیں۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اس کے سر کو اپنے شانے پر رکھ لیا۔ ”میں ہوں نا نورین۔“

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”سب میری تسلی کے لیے کہتے ہو... جھوٹ سے بہلاتے ہو مجھے۔“

صورتِ حال میرے قابو میں آرہی تھی۔ ”میرا اعتبار کرو نورین... تمہاری قسم میں جو کرتا ہوں، دل سے کرتا ہوں۔ کرنا چاہتا ہوں... ایسا نہ ہوتا تو میں یہاں ہوتا تمہارے ساتھ؟ کب کا چلا گیا ہوتا میں۔ کون تھا مجھے روکنے والا... لیکن میں جا نہیں سکا۔ تم نے مجھے روک لیا۔ زبان سے ایسا کہے بغیر... اب تو جہاں تقدیر لے جائے... میرا، تمہارا ساتھ ٹوٹنے والا نہیں ہے۔“

اس نے آنسوؤں سے بھیگی پلکیں اٹھا کے مجھے دیکھا۔ ”سچ کہتے ہو... تم مجھے چھوڑ و گے نہیں؟“

”کیا میری آنکھوں میں تمہیں جھوٹ نظر آتا ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہا۔ ”یہ کون کہتا ہے کہ تمہارے چہرے پر کالک ہے؟ یہ کالک ہے تو پھر چاند کے چہرے پر بھی کالک ہی ہوگی۔ سورج کی دھوپ میں بھی کالک ہوگی۔ میرے لیے تم اتنی ہی معصوم ہو جتنی تمہاری یہ آنکھیں... تمہاری آنکھوں میں یہ شبنم کے موتی۔“

میں شاعر کہاں تھا۔ ہاں، میرے مزاج میں شاعری تھی اور ضرورت نے مجھے وہ اظہار کا پیرایہ عطا کر دیا جو اس کی آتشِ غضب کو سرد کرنے کے لیے ضروری تھا۔ الفاظ کا جادو کام کر گیا۔ اس کے چہرے پر حیا کی لالی غالب آگئی جو پہلے غصے سے سرخ تھا... لال رنگ بھی اپنے الگ الگ روپ رکھتا ہے۔ شفق کی سرخی کہاں... جنگل کی آگ کی سرخی کہاں... خوف کے زرد رنگ اور بسنتی جوڑے کے رنگ کا کیا مقابلہ... آہستہ آہستہ اس کے لب ایک شرمیلی مسکراہٹ سے وا ہوئے۔ ”تم... بڑے وہ ہو۔“

میں سمجھ گیا کہ میں کیا ہوں۔ یعنی اس کے لیے کیا ہوں۔ اب دنیا کچھ بھی سمجھے، مجھے پروا نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے اندر سے پھوٹتی خوشی کے ساتھ مانا کہ میں بڑا وہ ہوں۔ میری جگہ کوئی بھی مرد ہوتا کیسے کہہ سکتا تھا کہ نہیں، میں وہ نہیں ہوں۔ وہ تو اقرار کا لمحہ تھا۔ وہ اس کے لیے بھی آیا اور میرے لیے بھی... اور ہمارے جذبوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر کے گزر گیا۔

اب میں وہ جواب عرض کرتا ہوں جو آپ کو پسند آئے گا۔ میں نے آستینیں چڑھا کے کہا۔ ”یہ دروازہ کیا چیز ہے... میں تمہیں ان دیواروں سے گزار کے لے جا سکتا ہوں۔ ایسے کہ تمہیں خراش بھی نہ آئے۔ میرے سر کا ناریل بے شک ٹوٹ جائے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”نارزن... باہر کوئی آیا ہے شاید۔“

میں نے کہا۔ ”وہی نازی ہوگا۔ تم خوامخواہ ہول رہی تھیں... وہ گیا ہوگا ناشتا لینے... دیر ہو گئی۔“

اسی وقت باہر لگے تالے میں چابی گھمائی گئی۔ دروازہ کھلا اور میں نے اپنے مقابل دو افراد کو دیکھا جن کے چہرے نقاب یا ڈھاٹے میں نظر نہیں آتے تھے۔ ان دونوں نے ملیشیا کے کرتے شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہنے ہوئے تھے۔ دونوں میں سے ایک کا قد کم تھا مگر گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ دوسرا قد میں میرا ہمسر لیکن نسبتاً ہلکے بدن کا تھا۔ اس کی اصل طاقت سیاہ رنگ کے بدوضع دیسی ریوالور میں تھی جس کا توپ کے دہانے جیسا منہ میری طرف تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک جیسی سفاکی تھی۔

نورین نے بلا ارادہ چیخ ماری اور میرے پیچھے آکے میرے بازو سے چمٹ گئی۔ خود میں ایک غیر ارادی عمل کے طور پر کھڑا ہو گیا تھا۔

یہ پوچھنا غیر ضروری یا لاحاصل تھا کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو... مگر میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ خوش آمدید... مزاج بخیر۔

باکسر جو خالی ہاتھ تھا میرے سوال پر ہنس پڑا۔ ”فرض کر لے کہ میں فریدالدین ہوں۔“

ریوالور والے نے فلمی انداز میں اسلحہ لہرایا۔ ”چل پیچھے دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھ جا... تو بھی بلبلِ جاں۔“

شک و شبہے کی بات کوئی نہیں رہی تھی۔ یہ نادر شاہ کی پولیس تھی جسے یہاں نازی کی نشاندہی پر بھیجا گیا تھا۔ وہ چالاک آدمی میری توقع سے کہیں بہتر ایکٹر ثابت ہوا تھا۔ اس نے جو کیا، کامل اعتماد اور سکون کے ساتھ کیا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ ہمارے ساتھ رہا۔ ہماری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اپنی مجبوری کی ایک دکھ بھری کہانی سنائی اور ہماری آنکھوں پر بھروسے کی ایسی پٹی باندھی کہ ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس جگہ تک آگئے جو چوہے دان تھا۔ ہم چوہوں کی طرح پکڑ لیے گئے تھے۔

دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کے میں نے ٹانگیں سامنے پھیلا دیں اور نورین سے کہا۔ ”ایک بھائی نے اپنی بہن کی رخصتی کا کتنا شاندار انتظام کیا ہے مس نورین!“

اس نے مجروح نظر سے مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اس کی نظروں کا سوال بہت واضح تھا کہ دھوکا صرف میں نے کھایا۔ تم ایسے عقل مند تھے تو میری نہ سنتے، اسے گولی مار دیتے۔

''آلو نے سلام بھیجا ہے تمہیں۔'' گن مین بولا۔ ''آلو یاد ہے نا علاؤالدین۔''

میں نے خوش دلی سے جواب دینا ضروری سمجھا تاکہ ان پر میرا خوف ظاہر نہ ہو۔ ''وعلیکم السلام... خیر سے تم بھی وہیں سے آئے ہو گے... جہنم سے۔''

''وہ کہاں ہے، تم اس سے ملو گے تو معلوم ہو جائے گا۔'' دوسرے نے جیب سے سگریٹ نکال کے جلائی۔

میں نے کہا۔ ''پھر انتظار کیسا ہے، چلو۔''

''بس تمہاری میت گاڑی آجائے۔'' باکسر بولا۔ ''وہ پیچھے آرہی ہے۔''

میں نادر شاہ کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس کے غیر جذباتی طریقۂ کار سے بھی واقف تھا۔ اس نے واضح ہدایات دی ہوں گی کہ چودھری فرید کو زندہ سلامت لاتا ہے لیکن کوئی رسک بھی نہیں لینا ہے۔ وہ خود مرنے پر کمربستہ ہو تو مار کے وہیں چھوڑ آنا۔ چنانچہ میں فلمی ہیرو ٹائپ کسی ایکشن کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہا تھا۔ پہلی فکر تھی مجھے نورین کی۔ نادر شاہ اس کے نام سے بھی ناآشنا تھا اور اگر میرے سالے کا کردار کامیابی سے نبھانے والے نازی نے اسے نورین کے بارے میں بریفنگ دے دی تھی، تب بھی میرے اور نادر شاہ کے معاملات کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ففٹی ففٹی چانس یہ تھا کہ وہ نورین کو اجازت دے کہ چودھری فریدالدین کی، جسے تم خاور کہتی ہو... فکر چھوڑ دو... اسے تو سمجھو کہ مرحوم و مغفور ہوا... محبت کا کیا ہے، بعد میں کسی اور سے کر لینا... شکر کرو کہ اس سے نکاح نہیں کیا ابھی تک ورنہ بیوہ بن کے چار ماہ دس دن عدت کے گزارنے پڑتے۔ چاہو گی تو یہ بھی بتا دیں گے کہ تمہارا مرحوم محبوب کہاں مدفون ہے ورنہ گھر بیٹھ کے بھی مغفرت کی دعا تو مانگی جا سکتی ہے۔

اپنے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس نے قانونی طور پر مجھے قتل کرانے کے لیے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کا پکا انتظام کر لیا تھا۔ اس کے لیے آسان تو یہی ہو گا کہ وہ مجھے واپس قانون کے رکھوالوں کی تحویل میں دے دے لیکن ہو سکتا ہے وہ اس مرتبہ کوئی چانس نہ لے۔ اس نے تو سوچا بھی نہ ہو گا کہ جو کبھی نہیں ہوا تھا، وہ ہو جائے گا۔ ڈاکو اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے لیے جیل پر حملہ کریں گے اور اس ہڑبونگ میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ فرید بھی نکل جائے گا۔ گیہوں کے ساتھ گھن پسے جانے کا محاورہ الٹا ہو جائے گا۔ اس بار وہ بقلم خود مجھے جہنم رسید کرے۔ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے میں نے اس کے اور عدالت کے سامنے پہلے بھی بہت شور کیا تھا مگر میری کس نے سنی تھی اور کس نے مانی تھی۔

مجھے تھوڑی سی مہلت ملی تھی۔ بقول باکسر... میری میت گاڑی آنے تک... ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ یہ نادر شاہ کے غلام میری توقع کے خلاف تھوڑے سے احمق ثابت ہو رہے تھے۔ وہ ہر قسم کے جرائم کا تجربہ رکھتے تھے لیکن زندہ گرفتار کرنے کے بنیادی اصولوں سے بھی ناواقف تھے ورنہ مجھے توپ کے دہانے پر رکھ کے مطمئن نہ ہو جاتے۔ سب سے پہلے وہ میری تلاشی لیتے اور اسلحہ برآمد کر لیتے۔ ان کے اپنے ہاتھ میں بڑا ظالم ریوالور تھا اور انہیں اپنے نشانے پر بھی اعتماد تھا چنانچہ ان کے دماغ میں یہ خیال نہیں آیا کہ اسلحہ میرے پاس بھی ہو سکتا ہے اور یہ ان کے لیے بہت بڑا رسک ہے کہ انہوں نے مجھے نہتا نہیں کیا۔ خدا سے میں نے ایک دعا کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا جو درحقیقت ٹو ان ون تھی۔ قبولیت کی گھڑی کا کسے پتا ہوتا ہے۔ میں نے دعا کی کہ دشمن میری تلاشی نہ لیں۔ اس طرح ایک تو میرے پاس وہ اسلحہ محفوظ رہے گا جو تھا تو ناجائز لیکن وقتِ ضرورت میری جان بچا سکتا تھا۔ اس دعا کے قبول ہونے کی صورت میں وہ تمام رقم بھی محفوظ رہتی جس کا علم میرے سوا صرف اللہ کو تھا... یا مرحوم سلمان خان کی روح کو جو اسے مجھ سے واپس نہیں مانگ سکتی تھی۔ نورین تک بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ میں ایک لکھ پتی ہوں۔ مال میرا نہ سہی... دنیا میں زیادہ تر لوگ تو لوٹ مار اور دوسروں کے مال سے ہی دولت مند بنتے ہیں۔

میرے خیالات کی روانی میں نورین نے خلل ڈالا۔ ''خاور! مجھے سخت بھوک لگی ہے۔'' اس نے مجھے ٹہوکا دے کر کان میں کہا۔

پہلے تو مجھے غصہ آیا۔ اب کیا میں چھوٹی انگلی کھڑی کر کے بہانے سے جاؤں اور خاتون کے لیے حلوا پوری لے کر واپس بھی آجاؤں؟ پھر مجھے خیال آیا کہ آخر وہ اپنا مسئلہ کس کو بتا سکتی ہے اور پھر یہ تو کسی حد تک میرا مسئلہ بھی ہے۔ نیند کے بارے میں سنا تھا کہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ یہ نیا تجربہ تھا کہ بھوک اس وقت بھی لگ جاتی ہے جب موت سامنے نظر آرہی ہو۔ ان دو متوقع قاتلوں سے چھٹکارا پانے کا کوئی فوری پلان

بھی میرے ذہن میں نہ تھا چنانچہ میں نے پُرسکون رہ کے نورین کو بھی پُرسکون رکھنا بہتر سمجھا۔

باکسر نے خود مجھ سے سوال کر دیا۔ ''کیا کہہ رہی ہے تیری ہمشیرہ؟''

میں نے رشتے کو نظر انداز کر دیا۔ ''ہم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ یہ نہ ہو تمہاری میت گاڑی...''

''تمہاری میت گاڑی...'' گن مین نے خفگی سے کہا۔

''اچھا بھائی ہماری میت گاڑی... اس کے آنے سے پہلے ہی ہم فوت نہ ہو جائیں۔ یہ گن مین ہماری حفاظت کے لیے کافی ہے۔ تم ذرا باہر سے کچھ لاؤ ناشتے کے لیے۔ حلوا پوری اچھی ملتی ہے۔ اللہ تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔''

''پیسے میں دوں گی بھائی۔'' نورین نے بڑی مسکینی سے کہا اور اپنا بیگ اٹھا لیا کیونکہ باکسر کے چہرے پر کچھ رضامندی کے آثار نظر آئے تھے۔

''خبردار... بیگ ادھر دے مجھے۔'' باکسر چوکنا ہو گیا۔ ''ریوالور نکالنا چاہتی ہے اس میں سے۔''

نورین نے بیگ اس کی طرف پھینک دیا۔ ''دیکھ لو کیا ہے اس میں۔ زیور ہے میرا اور پیسے ہیں۔''

میرا خیال تھا کہ نورین نے بہترین زنانہ حماقت کا مظاہرہ کیا ہے۔ باکسر جیسا پیشہ ور مجرم کیا شرافت سے صرف پچاس کا نوٹ لے کر جائے گا اور بیگ نورین کو واپس کر دے گا؟ میرا اندازہ تھا کہ وہ زیورات بھی لاکھوں کے ضرور ہوں گے۔ مگر باکسر نے بیگ میں جھانکنے کے بعد تمام چیزوں کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور سچ مچ پچاس روپے نکال کے بیگ واپس نورین کی طرف پھینک دیا تو مجھے بڑی خفت ہوئی۔ اچھا ہوا کہ میں نے اپنی رائے کا اظہار نورین پر نہیں کیا تھا۔

''دراصل خود ہم رات بھر چلتے رہے... رکے بغیر... ہم نے بھی کچھ نہیں کھایا۔'' باکسر بولا۔ ''میں کچھ لاتا ہوں باہر سے مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ جو گن لیے بیٹھا ہے، یہ سکھوں کی طرح کام کر کے سوچتا ہے۔ ذرا شک ہوا تو گولی پہلے مارے گا، سوال بعد میں کرے گا۔''

باکسر کے جانے کے بعد گن مین نے ناراضی ظاہر کی۔ ''سالا خود سکھ کی اولاد... دوسری گاڑی اس کی بے وقوفی سے خراب ہوئی۔ تیل پانی دیکھا نہیں، لے کے چل پڑا۔''

میں نے بڑی فکرمندی ظاہر کی۔ ''اس کا تو بیٹھ گیا ہو گا انجن؟''

اس کا اعتراف باکسر نے اس وقت کیا جب ہم ڈٹ کے حلوا پوری کھانے کے بعد لسی بھی نوش فرما چکے تھے۔ انہوں نے اجازت نہیں دی تھی کہ نورین کچن میں جا کے چائے بنا لے۔ ''بس اب چلنے کی کرو۔''

میں نے مایوسی سے کہا۔ ''ہم تو میت گاڑی میں آرام سے جانے کی سوچ رہے تھے۔''

''میں نے پتا کیا ہے۔ اس کے انجن کا کام ہے۔ ہم ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔''

''اور ہمارا سامان؟ دو سوٹ کیس...'' نورین نے کہا۔

''بھاڑ میں گیا تمہارا سامان؟'' گن مین نے خفگی سے کہا۔

''وہ بھی رکھ لیں گے ڈکی میں۔'' باکسر نے نورین کو تسلی دی۔ وہ اس میں غیر ضروری دلچسپی لیتا محسوس ہوتا تھا اور اپنے اس خیال کو میں محض وہم قرار دینے سے قاصر تھا کیونکہ جب سے وہ آیا تھا، اس کی نظر نورین کے چہرے پر جیسے چپک کے رہ گئی تھی۔ برا مجھے یوں بھی لگ رہا تھا کہ بس اپنے سوا کسی اور کا نورین پر فریفتہ ہونا برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ باکسر کی جگہ میں ہوتا تو اسے کیسے نہ دیکھتا۔ اسے میں روکتا تو نری احمقانہ حرکت ہوتی۔ وہ پوچھتا کہ بھائی تم کون؟ کیا یہ تمہاری گھر والی ہے اور اس کو دیکھنے پر بھی تم نے پابندی لگا رکھی ہے تو اسے برقع میں ڈال کے کسی کمرے میں بند رکھو۔ زمانہ تو اپنی آنکھیں بند کرنے سے رہا۔

ابھی وہ وقت میری نگاہ کی حد سے بھی دور تھا جب میں پوری نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ نورین کے سامنے سر جھکا کے اعتراف کروں کہ تمہارے عشق کے بحرالکاہل میں غرق ہو کے میں مجنوں ہو گیا ہوں اور تم نے ہاتھ نہ بڑھایا تو میں ڈوب کے پھر یوم حشر سے پہلے نہ نکلوں گا اور ایسا میں پورا یقین آجانے کے بعد ہی کہوں گا کہ وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر مجھے زندگی کے سفر میں شریک کر لے گی۔ ابھی تو میں نے خود اپنے آپ سے جرمِ عشق کا اعتراف کیا تھا۔ میرے رقابت اور حسد کے جذبات بے سبب نہ تھے۔

باکسر کی آواز نے مجھے پھر سنگین حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا۔ اس نے کمال مہربانی سے ہمارے دو سوٹ کیس باہر کھڑی گاڑی کی ڈکی میں رکھ دیے تھے اور شاید ایک بار پہلے روانگی کا سگنل دے چکا تھا۔ ''اوئے کیا بت بنا کھڑا ہے... ابھی سے پتلون گیلی ہو رہی ہے؟ ہمت نہیں تھی تو پنگا کیوں لیا تھا نادر شاہ سے؟ اس وقت تو بڑی اکڑفوں تھی۔''

دوسرے نے زیادہ فحش زبان استعمال کی۔ ''جیل

سے نکل کے سمجھا ہو گا کہ دنیا فتح کر لی۔ لڑکی بغل میں دبا کے عیاشی کرنے نکل کھڑا ہوا۔"

نورین کا چہرہ شرم اور احساسِ ذلت سے لال ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے دماغ کا فیوز بھی اڑ گیا تھا لیکن اللہ نے مجھے ضبط کی توفیق دی ورنہ شاید میں غصے میں اندھا ہو کے ایک دم جیب سے ریوالور نکالتا اور ان دونوں کتوں کو شوٹ کرنے کی کوشش میں خود مارا جاتا۔ وہ مجھے ریوالور نکالنے کی مہلت کہاں دیتے، جن کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور انہیں صرف ٹریگر پر ایک انگلی کا دباؤ بڑھانا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر نورین سے کہا۔ "حوصلہ رکھو... بھونکنا کتے کی فطرت ہے۔ اسے کاٹنے کا موقع مت دو۔"

نورین نے سر ہلایا اور میرے ساتھ باہر آ گئی۔ اب دوپہر ہونے والی تھی۔ وہ تمام امیدیں اور خوش فہمیاں جو بازی سے وابستہ تھیں، ایسے محو ہو چکی تھیں جیسے سورج سر پر ہو تو صبح کی شبنم کا تصور... پہلے ایک موہوم سا خیال تھا کہ شاید ہمیں سوتا پا کے وہ دروازہ باہر سے بند کر گیا ہو اور ناشتا لے کر آئے تو ہم سے معذرت کر لے۔ ہم جس عذاب سے گزر رہے تھے، یہ اس پر اعتماد کی بھول کا خمیازہ تھا۔ آدمی کی مت کیسے ماری جاتی ہے جب وہ زندگی کے سارے تجربات کو بھلا کے کسی جانی دشمن کو دوست سمجھ لیتا ہے۔

باہر کا دروازہ کھلا تھا اور میں دیکھ سکتا تھا کہ دروازے کے عین سامنے ایک پرانی ڈبل کیبن ہائی لکس گاڑی کھڑی تھی جو کسی کار کے مقابلے میں زمینی جہاز جیسی طاقتور اور طوفانی چیز تھی۔ اونٹ یقیناً شرمسار ہو گا کہ پہلے یہ خطاب اس کے پاس تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اور نورین کے سوٹ کیس بڑی بیدردی سے پیچھے والے کھلے حصے میں پھینک دیے گئے ہیں۔ یہ بات عجیب تھی کہ جو بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، اس نے اچانک میرے ذہن پر یوں قبضہ کر لیا تھا جیسے یہ فیصلہ میں نے بہت غور و خوض کے بعد کیا ہو۔ اچانک جیسے اگلے چند سیکنڈ کے امکانات مجھ پر روشن ہو گئے تھے تو کوئی غیب کا علم نہیں تھا۔ ایسا ہی اندازہ تھا، کوئی پتھر پھینک کے کرتا ہے کہ وہ کب اور کہاں گرے گا... یا گاڑی کو گیئر میں ڈال کے کرتا ہے کہ اگلے چند سیکنڈ میں وہ کہاں ہو گی۔

مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ نورین کو آگے ڈرائیور کے ساتھ جگہ ملے گی اور میں پیچھے والے کیبن میں اس شخص کے ساتھ بیٹھوں گا جس کو میں نے گن مین کا نام دے رکھا تھا۔ باکسر اب ڈرائیور کے فرائض سرانجام دے گا۔ نورین سے اسے کیا خطرہ... ایک تو وہ نازک سی کمزور عورت... ڈرائیونگ کرنے والے نے ابھی تک اپنا اسلحہ نہیں نکالا تھا تو اس لیے کہ ضرورت نہیں پڑی تھی مگر یہ فرض کرنا بے وقوفی ہوتی کہ وہ مسلح نہیں۔ نورین کے حسن پر فریفتہ نظر آنے کے باوجود وہ اسے خطرہ بننے کی صورت میں قتل بھی کر سکتا تھا۔ ایسے لوگ دل نہیں رکھتے جس میں صنفِ نازک کے لیے لطیف جذبات کا گزر ہو۔ صرف حیوانی ہوس رکھنے والے مرد ہوتے ہیں۔

ایک خیال اس سے زیادہ پریشان کرنے والا یہ تھا کہ میرے ساتھ پیچھے بیٹھنے والے کو میری تلاشی لینے کا خیال آ گیا تو میں کیا کروں گا؟ یہ ان کی بہت بڑی بھول تھی کہ انہیں ابھی تک اس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اب اس نے مجھے غیر مسلح کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں ایسی فرماں برداری کا مظاہرہ نہیں کروں گا جیسے اب تک کرتا رہا تھا۔ میں نے طے کیا کہ خاموشی سے زندگی اس کے حوالے کر دینے سے یہ جوا کھیلنا بہتر تھا۔ اس کو دبوچنے اور آواز نکالنے کا موقع دیے بغیر اس کا ریوالور چھیننے میں پانچ سیکنڈ لگ جائیں گے مگر یہی ہار جیت فیصلہ کرنے کی مہلت ہو گی۔ اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو گویا بازی جیت لوں گا۔ اس کے بعد میرا مقابلہ صرف ایک سے رہ جائے گا۔ اسے موقع ہی کہاں ملے گا کہ اپنا اسلحہ نکالے۔ اور اگر تقدیر نے ساتھ نہ دیا تو کوئی بات نہیں... جواری ہارتے بھی ہیں۔

وہ دونوں اتنے غیر محتاط اور احمق نہیں تھے جتنا میں نے خوش فہمی میں فرض کر لیا تھا۔ پہلے کی بات اور تھی جب نورین اور میں ان کے نشانے پر ذرا دور بیٹھے تھے۔ انگریزی محاورے کے مطابق ہم SITTING DUCK تھے۔ کوئی غلط حرکت سے پہلے ان کے ریوالور کی گولی درمیانی دو فٹ کا فاصلہ طے کر کے میرے سر میں پیوست ہو جاتی۔ جب چلنے کا وقت آیا تو انہوں نے کوئی رسک نہیں لیا۔

"چل ہیرو... دیوار کی طرف منہ کر کے سیدھا کھڑا ہو جا۔ ہاتھ اوپر۔" گن مین نے مجھے حکم دیا۔

میں نے پوچھا ہی تھا "مگر کیوں؟" کہ دھماکا ہوا اور گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی دیوار میں پیوست ہو گئی۔

نورین نے ایک چیخ ماری۔ "خدا کے لیے خاور! جو کہیں مان لو... تمہیں میری قسم۔"

صورتِ حال جان لیوا اور خطرناک تھی۔ ایسے میں اکبر الٰہ آبادی کا یاد آنا میرے دماغ کا خلل تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ اکبر ڈرے نہیں کسی سلطان کی فوج سے... شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے... تو مجھے بھی نورین کی قسم نے شہید کر دیا۔ میں ہاتھ اوپر اٹھا کے گھوم گیا۔ میری ناک دیوار سے جا لگی جس پر ایک چیونٹی رینگ رہی تھی۔ وہ میری ناک پر آ گئی اور پیشانی کی طرف سفر کرنے لگی۔ خونی اور سفاک نظر آنے والے گن مین نے اپنے ساتھی کو حکم دیا۔ "اس کی جیب میں کچھ ہے تو نکال لے۔"

باکسر اپنے جثے کے باوجود گن مین کے حکم کا غلام تھا۔ اس نے نورین سے کہا۔ "تو دور ہٹ۔"

نورین مجھ سے دو فٹ دور کھسک گئی۔ "دیکھو... گولی مت چلانا... خاور تمہاری ہر بات مانے گا۔"

"یہ کیا خاور خاور لگا رکھی ہے، الو کی پٹھی... اس حرام زادے کا نام چودھری فریدالدین ہے، یقین نہیں تو جس دن اسے پھانسی ہو، جیل جا کے تصدیق کر لینا... تجھے چودھری فریدالدین کی لاش ہی ملے گی۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کہو۔" وحشت زدہ نورین چلائی۔

باکسر نے ایک گھٹنا میری کمر پر رکھا اور مجھے دیوار کے ساتھ دبا لیا۔ میں کسی ریوالور کی زد میں نہ ہوتا تو اسے یہ حماقت بہت مہنگی پڑتی۔ دو سیکنڈ میں اس کے بھاری بھرکم وجود کو میں مٹی کے برتن کی طرح اٹھا کے زمین پر دے مارتا اور اس کی کمر کے سارے مہرے الگ ہو جاتے۔ ہوش مندی کا تقاضا تھا کہ ایسے جان گنوانے میں دہرا نقصان ہو گا۔ میری جان اب صرف میری نہیں تھی، نورین بھی میری جان تھی۔ یہ وحشی جانور بعد میں اس کا وہ حشر کرتے کہ نورین اپنے عذاب کے ہر لمحے میں مجھے کوستی... ایک گہری سانس لے کر میں نے خود کو سمجھایا کہ کھیل ابھی جاری ہے۔ ایک مورچے پر پسپائی سے جنگ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

باکسر نے فاتحانہ انداز میں وہ ریوالور لہرایا جو میری جیب میں سے برآمد ہوا تھا۔ "استاد! کیا شاندار چیز ہے۔ یہ میں رکھ لوں؟"

"رکھ لے رکھ لے۔" استاد نے شاہانہ فیاضی سے کام لیا۔ "رہے گا تو پھر بھی..." اس نے جملے کا اختتام جس لفظ پر کیا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے پھر اس نے حکم دیا۔ "اپنی ہمشیرہ کو آگے اپنے ساتھ بٹھا... مگر ہوشیاری سے... نظر سامنے رکھنا اور ہاتھ اسٹیئرنگ پر۔"

"آپ فکر ہی مت کرو استاد۔" باکسر بولا اور اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں سے نورین کی نازک کلائی دبوچ لی۔

استاد نے میری طرف دیکھا۔ "ہم تیرے ساتھ ہوں گے... چل۔"

جب میں باہر آیا تو نورین آگے ڈرائیونگ کیبن کے ایک دروازے سے لگی بیٹھی تھی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا اور زیادہ پُراعتماد نظر آ رہی تھی۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے آہستہ سے مجھے آنکھ ماری۔ اس کی یہ بے ضرر سی حرکت کسی اور نے نہیں دیکھی تھی۔ خود میں سوچتا رہ گیا کہ اس اشارے کا مطلب کیا لوں؟ گن مین نے دروازہ کھولا اور مجھے سوار ہو کے آگے دوسرے دروازے کی طرف کھسکنے کا اشارہ کیا۔ اس دروازے میں اندر کی طرف کوئی ہینڈل نہیں تھا۔ میں عین نورین کے پیچھے تھا اور اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ اسی طرح آگے والے دروازے کو بھی اندر سے نہیں کھولا جا سکتا۔

گن مین کے میرے ساتھ بیٹھتے ہی گاڑی ایک دم آگے بڑھی۔ اس کا انجن پہلے سے رواں تھا۔ گن مین تھوڑا سا ترچھا ہو کے میری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے ریوالور کا رخ میری طرف رکھا تھا اور اپنی انگلی ٹریگر سے نہیں ہٹائی تھی۔ یہ خطرناک بات تھی۔ کسی جھٹکے سے بلا ارادہ بھی دباؤ بڑھ جاتا تو گولی میرا کام تمام کر دیتی۔

میں نے اس اندیشے کا اظہار کر دیا۔ "استاد! ایسے کب تک بیٹھے رہو گے؟ یہ نہ ہو میں بلاوجہ مارا جاؤں۔ جان دینی ہو گی تو پھانسی کے تختے پر دوں گا۔ تمہارے ہاتھوں مرنا مجھے بالکل قبول نہیں۔"

وہ کچھ دیر مجھے شک کی نظر سے دیکھتا رہا لیکن صاف ظاہر تھا کہ اس پوز میں وہ خود زیادہ دیر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "چالاک بننے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔ لاش ہم راستے میں پھینک دیں گے اور تیری بلبل کی..."

میرے اور نورین کے درمیان پارٹیشن تھا جس کا درمیانی حصہ شیشے کا تھا چنانچہ گن مین کے بے ہودہ الفاظ نورین نے نہیں سنے۔ وہ ریوالور گود میں رکھ کے کچھ ایزی ہو گیا لیکن ریوالور اس کے ہاتھ کی گرفت میں رہا۔ گاڑی کچے پکے راستوں سے گزرتی ایک نیم پختہ سڑک پر آ گئی۔ مجھے اس کی کوئی شناخت نہ تھی۔ یہ علاقہ میرے لیے اجنبی تھا اور ہم یہاں سے گزرے تھے تو ہمارے گرد رات کی تاریکی محیط تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا جس کا شیشہ بھی نیچے نہیں اتارا جا سکتا تھا۔ یہ پنجاب کا سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ دور دور تک شیشم کے درخت تھے اور لہلہاتے کھیت تھے جس میں مرد عورتیں اور بچے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں اور نہا رہی تھیں۔ ایک تالاب میں ڈوبی ہوئی بھینسوں کے صرف سر نظر آ رہے تھے۔ اوپر یا نیچے سے آدھے ننگے بچے بھی اسی سوئمنگ پول میں اور اس کے کنارے کھیل میں وقت گزار

رہے تھے۔ یہ تفکرات سے آزاد سادہ زندگی کے وہ مناظر تھے جو شہروں کی بھاگ دوڑ اور ٹینشن والی زندگی کے مناظر سے یکسر مختلف تھے۔

نیم پختہ سڑک ایک نسبتاً بڑی اور پختہ سڑک سے جا ملی۔ میں صرف اندازہ کرسکتا تھا کہ گزشتہ روز کے مقابلے میں یہ مخالف سمت کا سفر واپسی کے لیے ہے۔ جلد یا بدیر ہم پھر وہیں ہوں گے جہاں سے چلے تھے... دنیا کے گول ہونے کا ثبوت... اپنا انجام میرے تصور میں تھا۔ شاید پہلے مجھے نادر شاہ کے حضور پیش کیا جائے گا کہ آپ کا مجرم حاضر ہے جناب... اور مجھے زندہ پکڑ لانے پر نادر شاہ خوش ہوکے اپنے حکم کے غلاموں کی طرف نوٹوں کی گڈی اچھال کر کہے گا... یہ لو اپنا انعام... پولیس کے آنے تک مجھے اس کی میزبانی کا شرف حاصل رہے گا... میری تواضع گالیوں، جوتوں اور ڈنڈوں سے کی جائے گی۔ انجام کار... جتھے دی کھوتی، اتھے آن کھلوتی... وہ نہ سہی کوئی دوسرا جیل خانہ ہوگا... اپنے جرائم کی فہرست میں فرار کے جرم کا اضافہ کرانے کے بعد میں دوبارہ کسی کال کوٹھری میں ڈال دیا جاؤں گا اور اس مرتبہ مجھے پھانسی گھاٹ کے کنوئیں میں جھولتا دیکھنے کے آرزومند کسی تاخیر کا رسک نہیں لیں گے۔ وہ زر یا زور لگا کے ضابطے کی ساری کارروائی کم سے کم وقت میں مکمل کرائیں گے۔ وہ دن شاید اب بہت قریب آگیا ہے جب صبح دم میرا بے جان جسم اسی زنداں سے نکلے گا اور ایدھی سینٹر کی کسی ایمبولینس میں ڈال دیا جائے گا کہ اس لاوارث کو بھی کہیں گاڑ دیں۔

خوف کی جھرجھری سے میرے جسم میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے گن مین کی طرف دیکھا۔ وہ پوری طرح مستعد بیٹھا تھا۔ آگے نورین کیا سوچ رہی ہوگی؟ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ میں تو پہلے بھی نہیں تھا، اب سلمان خان بھی نہیں ہے۔ اس پر یہ خون کے آنسو رونے والا انکشاف کب ہوگا؟ نہ جانے کیسے کیسے جسمانی استحصال کے شرمناک مرحلوں سے گزر کے وہ تھانے سے جیل پہنچے گی اور پھر اپنی باقی عمر اپنی ایک غلطی کی سزا کاٹتے گزارے گی۔ گھر سے باہر قدم نکالتے وقت اس نے سلمان کی محبت کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا مگر وہ محبت کا سراب تھا جس کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ دنیا کے بدترین جہنم میں پہنچ گئی تھی۔ پھر وہ زندگی اسے جنت کا خواب لگے گی جو وہ اپنے گھر میں ایک پاگل کو شوہر مان کے عزت آبرو سے گزار سکتی تھی۔

میرے دل میں اپنی گرفتاری کا کوئی دکھ یا پچھتاوا نہیں تھا۔ میرا سارا دکھ نورین کے مستقبل کے تصور میں سمٹ گیا تھا۔ اَن گنت ''کاش'' تھے جو میرے احساس میں زہر[illegible] کانٹے بن کے چبھ رہے تھے۔ کاش میں جیل سے فرار ہو[illegible] اس پُرآسیب حویلی کا رخ نہ کرتا... کاش نورین کو اس[illegible] سلمان خان مل جاتا اور اپنے ساتھ لے جاتا۔ کاش وہ مجھ[illegible] اعتماد نہ کرتی اور میرے ساتھ نہ آتی۔ ایسے سیکڑوں خواہش[illegible] کے پچھتاوے تھے جو میرے ماضی کا حصہ بن چکے تھے[illegible] گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں... خواہش کر[illegible] خواب دیکھنا تو انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس[illegible] برائی کیسی... یہ خواب ہی تو ہیں جو آپ کو تعبیر کی جدوجہد[illegible] اکساتے ہیں لیکن خواب صرف مستقبل کے لیے ہو[illegible] ہیں... ماضی صرف تاریخ کا نام ہے۔

پرانی ڈبل کیبن ہائی لکس پک اپ میں ڈرائیور[illegible] ساتھ آگے بیٹھنے والوں کا پیچھے کے کیبن والوں سے رابطہ[illegible] رہتا تھا۔ ایسا ہی سوزوکی وین میں تھا لیکن گاڑی بنانے[illegible] زیادہ عقل مند خریدار اس مشکل کا آسان حل یہ تلاش کر[illegible] ہیں کہ درمیانی دیوار کے شیشے کو سلائیڈنگ کرلیتے ہیں۔ دا[illegible] بائیں کھسکا کے لین دین اور گفت و شنید کا سلسلہ قائم ہو[illegible] ہے لیکن اس پک اپ کو قیدیوں کی گاڑی کے طور پر استع[illegible] کیا جارہا تھا۔ اس کے دروازوں کے اندر والے ہینڈل[illegible] نکال دیے گئے تھے۔ اب باہر نکلنے کے لیے ضروری تھا[illegible] پہلے ڈرائیور اترے اور باہر کا ہینڈل کھینچ کے دوسروں کو[illegible] آنے دے۔ اس ہیرو کی بات اور ہے جو سر سے ٹکر مار[illegible] شیشہ توڑ دے اور جمپ لگا کے کھڑکی سے کود کے تو ڈھائی[illegible] فٹ پل کے نیچے والی ندی میں کود کے مچھلی کی طرح نیچے[illegible] نیچے تیرتا ہوا جہاں چاہے جا نکلے۔

نورین نے کئی بار سر گھما کے میری طرف دیکھا[illegible] اس کی خوب صورت آنکھوں کی اداسی، مایوسی، پریش[illegible] شرمندگی وغیرہ کو دیکھنے سے میرا بھلا نہ ہوا۔ اس کے آ[illegible] سے ہلتے ہونٹوں کی سرگوشی کو صرف اس کے اپنے کانوں[illegible] سنا ہوگا۔ وہ اگر گلا پھاڑ کے بھی کچھ کہتی تو مجھے صرف اس کا[illegible] کھلتا بند ہوتا نظر آتا۔ اس کے الفاظ درمیان میں حائل[illegible] کی سرحد کو عبور نہ کر پاتے۔ پھر بھی مجھے خیال آیا کہ آخر و[illegible] کہنا چاہتی ہے۔ اس کے دل کی بات میرا دل سمجھتا ہے[illegible] صرف ایک جذباتی رومانی ڈائیلاگ ہے جس کا حقیقت[illegible] کوئی تعلق نہیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی قیامت آگئی۔ وہ سب[illegible] جو نہ میں سوچ سکتا تھا، نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ سمجھ سکتا تھا۔ فل[illegible] کی تکنیک استعمال کی جائے تو بہت سے کیمروں کی[illegible]

سلو موشن میں چلا کے دیکھا اور دکھایا جاسکتا ہے کہ ہر سیکنڈ میں کیا ہوا۔ اس کے لیے چار کیمرے گاڑی کے اندر اور اتنے ہی باہر ہونا لازمی تھے۔ پھر واضح ہوجاتا کہ جو ہوا کیسے ہوا؟ کس کا ردِعمل کیا تھا؟ کس پر کیا بیتی؟ ایک منٹ کے یا اس سے بھی کم وقت میں پیش آنے والے واقعات کس ترتیب سے پیش آئے... یہ سب الفاظ میں بتانا ناممکن ہے۔ میں وہی بتا سکتا ہوں جو مجھ پر گزری۔

گاڑی اس وقت کسی چھوٹی سی گمنام ندی کے پل پر تھی اور میری نظر پل کے نیچے بہنے والے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ شاید بارشوں کے موسم میں یہ گدلا پانی دور کناروں تک اور پل کی بلندی تک پہنچ جاتا ہو... ابھی یہ دریا نہیں تھا... ندی تھی۔ اس کا پل شاید سو فٹ اوپر ہوگا۔ پل اتنا تنگ تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی بس گزر سکتی تھی۔ ممکن ہے دو چھوٹی گاڑیاں بھی ایک انچ کا فاصلہ رکھ کے گزر جاتی ہوں۔ ہائی لکس پک اپ کی چوڑائی بس سے کچھ ہی کم تھی جس کے دونوں طرف لوہے کے پائپ لگا کے تین فٹ اونچا جنگلا سا کھڑا کردیا گیا تھا۔ اس پر نارنجی رنگ تھا اور اس سے رات کے وقت ڈرائیور کو پل کی چوڑائی کا اندازہ کرنے میں مدد ملتی ہوگی۔

یکلخت گاڑی بائیں جانب گھومی اور اس کے ساتھ ہی ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ڈرائیور نے شاید بریک بھی لگایا ہوگا مگر گاڑی کی رفتار کم تھی تو فاصلہ بہت ہی کم تھا۔ اس کے اگلے پہیے دو فٹ چوڑی اور سڑک سے چھ انچ اونچی فٹ پاتھ سے ٹکرائے۔ پھر گاڑی اچھلی اور اس نے جنگلا توڑا۔ آگے خلا تھا، سو فٹ یا اس سے زیادہ اور پھر بہتا پانی تھا۔ اندر میں بھی اچھلا اور میرا سر سامنے کی دیوار سے لگا۔ میں نے ایک زبردست گالی بھی سنی جو گن مین کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ بھی اچھلا نہ ہو اور اس کا سر بھی سامنے نہ لگا ہو۔ یہ تو میں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ جس ہاتھ میں اس نے ریوالور تھام رکھا تھا، اس کو جھٹکا کہاں اور کیسے لگا تھا۔ میں نے تو اس کے ریوالور کو اپنے چہرے پر لگتا اور پھر اپنی گود میں گرتا محسوس کیا۔ ایک سیکنڈ کا وقت تو بہت ہوتا ہے، میرا ردِعمل یعنی REFLEX ACTION اس سے بہت کم وقت کا تھا۔ اس ایکشن میں دماغ کام ضرور کرتا ہے مگر آپ کے حکم سے نہیں۔ جیسے ہاتھ بجلی کے تار یا انگارے کی طرح گرم کسی چیز کو چھولے تو از خود جھٹکا کھا کے دور ہوجاتا ہے۔ کچھ اسی قسم کے خودکار عمل کے باعث ریوالور میرے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اور پک اپ نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے ندی کے پانی کی جانب اپنا سفر شروع کیا۔ زمین کی کشش اگر نہ ہوتی تو شاید میں خود کو درمیان میں روک لیتا۔

اس ایک مختصر ترین لمحے میں مجھے احساس ہوا کہ میں پک اپ کے اندر سے باہر آگیا ہوں۔ ظاہر ہے تصادم کے نتیجے میں دروازے کا ہینڈل ہلا تھا اور اس نے دروازے کو آزاد کردیا تھا۔ ہوا میں ہاتھ پیر چلاتے ہوئے میں چلایا۔ ''نورین!'' اور پک اپ کو اپنے سے کچھ فاصلے پر نیچے جاتا دیکھا۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ یکے بعد دیگرے میں نے دو دھماکے سنے۔ ایک اس وقت جب میں پانی کی سطح پر گرا تھا۔ دوسرا پانی کے نیچے جانے کے بعد... میں اچھا تیراک ہوتا لیکن تیرنے کے لیے پانی ضروری ہے۔ پانی کی گہرائی کتنی ہونی چاہیے... اس کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ پانی میں گرنے والے کا وزن اور بلندی جہاں سے وہ کودا کیونکہ بلندی کا تعلق رفتار اور کششِ ثقل کے ایک فارمولے سے ہے۔ بلندی جتنی زیادہ ہوگی، رفتار بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

میرے پیر ضرور ندی کی سطح سے ٹکرائے تھے لیکن ندی میں پانی نہ ہوتا تو صرف پاؤں ہی نہیں... میرے جسم کی باقی ہڈیاں بھی ٹوٹ جاتیں۔ وہ قوت جسے پانی کا اچھال کہتے ہیں، وزن کو بہت کم کردیتی ہے۔ معمولی سے تختے کا سہارا بھی ہو تو وزن ختم ہوجاتا ہے اور آپ تیر سکتے ہیں۔ میرے پاؤں بھی تہِ دریا سے لگے... پھر اسپرنگ جیسی حرکت نے مجھے اوپر دھکیلا... سانس بھی میں نے ایک خودکار عمل کے تحت روک رکھی تھی۔ ایک دو یا چار سیکنڈ بعد میں سطحِ آب پر ابھرا... میں نے کہا تھا کہ وقت کو صرف باہر سے کوئی سلو موشن کیمرا ریکارڈ کرسکتا تھا۔ اسی سے مجھے بھی معلوم ہوتا کہ دوسروں پر کیا گزری۔ اوپر آتے ہی میں نے ایک سانس کھینچی اور پھر گلا پھاڑا۔ ''نورین!''

میری آنکھوں نے دیوانہ وار سطحِ آب کا جائزہ لیا مگر ویگن کہیں بہتے پانی کے نیچے تھی۔ اس جگہ کی نشاندہی لہروں کا انتشار کرتا تھا جو تقریباً ختم ہورہا تھا اور اب پیچھے سے آنے والے پانی کا بہاؤ سب برابر کررہا تھا۔ میں دیوانہ وار ہاتھ چلاتا آگے بڑھا۔ کیسی احمقانہ بات ہے کہ ریوالور پر اب بھی میری گرفت برقرار تھی حالانکہ وہ بے مصرف تھا۔ اندازے سے میں نے ایک غوطہ لگایا۔ پک اپ کے کسی فولادی حصے سے میرے پیر ٹکرائے۔ میں نے اندھیرے میں ہاتھ مارے تو مجھے اس کی چھت محسوس ہوئی پھر شیشہ جو آگے والی ونڈ اسکرین تھی۔ ابھی مجھے آدھ منٹ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے پانی کے نیچے دو منٹ تک سانس روک لینے کا پرانا تجربہ تھا۔ مشق

نہ ہونے سے یہ کم ہوا ہوگا لیکن میں نے وقت کی پروا کیے بغیر پک اپ کو ٹٹولا۔ میرے ہاتھ نے نورین کی سائڈ کا ہینڈل تلاش کرلیا۔ ایک دم میرا حوصلہ دوچند ہوگیا۔ میں نے اسے کھینچا اور ہاتھ آگے بڑھایا۔ مجھے نورین کے وجود کی تلاش تھی۔ اس کے لمس کی ضرورت تھی اور وقت گزرتا جارہا تھا۔ سانسوں کی صورت میں لمحوں کی صورت میں... سیکنڈوں کی صورت میں... ابھی میں ہمت ہارنے پر تیار نہ تھا حالانکہ میرا سینہ پھٹ رہا تھا۔ میرے پھیپھڑے آکسیجن کے لیے زور لگا رہے تھے۔ پانی مجھ سے لڑ رہا تھا لیکن میں یہ مان کر حوصلہ ہارنے کے لیے تیار نہ تھا کہ نورین مر چکی ہے۔

لیکن حوصلہ نہ ہارنا کسی کے اختیار میں کب ہوتا ہے۔ بالآخر میں مرگیا اور مجھے پتا بھی نہ چلا۔

مجھے سو فیصد فلمی انداز میں ہوش آیا اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے کچھ دیر تو خود کو زندگی کا یقین دلانے میں لگی... پھر یہ سمجھنے میں کہ جو کچھ مجھے نظر آرہا ہے، عین اسی دنیا کا منظر ہے جسے میں خیرباد کہہ چکا تھا۔ یہ عالم بالا یا کسی دوسری دنیا کا سین نہیں ہے۔ ہوش آنے کا مطلب ہوتا ہے کہ دماغ کا کمپیوٹر آن ہوگیا ہے۔ چند سیکنڈ میں اس کے سارے فنکشن آن ہوگئے۔ ہر ونڈو کھل گئی۔ میں نے کسی کچی دیواروں اور پختہ چھت والے چھوٹے سے تاریک کمرے کو دیکھا اور خود کو دیکھا جو نہ جانے کس کے شلوار قمیص میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ بان کی چارپائی تھی جس پر میلا کچیلا گدا اور تکیہ تھا۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے دیوار سے ٹیک لگائے کوئی بوڑھا بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

میں نے ایک دم اٹھنا چاہا لیکن جسم نے ساتھ نہ دیا۔ میں پھر گر گیا۔ ”باباجی!“

بڈھا لپک کر اٹھا۔ ”بسم اللہ... بسم اللہ... خیر ہووے... نی ریشما... اندر آ... بندے نوں ہوش آگیا اے۔“

میں نے بڈھے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں کہاں ہوں... اور کب سے؟“

بڈھے نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”شکر کر پتر تو ڈوبا نہیں، خیر سے میرے گھر میں ہے کل سے۔“

”کل سے؟“ میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔

ایک لڑکی اندر آئی۔ بڈھے نے کہا۔ ”آہو... کل کیا ٹائم تھا، عصر کی اذان ہوگئی تھی ریشم؟“

ریشم نے سر ہلایا۔ ”چار بجے کے بعد کا وقت تھا۔“

”اور اب کیا بجا ہے؟“

”دوپہر ہوچلی ہے خیر سے... اللہ نے بڑا فضل کیا تیرے پر... جا ریشم دودھ لا گرم کر کے...“

میں نے ڈوبتے دل سے کہا۔ ”یہ تو... بیس گھنٹے ہوگئے۔“

بڈھے نے داڑھی کھجائی۔ ”آہو... ساری رات میں ادھر بیٹھا رہا۔ ادھر ایک ڈاکٹر رہتی ہے... ڈاکٹر نوشین ہے ایک اسپتال میں نرس ہے مگر سب جانتی ہے... ریشم اسے بلا لائی تھی۔ اس نے بڑا کام کیا۔“

میں نے کہا۔ ”بابا... تمہیں معلوم ہوگا... پل پر سے ویگن دریا میں گری تھی؟“

”ہاں، میں تو ادھر نہیں تھا لوگوں سے سنا ہے۔ اور کون تھا تیرے ساتھ؟“

”ایک لڑکی تھی... ریشم جیسی... اور دو بندے تھے میرے جیسے... وہ کہاں ہیں؟“

اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”میں کیا بتاؤں پتر! ڈوب گئے ہوں گے یا میرے مولا کی مرضی ہوگی تو کسی نے انہیں بھی بچالیا ہوگا۔“ پھر وہ حقے سمیت اٹھا اور باہر نکل گیا۔

میں نے شدید مایوسی کی کیفیت میں پوچھا۔ ”وہ جگہ... جہاں حادثہ ہوا تھا کتنی دور ہے... ریشم؟“

ریشم گرم دودھ کا گلاس لے کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ ”جہاں سے ہم نے تمہیں نکالا تھا، وہاں سے ہوگی کوئی چار سو گز... لو دودھ پیو۔“ اس نے گلاس کو میرے لبوں سے لگانے کی کوشش کی۔

میں نے اس سے گلاس لے لیا اور پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ وہ بیس بائیس سال کی گوری چٹی اور صحت مند لڑکی تھی۔ بھرے ہوئے مائل بہ فربہی بدن اور لمبے گھنے سیاہ بالوں والی جو اس کی کلائی سے زیادہ چوڑی چوٹی کی صورت میں گندھے ہوئے تھے۔ اس نے واجبی حد تک فٹ رنگین دھاریوں والی قمیص کے ساتھ نیلی شلوار پہن رکھی تھی اور گلے میں اسی رنگ کا دوپٹا ڈال رکھا تھا۔ نہ وہ فلمی جٹی تھی اور نہ حد سے زیادہ سادگی رکھنے والی دیہاتی لڑکی۔

”دریا سے تم نے نکالا تھا مجھے؟“ میں نے کہا۔ ”تم وہاں کیا کر رہی تھیں؟“

”میں اکیلی تو نہیں تھی اور بھی دو کڑیاں تھیں ساتھ کی... ہم ہر جمعرات کو ادھر جا کے... کپڑے دھوتے ہیں۔“ اس نے نہانے کی بات گول کردی۔ ”تم لاش کی طرح بہتے آرہے تھے۔ وہ تو چیخ مار کے بھاگنے لگی تھیں۔ میں نے روکا کہ دیکھو تو سہی... بندہ لگتا تو لاش ہے مگر کیا پتا زندہ ہو... انہیں تو تیرنا نہیں آتا... میں ہی تمہیں کھینچ کے لائی تھی۔“

میرا دل رنج سے ڈوب رہا تھا۔ ”میرے علاوہ کوئی نہیں ملا تمہیں... ایک لڑکی بھی تھی میرے ساتھ؟“

اس نے افسوس کے ساتھ انکار میں سر ہلایا۔ ”ہم تو ادھر ہی تھے کافی دیر تک... نذیراں... وہ میرے ساتھ تھی۔ اس کو میں نے دوڑایا کہ نوشین کو بلا کر لائے۔ وہ نرس ہے نا... یہ تو میں نے دیکھ لیا تھا کہ تمہاری سانس چل رہی ہے... یہی دیکھنا آتا ہے مجھے... ایک فلم میں دیکھا تھا... بندے کو پٹھا لٹا کے دباتے ہیں... پانی نکل جاتا ہے اندر سے... یہ بھی کیا تھا میں نے... پورے مٹکے جتنا پانی نکلا تھا... میری شکل مت دیکھو، دودھ پیو... ٹھنڈا ہوگیا تو مجھے پھر گرم کر کے لانا پڑے گا۔“ ریشم باتونی لڑکی تھی اور آہستہ آہستہ اس کی زبان کھل رہی تھی۔

میں نے دودھ کا گلاس ایک سانس میں حلق سے اتار کے گلاس اسے تھما دیا۔ ”لو دودھ پی لیا میں نے... اب یہ بتاؤ کہ میں کہاں ہوں؟“

”لو... ہمارے گھر میں ہو اور کہاں... چلو تم لیٹ جاؤ۔“

”میرا مطلب تھا یہ گاؤں ہے کوئی... سڑک سے اور شہر سے کتنی دور ہے... تھانہ کہاں ہے یہاں کا... تمہیں کچھ پتا ہے؟“

اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ”لو... پتا کیوں نہیں... مجھے کیا ان پڑھ سمجھا ہے تم نے... دسویں کے امتحان میں فیل ہوگئی تھی تو کیا... اس سال پھر امتحان دوں گی... یہاں اور جتنی ہیں پرائمری پاس بھی نہیں ہیں سب... کچھ نے شکل نہیں دیکھی اسکول کی۔“

”ریشم! میں نے کچھ اور پوچھا تھا۔“

”ہاں سب بتاتی ہوں... گاؤں کا نام ہے مرداں والی... جو اصل میں تھا مراداں والی... سڑک تو خیر گاؤں تک آتی ہے اور اس پر تانگے چلتے ہیں بس تک جانے کے لیے... گاڑی کبھی کبھی ملک صاحب کی آتی ہے... بس پر ادھر جائیں تو گجرانوالہ ہے... ادھر میرے ماموں کی درزی کی دکان ہے... یہ کپڑے بھی اسی نے سی کر دیے تھے پچھلی عید پر... ابھی تک فٹ ہیں مجھے... اور اگر بندہ جائے ادھر...“ اس نے ہاتھ سے مخالف سمت کو ظاہر کیا۔ ”تو دو گھنٹے میں ساہیوال... تھانہ بھی ادھر ہی ہے مگر میں نے دیکھا نہیں... تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

میں اس کی غیر ضروری گفتگو بھی تحمل سے سننے پر مجبور تھا۔ ”جب کوئی حادثہ ہوتا ہے تو پولیس تھانے سے آتی ہے... مجھے معلوم کرنا ہے کہ جو میرے ساتھ تھے ان کا کیا ہوا... گاڑی نکالی ہوگی انہوں نے؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”کیسے نکالی ہوگی گاڑی... آج کل ندی تیز ہے... پتا نہیں کہاں لے گئی ہوگی۔ اور تم نے بولا تھا کہ ایک لڑکی تھی تمہارے ساتھ... کون تھی وہ؟ تمہاری بیوی...؟ اس کے علاوہ بھی کوئی تھا... تمہارا دوست یا بھائی... گاڑی کس کی تھی؟“

”ریشم! ایک ساتھ اتنے سوال مت کرو۔ گاڑی میں میرے علاوہ تین لوگ تھے۔ لڑکی ایک تھی مگر وہ میری بیوی نہیں تھی۔“

”پھر کس کی بیوی تھی؟“

”یار کسی کی بھی نہیں۔“ میں نے جھلا کے کہا۔ ”مجھے صرف اسی کی فکر ہے۔“

”اچھا تمہاری کزن ہوگی؟ یا وہ تھی گرل فرینڈ... منگیتر... بہت خوب صورت تھی... مجھ سے بھی زیادہ؟“

”پاگل لڑکی۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تم سے بات کرنا فضول ہے۔ تم مجھے اتنا بتاؤ کہ مجھے تھانے جانا ہو تو کیسے جاؤں؟“

اس کا منہ سوج گیا۔ ”تم نے پاگل کہا ہے، احسان فراموش... اچھا ہوتا میں تم کو ڈوبنے دیتی۔ اب جاؤ جس سے مرضی پوچھو... میں بات نہیں کرتی۔“ وہ واک آؤٹ کر گئی۔

میں نے باہر نکل کے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا کمرا تھا۔ بائیں جانب ایک بھینس بندھی ہوئی تھی اور ایک بکری کھڑی تھی۔ مختصر سے صحن میں مرغیاں پھر رہی تھیں۔ ایک کونے میں بھوسے کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ اوپر نیلا آسمان تھا جس کی ویرانی میں بہت بلندی پر ایک چیل اڑ رہی تھی۔ میں نے خود کو بہت تنہا اور بے بس محسوس کیا۔ پلک جھپکتے میں مجھ سے وہ سب چھن گیا تھا جو میرے لیے زندگی کے نئے سفر میں زادِ راہ تھا۔ نورین نہ رہی تھی جو شریکِ سفر تھی۔ وہ کہاں سے چلی تھی میرے ساتھ اور صرف اس لیے یہاں تک میرے ساتھ آئی تھی کہ بالآخر میرے گناہوں کا کفارہ اپنی زندگی سے ادا کرے؟ وہ میرے ہی دشمن تھے جنہوں نے اسے مجھ سے چھینا۔ کیا ملا آخر اسے زندہ رہنے کی اس جدوجہد میں میرا ہاتھ تھام کے؟ میرے سارے دعوے اسی طرح دھرے رہ گئے جیسے سلمان کے دعوے تھے... اپنی قربت کی ان گنت یادیں چھوڑ کے وہ یوں غائب ہوگئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ جیسے وہ میرے خیال کا حسین واہمہ تھی۔ کسی آرزو کے خواب کا قصہ تھی۔ اب میں کیا کروں... کہاں جاؤں... آگے پھر اکیلا اسی راستے پر نکل جاؤں جس پر اب میرا ساتھ دینے والا

صرف اس کا خیال ہے...

ریشم شاید دوسرے کمرے میں تھی۔ اس نے مجھے صحن کے بیچ میں اکیلا اداس کھڑا دیکھا تو نکل آئی۔ ”دیکھو، کیا نام ہے تمہارا... تم مہمان ہو اور ٹھیک بھی نہیں ہو اس لیے معاف کرتی ہوں۔“

”میرا نام خاور ہے۔“

”خاور... یہ کیا نام ہوا؟ خیر مجھے کیا۔ گاڑی تو تمہاری غرق ہو گئی۔ پیسا تمہاری جیب میں کوئی نہیں۔ آخر جانا کہاں ہے تم کو... تم بابا سے کچھ پیسے لے سکتے ہو لیکن کپڑے تو مت لے کر جاؤ اس کے... تمہارے اپنے کپڑے سوکھ گئے تھے... لاؤں؟“

میں نے کہا۔ ”فکر مت کرو... میں یہ کپڑے لے کر نہیں جاؤں گا۔ تمہارا بابا کہاں ہے... اسے بلا دو۔“

”اس نے کہاں جانا ہے... باہر بیٹھا ہو گا انہی کے ساتھ... ایک تو گاما پہلوان سمجھتا ہے خود کو... گوشت کا پہاڑ ہے پورا... سالم بکرا کھا جاتا ہے۔ ایک دن مجھے روک کے کہنے لگا کہ مجھ سے شادی کر لے۔ میں نے تو اٹھائی اینٹ اور کہا کہ کسی سڑے سے شادی نہ کروں کمینے... وہ جو تیرے چاچے کی کڑی ہے چھچھلی... ابھی جا کے اسے بتاتی ہوں... منگیتر ہے نا اس کی... سر پھاڑ دیتی میں اس کا۔“

میں باہر نکل گیا۔ بڈھا تین افراد کے ساتھ ایک سایہ دار درخت کے نیچے حقہ لیے بیٹھا تھا۔ ان میں ایک تو وہی تھا جس کی لو اسٹوری ابھی ریشم نے سنائی تھی۔ دوسرا بانس جیسا خاکی وردی والا پوسٹ مین ثابت ہوا۔ تیسرا ایک موبائل باربر تھا جو اپنی چھوٹی سی ٹین کی صندوقچی کھولے بیٹھا تھا اور قینچی سے بابا کی داڑھی کے سفید بال برابر کر رہا تھا۔ میں نکلا تو ساری نگاہیں مجھ پر مرتکز ہو گئیں۔

بابا نے کہا۔ ”لو جی، یہ ہے وہ بھلا مانس جس کو رب نے بچا لیا۔“

”رب نے یا ریشم نے؟“ پہلوان بولا۔ اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک پتلی اور زنانہ تھی۔

”اوئے کفر نہ بک بھولے... بچانے والا وہی سوہنا رب ہے۔“ ڈاکیے نے ڈانٹ کر کہا۔

میں ان کے پاس انہی کی طرح فرشِ خاک پر بیٹھ گیا۔

”آپ سب نے حادثے کا سنا ہو گا؟“

”ہاں، ابھی رحیم بخش نے سب بتایا۔“ ڈاکیے نے بابا کی طرف اشارہ کیا۔ ”سوہنے رب نے نئی زندگی دی تمہیں... گاڑی کو جانے دو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم کرنا ہے کہ میرے ساتھ جو لوگ تھے ان کا کیا ہوا؟ تھانے والوں کو پتا ہو گا سب۔“

موبائل باربر نے قینچی رکھ دی۔ ”لو جی، خیر سے نام کیا ہے جناب کا؟“

میں نے کہا۔ ”خاور... مجھے گاڑی کی فکر نہیں۔ گاڑی میری نہیں تھی۔ ایک خاتون تھی میرے ساتھ۔“

خاتون کے لفظ پر پہلوان مسکرایا۔ ”آپ کی ووہٹی... خاتون نام تھا اس کا؟“

میں نے وضاحت کے مقابلے میں اقرار کو ترجیح دی۔ ”ہاں... اس کے علاوہ دو بندے تھے۔ انہوں نے ہمیں لفٹ دی تھی۔ میرا مطلب ہے انہیں بھی ساہیوال جانا تھا۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ ہمارا کچھ اسباب بھی تھا۔“

باربر نے معاملہ فہمی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میں بتاتا ہوں جی آپ کو ساری بات۔ صبح میں سائیکل پر تھانے دار کے گھر گیا تھا اس کی شیو بنانے۔ اس نے بتایا کہ گاڑی پل پر سے ندی میں گری تھی۔ بہت نیچے پھنسی ہو گی یا پانی کے ساتھ آگے بہہ گئی ہو گی۔ اسے نکالنا مشکل ہے۔ پتا نہیں اس میں بندے کون تھے۔ اسے تو جناب کے بارے میں بھی پتا نہیں... کہ آپ کو مولا نے بچا لیا۔“

”تمہارا مطلب ہے... لاش کوئی نہیں ملی؟“

باربر نے نفی میں کھوپڑی ہلائی۔ ”اسے تو علم نہیں تھا۔ اب آگے کسی نے دیکھی ہو تو کیا پتا... اندر ہی مر گئے ہوں گے سب۔ تھانے دار کہہ رہا تھا کہ شراب پی کے گاڑی چلاتے ہیں لوگ تو یہی ہوتا ہے۔ حشر والے دن سب ندی میں سے نکل آئیں گے۔“

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کسی کو تفصیل سے اپنے یا دوسروں کے بارے میں کچھ بتانا لاحاصل ہوتا۔ پہلا صدمہ نورین کے بچھڑ جانے کا تھا۔ دوسرا خیال سارے اثاثوں سے محرومی کا تھا۔ گاڑی میں نورین کا سارا زیور تھا جس کی مالیت لاکھوں کی ہو گی۔ دس لاکھ وہ تھے جو میں نے مقتول سلمان خان کی جیب سے نکال لیے تھے۔ لیکن جب نورین ہی نہیں رہی تو پھر اثاثے کس کام کے... زندگی نے ایک راہ اور ایک سمت اختیار کی تھی۔ ایک مقصدِ حیات چن لیا تھا۔ خواب دیکھے تھے اور امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اب پھر وہی تنہائی کے صحرا کا بے سمت سفر ہے... وہ نہ منزل ہے نہ منزل کا نشاں ہے۔

باربر نے اپنی قینچی بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”جناب ساہیوال جا رہے تھے... وہاں گھر ہے آپ کا؟“

میں نے بے خیالی میں دہرایا۔ ”گھر؟ وہ کیا ہوتا

ہے؟"

پہلوان، رحیم بخش اور باربر نے نظروں ہی نظروں میں اس خیال سے اتفاق کیا کہ میرا دماغ ٹھکانے نہیں۔

میں نے فوراً اس تاثر کو دور کیا۔ "میرا مطلب تھا، گھر والی ہی نہ رہے تو گھر کیسا... ہم نے تو ابھی شادی کی تھی، اپنا گھر بسانے کے لیے۔"

پہلوان منمنایا۔ "پھر بھی... گھر تو کہیں ہوگا تمہارا اور اس کا؟"

میں نے اس کا گول مول جواب دینا بہتر سمجھا۔ "ہاں تھا، چار سال پہلے باپ مر گیا تھا۔ میری شادی کے دو مہینے بعد ماں مر گئی۔ بڑے بھائی نے گھر پر قبضہ کیا اور ہمیں نکال دیا۔ رشتے دار سارے باہر ہیں مگر رابطہ کسی سے نہیں۔ اب تو میں اکیلا ہی رہ گیا ہوں۔"

ان سب کے چہرے دکھی ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے پوچھا نہیں کہ آخر وہ گھر کہاں تھا جہاں سے مجھے نکلنا پڑا اور میری منزل کہاں تھی۔ باربر ذرا ہوشیار تھا۔ اس نے سوال کیا۔ "اور تمہاری مرحوم گھر والی؟"

"اس کی زندگی سوتیلے باپ نے حرام کر رکھی تھی۔ وہ تو... اب کیا کہوں... اس پر بُری نظر رکھتا تھا۔ ایک جہنم سے نکلی تھی وہ مگر اپنی جنت نہ بسا سکی بدبخت..." میرا لہجہ رقت آمیز ہو گیا۔ "معلوم نہیں اللہ نے مجھے کیوں بچا لیا؟"

بابا رحیم نے میرے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ "چل حوصلہ کر پتر! بندے کی آزمائش کرتا ہے سوہنا رب اور جو اس میں پورا اترے اس پر اپنی رحمت نازل کرتا ہے۔"

"اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں... کدھر جاؤں... میرے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا۔"

"پتر تو رہ ادھر... اپنا گھر سمجھ اسے... میں بھی سمجھوں گا سوہنے رب نے بیٹا دے دیا اس عمر میں۔"

باربر اور پہلوان نے معنی خیز مسکراہٹ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ یہ خوب ہے بھئی... صاف کہو نا کہ سوہنے رب نے گھر بیٹھے ایسا داماد بھیج دیا... بابا رحیم بخش کے دل میں ایسے کسی خیال کا گزر بھی نہ ہوگا لیکن زبانِ خلق نے بدگوئی شروع کر دی تھی۔ میں اٹھ کے واپس اندر چلا گیا اور چارپائی پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ میرے ذہن میں ایک خلا تھا... خیالوں کے آسیب زدہ سائے چہرے بدل بدل کے مجھے ڈراتے تھے۔ میرے خیال میں ایک تصویر نقش ہو گئی تھی۔ تصویر میں وہ پانی میں ڈبل کیبن پک اپ تھی جو ندی کی تہ کے کیچڑ میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کی اگلی سیٹ پر باکسر ٹوٹا پھوٹا پڑا تھا۔ شاید وہیں نورین کھلی آنکھوں کے ساتھ پھنسی ہوئی تھی۔ زندگی کے آخری چند لمحات میں اس کے جذبات کیا ہوں گے؟ اس نے کیا سوچا ہوگا... زندگی کہاں فریب دیتی ہے... خواب کہاں تک لاتے ہیں اور پھر ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

اس وقت ایک خیال نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ آخر گاڑی بے قابو کیوں ہوئی تھی؟ باکسر ہرگز نشے میں نہیں تھا اور وہ ایکسپرٹ ڈرائیور تھا۔ پھر ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ اسٹیئرنگ پورا گھوم گیا اور گاڑی اپنی تیز رفتاری میں پل کے فٹ پاتھ پر چڑھی اور حفاظتی جنگلے کو توڑتی ہوئی ندی میں اتر گئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈرائیور کا دھیان نورین کی طرف ہو یا اس نے دست درازی کی ہو اور نورین کی مزاحمت کے نتیجے میں اسٹیئرنگ اس کے قابو میں نہ رہا ہو؟ باکسر صورت سے بھی ایک ہوس پرست حیوان لگتا تھا اور اس کی للچائی نظر مسلسل نورین پر تھی۔ ایسا ناممکن نہیں تھا۔ یہ ہو سکتا تھا۔

اندھیرے میں کبھی امید کی روشنی یوں چمکتی تھی جیسے رات کے اندھیرے میں بادلوں سے بجلی چمکے... ایک امید روشن ہوتی تھی کہ کیا پتا میری طرح نورین بھی باہر گر گئی ہو۔ وہ بھی بچ گئی ہو... اسے بھی کسی نے ندی سے نکال لیا ہو... لیکن عقل اس کو قبول نہیں کرتی تھی۔ معجزے بار بار رونما نہیں ہوتے۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں ندی کی تہ سے نورین کی لاش نکلوانے کی کوشش کروں؟ کون کرے گا یہ کام اور کیسے... مقامی پولیس ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی اور حادثے کو محض حادثہ سمجھ کے اہمیت ہی نہیں دے رہی تھی۔ انہوں نے گلوخلاصی کے لیے ایک نظریہ گھڑ لیا تھا کہ تیز رفتار پانی اس پک اپ کو بھی بہا لے گیا ہوگا حالانکہ یہ ناممکن حد تک مشکل نظر آتا تھا۔ اس ندی میں اتنا پانی نہیں تھا اور نہ اس کی روانی میں سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا زور تھا۔ فولادی ڈھانچا رکھنے والی پک اپ جیسی بھاری چیز آسانی سے بہہ کر دور نہیں جا سکتی۔ وہ وہیں تہِ دریا میں غرق ہو گی۔

اب میں اسے نکالنے کا سوچوں تو کیسے... نہ میرے وسائل ہیں... نہ اسباب... میں کہاں سے غوطہ خور ڈھونڈ کر لاؤں اور زنجیروں والی وہ طاقتور کرین جو پک اپ کو نکال لے۔ اول تو پولیس مجھے روکے گی کیونکہ الزام ان کی کاہلی اور نااہلی پر آئے گا۔ وہ مجھے تفتیش کے نام پر تھانے بلا کے ثابت کر سکتے ہیں کہ میری کہانی جھوٹی ہے اور میں تو ایک اشتہاری مجرم ہوں جس کی فوٹو ہر تھانے میں پہلے سے موجود ہے۔ میں اپنے مجرم ساتھیوں کے ساتھ کوئی واردات کر کے فرار ہوا تھا۔ میری جذباتی خواہش کا انجام یہ ہوگا کہ میری شناخت مجھے چودھری فریدالدین ثابت کر دے گی جو سکھر جیل سے فرار ہوا تھا اور پھر میری واپسی... سو پیاز اور سو جوتے کھانے کے بعد پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ بفرضِ محال میں نے نورین کی لاش کو نکالنے کا مقصد حاصل کر لیا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ میرے خیال میں تو نورین کی وہ موہنی صورت ہے جو زندگی میں تھی۔ اب ایک گلی سڑی ٹوٹی پھوٹی خون آلود لاش کو دیکھنے سے یہ نقش میرے خیال میں مستقل ہو جائے گا پھر میں اسے یہاں کی مٹی کے سپرد کروں گا اور آگے چل پڑوں گا۔ یہاں رک کے اس کی قبر کا مجاور تو نہیں بنوں گا۔

میری تنہائی میں ریشم نے پھر یلغار کی۔ "خاور! کیا سو رہے ہو؟"

میں نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کے کہا۔ "نہیں، کوئی کام ہے تمہیں؟"

"کھانا لائی ہوں میں تمہارے لیے۔ خیال تو تھا بھنڈی کا سالن بناؤں۔ یہاں پیچھے ہم نے سبزیاں اگا رکھی ہیں۔ تم شہر والے کیا جانو تازہ سبزی کا مزہ۔ اور پھر میں بھنڈی ایسی پکاتی ہوں کہ آس پاس کوئی نہیں پکا سکتا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ جو چتی والی مرغی ہے نا، اس پر نامراد کالی بلی نے حملہ کیا تھا۔ ابا نے مرہم پٹی کی تھی مگر اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ مر جاتی ایسے ہی... میں لے گئی تھی مولوی صاحب کے پاس دم کرانے... انہوں نے کہا کہ یہ نہیں بچے گی... چھری پھیر دی۔ وہ پکالی میں نے۔ ایک پیالہ مولوی صاحب کو بھجوا دیا۔ تمہارے لیے یخنی بنائی ہے... سالن بھی ہے۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "خدا کے لیے ریشم، مجھے کچھ نہیں کھانا۔ بھوک نہیں ہے مجھے۔"

"لو... بھوک کیوں نہیں ہے... اور تمہیں تو ضرورت ہے۔"

"مجھے صرف سکون اور تنہائی کی ضرورت ہے۔ تم جب بولنے پر آتی ہو تو ایک ہزار الفاظ فی منٹ کی رفتار سے بولتی چلی جاتی ہو۔ اتنا تیز تو میرے کان بھی نہیں سنتے۔ تم جاؤ، جب مجھے بھوک لگی تم سے کہہ دوں گا۔"

وہ میری چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گئی اور اس نے ایک ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ "شکر ہے بخار نہیں ہے۔ مجھے تو شک ہو گیا تھا کہ تمہارے دماغ کو گرمی چڑھی ہے۔ صدمے سے پہلے ہی خراب تھا اسی لیے تو تم نے پاگل کہا تھا مجھے... اور کوئی کہتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتی مگر میں نے کہا کہ ریشم... شودا مصیبت کا مارا ہے۔ اس کے دماغ پر اثر ہے اور پھر مہمان بھی تو ہے۔ چلو اٹھو تمہیں میری قسم... پہلے یخنی پی لو... بے شک کھانا کچھ دیر بعد کھا لینا۔ ہم سب اکٹھے کھائیں گے۔ چلو منہ کھولو شاباش۔"

میں نے ہار مان لی اور منہ کھول دیا۔ اس نے چمچ بھر بھر کے یخنی مجھے پلانا شروع کی اور درمیان میں اس مرحومہ مرغی کی ذاتی اور خاندانی صفات بیان کرتی رہی جو بعد از وفات میرے وجود کو توانائی کا ذخیرہ فراہم کر رہی تھی۔ اس نے قاتل سیاہ بلی کی فطری خباثت اور سابقہ جرائم کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی۔ میں احمقوں کی طرح اس کی صورت دیکھتا رہا۔ عافیت اسی میں تھی کہ خاموشی سے سب سنتا رہوں اور اس کی تعمیلِ حکم کرتا رہوں۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ بے حد ذہین لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ اس کے مشاہدے کی گہرائی سے بھی ہوتا تھا اور اندازِ بیاں سے بھی۔ اس کا اعتماد حیرت انگیز تھا۔ میرے ساتھ اسے کسی قسم کی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی حالانکہ میں ایک اجنبی تھا۔

بالآخر ایک موقع آیا جب یخنی تمام ہوئی اور میں نے کہا۔ "ریشم! آخر تم مجھے بولنے کا وقت کب دو گی؟"

"بولو، میں نے کیا ہاتھ رکھا ہوا ہے تمہارے منہ پر۔"

"دیکھو، یہاں کے تھانے والے اس ڈوبی ہوئی گاڑی کو نکالنے میں دلچسپی نہیں رکھتے کیونکہ ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ مجھے بھی اب کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ نورین زندہ کہاں ملے گی۔"

وہ بولی۔ "آخر تم چھپاتے کیوں ہو؟ کون تھی یہ نورین؟ کیسی تھی... تمہارے پاس کوئی تصویر ہے اس کی تو مجھے دکھاؤ، ورنہ ایسے ہی بتا دو۔ کیا اس کی صورت ریما جیسی تھی... یا دھوری سے ملتی تھی؟ مجھ سے یا اپنی صائمہ سے... تمہاری کیا لگتی تھی؟"

"میں سب بتا دوں گا۔ مجھے بولنے تو دو۔ اس کے علاوہ... شرط یہ ہے کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گی۔"

"قسم لے لو مجھ سے جس کی چاہو۔ کہو تو کلام پاک پر ہاتھ رکھ کے کہوں... میرے کمرے میں رکھا ہے سنہری گوٹے والے غلاف میں لپٹا ہوا۔ میری ماں نے بنایا تھا۔ اس پر سفید گوٹے کے پھول میں نے ٹانکے تھے۔ ابا نے کھڑکی کے اوپر تختہ جڑ دیا تھا۔"

میں نے سر پکڑ لیا۔ "ریشم! تم سے بات کرنا فضول ہے۔ تم مجھے پاگل کر دو گی اپنے ساتھ۔"

"اچھا اچھا، تم بولو... میں چپ... بالکل چپ رہوں گی۔"

”نورین نہ میری بیوی تھی نہ منگیتر... نہ گرل فرینڈ جیسا کہ تم کہہ رہی تھیں۔ لگتا ہے تم کیبل پر فلمیں بہت دیکھتی ہو۔ مجھے محبت تھی اس سے۔ گھر والے ہماری شادی کے خلاف تھے۔ ہم نے بھاگ کر شادی کا فیصلہ کیا۔“

اس نے ایک پُرمسرت چیخ ماری۔ ”واقعی... کمال کر دیا تم نے تو... ایسا تو صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ مجھے بھی کہا تھا ایک لفنگے نے کہ میرے ساتھ شہر چل۔ میں نے پہلے تو دیا اس کو دھکا... پھر گالیاں دیں۔ وہ گر گیا ایک کھڈے میں جہاں اس کی بھینس پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اس کے گھر جا کے اس کے باپ سے سب کہہ دیا۔ اچھا سوری... تم اپنی بات کر رہے تھے۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”بدقسمتی میری کہ حادثہ ہو گیا۔ اچھا ہوتا اگر ہم بس سے چلے جاتے لیکن ڈر تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا نہ کرے۔ ساہیوال پہنچ جاتے تو آگے جاتے ٹرین سے... کراچی جانے کا خیال تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ واپس بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے خاندان والے میرے خون کے پیاسے ہیں اور مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اپنے بارے میں بتا چکا ہوں کہ بھائی نے پہلے ہی مجھے بے گھر کر دیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نورین کے گھر والوں نے میرے خلاف پولیس میں ایف آئی آر لکھوا دی ہو۔ یہ ضروری ہے کہ میں روپوش رہوں۔ رہ گئی نورین کو بھلانے کی بات تو یہ روپوشی سے کہیں زیادہ بڑی آزمائش ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ اس سے مجھے کتنی محبت تھی... یا وہ مجھے کیسی لگتی تھی۔ میں اس پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ ریما یا مادھوری اور صائمہ کی کیا بات کرتی ہو۔ بُرا نہ مانو تو کہوں کہ ان سے زیادہ حسن تو خدا نے تمہیں دیا ہے۔“

ریشم نے میرے بیان کی سچائی کو تسلیم کیا۔ ”لیکن تمہاری نورین مجھ سے بھی زیادہ خوب صورت تھی؟“

میں نے کہا۔ ”میری نظر سے دیکھو تو ہاں... اس سے زیادہ حسین کوئی نہیں ہو سکتا... معلوم نہیں خدا نے کیوں مجھے زندہ رکھا؟ میں بھی ساتھ ہی مر جاتا تو اچھا تھا۔“

باہر سے بابا رحیم بخش نے ریشم کو آواز دی۔ ”پتر کچھ کھانے کو ملے گا؟“

جو کہانی میں نے اپنے اور نورین کے بارے میں ریشم کو سنائی تھی، وہی بابا رحیم بخش کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میں نے اسے بھی سنائی۔ جسمانی طور پر میں اس قابل نہیں تھا کہ روپوشی کا سفر جاری رکھ سکوں۔ حادثے کے بعد اتنی بلندی سے ندی میں گر کے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ میری ہڈیاں سلامت رہی تھیں لیکن میں جتنا ذہنی اور جذباتی طور بے حال تھا، اتنا ہی ناطاقتی کا شکار... خالی ہاتھ تھا اور زندگی کے مقصد سے محرومی میرا عذاب بن گئی تھی۔ جب میں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا تو میرے سامنے ایک ہی منزل تھی۔ مجھے خود کو قانون کی گرفت میں آنے سے بچانا تھا اور ایک ایک کر کے ان سب سے بدلہ لینا تھا جو میرے بھائی کے قتل کے ذمے دار تھے اور مجھے جرم بے گناہی میں پھانسی کے تختے تک پہنچا چکے تھے۔ پھر تقدیر نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ نورین کی ذمے داری مجھے سونپ دی اور اس کے ساتھ میری منزل بدل گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ حادثاتی طور پر ملنے والی کے لیے مستقبل ایک نئی زندگی کے خواب کو تعبیر دینا بن گیا۔ ابھی تک نہ میں نے اپنی زبان سے نورین کی محبت میں گرفتار ہونے کا اعتراف کیا تھا اور نہ نورین نے مجھ پر اعتماد سے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ سلمان خان کو اور اپنی سابقہ زندگی کو بھلا کر میرے ساتھ زندگی کی ہم سفر بننے کو نوشتۂ تقدیر کی طرح قبول کر چکی ہے۔ یہ خواب میری آنکھوں نے دیکھا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ میرے جذبۂ عشق کی صداقت بالآخر ایک دن نورین کا دل بھی جیت لے گی۔

اچانک وہ سب ختم ہو گیا تھا اور میں پھر اسی دوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے میں نے ایک نئی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ میں پھر اکیلا تھا۔ نورین کسی حسین خواب کی طرح حقیقت ہو گئی تھی۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ نہیں رہی۔ صرف اس کا خیال اور اس کا تصور باقی ہے۔ دل کہتا کہ وہ ایسے مجھے چھوڑ نہیں سکتی۔ اب مجھے اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ نورین سے میری محبت نے کس طرح عشق اور جنون کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یوں بچھڑ جائے گی۔ جیسے اچانک ملی تھی ایسے ہی اچانک غائب ہو جائے گی۔ ناممکن مجھے ممکن لگتا تھا کہ میری طرح وہ بھی بچ رہی ہو گی۔ قدرت اتنی بے حس اور سفاک کیسے ہو سکتی ہے کہ صرف اسے میری زندگی سے چھین لے۔ وہ زندہ ہو گی، مجھے پھر ملے گی۔

اگلی صبح باربر میری شیو بنانے آیا تو اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جو درحقیقت لوکل ڈسپنسری کا انچارج تھا۔ جب ندی میں گرا تھا تو اس سے پہلے کہ مجھے باہر نکالا جاتا بہت سا میلا گدلا پانی میرے پیٹ میں بھر گیا تھا۔ ندی میں دنیا کے سارے کام ہوتے تھے۔ عورتوں، بچوں سے گائے بھینسوں کے نہانے، کپڑے دھونے اور جسم کے نظام اخراج کی ساری غلاظت شامل کرنے تک چنانچہ پانی خارج ہونے کے بعد بیکٹیریا اور جراثیم نے اپنا کام شروع کیا اور مجھے رات بھر قے اور دست کا مسئلہ درپیش رہا تھا۔ نہ میرے پاس کوئی دوا تھی اور نہ میرے میزبان اس وقت مجھے کہیں لے جا سکتے تھے۔ پھر صبح ہوتے ہی مجھے طبی امداد میسر آ گئی۔ شیو بڑھ جانے سے میں زیادہ بیمار نظر آنے لگا تھا۔ میں نے احتیاطاً کھانا پینا بھی بند کر رکھا تھا۔ نقاہت کے باعث میں اٹھ کر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا لیکن میری تیمار دار ریشم جو سختی کم تھی، ستاتی زیادہ تھی، اس نے پہلے ڈاکٹر صاحب کو وارننگ دی کہ دوا نے اثر نہ کیا تو اس کی دکان بند کرا دے گی۔ وہ پہلے کی طرح تنور میں روٹیاں لگاتا نظر آئے گا۔ پھر اس نے خلیفہ کو ہدایات دیں کہ میری مخالفت کو نظرانداز کرتے ہوئے اسی حالت میں میرا چہرہ صاف کر دے۔

دوپہر تک میں سوتا رہا۔ اٹھا تو میری حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ پیٹ میں کچھ تھا ہی نہیں جو اوپر نیچے کے کسی راستے سے باہر آتا۔ ریشم کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں نے سوپ اور دودھ پینے کے بعد کھچڑی بھی کھائی لیکن مجھے چائے نصیب نہ ہوئی جس کی خواہش تھی۔ چائے مجھے شام کو غسل کے بعد ملی جس کے بعد میری حالت میں حیرت انگیز بہتری آئی۔ رحیم بخش مجھے سہارا دے کر پچھلے حصے میں لے گیا۔ وہاں ایک مختصری چار دیواری کے اندر انہوں نے سبزیاں کاشت کر رکھی تھیں اور مرغیاں پالی ہوئی تھیں۔ اس حصے میں بھی دو کمرے تھے لیکن وہ بند پڑے تھے۔ درمیان میں ایک تخت پڑا تھا اور دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

رحیم بخش نے مجھے بتایا۔ ”یہاں پہلے میں رہتا تھا جب ریشم کی ماں زندہ تھی۔ سامنے والے حصے میں میرے ماں باپ تھے اور میرا چھوٹا بھائی تھا۔ آس پاس کی زمین بھی ہماری ہے جس پر پہلے ہم سال میں دو فصلیں اگاتے تھے۔ پہلے میں باپ کے ساتھ کام کرتا رہا پھر باپ نہیں رہا۔ وہ رات کے وقت ہیر وارث شاہ سناتا تھا تو سننے والوں پر اپنی درد بھری آواز سے جادو کر دیتا تھا۔ جوانی میں اسے ہر جگہ بلایا جاتا تھا۔ میلوں ٹھیلوں میں... شادی بیاہ کی تقریبات میں اور عرس پر... اور اچھے خاصے پیسے بنا لیتا تھا لیکن وہ میراثی نہیں بنا اور کسی ٹولی میں شامل نہیں ہوا۔ میری ماں بتاتی تھی کہ اسے زور کرنے کا بھی شوق تھا اور وہ کبڈی بھی کھیلتا تھا۔ وہ جہاں گاتا تھا، وہاں عورتیں اس پر فریفتہ ہوتی تھیں۔ کیا شادی شدہ اور کیا بن بیاہی۔ ایسی باتیں چھپی کہاں رہتی ہیں۔ کئی بار اسے مار پڑی اور کئی بار وہ بچ نکلا۔ پھر اس نے میری ماں سے شادی کر لی۔ وہ بھی ساتھ والے گاؤں کی لڑکی تھی۔ شادی کے بعد وہ بالکل سدھر گیا تھا اور اس نے محفلوں میں گانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے جب زمیندار کے گھر کی شادی میں اسے گانے کے لیے جانا پڑا۔ وہاں معلوم نہیں کیا ہوا کہ اگلے روز اس کی لاش اس گاؤں کے باہر کھیتوں میں پڑی ملی۔ ماں کو پتا چلا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا مگر یہ جھوٹ تھا۔ بعد میں سنا کہ وہ زمیندار کی تیسری بیوی کے ساتھ تھا۔ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا کوئی۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کی تیسری بیوی بھی مر گئی۔ مشہور بھی ہوا کہ اسے ہیضہ ہوا تھا پھر وہ میری ماں کے پیچھے پڑ گیا۔ تم نے ریشم کو دیکھا ہے... میری ماں ایسی ہی تھی۔ میرے چچا نے اس کی عزت بچائی۔ اس نے بھابی پر چادر ڈالی اور اس سے نکاح کر لیا۔ وہ شروع سے آوارہ گرد اور لوفر تھا۔ چھوٹی موٹی چوری چکاری کے بعد ڈاکے ڈالنے لگا تھا۔ علاقے میں راجو راکٹ نام کے ڈاکو کی بڑی دہشت تھی۔ میرا وہ چچا اسی کے گروہ میں شامل تھا لیکن وقت پڑنے پر اس نے بڑی ذمے داری کا ثبوت دیا۔ اس نے زمیندار کو پیغام دے دیا کہ میری بیوی کا نام بھی آیا تمہاری زبان پر تو اچھا نہیں ہو گا۔ وہ بہت کم گھر آتا تھا لیکن جب تک وہ زندہ رہا، ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ نہ کسی نے ہمیں پریشان کیا۔ میری شادی ہو چکی تھی اور چھوٹے بھائی کی بات بھی میری بیوی کی بہن سے پکی ہو چکی تھی جب میرا چچا جو میرا سوتیلا باپ بھی تھا، پولیس مقابلے میں ہلاک ہو گیا۔ سوتیلا وہ کبھی نہیں رہا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ سگوں سے زیادہ اچھا سلوک رکھا تھا لیکن اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کی موت کی خبر عام ہونے کے کچھ عرصے بعد زمیندار کو بھی بدلہ لینے کا خیال آیا۔ حالانکہ وہ بڈھا ہو چکا تھا مگر بدلے کی آگ سرد نہیں ہوئی تھی۔ خوف کی وجہ سے وہ دبک کے بیٹھا تھا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں رہتا تھا۔ سامنے والا حصہ میری ماں اور چھوٹے بھائی کا تھا۔ ایک رات زمیندار نے میرے بھائی کو بہانے سے کہیں بھیجا اور خود اندر گھس آیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس نے میری ماں سے کہا کہ آج تجھے اپنے شوہر کے گناہ کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس کی بدقسمتی کہ میرا بھائی لوٹ آیا۔ میری ماں کی عمر بھی چالیس سے تو اوپر تھی، وہ کیسے مزاحمت کرتی۔ پچھلے حصے میں میرے کانوں تک اس کی آواز نہیں پہنچی۔ بھائی نے واپس آ کے ماں کی آواز سنی تو دروازہ توڑ کے اندر گیا اور کلہاڑی کے ایک وار سے زمیندار کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیا۔ پھر وہ خود پولیس کے سامنے پیش ہو گیا۔ تین سال بعد اسے پھانسی ہو گئی۔ اس کی لاش گھر آئی تو ماں ہوش کھو بیٹھی۔ تین

سال اس نے بڑے سخت عذاب میں گزارے تھے مگر امید زندہ تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ میں مرجاؤں تو مجھے شوہر کے ساتھ نہیں بیٹے کے ساتھ دفن کرنا۔ تیسرے یا چوتھے روز وہ کنوئیں میں کود گئی۔“

میں انتقام اور جنون کی یہ خونی داستان سن کے دم بخود تھا۔ ”تم یہ جگہ چھوڑ کے بھی جاسکتے تھے۔“

”زمین کو چھوڑ کے جاتے تو کہاں... یہاں رہنا مجبوری تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد ہم نے پیچھے والا حصہ چھوڑ دیا اور آگے رہنے لگے کیونکہ پیچھے ہماری زمین ہے اور آگے آبادی نہیں ہے۔ میری بیوی ڈرتی تھی کہ ادھر سے کوئی بھی آسکتا ہے۔ یہ فضول بات تھی، سامنے سے آنے والے کو بھلا کون سی رکاوٹ کا سامنا تھا۔ اس کی تسلی کے لیے میں نے پیچھے کا حصہ چھوڑا اور آگے رہنے آگیا۔ ریشم اس وقت صرف دس سال کی تھی۔“

”ریشم تمہاری ایک ہی بیٹی ہے؟“

وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتا رہا۔ ”اس سے بڑا بیٹا تھا، چودہ سال کا تھا کہ گم ہوگیا۔“

”کہاں... کیسے گم ہوگیا؟“

”وہ اسکول میں پڑھتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ شالامار میں مادھو لال حسین کے عرس پر میلا چراغاں دیکھنے گیا تھا۔ سب واپس آگئے، وہ نہیں آیا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ وہ بھیڑ میں کیسے گم ہوا۔ ایک بات سنی تھی میں نے اس کے بارے میں کہ وہ خواجہ سراؤں کی کسی ٹولی میں شامل ہے۔ خدا جانے جھوٹ تھا کہ سچ۔ میں نے اسے تلاش نہیں کیا اور نہ یہ بات اپنی بیوی کو بتائی مگر نہ جانے کیسے ریشم کو پتا چل گئی تھی۔ اس نے مجھے روک دیا کہ ابا! سمجھو اتنے مرے تھے وہ بھی مرگیا۔ اب یہ دس بیٹوں کے برابر ایک بیٹی ہے۔ بڑی ہمت والی ہے۔ دس جماعت سے آگے بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر کیسے پڑھتی۔“

”چاچا! اب تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟ آمدنی کہاں سے ہوتی ہے؟“

”ایسے ہی دودھ اور کچھ انڈے بیچ کے... سبزیاں بھی نکل جاتی ہیں۔ زمین بیکار پڑی تھی جسے ریشم تو کاشت کر نہیں سکتی۔ ایک بندے کو رکھ لیا تھا مگر وہ آدھی پیداوار خود رکھتا ہے۔“

”آدھی کچھ زیادہ نہیں ہے... کیا سب مزارعوں کو اتنا ہی دیتے ہیں؟“

”مزارع کہاں وہ تو مالک سمجھتا ہے خود کو... مجبوری جانتا ہے میری کہ خود یہ کام کر نہیں سکتا۔ بیٹی کے بس کا نہیں فصل اگانے کے لیے ہل چلانا... پانی لگانا اور کٹائی کرنا۔ مجھے تو پتا ہے وہ آدھی سے زیادہ ہی خود رکھتا ہے۔ بے ایمانی کرتا ہے... چور۔“

”پھر بھی تم اسے پال رہے ہو؟“

”میں ایک بیٹی کو پال رہا ہوں۔ یہ سارے کام میرے بس کے ہوتے تو اس کی محتاجی کیوں قبول کرتا۔“

میں نے کہا۔ ”اسے نکال باہر کرو۔ کسی اور کو رکھ لو۔“

”اول تو یہ میرے بس کی بات نہیں۔ زمین سے کون اٹھاتا... پھر اس کی کون سی ضمانت ہے پتر کہ اگلا اس سے بُرا نہیں ہوگا۔ یہ فصل میں ڈنڈی مارتا ہے، وہ قابض ہو جائے زمین پر... پھر... کون کرے گا جھگڑا یا مقدمے بازی۔ میں صبر کرتا ہوں کیونکہ ایک ذمے داری ہے مجھ پر... ریشم... بیاپ سے زیادہ میں اس کا محافظ ہوں۔“

”کسی اچھی سی جگہ اس کا رشتہ کردو۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”اچھی جگہ کیا ہوتی ہے پتر! اچھا گھر... اچھی شکل... اچھی تعلیم... یا اچھا کردار... ریشم کو سب چاہیے اور ایسا خوش نصیب بنایا ہوتا اسے خدا نے تو وہ رحیم بخش کے گھر میں کیوں پیدا ہوتی۔ سب قصوروار مجھے ٹھہراتے ہیں کہ میں نے اسے دسویں تک پڑھنے دیا جس سے اس کا دماغ خراب ہوگیا۔“

”دماغ ان کا خراب ہے جو ایسا سمجھتے ہیں۔“

”لیکن میرے اکیلے کے یہ کہنے سے فرق نہیں پڑ سکتا، سو میں سے ایک بندے کو پاگل کہیں سب تو وہ پاگل... پھر ایسا بھی ہوا کہ رشتے آئے جو میرے خیال میں اچھے تھے۔ ریشم نے کہا کہ زندگی میری ہے، اپنے خیال کو رکھو اپنے پاس۔ میں زبردستی نہیں کرسکتا۔ وہ مانے گی نہیں اور مجھ میں حوصلہ نہیں ہے اور کوئی صدمہ اٹھانے کا... ماں، باپ بھائی اور بیوی کے بعد کیا بیٹی کو بھی گنوا دوں؟“

میرے کچھ کہنے سے پہلے ریشم نمودار ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چنگیر تھی اور دوسرے میں سلور کا گلاس اور جگ۔ ”اب تو ٹھیک ہو تم... چلو کھانا کھاؤ رج کے۔ آج میں نے تمہارے لیے خاص چھولوں والے چاول بنائے ہیں اور دہی منگوایا ہے۔ کھانے کے بعد بھی ایک گلاس پی لینا تو کچھ جان آئے گی۔ رات سونے سے پہلے میں تمہیں بادام گھوٹ کے اور دیسی گھی ڈال کے گرم دودھ دوں گی۔“ وہ اپنے لیے اور برتنوں کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولتی رہی۔

میں نے کہا۔ ”ایسے ہی مارنا تھا مجھے تو بچایا کیوں تھا... ڈوبنے دیا ہوتا۔“

”ہا... ہائے! ایسی کیا بات ہے... سن رہے ہو نا بابا... کیا کہہ رہا ہے یہ مرن جوگا مجھے کہ میں اس کی دشمن ہوں؟ اچھا ہوتا میں نے ڈوبنے دیا ہوتا اسے... مرجاتا اسی کے ساتھ۔ کیا نام ہے اس کا... ہاں نورین جسے روتا رہتا ہے ہر وقت... سچ ہے بھلائی کا زمانہ ہی نہیں۔ اب احسان ماننے کے بجائے الٹا مجھ پر الزام لگا رہا ہے کہ میں اسے مارنا چاہتی ہوں۔“

میں ہنس پڑا۔ ”ریشم! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ بندہ احسانوں کے بوجھ سے بھی تو مرجاتا ہے۔ ہم جو شہری لوگ ہیں نا... اتنا کیسے ہضم کرسکتے ہیں لیٹے لیٹے... ہم تو شہر میں پتلا پانی دودھ پیتے ہیں وہ بھی چائے میں۔“

”کیوں... خالص دودھ پینا منع ہے وہاں؟“ اس نے بھولپن سے پوچھا۔

”یہی سمجھ لو۔ ہم خالص چیزوں کے عادی نہیں رہے۔ یہاں ہوا خالص، سبزی تازہ، دودھ دہی اور گھی اصلی... اور پھر تمہارا یہ... یہ خلوص۔“ میں ’بے غرض پیار‘ کہتے کہتے رک گیا۔ ”اتنی توجہ کون دیتا ہے اور وہ بھی ایک اجنبی کو جس سے نہ لینا دینا... وہاں تو ہر کام کے پیچھے غرض ہوتی ہے کہ فائدہ کیا ہوگا... تم کیا سوچ رہی ہو؟“

وہ چونکی۔ ”یہ خیال کیسے آیا تمہیں کہ میں کچھ سوچ رہی تھی؟“

”تمہاری زبان اتنی دیر بلاوجہ چپ نہیں رہ سکتی۔“

اس نے شکایتی انداز میں باپ سے احتجاج کیا۔ ”دیکھا تم نے بابا۔“

”ریشمے... یہ تو سب ہی کہتے ہیں۔“ رحیم بخش لاڈ سے ہنسا۔ ”سچ کا بُرا کیوں مانتی ہے؟“

”سچ تو یہی ہے کہ میں سوچ رہی تھی۔ وہ گاما کا ماما آیا تھا میرے پاس۔ بڑا مسکین بنا ہوا ہے آج کل۔ کہنے لگا کہ ریشم وہ جو مہمان ہے تیرے گھر میں اسے فوراً چلتا کردے۔ میں نے کہا کہ مدھانی سے سر پھاڑ دوں گی تیرا اور چھری سے یہ تربوز جیسا پیٹ... میرے مہمان سے تجھے کیا تکلیف ہے؟ تیرے باپ کی ہٹی کا کھاتا ہے کمینے... پھر اس نے بتایا کہ خلیفہ اسے ملا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ اس بندے کا نام کیا ہے جسے ریشم نے پانی سے نکالا تھا۔ خلیفہ نے کہہ دیا کہ مجھے تو پتا نہیں... وہ کہہ رہا تھا کہ میں خود ہی آؤں گا تفتیش کے لیے۔ نہر میں گرنے والی گاڑی اس کی نہیں تھی۔ وہ گاڑی میں تو تھا۔ کس کے ساتھ تھا... یہ پکی رپورٹ ہونی چاہیے۔ کل کوئی پوچھ لے پھر... خلیفہ نے بڑی عقل سے کام لیا۔ کہہ دیا کہ تھانے دار صاحب! راہ چلتا کوئی ساتھ بیٹھ گیا ہوگا۔ اس کی گاڑی ہوتی یا بندے واقف ہوتے تو وہ ایسے چپ بیٹھ جاتا۔“

”یہ تو واقعی تمہارے لیے پریشانی کی بات ہوگی۔ یہ پولیس والے مجھے بھی مجرم بنا سکتے ہیں اور خوامخواہ تمہیں مجرم کی مدد کرنے اور پناہ دینے کے الزام میں تنگ کرسکتے ہیں۔ میں چلا جاؤں گا صبح بلکہ راتوں رات۔“

وہ غرائی۔ ”چلا جاؤں گا راتوں رات... کوئی مخول ہے۔ حالت دیکھی ہے اپنی۔ یہ پہلی بار ڈھنگ سے پیٹ بھر کے کھانا کھایا ہے تم نے۔ شکل سے برسوں کے بیمار لگتے ہو ابھی... یہاں سے نکل کے جاؤ گے کہاں پہلے یہ بتاؤ... نہیں، پہلے یہ لسی ختم کرو۔“

میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”ریشم! چاول مزے کے تھے اور واقعی بھوک لگ گئی تھی مگر ایک بالٹی لسی کی اندر ڈالوں گا تو سب باہر آجائے گا۔ کسی گاما کا ماما نہیں ہوں میں۔“

”چل رہن دے پتر... زبردستی نہ کر۔“ میں نے محسوس کیا کہ بڈھا کچھ فکرمند ہورہا ہے۔ وہ اٹھ گیا۔

ریشم نے میری اپیل منظور کرلی۔ ”اب تم یوں کرو پردیسی بابو کہ آج رات ادھر ہی رہو۔ پیچھے والے حصے میں سو جاؤ۔ ادھر ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ کوئی جن بھوت نہیں آتا۔“

میں نے بیچ میں کہا۔ ”آیا تو میں اس سے نمٹ لوں گا گاؤں کی گوری... ڈرنا تو تم سے چاہیے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”مجھ سے سب ڈرتے ہیں۔“

”تم نے بُرا تو نہیں مانا میری بات کا؟“

”میں بُرا مانوں تو منہ پر سنا دیتی ہوں یا ہاتھ مار دیتی ہوں... تم نے ایسا کیا کہا تھا؟“

”گاؤں کی گوری... نام کے بجائے... جو کہ تم ہو۔“

وہ پھر ہنسی۔ ”میں نے بھی تو شہری بابو کہا تھا تمہیں... جو کہ تم بھی ہو... سنو، میں تمہارا بستر اسی تخت پر لگا دیتی ہوں۔ مچھر بہت ہیں ادھر... چادر منہ تک لپیٹ کے سو جانا۔ ابھی کوئی آیا نا تھانے کا بندہ تو میں صاف ٹرخا دوں گی کہ وہ تو گیا اور نام بھی غلط بتاؤں گی۔ میں نے سنا تھا کہ اس تھانے دار کی بہن کی شادی ہے ملتان میں۔ کل یہ جائے گا ہفتہ دس دن کے لیے۔ لوٹ کے آئے گا تو سب بھولا ہوا ہوگا۔ کیا نام بتاؤں میں تمہارا؟“

میں اچانک سوال پر چونکا۔ ”کیا ضرورت ہے اس جھوٹ کی؟ پہلوان اور خلیفہ کو میرا نام معلوم ہے۔“

"وہ گاما کا ماما تو چوچا ہے چوچا۔ کھیلتی ہوں میں اس سنڈے کے ساتھ... میں کہوں نا کہ رات ہے ابھی تو وہ قسم کھا کے بولے گا کہ یہ چاند نہیں سورج ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ چوچا میری مٹھی میں ہے۔ رہ گیا خلیفہ تو وہ میرے بابا کا ایک ہی یار ہے... بابا کو بچانے کے لیے ہی تو اس نے تھانے دار کو ٹالا تھا۔ وہ سب سے پہلے گواہ بنے گا کہ تم سلیم ہو۔"

"سلیم؟ سلیم کون؟"

وہ تنک کے بولی۔ "تم اور کون... اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟ یہ نام اچھا لگتا ہے... شہزادہ سلیم کو دیکھا تھا تم نے مغلِ اعظم میں؟ میں گئی تھی بابا کے ساتھ لاہور ایک مرتبہ داتا دربارؒ کے مزار پر چادر چڑھانے... جب میرا بھائی گم ہوا تھا۔ اس وقت دیکھی تھی۔ ہائے کتنا دل چاہتا ہے میرا پھر دیکھوں... شہزادہ سلیم وہ تھا اپنا دلیپ کمار... اور وہ جو... انارکلی تھی... اللہ... اتنی خوب صورت... اتنی خوب صورت... جب وہ ڈانس آجاتا... پیار کیا تو ڈرنا کیا... میں اتنا روئی..."

میں نے نرمی سے کہا۔ "ریشم! میرے سلیم نام رکھنے سے کچھ نہیں ہوگا... میں دلیپ کمار نہیں بن جاؤں گا۔"

"مصیبت تو ٹل جائے گی۔" وہ تنک کے بولی۔ "میں اتنی فکر کر رہی ہوں تمہاری... تم میری اتنی سی بات نہیں مان سکتے؟ دو چار دن میں ٹھیک ہو کے چلے ہی جانا ہے۔ پھر بے شک اپنا وہی نام رکھ لینا خاور ناور..." اس نے برتن اٹھائے اور غائب ہوگئی۔ پھر آئی تو تخت پر میرے لیے ایک دری بچھا کے سرہانے کی طرف تکیہ رکھ گئی اور ایک کھیس دے گئی۔ اس کی خاموشی سے اس کی ناراضی کا پتا چلتا تھا مگر میں نے بہت غنیمت جانا اور اس سے سبب نہیں پوچھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی یہ دھڑکا ضرور لگا رہا تھا کہ ابھی وہ پھر گرما گرم دودھ کی بالٹی اٹھائے نمودار ہوگی اور کہے گی کہ پیو ورنہ ڈالتی ہوں سر پر... معلوم نہیں تیمارداری کا اس قدر اہم فریضہ اس نے اپنی برہمی پر کیسے قربان کر دیا۔ میں کچھ دیر اندھیرے میں تاروں بھرے آسمان میں دم بدم روشن ہوتے چاند کو دیکھتا رہا۔

از خود میرا ذہن نورین کے تصور میں الجھ گیا۔ چاند میں اس کی شبیہہ روشن ہوگئی۔ پل پل روپ دکھاتا، رنگ بدلتا اس کا چہرہ گزرے وقت کے ہر لمحے کی تصویر بن گیا۔ خوابوں میں، خیالوں میں، سوتے میں جاگتے میں، اندھیرے میں اجالے میں، وہ نیم خواب نیم بیداری جیسی کیفیت تھی جب میں نے نورین کے ہاتھ کا لمس اپنے ماتھے پر محسوس کیا اور اس کے وجود کی مہک نے میرے حواس کو یوں بیدار کیا کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دھندلکے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ نورین... کہاں ہو تم... نورین... نورین... میرے دل کی دھڑکن نے صدا دی مگر میرے گرد رات محیط تھی جس کے سناٹے کو جھینگروں کی صدا منتشر کر رہی تھی۔ چاند خاموش تھا اور ستارے پلکیں جھپکا کے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میری گھڑی میرے ہاتھ پر سلامت رہی تھی۔ ایک واٹر پروف آٹومیٹک گھڑی کو پولیس اور جیل کے مردار خور گدھوں سے بچانے کے لیے مجھے بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔ اس قیمتی گھڑی کے ساتھ ماضی کا ایک جذباتی رشتہ تھا۔

گھڑی میں رات کے بارہ بج رہے تھے۔ دوبارہ سونے کی کوشش میں ناکام ہو کے میں اس مختصر سے احاطے میں ٹہلنے لگا۔ وہاں دیوار کے ساتھ ساتھ سبزیوں کی بیلیں تھیں۔ فالتو زمین کا تین چوتھائی حصہ مختلف سبزیوں نے گھیر رکھا تھا۔ آخری حصے میں مرغیاں تھیں۔ یہ سب بھی ان باپ بیٹی کے باقی رہ جانے والے خاندان کے لیے بقا کا سرمایہ تھا۔ وہ فاضل سبزی اور انڈے کسی کو فروخت کر دیتے تھے۔ سب کچھ دیکھنے کے باوجود میں کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن گزرے وقت کی یادوں کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں... اس وقت کے جال سے رہائی کے لیے وقت کی مہلت درکار تھی۔ یہ وقت کیسے گزرے گا۔ ابھی تک تو میرے ذہن نے مانا ہی نہیں کہ وہ جو تھی... اب نہیں ہے... ندی کا پانی بہہ رہا ہے... بہت آگے نکل گیا ہے... مگر وہ وہیں ہے۔

کیا واقعی وہ وہیں ہے؟ یہ ایک خیال کی چنگاری تھی جس نے مایوسی کی تاریکی میں ایک شعلہ روشن کر دیا۔ میرا دماغ کسی مزاحمت کے بغیر اس خیال کے طلسم کا اسیر ہوگیا کہ مجھے جاننا چاہیے۔ تصدیق کرنا چاہیے، معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔ وہ وہاں نہیں ہوگی... میری طرح کہیں بے خواب نظروں سے چاند کو تک رہی ہوگی۔ بنگال کے ایک شاعر ٹیگور نے کہا تھا، میں چاند کو تکتا رہتا ہوں کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں میری اور میرے محبوب کی نظریں ملتی ہیں۔ یہ مشکل ہو سکتا ہے، ناممکن نہیں ہے۔ میں خود ایک بار پل سے گر کر ندی کی گہرائی تک جا سکتا ہوں تو دوسری بار خود پل سے کود کے اس کی تہ تک کیوں نہیں پہنچ سکتا؟ میں ٹرینڈ اسکوبا ڈائیور نہ سہی... غوطے لگا کے جائزہ تو لے سکتا ہوں۔ پانی کے نیچے جا کے روشنی کہاں تک کام کرتی ہے؟ اگر پاور فل

ٹارچ ہو... ملنے کو تو آکسیجن ماسک بھی مل سکتا ہے... میں کسی پروفیشنل غوطہ خور کی خدمات بھی حاصل کر سکتا ہوں لیکن میری جیب میں تو ایک پیسا نہیں۔

"سلیم!" ریشم نے پیچھے سے اچانک میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں ایک دم چونک کے پلٹا۔

میں نے بھنّا کے کہا۔ "بھاڑ میں گیا سلیم... اور جہنم میں جائے اس کی انارکلی۔"

خلافِ توقع اس نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ "تمہیں نیند نہیں آرہی ہوگی۔ آؤ میرے ساتھ... مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے نرمی سے کھینچا۔

وہ میرے ساتھ تخت پر پیر لٹکا کے بیٹھ گئی۔ "نورین کی یاد آرہی تھی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ریشم! مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مجھے چھوڑ گئی ہے۔"

"آجاتا ہے یقین وقت کے ساتھ۔" اس نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔ "بابا کو دیکھو۔"

"ریشم! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے آنکھوں سے لگا لیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "تم رو رہے ہو؟ مرد ہو کے رو رہے ہو... شرم کرو شرم۔"

"دکھ تو سب کے ایک ہوتے ہیں ریشم... بتاؤ میری مدد کرو گی... ایک تم ہی ہو جس سے میں کہہ سکتا ہوں۔"

وہ مجھے قابلِ ترحم نظروں سے دیکھتی رہی۔ "کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "میں ندی کی تہ میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام بہت مشکل ہے لیکن آسان ہو سکتا ہے اگر میرے پاس ندی کی تہ تک جانے کی آسانی ہو۔ کچھ سامان ہو... مگر وہ سب یہاں ملے گا نہیں... آکسیجن ماسک... ایک طاقتور ٹارچ لائٹ اور پیسے بھی نہیں ہیں میرے پاس کہ شہر سے منگوا لوں۔ بس ایک بار... صرف ایک بار مجھے یقین آجائے... کہ اب وہ نہیں رہی۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔ "تمہاری مشکل میں آسان کر سکتی ہوں۔"

"تم؟ یہ اتنا آسان ہوتا ریشم تو میرے عذاب کا یہ جال کٹ جاتا جس میں میری روح گرفتار ہے۔"

"تم دیکھنا چاہتے ہو نا اپنی آنکھوں سے؟ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں لیکن مجھے یقین نہیں کہ اس کے بعد تم اس کے جادو کے اثر سے آزاد ہو جاؤ گے... چلو اٹھو۔" وہ بڑے عزم سے بولی۔

"کہاں چلوں؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"دیر مت کرو۔ وقت کم ہے اور آج ہی موقع ہے۔ تم دیکھنا چاہتے تھے کہ نورین وہیں ہے یا نہیں، میں دکھاتی ہوں تمہیں... اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی تمہارا دل نہ مانے تو اس کی ذمے دار میں نہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ چلتے چلتے کہا۔ "خدا کے لیے پہلے مجھے سمجھا دو۔ یہ سب کیا ہے... کیا کرنا چاہتی ہو آخر تم؟"

وہ بگڑ گئی۔ "کیسی پنچھی مت والا بندہ ہے۔ خود ہی کہا تھا مجھ سے کہ ندی کے پانی میں اتر کے اسے دیکھنا ہے۔"

"لیکن ریشم... تم کیا کر سکتی ہو... خالی ہاتھ... اور پھر اتنی رات گئے۔"

"اس سے تمہیں کیا... چپ چاپ چلو میرے ساتھ... فجر سے پہلے پہلے ہمیں واپس یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ اس وقت دیکھنے والا کوئی نہیں۔" اس نے جھک کر ایک ڈنڈی اٹھالی۔ "کتے ہوتے ہیں رات کو... کبھی گیدڑ بھی آجاتے ہیں لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔"

"تمہیں کسی سے ڈر نہیں لگتا؟"

وہ مسکرائی۔ "کسی سے کا کیا مطلب... میں خدا سے ڈرتی ہوں... اپنے ابا سے ڈرتی ہوں... اور چھپکلی سے... اور ہاں چوہے سے۔"

"جنگلی جانور... بھیڑیے، چیتے، شیر... یا جن بھوت... وہ مل جائیں راستے میں؟"

"ایسے جانور تو ادھر ہوتے نہیں... کسی نے بھی نہیں دیکھے۔" وہ احاطے کے دروازے سے نکل کے کچے راستے پر سیدھا چلتی گئی۔ "جن بھوت ملے ہیں دوسروں کو... بڑے قصے مشہور ہیں ادھر قبرستان والے پیپل کے... میرا واسطہ نہیں پڑا کبھی۔"

"اور انسانوں سے؟ اس وقت تم ایک اجنبی مرد کے ساتھ ہو... اندھیرا ہے اور دور دور تک کوئی نہیں۔"

"اجنبی مرد۔" وہ طنز اور تلخی سے بولی۔ "ہمت ہے تو زبانی بات کیا... کچھ کر کے دکھاؤ... ہاتھ ہی پکڑ لو میرا۔"

میں نے ایک دم اس کی کلائی تھام لی مگر یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی۔ اس کی گداز کلائی کا لمس محسوس ہونے کے ساتھ ہی جیسے دنیا الٹ گئی۔ زمین پیروں کے نیچے سے غائب

ہوگئی اور آسمان میری ٹانگوں میں سے گزر گیا۔ لمبی گھاس اور مٹی میں لیٹے ہوئے میں نے چاند کو دیکھا جو مجھ پر ہنس رہا تھا۔ فرشِ خاک پر چت پڑا میں خفت سے زیادہ حیرت کا شکار تھا کہ یہ سب کیسے ہوا۔

ریشم نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”لو... اب اجازت ہے۔ پکڑ لو میرا ہاتھ اور اٹھو۔“

میں کپڑے جھاڑ کے کھڑا ہو گیا۔ ”تم جوڈو کراٹے جانتی ہو؟“

”وہ کیا ہوتا ہے... یہ تو کشتی کے داؤ پیچ ہیں۔“ وہ پھر میرے ساتھ چل پڑی۔

”تم... پہلوانی کرتی ہو؟“ میں بھونچکا رہ گیا۔

”پہلوانی؟ پہلوان تو مرد ہوتے ہیں۔ یہ تو ایسے ہی میرے حکم کے غلام اس گامے کے مامے نے میری ضد پر سکھائے تھے سب سے چھپ کر... ابا بھی بہت ناراض ہوتا اگر پتا چل جاتا۔ گامے کا ماما... اصل نام تو اس کا امجد ہے، سب موجو کہتے ہیں۔ میں نے چھیڑنے کے لیے گاما کا ماما کہنا شروع کیا تو سب نے چڑ بنا لی۔ کوئی اور کہہ کے دیکھے... مارنے کو دوڑتا ہے... آس پاس دور تک اس کے جوڑ کا کوئی نہیں... میرے آگے بن جاتا ہے بھیگی بلی... اس سے کہا میں نے کہ مجھے جوڑ سکھا تو پریشان ہو گیا۔ اتنی شرم مجھے نہیں آتی تھی جتنا وہ شرماتا تھا۔ پھر بھی تھوڑا بہت سکھا دیا اس نے... گھبراتا بہت تھا کہ کسی کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔“

وہ چلتے چلتے ایک کنوئیں پر رک گئی۔ اس کی منڈیر پر چمڑے کا ڈول اور ایک موٹی سی رسی بل کھائی پڑی تھی۔ اس نے ڈول کو رسی سے الگ کیا۔ ”یہ ہوگی چالیس ہاتھ کی... ساٹھ فٹ سمجھ لو... شاید کچھ زیادہ ہو... کنوئیں تو بہت ہیں لیکن مجھے پتا تھا کہ یہ رسی ابھی دو ہفتے پہلے کی ہے۔ ایک بندہ گر گیا تھا کنوئیں میں۔ کوئی ملنگ فقیر تھا۔ اصل بات کا پتا صرف مجھے ہے۔ جانو موچی کی بیوی نے خود مجھے بتایا کہ کمینہ نہ جانے کہاں سے آکے ادھر منڈیر پر بیٹھا تھا۔ وہ پانی بھرنے آئی تو اسے چمٹ گیا بھوت کی طرح... اس کے کپڑے پھٹ گئے خود کو چھڑانے میں... لیکن وہ لگا منڈیر سے تو اس نے دھکا دے دیا اور بھاگ آئی۔ جب اسے نکالنے لگے تو بیچ میں ہی رسی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پھر جا کے پانی میں گرا... مر تو بہت پہلے چکا تھا۔ اس وقت کوئی لایا تھا نئی رسی لیکن اب اس کنوئیں سے پانی کوئی نہیں پیتا۔ عورتیں کیا مرد بھی ڈرتے ہیں ادھر آتے ہوئے۔“

”ایک صرف تم ہو جو کسی سے نہیں ڈرتی... دور ہو جائے گی کسی دن یہ غلط فہمی... آخر ہو تو ایک لڑکی۔“

”میں نے کہا نا کہ ڈرتی ہوں چوہے سے اور چھپکلی سے... تم کس سے ڈرتے ہو؟“

”ابھی صرف تم سے... یہ بتاؤ ہم جا کہاں رہے ہیں؟“

اس نے اوپر دیکھا۔ ”بادل آگئے... اچھا ہے چاند کی روشنی بھی نہ رہے۔ آج ندی کا پانی اتر گیا تھا۔ پچھلے ہفتے ادھر بارشیں بہت ہوئیں۔ اسی سے ندی چڑھی تھی۔ کیا پتا کل پھر ہو جائے لیکن اس وقت پانی وہاں چالیس پچاس فٹ ہو گا... پل کے ستون دیکھنے سے اندازہ ہو جائے گا۔ تیرنا آتا ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”آتا ہے لیکن کسی نے دیکھ لیا پھر؟“

”اتنا ڈرتے ہو تو پھر چھوڑو... ڈرنا مجھے چاہیے کہ کسی نے دیکھ لیا تو بابا کو بتائے گا۔ تمہیں کون جانتا ہے یہاں... میں مشہور ہوں... شیطان کی طرح... اچھا، دیکھو یہ وہی جگہ ہے... سامنے پل نظر آرہا ہے نا تمہیں؟“

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر چھوٹا پل ایک لکیر کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔ مشرق کی طرف سے آنے والے بادلوں کی ایک ٹکڑی نے چاند کو ڈھک لیا۔ خاموشی میں بہنے والی ندی کا کنارہ بھی تاریکی میں ڈوب گیا۔

میں نے کہا۔ ”کیا ہم پل پر سے... ریشم... کہاں ہو تم ریشم...“ میں نے ہر طرف گھوم کے کہا۔ میرے قریب رسی پڑی تھی لیکن ریشم جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میری عقل خبط ہو گئی۔ یہ ضرور کسی جن کی بیٹی یا چھلاوا تھی جسے میں نے انسان سمجھنے کی بے وقوفی کی تھی۔ وہ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ لڑکیوں والی کوئی بات ہی نہیں تھی اس میں... مگر اب میں کیا کروں؟

اچانک وہ اندھیرے میں سے نکل آئی۔ ”میں نے سوچا ایک رسی کم ہوگی۔ ادھر تنور والی مائی پھاتاں کا گھر ہے، اس کے کنوئیں کی رسی کھول لائی ہوں۔ صبح اس کے جاگنے سے پہلے واپس رکھ دوں گی۔ اسے پتا بھی نہیں چلے گا۔“ وہ ہنسی۔

میں نے اپنے حق میں یہی بہتر جانا کہ اسے کچھ نہ کہوں۔ بس جو وہ کہہ رہی ہے سنتا رہوں اور جو کر رہی ہے دیکھتا جاؤں... یہاں تک آکے سوچنا کیسا... اچھا برا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ خاموشی سے اس کی اطاعت کرتے رہنے میں ہی عافیت نظر آتی تھی۔

مزید سو گز کے بعد اس نے نشیب پر چلنا شروع کیا لیکن وہ اندھیرے میں ایسے چل رہی تھی جیسے اس کی آنکھیں نہیں دو ٹارچ لائٹس ہیں، اس میں نظر کا کوئی کمال نہیں۔ میں نے سنبھل کر اترتے ہوئے خود کو تسلی دی۔ وہ یہاں بے مہار پھرنے کی عادی ہے اور چپا چپا اس کا دیکھا ہوا ہے۔ صحرانورد ہر سمت ریت کے سمندر میں جہاں عام آدمی سمت کا تصور بھی کھو بیٹھتا ہے، بہ آسانی یوں صحیح راستے پر چلتے جاتے ہیں جیسے ان کے پیروں کے نیچے سڑک ہو۔ اسی خیال کے ساتھ میرا پیر پھسلا اور میں بلندی سے لڑھکنے والے پتھر کی طرح ریشم کو بھی سمیٹ کر نیچے لے گیا۔ یہ بہت مختصر ڈھلوان تھی لیکن وہ بھی گری اور اس کے ساتھ لڑھکنے کے عمل میں ایک بار وہ مجھ پر آئی اور دوسری بار جب میرے نیچے تھی، میں اٹھ کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ”آئی... آئی... میرا مطلب ہے...“

”کون آئی؟“ وہ خفگی سے کپڑے جھاڑ کے بولی۔ ”سنبھل کے چلو۔ بچ گئے ورنہ دونوں جاتے پانی میں۔“

میں کہنا چاہتا تھا کہ آئی ایم سوری مگر خفت، گھبراہٹ اور بدحواسی میں بات 'آئی آئی' سے آگے نہ بڑھ پائی تھی۔ ”میرا مطلب تھا... مجھے افسوس ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”کس بات کا؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہاں تک آکے افسوس ہو رہا ہے۔“

”یار! تمہارے اوپر گرنے کا۔“ میں نے جھنجلا کے کہا۔

”تو کیا تم جان بوجھ کے خود گرے تھے؟ ایسے تو کسی کا بھی پیر پھسل جاتا ہے... چوٹ تو نہیں آئی؟“

مجھے مزید خفت ہوئی۔ وہ جتنی پُراعتماد اور بے خوف تھی، اس سے زیادہ صاف دل اور سادہ لوح تھی۔ یہ تو مجھے اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ چوٹ تو نہیں آئی۔ وہ اچانک رک گئی۔ پل اب میرے بائیں جانب خاصی بلندی پر تھا۔ پانی کی سطح واقعی نیچے ہو چکی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ پک اپ کا ڈھانچا نمایاں ہو جاتا۔ ایک خیال مجھے یہ بھی تھا کہ کہیں سچ مچ پانی کا بہاؤ اس پک اپ کو آگے نہ لے جا چکا ہو۔ تھانے دار کی بے حسی اور عدم فرض شناسی کی انتہا تھی کہ اس نے کوشش کیے بغیر اپنا نظریہ پیش کر دیا کہ پک اپ تو بہہ کر آگے چلی گئی۔ میرے تھانے کی حدود سے باہر... میں کوشش بھی کیوں کروں اسے نکالنے کی... خصوصاً جب مدعی کوئی نہیں... کوئی آکے فریاد کرے کہ تھانے دار صاحب مدد کرو تو بندہ سوچے بھی... اسے تو جلدی تھی شادی میں جانے کی۔

ریشم کنارے سے کچھ اوپر رک گئی۔ یہ ایک پتھر کی چٹان تھی جس کے پیچھے ایک درخت ایستادہ تھا۔ ”اب میں یہاں رسی پکڑ کے بیٹھتی ہوں۔ اول تو ایک کافی ہونی چاہیے۔ تم جاؤ پانی میں اترو۔ گہرائی زیادہ ہو تو واپس آجانا۔ میں دوسری رسی بھی ساتھ جوڑ لوں گی۔ اس کا پچھلا سرا میں درخت سے باندھ رہی ہوں۔ تم رسی کھینچتے ہوئے آجانا یہاں تک... ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟“

میں نے خفگی کا اظہار کرنا بہتر سمجھا۔ ”ڈر کس کا... اتنا بزدل کیوں سمجھتی ہو تم مجھے؟“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمر میں رسی باندھتے ہوئے میری جذباتی کیفیت بہت عجیب تھی۔ میرے ذہن میں ایک انجانا خوف جڑ پکڑ رہا تھا کہ پانی کی تاریک گہرائی میں جا کے میں نے پک اپ کا ڈھانچا تلاش کر لیا... اور کسی طرح اندر پہنچنے میں بھی کامیاب رہا تو کیا میں نورین کی گلی سڑی لاش کو چھو پاؤں گا؟ پانی میں اس کے نازک گلابی وجود کا سارا گوشت گل کے پھول گیا ہوگا۔ وہ گوشت کے ریشے میرے ہاتھ سے نہ چپک جائیں۔ پھر خواہ میں ساری عمر صابن مل مل کے دھوتا رہوں، مجھے اپنے ہاتھوں سے سڑے ہوئے گوشت کی باس آنے لگی۔ اس عورت کا وجود میرے لیے خوشبو کا جھونکا بن کے آیا تھا۔ تاریکی میں جب میری آنکھیں اسے ایک آسیب زدہ حویلی کے اندھیرے میں دیکھنے سے قاصر تھیں تو وہ مسحور کر دینے والی خوشبو میرے حواس پر چھا گئی تھی۔ کیا وہی خوشبو آج ناقابلِ برداشت بدبو ہوگی؟

”شہزادہ سلیم! کیا سوچ رہے ہو... جلدی کرو۔“ ریشم کی آواز آئی۔ ”اور رسی تم نے کپڑوں کے اوپر ہی باندھ لی؟ کپڑوں سمیت پانی میں جاؤ گے تو باہر نکل کے کیا پہنو گے؟“

میں نے اسے پلٹ کے دیکھا۔ ”پھر کیا کپڑے اتار کے جاؤں... تمہارے سامنے؟“

وہ ہنسی۔ ”تمہیں معلوم نہیں... مگر تمہارے وہ کپڑے میں نے ہی بدلے تھے جو تم نے ڈوبتے وقت پہن رکھے تھے۔ اب شرم آرہی ہے۔ میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔“

”لاحول ولاقوۃ... عجیب بے ہودہ باتیں کرتی ہو تم بھی...“ میں نے برہمی سے کپڑے اتار کے کنارے پر رکھے اور کمر سے رسی باندھ کے پانی میں اتر گیا۔

اب بادلوں کا ایک زیادہ بڑا ٹکڑا چاند پر آگیا تھا۔ پانی کی دھندلی سی چمک بھی غائب ہو گئی تھی۔ صرف اس کے بہنے کی خفیف سی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ کنارے ویران تھے اور پل سنسان پڑا تھا۔ یہ کوئی مین روڈ نہیں تھی۔ دن میں

بھی اس سڑک سے کم ہی ٹریفک گزرتا ہوگا۔ پانی اب میری کمر تک آ گیا تھا۔ ریشم مجھ سے دور کچھ بلندی پر بیٹھی ڈھیل چھوڑتی جا رہی تھی۔ یکلخت کوئی گہری جگہ آئی اور میں پانی کے اندر چلا گیا۔ سانس روک کے میں تیزی سے آگے بڑھا... خود مجھے اپنی نظر کی شناخت نہ تھی۔ مجھ سے ریشم نے سو فیصد یقین کے ساتھ کہا تھا کہ یہی وہ جگہ تھی۔ میں نیچے گیا... پھر اوپر آیا۔ تیسری کوشش میں میرے پیر کسی چیز سے ٹکرائے... یہ پتھر کی چٹان نہیں تھی۔ فولاد کا لمس مجھے یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ میں نے پک اپ کے ڈھانچے کو چھوا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب عدم اور وجود کے درمیان کوئی فاصلہ نہ رہا تھا۔ صرف چند منٹ میں یقین کا در بند ہونے والا تھا یا امید کی کرن روشن ہونے والی تھی۔

ایک بار پھر ہمت کر کے میں نے گہرا سانس بھرا اور ناک کو انگلی سے پکڑ کے پانی میں اتر گیا۔ اس بار میرے پیروں نے کسی کھلے دروازے کو محسوس کیا۔ میں نے تصور سے مدد لی۔ پک اپ ترچھی کھڑی تھی۔ اس کے دونوں بائیں جانب کے دروازے جھٹکے اور دباؤ سے کھلے تھے۔ ڈرائیور دائیں طرف تھا۔ گن مین بھی دائیں طرف تھا۔ وہ دروازے باڈی کے اوپر دباؤ ڈالنے کے باعث کھلے نہیں تھے۔ میں اوپر آیا۔ گہری گہری سانسوں سے ہمت بحال کر کے پھر نیچے گیا۔ میرے پیر پانی میں ہاتھوں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ مجھے اگلا دروازہ دیکھنا تھا۔ تھوڑا سا آگے... ایک آخری کوشش نے مجھے تقریباً ڈرائیور کے کیبن میں پہنچا دیا اور میرے ہاتھوں نے کسی نرم گوشت والے جسم کو چھوا۔ میں نے اسے ٹٹولا... باکسر... یہ باکسر تھا جو گاڑی چلا رہا تھا۔

میں نے آخری بار دو منٹ تک سانس بحال کر کے غوطہ لگایا اور اس مرتبہ ٹارگٹ پر رہا۔ میں نے پھر ڈرائیور کی لاش دیکھی۔ دروازہ جو نورین کی طرف تھا، پورا کھلا ہوا تھا لیکن وہاں نورین نہیں تھی۔ کچھ پانی میرے پیٹ میں گیا۔ میں اوپر کی جانب بڑھا۔ میرا شک اب یقین میں بدل رہا تھا۔ وہاں نورین کی لاش نہیں تھی۔ وہ بھی میری طرح باہر پانی میں گری ہوگی۔ ہم دونوں ایک ہی طرف تھے۔ پانی مجھے بہا لے گیا تھا تو اسے بھی لے گیا ہوگا۔ کوئی نہیں جان سکتا کہ کہاں... مجھے تو تیرنا بھی آتا تھا، اس کے باوجود میں کنارے تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ پل سے گاڑی کے ساتھ ندی میں اور گاڑی سے باہر پانی میں گرنے کے بعد کیا نورین کے ہوش سلامت رہے ہوں گے؟ کیا جسمانی طور پر بھی اسے کوئی گزند نہیں پہنچی ہوگی؟ اس کی تو ہڈیاں بھی نازک تھیں اور اسے تیرنا آتا ہوگا تب بھی کیا وہ تیر سکی ہوگی؟ ان سارے سوالات کا جواب نفی میں آتا تھا پھر بھی میں اس موہوم امید سے کیسے دستبردار ہوتا کہ شاید کسی نے اسے بھی بچا لیا ہو۔ میری طرح اسے بھی بے ہوشی کی کیفیت میں بہتے ہوئے پانی سے نکال لیا ہو... اور جیسے میں زندہ ہوں، وہ بھی زندہ ہو۔

کنارے پر آ کے میں بے سدھ گر گیا۔ ”وہ مجھے نہیں ملی۔“

ریشم نے مجھ پر جھک کے کہا۔ ”تم نے اچھی طرح دیکھا؟“

”ہاں، اس کی لاش گاڑی میں نہیں ہے... ڈرائیور کی لاش پھنسی ہوئی ہے۔“

”تمہارا بچ جانا ایک معجزہ تھا... اور کیا کہا جا سکتا ہے۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ پانی اسے بھی بہا کے لے گیا ہو... کسی ریشم نے اسے بھی بچا لیا ہو۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”خدا کرے کہ ایسا ہی ہوا ہو۔ ایسی صورت میں اس کا زیادہ دور بہہ کر جانا مشکل تھا۔ کسی نے اسے نکالا ہوگا تو وہ آس پاس کے کسی گاؤں میں ہوگی۔ یہاں ہوتی تو اب تک مجھے معلوم ہو جاتا۔“

”اور کون سا گاؤں ہے یہاں؟“ میری بے چینی بڑھ گئی۔

”ہر طرف گاؤں ہی گاؤں ہیں۔ دوسرے کنارے پر تھوڑا سا آگے بھاگری ہے... وہاں سے معلوم کیا جا سکتا ہے اور آگے پیچھے دوسری آبادیوں سے بھی۔“

”تم نے مجھے نئی امید دی ہے ریشم۔“

”دنیا امید پر قائم ہے... کیا اسے تمہاری تلاش نہیں ہوگی... وہ تمہیں یاد نہیں کرتی ہوگی؟“

”اگر وہ زندہ ہوگی تو... مجھے یقین ہے کہ مل جائے گی۔“

”مگر کہاں؟ اسے تلاش کرنا ہے تو ابھی کچھ دن یہاں رک کے دیکھو... آس پاس معلوم کرو... کیا پتا وہ خود بھی تمہیں تلاش کرتی ہوئی آ جائے۔“

”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ ابھی کچھ دن مجھے یہیں رک کے دیکھنا چاہیے... لیکن... مجھے اچھا نہیں لگتا تم پر بار بن کے رہنا۔“

”فضول بولنے سے بہتر ہے بندہ منہ بند رکھے۔ یہ بتاؤ تمہارے ساتھ سامان بھی تھا... وہ کہاں گیا؟“

”سامان؟ اس کا تو مجھے خیال نہیں آیا... ایک سوٹ

کیس میرا تھا۔ ایک نورین کا... کیا پتا نیچے پڑے ہوں۔"
"ابھی موقع ہے... چاہو تو دیکھ لو۔"
ریشم کی باتوں نے مجھے نئی امید اور نیا حوصلہ دیا تھا۔ میں نے پھر کمر سے رسی باندھی اور پانی میں اتر گیا۔ اس مرتبہ مجھے پک اپ کے اندر نہیں باہر ندی کی تہ کو کھنگالنا تھا۔ یہ کام نسبتاً آسان تھا۔ میں یہ کام اپنے پیروں کی مدد سے کر سکتا تھا۔ نورین اور میرے سوٹ کیس پیچھے ہی تھے اور دروازہ کھلنے سے ایک ساتھ ایک ہی جگہ گرے ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پانی دونوں میں بھر گیا ہوگا لیکن اسی کے بوجھ سے وہ نیچے بیٹھ گئے ہوں گے۔ جو کچھ ان سوٹ کیسوں میں تھا، پانی میں بھیگ سکتا تھا۔ پانی سے ضائع بھی ہو سکتا تھا۔
وہ تیسری چوتھی کوشش تھی جب میرے پاؤں کے انگوٹھے نے سوٹ کیس کے ہینڈل کو چھوا۔ میں اوپر آیا اور سانس بحال کر کے غوطہ مارا... اب میرے ہاتھ نیچے کی طرف تھے۔ اندازے سے میں سیدھا وہاں گیا جہاں میں نے سوٹ کیس کی موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ میرے ہاتھوں نے سوٹ کیس کو چھوا جو نرم مٹی میں یوں سیدھا کھڑا تھا کہ اس کا ہینڈل اوپر تھا۔ میں نے ہینڈل کو گرفت میں لے کر زور لگایا تو سوٹ کیس اوپر اٹھا... پھر ریشم نے رسی کھینچی۔ میں پانی کی سطح پر ابھرا... کنارے تک تھوڑا سا فاصلہ میں نے تیر کر طے کیا اور سوٹ کیس کو پانی سے باہر آ کے کھینچا... کچھ اوپر سے ریشم نے میری کوشش کی کامیابی کو دیکھا اور چھلانگ مار کے نیچے آ گئی۔
"تم اسے سنبھالو... میں پھر جاتا ہوں... ایک سوٹ کیس اور ہے... شاید وہ بھی مل جائے۔"
"ہوگا تو آس پاس ہی ہوگا۔" اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے سوٹ کیس کو ترچھا کیا تاکہ پانی نکل جائے۔
ایک کامیابی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔ رسی اب بھی میری کمر کے گرد پھنسی ہوئی تھی اور اس کا آخری سرا درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا مگر درمیان کا حصہ ریشم کے ہاتھ میں تھا۔ میں ہلکا سا جھٹکا دیتا تھا اور وہ مجھے کھینچ لیتی تھی۔ کچھ میں اوپر کی طرف زور لگاتا تھا۔ اس طرح مشقت بہت کم ہوتی تھی اور خطرہ کوئی نہیں رہتا تھا۔ دوسری بار نیچے جا کے مجھے زیادہ تلاش کرنا پڑا۔ میرا اپنا سوٹ کیس جو چھوٹا تھا لیکن اس میں دس لاکھ کے بھیگے ہوئے نوٹ کسی غرق شدہ خزانے کی طرح تھے۔ جو زیورات نورین کے سوٹ کیس میں تھے، ان کا اندازہ بھی میں نے ایک مرتبہ اتنا ہی لگایا تھا۔ ان کی مالیت زیادہ ہو سکتی تھی کم نہیں۔

بالآخر میرے پیروں نے ندی کی تہ میں اپنا سوٹ کیس بھی تلاش کر لیا۔ یہ سیدھا پڑا تھا اور کیچڑ میں دھنس گیا تھا۔ اسے اٹھانے کے لیے مجھے سر کے بل جا کے دونوں ہاتھ استعمال کرنا پڑے۔ میرا سانس اکھڑنے ہی والا تھا کہ میں سطح پر آ گیا۔ ایک گہرا سانس لے کے میں کنارے پر گر گیا۔ اس مشقت نے میرے جسم سے ساری توانائی لے لی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاید میں کھڑا ابھی نہیں ہو سکتا مگر کچھ دیر لمبے سانس لینے کے بعد میں کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ ریشم بڑی غیر معمولی ہمت والی لڑکی تھی۔ اسے خیال تھا صرف میرے کام آنے کا... وہ سوٹ کیس کھولنا چاہتی تھی لیکن ان کی زپ میں ریت پھنس گئی تھی اور پانی بھر گیا تھا۔
میں نے ایک طرف جا کے اپنے خشک کپڑے جسم پر چڑھائے اور پھر دونوں سوٹ کیس کھینچ کے باری باری ایک گوشے میں لے گیا جہاں ہر طرف جھاڑیاں تھیں۔ ہمارے اوپر ایک درخت کی پھیلی ہوئی شاخیں سایہ فگن تھیں چنانچہ ہم دیکھنے والوں کی نظروں سے محفوظ تھے۔ سوٹ کیسوں میں سے پانی تو رس کے خارج ہو گیا تھا لیکن ان کا وزن اب بھی کم نہ تھا۔ انہیں کھولنے کا اب ایک ہی طریقہ تھا کہ تالے توڑ دیے جائیں اور موٹے کینوس کو پھاڑ کے ضروری سامان نکال لیا جائے یا پھر میں دونوں سوٹ کیس اٹھا کے ریشم کے گھر لے جاؤں۔ یہ کام تقریباً ناممکن تھا۔ نہ میں بڑا سوٹ کیس اٹھا سکتا تھا اور نہ ریشم کے لیے چھوٹا سوٹ کیس اٹھانا ممکن تھا۔ بھیگ کے ان کا وزن دگنا ہو گیا تھا اور ہمیں واپس پیدل چل کے کم سے کم ایک میل تو جانا تھا۔
ریشم نے میری مایوسی دیکھ کے پوچھا۔ "کیا ہے ان میں... کپڑوں کے علاوہ؟"
میں نے کہا۔ "اگر میں کہوں... لاکھوں کا مال اور لاکھوں نقد... پھر؟"
وہ ہنسی۔ "پھر مجھے کیا... میں کہوں گی جیسے یہ مال ملا ایسے ہی نورین بھی مل جائے گی۔"
میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ واپس پہنچتے پہنچتے چار سوا چار ہو جائیں گے۔"
"پانچ بجے صبح کی اذان ہوتی ہے۔"
"ابھی ان سوٹ کیسوں کا میں کیا کروں۔ ایسی کوئی جگہ ہے جہاں میں انہیں چھپا دوں؟ ساتھ لے کر جانا تو بہت مشکل ہے اس وقت۔ اگر کھول سکتا تو فالتو چیزیں سب پھینک دیتا جو بھیگ کے ضائع ہو گئی ہوں گی۔"
"ہے ایک چیز... اس سے تمہارا کام بن جائے گا۔"

وہ بولی اور اچانک اپنی ڈب سے ایک خنجر نکال لیا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ... ایسی چیز کیوں رکھتی ہو تم اپنے پاس؟"
"اپنی حفاظت کے لیے اور کس لیے۔" اس نے کمانی والا چاقو بڑی مہارت سے کھولا تو اس کی آواز خاموشی میں کچھ زیادہ ہی گونجی۔ "اگر میرا بس چلتا تو میں ریوالور رکھتی اپنے ساتھ۔"
"کیسی لڑکی ہو تم... تمہیں ڈر نہیں لگتا ایسی خطرناک چیزوں سے؟"
"یہ تو حفاظت کے خیال سے رکھتی ہوں... ڈر مجھے بھی لگتا ہے وحشی درندوں سے... جو میرے آس پاس ہیں۔"
میں نے کہا۔ "لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ یہاں شیر چیتے بھیڑیے نہیں ہیں۔"
وہ ہنسی۔ "ان سے زیادہ خطرناک دو ٹانگوں پر چلنے والے درندے تو ہیں... یہ لو۔"
میں نے خنجر لے لیا۔ "آج تک کبھی اس کے استعمال کی ضرورت پڑی ہے؟"
"ابھی تک تو میری زبان کی کاٹ سے ہی ڈر جاتے ہیں لوگ... لیکن مجھے معلوم ہے کہ مرد پر خون سوار ہو یا ہوس تو اس کی شرافت، انسانیت، عقل سب بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس وقت میرے جیسی ایک کمزور عورت خود کو کیسے محفوظ رکھ سکتی ہے؟ اور جیسے بھوکے بھیڑیے غول کی صورت میں پھرتے ہیں ایسے ہی یہاں آتے جاتے اکیلی عورت کسی کے ہاتھ لگ جائے تو ایسا بھی ہوا ہے کہ اس پر ایک غول نے حملہ کر دیا۔ دو چار اپنی حیوانیت کی تسکین کر کے بھاگ گئے۔ عورت صرف بدنام ہوئی۔ میرا تو کوئی بدلہ لینے والا بھی نہیں۔ ایک بوڑھا باپ ہے۔"
میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ "اتنا بھروسا ہے تمہیں اس خنجر پر... جیسے یہ توپ ہے یا بم۔"
"کچھ تو ہے... جیسے تم حیران ہوئے... اچانک نکال لوں تو سنبھلنے سے پہلے حملہ آور کا پیٹ پھاڑ دوں... خیر، اب تم باتوں میں وقت مت ضائع کرو... کام کرو اپنا۔"
میں نے تیز دھار کے چھ انچ پھل والے خنجر سے سوٹ کیس کو کسی بدخواہ کے پیٹ کی طرح پھاڑ دیا جیسے کہ ابھی ریشم نے کہا تھا۔ اندر گیلے کپڑے، جوتے، سب ضائع ہو چکے تھے۔ میں نے چھوٹے سوٹ کیس کی زپ کاٹی تھی تاکہ اسے میں استعمال کرنا چاہوں تو وہ قابل استعمال ہو۔ میں نے اس

میں اپنے دو پانی میں تربتر جوڑے رکھے۔ ایک جوڑا جوتوں کا ڈالا۔ اصل چیز نورین کے زیورات تھے جو اس کے بیگ میں بند تھے۔ میں نے اس بیگ سے پانی خارج کیا اور اسے اپنے سوٹ کیس میں ڈال لیا۔ دس لاکھ کے نوٹ جو میرے ہی سوٹ کیس میں تھے، یقیناً بھیگ کر اتنے نرم پڑ چکے ہوں گے کہ انہیں الگ کرنے کی کوشش سے ان کے ٹکڑے ہو جاتے۔ انہیں بعد میں احتیاط سے دھوپ میں سکھانا اور پھر استری کر کے سیدھا کرنا ضروری تھا۔ سونے کے بھاری پن اور ہر چیز کے نم ہونے کے باعث وزن کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے کپڑے، جوتے نکال کے واپس بڑے سوٹ کیس میں ڈالے اور اس کو رسی کے ایک ٹکڑے سے باندھ کے واپس ندی میں پھینک دیا۔ چھپاک کی آواز کے ساتھ وہ ہمیشہ کے لیے دریا کی تہ میں بیٹھ گیا۔
چاقو سے رسی کا ایک اور ٹکڑا کاٹ کے میں نے چھوٹے سوٹ کیس پر لپیٹا اور اسے کندھے پر اٹھا لیا۔ "چلو۔"
ریشم نے ہاتھ بڑھایا۔ "میرا چاقو۔"
میں نے ہاتھ گھما کے چاقو کو بھی ندی میں پھینک دیا۔ "تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔"
وہ چلائی۔ "یہ کیا کمینہ پن ہے؟"
میں نے کہا۔ "تم جتنی گالیاں چاہے دو۔ میں سمجھتا ہوں یہ تم جیسی لڑکیوں کا اسلحہ نہیں ہے۔"
"پھر کیا ہے۔ توپ، ٹینک اور مشین گن... ایٹم بم۔"
"تمہاری اصل قوت ہے تمہارا اعتماد... خدا پر بھروسا... آؤ چلیں۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ویسے تو تم جیسی لڑکیاں چلتا پھرتا اسلحہ خانہ ہوتی ہیں۔ ان کا حسن و شباب... ناز و ادا... کون قتل نہیں ہوتا ان سے۔"
"بکواس مت کرو... تم جیسے مرد ایسی ہی باتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔" اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔
"دنیا کی ہر عورت کے پاس یہ اعتماد ہو جو تمہاری طاقت ہے، تو مرد اپنی ساری مردانگی بھول جائیں... مجھے حیرت ہوتی ہے اس چھوٹے سے گاؤں میں تم جیسی ذہین، باہمت اور بہادر لڑکی کو دیکھ کے... یہ نہ میٹرک پاس ہونے کی بات ہے نہ ایم اے، پی ایچ ڈی ہونے کی... عزت سے زندہ رہنے کا فن کتابوں اور ٹی وی ڈراموں سے نہیں ملتا... آج تم نے جس طرح میری مدد کی ہے، اس کے بعد تمہاری عزت میرے دل میں کئی گنا بڑھ گئی ہے۔"
اس نے کچھ بدلے ہوئے موڈ میں کہا۔ "خنجر میں پھر

خرید لوں گی۔ تمہارے پیسوں سے... تم لا کے دو گے مجھے۔"

"مجھے لا کے دینا ہوتا تو چھینتا ہی کیوں؟"

"اپنی حرکت پر معافی بھی مانگو گے تم۔" اس نے پورے یقین سے کہا۔

"ورنہ؟" میں نے اسے چھیڑا۔ "بولو... ورنہ کیا کرو گی تم؟"

میرے بار بار پوچھنے کے باوجود جواب نہ دے کر اس نے جواب دے دیا کہ وہ مجھ سے بات نہیں کرے گی۔ ہر عورت کا اپنی بات منوانے کے لیے حربہ نمبر ون۔ روٹھنا... اس کے بعد آنسو... آخری مرحلہ میکے جانے کی یا مرنے کی دھمکی... دوسرے حملے میں ننانوے فیصد مرد ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ میں اس کے ساتھ خاموشی سے چلتا گیا۔ واپسی کا راستہ مجھے اتنا لمبا محسوس نہ ہوا۔ ریشم نے تنور والی مائی کے گھر میں رسی باہر سے اندر اچھال دی۔

"صبح شور کرے گی کہ کوئی کمینہ رات کو رسی میں سے آدھی کاٹ کے لے گیا۔ اس کی گالیوں کا مزہ لینا ہو تو سن کے دیکھو... ایسے ایسے استعمال بتائے گی چوری ہونے والی رسی کے... کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔" ریشم کا موڈ اب ٹھیک ہو گیا تھا۔

میرے واپس پہنچنے کے کچھ دیر بعد گاؤں کی کسی مسجد سے اذانِ فجر کی صدا آئی۔ اس وقت تک ریشم نے پچھلے حصے کا کمرا کھول کے میرا ٹھکانا وہیں بنا دیا تھا۔ "تم یہاں رہو گے۔ اور خیال رکھنا... تمہارا نام سلیم احمد ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم خاتون... لیکن ابا کو کیا کہو گی؟"

"وہ میرا کام ہے۔ ابا کو بھروسا ہے مجھ پر... وہ منع نہیں کرے گا۔ اب تم سو جاؤ... میں بھی تھک گئی ہوں۔"

واپس آنے کے بعد میرے خیالات اور ذہنی حالت دونوں میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ نورین کی لاش کا نہ ملنا اس کے زندہ ہونے کی کوئی قطعی ضمانت نہیں تھی مگر وہ میرے تصور میں ضرور زندہ ہو گئی تھی۔ وہ تہِ آب گلنے سڑنے والی کوئی لاش نہیں رہی تھی، ایک مبہم سا خیالی پیکر بن گئی تھی۔ کیا پتا وہ کہیں ہو... جہاں بھی ہو گردشِ وقت اسے پھر مجھ سے ملا دے... اس کے اور میرے راستے پھر ایک کر دے۔ اگر بلا ارادہ ہمیں قسمت ملا سکتی ہے تو ارادے کے ساتھ کوشش کیوں نہیں ملا سکتی؟ جیسے میں اس کے لیے بے قرار اور سرگرداں ہوں، وہ بھی تو ہو گی... بقول شاعر... جن کو ملنا ہو وہ ہر حال میں مل جاتے ہیں... خواہ وہ شادی ہال ہو۔

میرے اعتماد کا گراف ایک بار پھر آسمان کی بلندی کو چھو رہا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں محفوظ تھا اور مجھے ریشم ایسے مل گئی تھی جیسے کسی مجبور کی لاٹھی گم جائے تو اسے پیسا بھی مل جائے۔ اب میں خالی ہاتھ بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں گیلے نوٹوں کو خشک کر کے قابلِ استعمال بنا لوں گا۔ جتنا پانی سوٹ کیس میں تھا، رس کر بہہ چکا تھا۔ باقی رفتہ رفتہ ہوا کھینچ لے گی۔ میرے پاس زیور بھی تھا جو نورین کی امانت تھا۔ اس کی تلاش کے لیے مجھے ریشم کے ساتھ مل کے ایک پلان تشکیل دینا تھا۔ وہ زندہ ہو گی تو اسی علاقے میں ملے گی۔ آٹھ دس میل کے دائرے میں... ندی کے ساتھ والے کسی گاؤں میں۔

تصور میں گزرے واقعات کی فلم دیکھتے دیکھتے مجھے نیند نے آلیا۔ اچانک گہری نیند سے میری آنکھ کھلی تو دوپہر ہونے کو تھی۔ بند دروازہ تھوڑا سا کھل گیا تھا۔ اس میں سے دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ چارپائی کے نیچے آخری حصے میں دیوار کے ساتھ رکھے سوٹ کیس سے رسنے والا پانی ایک دھارے کی صورت میں دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو رات کو بکھرے ہوئے نظر آنے والے بادل اکٹھے ہو کے آسمان پر پھیل گئے تھے اور برسنے کے لیے تیار تھے۔ مجھے یہ ایک اور نئی زندگی کا نیا دن لگا۔ جیسے جیل کی کال کوٹھری میں پہلا دن لگا تھا یا باہر آ کے نورین کے ساتھ آزادی کا پہلا دن محسوس ہوا تھا۔ شاید یہی مرمر کے جینا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ موت کے سوا کوئی مستقبل دکھائی نہیں دیتا۔ راستے مسدود نظر آتے ہیں۔ امید ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ پھر جیسے دستِ غیب پورا منظر نامہ بدل دیتا ہے کہ ابھی مہلت تمام نہیں ہوئی۔

مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ گزشتہ رات کی محنت کا نتیجہ بھی تھا اور کچھ طبیعت کی بحالی کا... وقت بڑا چارہ گر ہے... بڑے سے بڑے غم کا مداوا فراہم کر دیتا ہے۔ آج تیسرا دن تھا اور میرے ذہن نے جذباتی سہارے تلاش کر لیے تھے۔ امید سب سے بڑا سہارا تھی جو مر کے زندہ ہوئی تھی۔ نورین کا پھر ملنا اب ناممکن نہیں رہا تھا۔ اعتماد کے لیے محض ارادے کافی نہیں ہوتے، وسائل بھی درکار ہوتے ہیں۔ اب میں تہی دست اور محتاج نہیں تھا۔ میں سوچ سکتا تھا اور پلان کر سکتا تو عمل کے وسائل بھی رکھتا تھا۔ فی الحال کچھ عرصہ اس جگہ قیام میری مجبوری بھی تھا اور ضرورت بھی۔ یہاں میں دشمن کی متلاشی نظر سے محفوظ تھا اور اگر نورین مجھے مل سکتی تھی تو اسی علاقے میں۔

بابا رحیم حقہ اٹھائے گڑگڑ کرتا نمودار ہوا۔ "بہت دیر سوئے پتر! جی تو ٹھیک ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے... آپ کی کوشش ہے کہ میں بہت اچھا ہو گیا۔"

"ہماری کیا کوشش... اس سوہنے رب کی رضا ہے۔ ریشم نے بتایا کہ کچھ دن ادھر ہی رکنا منظور کر لیا ہے تم نے۔"

میں نے کہا۔ "یہی بہتر ہو گا۔ اگر میری وجہ سے آپ کو تکلیف نہ ہو۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "لو... تم نے کیا میرے مونڈھے پر چڑھ کے پھرنا ہے۔ یہاں کون رہتا تھا۔ جگہ آباد ہو گئی خیر سے۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ ادھر بھی اچھے برے لوگ ہیں۔ بندہ خود ہی برائی سے بچے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ "آپ فکر نہ کرو چاچا۔ مجھے مشورہ دینے والی ہے آپ کی بیٹی ریشم اور اس کے ہوتے نہ مجھے کسی کی فکر ہونی چاہیے نہ آپ کو۔"

وہ کچھ خاموش ہو گیا۔ "ہاں، ریشم بڑی سیانی ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ صرف سیانی کہتے ہو... میں نے بڑے شہر دیکھے ہیں لیکن اس چھوٹے سے گاؤں کی ریشم جیسی ذہین، ہمت والی اور نیک سیرت لڑکی نہیں دیکھی۔ اگر موقع ملے تو وہ اپنا اور آپ کا نام دنیا میں روشن کر سکتی ہے۔"

"لڑکیوں کے نصیب اچھے ہونے چاہئیں پتر... باقی سب کون دیکھتا ہے۔" اس نے میری بات ختم ہونے سے پہلے کہا اور پلٹ گیا۔ "میں کہتا ہوں ریشم سے کچھ کھانے کو لائے تیرے لیے۔ پتا نہیں کیوں آج وہ بھی سوتی رہی۔ نماز کے لیے بھی نہیں اٹھی۔"

بیٹی پر بیٹوں سے زیادہ اعتماد کرنے والا بڈھا رات کو سکون سے سو سکتا تھا۔ اسے یہ فکر جگائے نہیں رکھتی تھی کہ رات کو لٹیرے ڈاکو آ گئے تو وہ کیا کرے گا۔ اس کا سارا خزانہ ایک بیٹی تھی۔ اس اعتماد کے باوجود اندر سے وہ روایتی باپ تھا جو بیٹیوں کے لیے صرف اچھے نصیب مانگتے ہیں۔ نصیب سے ان کی مراد اچھا شوہر، اچھا گھر اور اچھی اولاد کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ گاؤں کے معیار سے ریشم بہت پہلے شادی کی عمر سے گزر چکی تھی۔ وہ عام لڑکی ہوتی تو کب کی وداع ہو جاتی اور کسی عام دیہاتی کے گھر میں زندگی کے لگے بندھے معمولات اپنا کے مطمئن رہتی لیکن وہ بدقسمتی سے عام لڑکی نہیں تھی۔ کچھ اسے پسند ضرور کرتے ہوں گے لیکن ایک بیوی کے طور پر نہیں... اکثر کو وہ قبول نہیں کرتی تھی اور یہی بابا رحیم بخش کی زندگی کا آخری کام تھا جس کے لیے وہ دستِ دعا اٹھا کے خدا سے مدد مانگتا تھا۔

ریشم رات والے کپڑے بدل چکی تھی اور اس وقت بسنتی زرد رنگ کے سوتی جوڑے میں مرغیوں کے انڈے جمع کرتی پھر رہی تھی۔ "مرجانی... سارا دن کھاتی ہے اور انڈا دو دن بعد ایک دیتی ہے... اور یہ... اسے تو اب ذبح کر دینا چاہیے۔ اتنے چھوٹے انڈے دینے لگی ہے حرام خور... کبوتر نہ پال لو اس کی جگہ... چل کمینے... بے شرم۔" اس نے مرغے کو ایک ہاتھ مارا۔

وہ ڈربے میں منہ ڈالے خود سے ہمکلام تھی۔ مجھے ہنسی آئی۔ "یہ تمہاری زبان سمجھتی ہیں۔"

وہ ایک دم پلٹی۔ "مجھے آتا ہے اپنی زبان سمجھانا۔ یہ انڈے اکٹھے کر لوں پھر بناتی ہوں لسی اور پراٹھا تمہارے لیے۔"

میں نے ہاتھ جوڑے۔ "لسی کی جگہ آج مجھے چائے نہیں مل سکتی اور مکھن کی جگہ آملیٹ؟"

"ہمارے ہوٹل میں سب ملتا ہے سر... یہ انڈے پکڑیں۔" اس نے کوئی ایک درجن انڈے اٹھائے۔ "جھولی کریں جھولی۔"

اس نے تین ڈربوں سے تین درجن انڈے جمع کیے اور میں جھولی پکڑے اس کے ساتھ چلتا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد مجھے ناشتا نصیب ہوا مگر ایسے ناشتے کے لیے میں آدھا دن بھی انتظار کر سکتا تھا۔ پراٹھا گرم اور خستہ تھا اور آملیٹ جیسا اس نے بنایا تھا، میں نہیں بنا سکتا تھا حالانکہ مجھے مہارت کا دعویٰ تھا۔ چائے البتہ خالص دیہات کے کلچر کی ایک صحت بخش گاڑھا میٹھا مشروب تھی۔ دودھ میں چورا پتی ڈال کے اسے دس پندرہ منٹ گلایا گیا تھا اور اس شیرے کو کپڑے سے چھان لیا گیا تھا۔

اپنے خزانے کو میں ساری دنیا سے چھپا کے رکھ سکتا تھا مگر ریشم سے نہیں۔ یہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا اور اس کا فائدہ نہیں نقصان ہوتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب میں نوٹوں کو دھوپ لگانا چاہتا تھا، رحیم بخش مجھے اپنی زمین پر لے گیا۔ وہاں کالی داڑھی والا ایک دراز قامت سیاہ فام چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔ "یہ شاہ محمد ہے۔ شامو کہتے ہیں سب۔ میری زمین یہی کاشت کرتا ہے۔"

"اور پیداوار میں نصف کا شریک بن جاتا ہے۔"

"اگو نصف تک قناعت کرتا تو بھی غنیمت ہوتا۔ دو سال سے یہ بدنیتی پر اتر آیا ہے۔ فصل کے تول میں سے تین چوتھائی خود لے جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ ”تم اپنے سامنے نکلواتے ہو؟“

”ہاں مگر یہ بے ایمان رات کو کھلیان سے چوری کرتا ہے۔ لوگوں نے اسے دیکھا ہے اور مجھے بتایا بھی مگر یہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔ میرے لیے چوبیس گھنٹے چوکیداری کرنا کیسے ممکن ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پھر نکال باہر کرو اسے... زمین اور کسی کو دے دو۔“

”دوسرے بھی فرشتے تو نہیں ہیں۔ کوئی تھوڑا کوئی زیادہ... پورا ایمان دار تو خود زمین کا مالک ہوسکتا ہے مگر اس عمر میں یہ سب میرے بس کی بات نہیں رہی اس لیے چل رہا ہے۔“

شامو غالباً ہماری آوازوں سے بیدار ہوگیا تھا مگر وہ سر ڈھانپے یہ باتیں سنتا رہا۔ اس نے چادر یہ دیکھنے کے لیے ہٹائی ہوگی کہ آج بابا رحیم اس کی شکایت کا دفتر کس کے سامنے کھول کے بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی شک آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ کے کہا۔ ”یہ کون ہے؟“

”بوائی کے لیے یہ زمین میں نے لے لی ہے... اگلی فصل سے۔“ میں نے بابا رحیم سے پہلے جواب دیا۔

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے چاچا رحیم بخش؟“ اس نے درشتی سے کہا۔

”ایسا ہوگیا ہے۔ یہ تمہاری سمجھ میں آجانا چاہیے شامو۔ پیداوار کے اندازے کے لیے اس بار... فصل کی کٹائی پر میں تمہارے ساتھ یہاں رہوں گا۔ دانے دانے کا حساب کروں گا۔“

شامو نے رحیم بخش سے بات جاری رکھی۔ ”چاچا! تم زمین گاؤں سے باہر کے بندے کو نہیں دے سکتے۔“

میں نے رحیم بخش کو اشارے سے روک دیا۔ ”یہ کون سی قانون کی کتاب میں لکھا ہے اور تم سے کس نے کہا ہے کہ میں گاؤں سے باہر کا ہوں... میرے دادا پردادا اسی گاؤں کے تھے۔ گوروں کے وقت فوج میں بھرتی ہوکے بہت سے لوگ گئے تھے۔ ان کی اولاد کا رشتہ تو ختم نہیں ہوا گاؤں سے؟“ میں نے درمیان میں جو شاندار گالی صحیح لہجے میں فٹ کی تھی، اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

صلح جو بابا رحیم بخش نے کہا۔ ”سچ کہتا ہے سلیم... اس کا دادا لام پر گیا تھا میرے سامنے... وہ لوٹ کے نہیں آیا تھا، اس کا دادا فوت ہوا تو ماں اسے لے کر اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھی، وہ بیوہ تھی۔“

شامو اس خودساختہ تاریخ کو کیسے جھٹلاتا جس کا میں زندہ کردار بن گیا تھا اور بابا رحیم بخش ایک گواہ۔ ”تم ایسے کھڑے کھڑے فیصلہ نہیں کرسکتے چاچا۔“

میں نے کہا۔ ”چلو کہیں بیٹھ کے فیصلہ کرلیں گے، چار بندوں کے سامنے۔“

شامو کے لیے یہ بے عزتی اور صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ ”صاف کہو نا رحیم بخش کہ گھر داماد مل گیا ہے۔“

میں نے پلٹ کے کہا۔ ”تم تو ہو نہیں سکتے تھے۔ پہلے سے بیوی بچوں والے ہو... لیکن میرے بارے میں اور کچھ کہا تو مار کے اسی کھیت میں زندہ گاڑ دوں گا۔ ابھی اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔ دیکھتا ہوں کون آتا ہے تمہارا حمایتی۔“

شامو کی سٹی گم ہوگئی۔ میرے تیور سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں جو کہہ رہا ہوں، کر بھی سکتا ہوں۔ رحیم بخش مجھے واپس لے گیا۔ ”جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں پتر! یہ بکواس کرتا پھرے گا گاؤں میں... تم تو چار دن ہو یہاں... بعد میں میرا، ریشم کا کیا ہوگا... میری زندگی کتنی باقی ہے۔“

”زمین اس کے نام کرو یا دے دو کسی کو... قبضے سے تو بہتر ہے... ریشم کو بھی رخصت کرو۔“

”یہ کیا میرے اختیار میں ہے؟“ اس نے ایک گہری سانس لی اور باہر نکل گیا۔ اس کے لہجے میں ناراضی، اداسی، بے بسی اور میرے سوال پر حیرانی سب کچھ شامل تھا۔ مجھے اپنے سوال کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔ وہ تو شاید برسوں پہلے سے اس خواہش کو اپنے دل میں دبائے بیٹھا تھا مگر یہ فقط آرزو کی بات نہ تھی۔ اگر ایسا کوئی تھا اس کرۂ ارض پر کہیں تو وہ اس گاؤں میں نہیں تھا اور اس کے حلقۂ شناسائی میں نہیں تو جو ریشم کے معیار پر اسے بھی قابلِ قبول ہو اور ریشم کو بھی... اس کا انتظار ایک مسلسل عمل تھا جو شب و روز جاری تھا مگر وہ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ کب اور کہاں سے آئے گا۔ اس کے لیے مہلت عمر تمام ہونے اور ریشم کی شادی کی عمر نکل جانے کے بعد آیا تو کیا؟

میرے کمرے میں روشنی کے لیے ایک لالٹین لٹکا دی گئی تھی جس کی روشنی دس بائی بارہ کے اس کمرے کی ویرانی کے تاثر میں اداسی بھی شامل کردیتی تھی۔ میرا اپنا سایہ بے رنگ دیوار پر سمٹتا پھیلتا رہتا تھا۔ رات ہوتے ہی باہر سے مچھر میرے شہری خون کا ذائقہ چکھنے جوق در جوق آتے تھے۔ ندی کے کنارے اور بارشوں کے موسم میں سبزہ و گل ویسے بھی فراوانی تھی اور میرے حجرۂ خاص کے آس پاس بھنڈی، توری کاشت ہوتی تھی اور مرغیوں کے دڑبے۔ چنانچہ مچھروں کی افزائش کے لیے ماحول اتنا سازگار تھا

مچھر کسی دشمن ملک کو کثیر تعداد میں بھیجے جاسکتے تھے۔

ریشم آج ساری دوپہر سے شام تک نہ جانے کہاں مصروف رہی تھی۔ میں کمرے میں چارپائی پر لیٹ کر ان تمام مسائل پر سوچ چکا تھا جن کا تعلق میرے مستقبل سے ہو سکتا تھا اور اب چائے کی شدید طلب محسوس کررہا تھا۔ بالآخر وہ چائے کا کپ اور انڈوں کے حلوے کی پلیٹ کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس کے یقین کے مطابق میری صحت کی بحالی کے لیے ازحد ضروری تھا کہ گڑ کے شیرے اور خالص دودھ سے پکایا گیا وہ حلوا میری بحالی صحت کے پروگرام کا حصہ تھا۔

میں نے شرافت اور عاجزی سے کہا۔ ”ویسے تو کوئی بھی تمہارے ہاتھ سے زہر کھا کے بھی بامراد کہلانا چاہے گا... اور میں تو مہمان کی حیثیت سے مجبور بھی ہوں لیکن مرنے سے پہلے سچ بولنا چاہیے۔“

”ہائے، کیسی منحوس باتیں کررہے ہو... یہ بیٹھے بیٹھے مرنے کا خیال کہاں سے آگیا؟“

میں نے کہا۔ ”اپنی تقریر سے پہلے میری دکھ بھری فریاد پوری سن لو... میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہونے کے اسباب کئی ہیں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہی یہاں کے موذی مچھر میرے جسم کا آدھا خون شربتِ روح افزا کی طرح پی چکے تھے۔ ملیریا بخار تو ہوگا بعد میں... تعمیلِ حکم میں یہ حلوے کا تھال کھا گیا تو مجھے ہیضہ ہوجائے گا صبح تک... اتنا حلوا تو جمعرات کو وہ مولوی نہیں کھا سکتا جس کا پیٹ ہو دیگ جیسا۔“

وہ کھلکھلا کے ہنسی۔ ”اچھا آدھا کھالو۔ مچھروں کا بندوبست میں ابھی کرتی ہوں۔ ہم کمرے میں اپلے جلاتے ہیں تو مچھر نکل جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مچھروں کو کیوں تکلیف دیتی ہو، میں چلا جاتا ہوں باہر... یا کوئی شٹل کاک برقع لادو مجھے... میری تصویر نہیں آئے گی آواز تو آئے گی۔ مجھے تم سے باتیں بھی کرنی ہیں کچھ ضروری۔“

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”دیکھو یہ گاؤں ہے، یہاں شہری نخرے نہیں چلتے۔ مچھر مار تیل کل مل جائے گا تو لادوں گی۔ ایسے یہ ملیریا والے مچھر ہوتے تو مجھے روز بخار چڑھتا... تمہیں حلوا پسند نہیں؟“

”صرف شب برأت پر... یا پھر گاجر کا حلوا... برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں... تمہاری زبان کو کیا ہوگیا؟ پہلے تو یہ قینچی کی طرح چل رہی تھی۔“

وہ بولی۔ ”کبھی اس طرح بھی بولنا پڑتا ہے۔ وہ عادت نہیں میری... ضرورت ہے... تاکہ اگلا مجھ سے ذرا سوچ سمجھ کے بولے۔ تمہاری آج شامو سے کیا بات ہوئی تھی؟ وہ دھواں دیتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔ پوچھ رہا تھا تمہارے بارے میں... میں نے اسی طرح جواب دیا کہ اپنے کام سے کام رکھ... کام کرتا شرافت سے تو ایسا کیوں ہوتا۔ تو نے ابا کو مجبور اور بے بس سمجھ لیا تھا۔ اس نے جل کے کہا کہ ہاں، مجھے دے کے چچا نے گھر داماد خرید لیا ہے اور تو گاؤں میں کوئی اس قابل ملا نہیں تجھے... کہاں سے آیا ہے یہ نمونہ... بس اس کے بعد میں نے زبان سے نہیں ہاتھ سے بات کی... ایک گلاس تھا میرے ہاتھ میں... وہ اس کے سر پر لگا... پلٹا تو میں نے پیچھے سے آدھا سیر کی لوکی ماری... وہ کمر میں لگی۔“

”ریشم! تمہارے باپ کی کافی عمر ہے... اکیلی کیسے رہ سکتی ہو تم ہمیشہ؟“

”رہ سکتی ہوں... اور تمہیں اتنی فکر ہوگئی میرے مستقبل کی دو دن میں تو تم رہ جاؤ نا یہاں میرے ساتھ... چھوڑ دو نورین کا خیال... مجھ سے بیاہ کرلو... ہے اتنی ہمت... باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔“ وہ پھر پرانی ریشم کی طرح بول رہی تھی۔

میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”واقعی غلطی ہوگئی مجھ سے جو تم سے ہمدردی ظاہر کی... میں تو چار دن کا مہمان ہوں۔“

رات کو کھانے کے بعد بابا رحیم بخش نے ریشم کے مزاج کی تیزی کا گلہ کیا۔ ”تمہاری بات سے ہی شامو پریشان تھا۔ یہاں آکے ریشم کو غصہ دکھانے کی غلطی کی اور اب سارے گاؤں میں باتیں پھیلا رہا ہے۔ جھوٹا، بے ایمان... اس نے کہا ہے کہ ریشم نے سل کا بٹا کھینچ کے مارا تھا، گالیاں الگ دیں... تمہارے بارے میں جو کہا، بہت شرم کی بات ہے میرے لیے... لوگ جانتے ہیں مجھے بھی اور ریشم کو بھی مگر سو ہمدرد ہوتے ہیں تو سو بدخواہ... آخر کیا بنے گا میرے بعد اس لڑکی کا؟“

میں چپ چاپ سنتا رہا اور تسلی کے رسمی الفاظ سے کام چلاتا رہا کہ وہ خدا پر بھروسا رکھے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں نے اسے زمین بیچ کے شہر جانے کا فضول مشورہ بھی دیا کیونکہ یہ ریشم کے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ میں بری طرح پھنس گیا تھا... نورین کے انتظار اور اس کی تلاش کے ساتھ اپنی شناخت چھپانے کی مجبوری نہ ہوتی تو میں دوسرے دن ہی چلا جاتا۔ اس گاؤں میں لوگ رات کا کھانا مغرب یا زیادہ سے زیادہ عشا کی نماز کے بعد کھا لیتے تھے پھر ان کے لیے زیادہ دیر جاگنا لاحاصل تھا۔ دس بجے آدھی رات کا سماں ہوتا تھا

جب سارا گاؤں سو جاتا تھا۔ ریشم نے مجھے ایک چادر فراہم کر دی تھی جو مچھروں کی یلغار کے خلاف بہترین مدافعتی ڈھال تھی۔ گرمی لگنے کی صورت میں میں دروازہ کھول کے یا باہر پڑے تخت پر سو سکتا تھا۔

میرے لیے اتنی جلدی سونا مشکل تھا۔ تخت کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس کھینچ کے میں نے اپنی کرنسی کا معائنہ کیا۔ دن بھر میں پانی نکل گیا تھا مگر نمی باقی تھی۔ احتیاط کے ساتھ میں نے بنڈل سے نوٹوں کو الگ کرنا شروع کیا۔ ان کے بیچ میں اب بھی نمی زیادہ تھی اور ہر نوٹ ابھی الگ کیا جاتا تو پھٹ جاتا۔ میں نے دس دس پندرہ پندرہ نوٹ تخت پر پھیلائے اور خود باہر سونے کا فیصلہ کیا۔ مجھے امید تھی کہ رات بھر میں نوٹ مزید خشک ہو جائیں گے۔ یہاں استری کا ملنا محال تھا ورنہ گھنٹوں کا مشکل کام منٹوں میں آسانی سے ہو جاتا۔

مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا اور ریشم اتنی خاموشی سے اندر آ کے میرے پیچھے کھڑی ہو گئی کہ مجھے پتا ہی نہ چلا۔ جب نوٹ آدھے سے زیادہ تخت پر پھیل گئے تو میں نیچے اترا اور میری کہنی نے ریشم کو چھوا۔ میں نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ ”تم کب آئیں؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔ ”یہ سب کیا ہے؟ کون ہو تم... ڈاکو؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے... ڈاکو میرے جیسے ہوتے ہیں؟“ میں نے مسکرا کے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

اس نے ترشی سے جواب دیا اور پیچھے ہٹ گئی۔ ”صورت سے معلوم ہو جاتا تو کوئی بھی کسی سے نہ پوچھتا کہ تم کرتے کیا ہو... اور میں نے تو ڈاکو دیکھے ہی نہیں۔“

”میں ڈاکو نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”پھر یہ کیا ہے؟ یہ نوٹ اور یہ سونا؟“ وہ چلائی۔

”چلاؤ مت، نوٹ جعلی ہیں... سونا نقلی۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم چاہو تو سب کو بتا دو۔ پکڑوا دو مجھے۔ کہہ دو مجھ سے کہ اسی وقت اٹھاؤ یہ سب اور دفع ہو جاؤ... میں چلا جاؤں گا۔“

وہ کچھ دیر میری صورت دیکھتی رہی۔ ”تمہیں نورین کا نہیں... اس دولت کا خیال تھا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر آ کے تخت پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر میں نکلی اور میرے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ”تم جواب دینا نہیں چاہتے یا جواب ہی نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”جس خدا نے منہ میں زبان دی ہے جھوٹ بولنا بھی آتا ہے مجھے... تو جواب کیا مشکل ہے... جو کہوں گا تمہارے لیے سچ ہوگا... تصدیق کیسے کر سکتی ہو تم؟“

”اچھا۔“ اس نے ایک گہری سانس لی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”پھر اب تک یہ بات کیوں چھپائے رکھی تھی مجھ سے؟ میری مدد حاصل کرنے کے لیے نورین کا نام ہی کیوں استعمال کیا تھا؟ کیا واقعی نورین نام کی کوئی لڑکی ہے جس سے تم اتنی محبت کرتے ہو یا تمہیں ڈر تھا کہ صرف اس ڈوبی ہوئی دولت کو نکالنے کی بات کی تو میں جذباتی ہو کے آدھی رات کے وقت تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی؟ اچھا صلہ دیا تم نے میرے خلوص کا... مجھ پر اعتماد نہ کر کے۔ تمہاری جان بچا کے میں نے تو کوئی احسان نہیں کیا تھا تم پر لیکن تم نے جانتے بوجھتے دھوکا دیا۔“

”بس کرو ریشم! خدا کے لیے... میں مانتا ہوں یہ ایک غلطی تھی کہ میں نے تمہیں پوری طرح اعتماد میں نہیں لیا لیکن میرا مقصد تمہیں اندھیرے میں رکھنا نہیں تھا۔ ایسا ہوتا تو یہ سب میں تخت پر کیوں پھیلاتا... کیا میں نہیں جانتا تھا کہ تم کسی بھی وقت آ سکتی ہو... کیا یہ زیادہ آسان نہ تھا میرے لیے کہ میں اس خزانے کو تکیے کے غلاف میں ڈالوں اور صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤں؟“

”پھر مجھے بتانے میں کیا نقصان تھا تمہارا... تمہیں ڈر تھا کہ میں آدھا مانگ لوں گی؟“

”نہیں، اگر میں تمہیں پیش کروں تب بھی تم لینے سے انکار کر دو گی۔ مجھے ڈر تھا کہ تم یقین نہیں کرو گی۔ غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ گی یا ڈر جاؤ گی تو میری مدد نہیں کرو گی۔ خدا کی قسم یہ سب میں اسی طرح چھوڑ کے جا سکتا ہوں، ابھی اور اسی وقت... دوبارہ کبھی تم میری شکل بھی نہیں دیکھو گی۔ نورین جھوٹ نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ جو بھی میں نے کہا تھا جھوٹ تھا... میں سچ نہیں بول سکتا تھا اس وقت... آج بھیگے ہوئے نوٹ اور زیورات اسی لیے پھیلا کے رکھے تھے میں نے... کہ تم آؤ گی تو تمہیں سب سچ بتاؤں گا۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔ کون پوچھے گا تمہارے بارے میں ابا کے سوا... میں کہہ دوں گی کہ مجھے کیا پتا... میں بھی سو رہی تھی۔“

”جانے کے لیے مجھے بہت مہلت ملی تھی اور مجھے روکنے والا بھی کون تھا لیکن میں کہیں نہیں جا رہا ہوں ریشم، میں ایسا احسان فراموش نہیں ہوں۔ یہ زندگی نورین کی امانت تھی جسے تم نے بچا لیا۔ کبھی وہ ملی تو اسے میں بتاؤں گا کہ ریشم... خدا نے اسے بالکل صحیح وقت پر صحیح جگہ نہ بھیجا ہوتا تو شاید ہم اس دنیا میں نہ مل پاتے۔ ایسی کوئی ہستی اسے ملی ہو گی تو اس کی زندگی بھی محفوظ ہو گی لیکن اصل فیصلہ کرنے والا تو نظر نہیں آتا جس کے ہاتھ میں ہم انسانوں کی زندگی اور موت ہے۔ اس لیے نورین کو بھی مہلت دی ہو گی تو جینے کا بہانہ بھی فراہم کیا ہو گا۔ یہ میرے چاہنے کی بات ہی نہیں۔“

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں... آخر تم کیا ہو؟“

”الزام کی حد تک اسے سچ کہا اور سمجھا جا سکتا ہے کہ میں ایک ڈاکو ہوں۔ مجھے پھانسی ہونے والی تھی کہ میں جیل سے نکل بھاگا۔ اتنا حیران ہو کے مجھے دیکھنے کی ضرورت نہیں... جھوٹ پر تم نے یقین کر لیا تھا، سچ بھی سن لو۔“ میں نے کہا۔

طول دیتا تو اپنی کہانی سنانے میں رات چھوٹی پڑ جاتی۔ میں نے جہاں تک ممکن ہوا، گزرے ہوئے واقعات کے بیان میں اختصار سے کام لیا۔ ریشم دم بخود بیٹھی سنتی رہی۔ پہلے شاید وہ بھی اسی معمول کی عادی ہو گی جس پر گاؤں کے سب لوگ کاربند تھے اور وہ خود بھی عمل کرتی رہی ہو گی۔ وہ جلدی سو کے جلدی اٹھ جاتی ہو گی لیکن اب صرف بابا رحیم بخش ساری عمر کی عادت سے مجبور تھا۔ ریشم تو میری طرح راتوں کو جاگ رہی تھی اور دن دیر تک سو کے گزار رہی تھی۔ وہ بیچ میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی لیکن میں نے کہا کہ اب تم بولیں تو پھر میں نہیں بولوں گا۔ اسے چپ رہنا پڑا جو اس کے لیے یقیناً آسان نہ تھا۔

معلوم نہیں اس میں کتنا وقت گزر گیا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد وہ بھی اپنے خیالوں میں گم چپ بیٹھی رہی۔ میرے لیے کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن اس کے لیے وہ سب جھوٹ ہو گیا تھا جس پر اس نے اعتبار کیا تھا اور حقائق کی ایک نئی تصویر سامنے آ گئی تھی جو پہلے والی تصویر سے اتنی ہی مختلف تھی جتنی آسمان سے یہ زمین... یا سیاہی سے سفیدی... پہلی کہانی کا خالق میں تھا اور اس دوسری کہانی کو اصل حقیقت بتانے والا بھی میں۔ وہ مجبور تھی کہ اب اسے سچ مانے اور میں اس کے تذبذب کو سمجھتا تھا۔ اس کے ذہن میں نئے یقین کے پودے کو جڑ پکڑنے کے لیے مہلت کی ضرورت تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور ہم سبزیوں کے اس مختصر سے کھیت کی درمیانی جگہ پر چلنے لگے۔ ”اگر تم کہو گی تو میں صبح ہونے سے پہلے اپنے جھوٹ سچ کی پوٹلی اٹھا کے نکل جاؤں گا... پھر کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لیے۔“

”مجھے تمہارے جھوٹ سچ سے کیا... تم رکو گے نورین کے لیے... میری خاطر نہیں... وہ مل گئی تو چلے جاؤ گے۔ اس فضول سے گاؤں میں ساری زندگی گزارنے کا تم نے کب سوچا ہو گا جہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم دولت مندوں کی دنیا کے کسی شہر میں رہو گے۔“

”میں اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن میں کہوں کہ ہمارے ساتھ چلو پھر؟“

وہ تلخی سے ہنسی۔ ”ایسی بے وقوفی کی بات تم کیوں کہو گے؟“

”کیا بے وقوفی ہے اس میں... یہاں کیا ہے تمہارے لیے بھی؟“

”سب سے پہلے تو میرا باپ ہے۔“

”اور اس کے لیے تم ہو، یہ زمین ہے۔ ہم اسے بھی اٹھا کے ساتھ لے جائیں؟ اسے فکر ضرور ہے کہ جس دن وہ نہ رہا تمہارا کیا بنے گا۔ یہ جائز بھی ہے کیونکہ اس کی عمر بہت ہو گئی ہے اور یہاں کوئی نہیں جو تمہاری فکر کرنے والا ہو۔ کبھی تم نے اپنے بارے میں سوچا ہے؟“

”سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟“

”سب سوچنے سے ہی ہوتا ہے۔ بغیر سوچے تو جانور بھی کچھ نہیں کرتے۔ اپنی زندگی کی حفاظت سب کر سکتے ہیں۔“

”چھوڑو میری بات۔ مجھے نورین کے بارے میں بتاؤ... سلمان خان کے بارے میں اسے سچ کب بتاؤ گے؟“

”جب ضرورت پڑے گی، ورنہ کام اس کے بغیر چل ہی رہا تھا۔“

”کبھی سوچا ہے اسے حق اور انصاف دلانے کے بارے میں؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں، ماضی کے چکر میں پڑ کے سارا مستقبل داؤ پر لگانے سے کیا ملے گا۔ صرف خرابی، پریشانی اور تباہی۔ میں اپنا وقت اور توانائی کیوں ضائع کروں؟ میں اس کے ساتھ خوشی کے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنا چاہتا تھا اور بس۔“

وقت کے گزرنے کا احساس نہ ریشم کو ہوا تھا اور نہ مجھے۔ کہیں دور سے آنے والی اذان کی آواز نے اسے بدحواس کر دیا۔ ”صبح ہو گئی... بابا اٹھ گیا ہو گا۔“ وہ ایک دم پلٹ کے دوڑی۔ میں نے گھڑی کے روشن ڈائل میں وقت دیکھا، صبح کے سوا چار بجے تھے۔ میں نے اپنے کمرے کی

جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میرے کانوں نے ریشم کی سمع خراش چیخ سنی۔ وہ دیوانہ وار مجھے پکار رہی تھی۔ میں بدحواس ہوکے بھاگا تو ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچا۔ ریشم بدستور ”ابا... ابا“ چلا رہی تھی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے باپ کا معاملہ ہے۔ شاید سوتے میں ہی وہ گزر گیا۔ سانس کب رک جائے... دل کب تھم جائے... کون جان سکتا ہے۔ شہروں میں پھر بھی لوگ اپنا معائنہ کراتے رہتے ہیں اور احتیاط بھی اختیار کرتے ہیں۔ یہاں کسی کو بلڈ پریشر کا نام تک معلوم نہیں ہوتا۔ کولیسٹرول وغیرہ تو دور کی بات ہے۔

مجھے جو منظر بابا رحیم بخش کے کمرے میں نظر آیا، اس کے لیے میں بالکل تیار نہیں تھا۔ اس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ وہ آدھا اپنی چارپائی پر تھا اور آدھا پٹی سے لٹکا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ فرش پر لٹکے ہوئے تھے اور سر نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں چارپائی پر چوڑائی کے رخ دیوار تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے سینے یا گردن سے بہنے والا خون فرش پر بہہ کے دروازے کی دہلیز پر جمع ہو گیا تھا۔ خون کے قطرے اب بھی نیچے ٹپک رہے تھے۔ ریشم کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ بُری طرح چیخ رہی تھی۔ ”سلیم... سلیم! دیکھو بابا کو کیا ہو گیا... میرے بابا کا خون ہے۔ کیا بابا مر گیا... کس نے مار دیا اسے سلیم؟“

میں نے اسے جھنجوڑا۔ ”ریشم... ریشم! ہوش میں آؤ۔“

وہ چیختی رہی۔ ”بابا کو کس نے قتل کر دیا... بابا مر گیا۔“

میں نے کونے میں رکھے مٹکے پر سے کٹورا اٹھایا اور پانی سے بھر کے ریشم کے منہ پر اچھال دیا۔ اسے ایک جھٹکا سا لگا اور اس کی آواز بند ہو گئی۔ وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں گر کے بے ہوش ہو گئی۔ میں نے گھٹنوں پر جھک کے رحیم بخش کو دیکھا۔ کسی نے سوتے میں خنجر سے اس کے سینے پر وار کیے تھے۔ شاید اس نے اٹھنے کی کوشش بھی کی ہو گی اور مدد کے لیے پکارنے کی بھی مگر قاتل نے اسے موقع نہ دیا۔ بابا رحیم بخش کے مرنے کا یقین ہونے تک قاتل نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبائے رکھا ہو گا ورنہ یہ ناممکن تھا کہ اس کی آواز ہم تک نہ پہنچتی۔ اٹھنے کی کوشش میں ناکام ہونے سے وہ آدھا لٹک گیا تھا۔ یہ بہت دیر پہلے نہیں ہوا تھا۔ میرے خیال میں صرف آدھ گھنٹے پہلے رحیم بخش زندہ تھا۔ رگوں کا خون اب بھی فرش پر ٹپک رہا تھا اور فرش پر جمع ہونے والا خون جمنے لگا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ بابا کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اسی حالت میں رہنے دوں تاکہ پولیس مجھ پر شہادت ضائع کرنے کا جھوٹا الزام بھی نہ لگائے۔ قتل کس نے کیا اور کیوں کیا؟ اس سے متعلق تمام سوالوں کے جواب تلاش کرنا میرا کام نہیں تھا۔ بابا کی ناگہانی موت کا دکھ مجھے بھی تھا لیکن اس سے زیادہ پریشانی تھی کہ میں شامتِ اعمال سے ایسے معاملات میں ملوث ہو گیا جن کا میری ذات اور زندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس قتل کے وقت میں ریشم کے ساتھ تھا اور وہ میری بے گناہی کی واحد سب سے بڑی گواہ تھی ورنہ ایک اجنبی ہونے کے جرم میں الزام کا نشانہ سب سے پہلے میں بنتا۔

ریشم ابھی تک فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر اس کے پلنگ پر لٹا دیا۔ پانی کے چھینٹے ڈالنے سے وہ کچھ دیر بعد ہوش میں آ گئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی باپ کے قتل کا سانحہ تمام لرزہ خیز تفصیل کے ساتھ اس کی یاد میں ابھر آیا اور اس نے ایک دل دوز چیخ مار کے اٹھنا چاہا۔ میں نے اسے وہیں دبوچ لیا۔ ”ریشم! ہوش میں آؤ... خود کو سنبھالو۔“

وہ زار و قطار روتے ہوئے چلائی۔ ”میرا بابا... اسے کس ظالم نے قتل کر دیا؟“

”بے شک یہ بہت بڑا صدمہ ہے لیکن ہمیں ہوش سے کام لینا ہو گا ریشم۔ ہمیں پولیس کو اطلاع دینی ہو گی۔ وہ تفتیش کریں گے تو قاتل کا پتا چل جائے گا۔“ میں نے اس کی تسلی کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ”اسے سخت سزا ہو گی... پھانسی۔“

”اس سے میرا بابا تو واپس نہیں آئے گا۔“ وہ خون کے آنسو روتی رہی۔

”صبر کرو ریشم! ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ مسجد میں نماز ہو رہی ہے۔ میں وہیں جا کے سب کو اطلاع کر دیتا ہوں۔ مجھے تو کچھ بھی پتا نہیں... کفن دفن کا انتظام کرنے والے ہی پولیس کو بھی خبر کر دیں گے۔“

”میں بابا کے پاس جاؤں گی۔“ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

”نہیں، تم ابھی ادھر نہیں جاؤ گی۔ پولیس کے آنے سے پہلے کچھ بھی چھیڑنا نہیں ہے۔ اس حالت میں بابا رحیم بخش کو دیکھنا تمہیں پاگل کر دے گا۔ وعدہ کرو تم میری واپسی تک اس کمرے سے باہر نہیں جاؤ گی..... یا میں دروازے کو باہر سے بند کر جاؤں؟ تم نے میری بات سنی... تم میرے واپس آنے تک یہاں ٹھہرو گی... آئی بات سمجھ میں؟“

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ ”سلیم! ایک بار مجھے بابا کی صورت دکھا دو... صرف ایک بار۔“

”کیا فائدہ ریشم؟“ میں نے کہا مگر یہ فائدے نقصان کی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے آنسوؤں بھرے اصرار نے مجھے اس کو سہارا دے کر دوسرے کمرے کے دروازے تک لے جانے پر مجبور کر دیا۔ خون اور لاش کو دیکھ کر وہ پھر مچلی اور چیخنے لگی۔ میں اسے زبردستی گھسیٹ کر واپس لے گیا اور اسے ہوش سے کام لینے کی تاکید کرتا رہا۔ ”آخر کون تھا وہ ظالم سلیم؟ کس نے کیا یہ ظلم... میں جاگ رہی تھی اور مجھے پتا نہیں چلا۔ وہ خبیث بھاگ گیا۔ کیا دشمنی تھی اسے میرے بوڑھے باپ سے؟“

”دیکھو ان تمام سوالوں کے جواب پولیس تلاش کرے گی۔ وہ تم سے بھی پوچھیں گے اور مجھ سے بھی۔ تم سے میرے متعلق بھی معلوم کریں گے۔ انہیں اتنا ہی بتانا جتنا تم جانتی ہو۔ کسی پر شک ہے تو اس کا نام لے سکتی ہو ورنہ نہیں۔“

مسجد کے محلِ وقوع کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔ بابا رحیم بخش کا مکان آخری کنارے پر تھا۔ باقی گاؤں اس کے پیچھے مغربی حصے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اس وقت گلی میں بھی کوئی نہ تھا جو مجھے راستہ بتاتا لیکن ایک شخص مل گیا جو دیر ہونے کی وجہ سے بڑی عجلت میں نماز باجماعت کے لیے بھاگا جا رہا تھا۔ اس کی نیت کا اندازہ مجھے اس کے چہرے اور ہاتھوں کو دیکھ کر ہوا جو وضو کے پانی سے گیلے تھے۔ میں نے سلام کے بعد اس کے ساتھ تقریباً دوڑتے ہوئے اسے رحیم بخش کے قتل کے بارے میں بتایا۔ اناللہ پڑھ کے اس نے سخت افسوس کیا۔ پھر ہم نمازیوں کی دوسری صف میں شامل ہو گئے جس نے ابھی نیت کر کے ہاتھ باندھے ہی تھے۔

وہاں بمشکل سے بیس بائیس نمازی تھے۔ پیش امام کے سلام پھیرتے ہی میرے ساتھ آنے والے نے بہ آوازِ بلند رحیم بخش کے قتل کی خبر سب تک پہنچا دی۔ نماز کے بعد وہ سب میرے ساتھ ہی واپس پہنچے۔ وعدہ خلافی کرنے والی ریشم دروازے میں کھڑی لاش کو دیکھ رہی تھی اور خون کے آنسو رو رہی تھی۔ اس وقت جب دوسرے لوگ اس خونی منظر سے شاک کی کیفیت میں تھے، میں سیدھا پیچھے چلا گیا۔ سارے نوٹ اسی طرح تخت پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی انہیں سمیٹ کر تکیے کے غلاف میں زیورات کے ساتھ ڈالا اور باہر لے جا کے مرغیوں کے ڈربے کے پیچھے چھپا دیا۔ نوٹ اب بھی گیلے تھے لیکن زیادہ نہیں۔ ایک گوشے میں بھوسے کا ڈھیر تھا۔ وہاں سے کچھ بھوسا اٹھا کے میں نے اپنا خزانہ چھپایا۔ سبزیوں کی ایک بیل سوکھ گئی تھی۔ اسے نوچ کے بھوسے پر ڈالا اور لوٹ آیا۔

دو چار بزرگ اور معزز قسم کے لوگ اب ریشم سے اس قتل کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔ معاملہ ابھی یہیں تک تھا کہ اس خونی واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ریشم رو رو کے بتا رہی تھی کہ مجھے نہیں معلوم۔

ابھی کسی نے ریشم سے یہ سوال نہیں کیا تھا کہ قتل کے وقت وہ کہاں تھی اور اسے واردات کا علم کیسے ہوا؟ زبانِ خلق کے فساد سے بچنے کے لیے اصل حقائق کو پردے میں رکھنا ضروری تھا۔ وہ کہہ دیتی کہ جب یہ سانحہ پیش آیا تو میں ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ پیچھے والے صحن میں ٹہل رہی تھی تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی۔ اس سے رسوائی والے کئی سوال اٹھ کھڑے ہوتے۔ میں نے بروقت پہنچ کے معاملات سنبھال لیے۔ میں نے کہا۔ ”میں نے تو پیچھے والے کمرے میں سوتے ہوئے اچانک ریشم کی چیخ سنی۔ یہ نماز کے لیے اٹھی تھی اور بابا رحیم بخش کے کمرے میں دیکھنے گئی تھی کہ وہ اٹھے ہیں یا نہیں۔“

ایک شخص نے سوال کیا۔ ”آپ کون ہو جی؟“

ریشم کے جواب نے مجھے پریشانی سے بچا لیا۔ ”یہ بابا کے ایک پرانے دوست کے بیٹے ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔“

ممکن ہے اس جواب نے بھی کچھ لوگوں کے دل میں شکوک کو جنم دیا ہو مگر اس کے اظہار کا یہ موقع نہ تھا۔ کچھ ذمے دار لوگوں نے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ دو نوجوانوں کو سائیکل پر پولیس چوکی جانے کی ذمے داری سونپی گئی۔ پولیس کے آنے تک لاش کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ بھی ہوا۔ کچھ لوگ گاؤں میں اطلاع دینے پر مامور کیے گئے۔ تدفین کے دیگر انتظامات پر بھی بات ہوئی۔ بیشتر لوگ چلے گئے۔ پھر کسی کے گھر سے آنے والی ایک عمر رسیدہ اور ایک نوجوان عورت ریشم کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ میں نے اتنی دیر میں تعارفی بیان فائنل کر لیا تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ ریشم کی گواہی کافی تھی۔ پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ پولیس بہت سے سوالات پوچھے گی۔ میں بابا رحیم بخش کو کیسے جانتا تھا؟ اس کی دوستی میرے والد سے تھی تو کیسے اور میں یہاں کیوں آیا تھا؟ لاہور میں رہتا تھا تو کہاں... کیا کرتا تھا... ریشم

کے لیے سب سے مشکل اس سوال کا جواب تھا کہ اسے شک تھا تو کس پر؟ رحیم بخش کا دشمن تھا تو کون؟ یہ گاؤں ایک محلے کی طرح تھا جس میں لوگ ایک دوسرے کے بارے میں جدی پشتی معلومات رکھتے تھے۔

پولیس چوکی زیادہ دور نہیں تھی لیکن وہاں ڈیوٹی پر مامور حوالدار انچارج اور اس کے اکلوتے معاون کانسٹیبل نے قانونی نکتہ اٹھایا کہ اس معاملے میں تھانہ ہی کارروائی کرے گا۔ دس بارہ میل دور سے تھانہ انچارج اپنے چوکی انچارج، معاون اور کانسٹیبل کے ہمراہ شہر تک سبزی دودھ پہنچانے والی ایک پک اپ میں لد کے جائے واردات پر پہنچا تو دوپہر ہونے کو تھی۔ لوگوں نے کسی بھی چیز کو چھیڑا نہیں تھا کہ کہیں قانون گلے نہ پڑ جائے۔ وہ لاش اور خون سے مکھیوں اور کیڑے مکوڑوں کو دور رکھنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ ضابطے کی کارروائی کا آغاز ہونے میں ہی ایک گھنٹا لگ گیا۔ رپورٹ مرتب کرنے کے بعد تھانے دار نے پہلے ریشم کا بیان لیا۔ پھر میرا... ہم قتل کے چشم دید گواہ تو نہ تھے مگر جائے واردات پر سب سے پہلے پہنچے تھے اور ہمارا مقتول سے براہِ راست رشتہ تھا۔

جتنا میں پولیس کے طریقہ کار سے واقف تھا، شاید اور کوئی نہ ہوگا لیکن میں نے براہِ راست دخل اندازی سے گریز کیا۔ کچھ سیانے ضابطے کی کارروائی کو سمجھتے تھے۔ اگر لاش کو پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے لے جایا جاتا تو تدفین میں دو دن کی تاخیر ضرور ہوتی۔ پھر لاش کو لانے لے جانے اور صحیح رپورٹ ملنے کے معاملات سے نمٹنا آسان نہ ہوتا۔ انہوں نے شارٹ کٹ کی قیمت ادا کر کے آسانی پیدا کرنا بہتر سمجھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تھانے دار سے کس نے بات کی اور کیا بات کی۔ میں نے خود کو ان معاملات سے دور ہی رکھا۔ اے ایس آئی تھانے دار اس کمرے میں بیٹھا رہا جس میں ریشم سوتی تھی۔ اس کے اور ماتحتوں کے بیٹھنے کے لیے نہ جانے کہاں سے کرسیاں لائی گئی تھیں۔ ایک پرانی میز وہاں پہلے سے موجود تھی۔ ان سب کے لیے کسی کے گھر سے چائے کھانا بھی آیا۔

سہ پہر کے قریب ایک ادھیڑ عمر کے سنجیدہ صورت شخص نے مجھے ایک طرف بلایا۔ ''تھانے دار سے معاملات طے ہو گئے ہیں مگر وہ کہتا ہے کہ پوسٹ مارٹم ضروری ہے۔ تفتیش کسی سے نہیں ہوگی۔ شک میں کسی کو پکڑا نہیں جائے گا۔ واردات کا ذمے دار نامعلوم افراد کو بنا دیا گیا ہے۔ تھانے کا ایک سپاہی ساتھ جائے گا جو دو گھنٹے میں رپورٹ بنوا دے گا۔''

سب سمجھنے کے باوجود میں انجان بنا سر ہلاتا رہا۔ ''پھر جی اچھا ہو گیا سب۔''

''پچاس ہزار روپے میں ہوگا یہ سب۔''

''پچاس ہزار روپے۔'' میں نے سخت صدمے کا اظہار کیا۔

''ہاں، رقم کا بندوبست نہ ہوا... تو ضابطے کی کارروائی ہوگی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں مشکل ہوگی۔ پھر تفتیش چلے گی اور لوگوں کو شک میں بلایا جائے گا۔ اب رحیم بخش کی تو ایک بیٹی ہے اور کوئی بھی نہیں... تم اس سے پوچھو۔''

''میں کیا پوچھوں... مجھے ان کے حالات کا علم ہے۔ ان کا گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا۔ یہ مکان اور زمین بچے ہیں۔''

اس نے اداسی اور پریشانی سے سر ہلایا۔ ''سب جانتے ہیں یہ بات... تھانے دار کو کیسے ٹالا جائے؟ رقم کا بندوبست ضروری ہے۔ میں دو ہزار دے سکتا ہوں... کچھ دوسروں کی مدد سے دس تک ہونے کی امید ہے۔ باقی چالیس نہ ہوئے تو پریشانی سب کے لیے... تدفین بھی مشکل ہو جائے گی۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''باقی رقم میں کر دوں گا لیکن مجھے وقت چاہیے... ابھی کہیں سے انتظام ہو جائے تو کل میں لا دوں گا۔''

انہوں نے تذبذب سے کہا۔ ''تم کہاں سے لاؤ گے... اور تمہیں کوئی جانتا ہے یہاں؟''

''میری ضمانت ریشم دے گی۔ میں کہیں جاؤں گا نہیں۔ رقم آ جائے گی... میرا وعدہ۔''

ایک دم جیسے سارے مسئلے بے وجود ہو گئے۔ میں اور وہ شخص اور تھانے کا عملہ سب لاش کے ساتھ ایک ہی گاڑی میں ساہیوال کے لیے روانہ ہوئے۔ ڈسٹرکٹ اسپتال میں میڈیکولیگل آفیسر سے رپورٹ لے کر واپس آنے تک کے معاملات انتہائی انسانیت سوز اور تکلیف دہ تھے مگر میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ گزشتہ چند برسوں سے میں اس ماحول میں تھا اور سب اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور بھگت چکا تھا۔ انسانیت کی تذلیل کرنے والے اس معاشرے میں اخلاق اور قانون کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے تھے جو صرف رشوت کی زبان سمجھتے تھے۔ صبح اذانِ فجر کے وقت قتل ہونے والے رحیم بخش کو بڑی بھاگ دوڑ اور پچاس ہزار روپے رشوت میں دینے کے بعد عشا کی نماز کے بعد قبر میں سونا نصیب ہوا۔ یہ

سب کسی نے مرنے والے سے رشتے داری نبھانے یا ہمدردی اور انسانیت کے نام پر نہیں کیا۔ سب نے اپنی بلا ٹالی۔ اپنی جان بچائی اور قبرستان سے واپس گھر پہنچ کے سکون کا سانس لیا ہوگا کہ بلا ٹلی۔

ریشم ایک دور کے عزیز کے گھر سے آتی جاتی رہی۔ رات تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ رات کا کھانا میں نے بھی اسی گھر میں باہر بیٹھ کے کھایا۔ رسمِ دنیا نبھانے کے لیے ریشم کو رات بھی اسی گھر میں گزارنی پڑی۔ میں نے واپس آ کے وہ کمرا بند کر دیا جس میں اب خون سڑنے لگا تھا۔ میں خود ریشم کے کمرے میں اس کی چارپائی پر لیٹ گیا۔ قسمت نے مجھے کہاں سے کہاں لا کے پھنسا دیا تھا۔ اب میں ریشم کو چھوڑ کے جا ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھ پر چالیس ہزار کا قرض تھا اور یہ رقم مجھے انہی نوٹوں میں سے نکالنی تھی جو پوری طرح خشک بھی نہیں ہوئے تھے اور میں نے بھوسے کے ڈھیر میں چھپا رکھے تھے۔

کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلنے کے بعد میں باہر نکلا اور ہر طرف دیکھ کر پچھلے حصے میں پہنچا جہاں میرا خزانہ دفن تھا۔ چاندنی نے میری مدد کی۔ میں نے بھوسے کا ڈھیر ہٹا کے وہ تکیے کا غلاف نکالا جس میں نوٹ تھے اور زیور تھا۔

ریشم نے اچانک میرے پیچھے سے کہا۔ ''بھاگ کر جا رہے ہو تم مجھے چھوڑ کے؟''

اگر کوئی میرے کان پر ریوالور رکھ کے فائر کر دیتا تب بھی میں اس طرح نہ اچھلتا۔ ''تم...'' میں ایک دم پلٹ کے اٹھا۔

''ہاں، غلط وقت پر آ گئی نا میں؟ لیکن میں روکوں گی نہیں تمہیں... تم جا سکتے ہو۔''

میں نے غصے پر قابو پانے کے لیے ایک گہری سانس لی۔ ''میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ میں کچھ رقم لینے آیا تھا۔''

''آدھی رات کو پیسوں کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟'' وہ تلخی سے بولی۔

''یہ رقم مجھے صبح کسی کو دینی ہے۔ اس نے تمہارے ابا کے لیے پچاس ہزار دیے تھے۔ دس ہزار لوگوں کے تھے۔ چالیس ہزار کا بندوبست کرنے کا وعدہ میں نے کیا تھا۔''

''پچاس ہزار کس بات کے... کفن دفن کے؟''

''ہاں، یہی سمجھ لو۔ اگر یہ رقم پولیس کو نہ دی جاتی... تو اس وقت تمہارے ابا کی لاش مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔'' میں نے درشت لہجے میں بلا ارادہ کہہ دیا۔

اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

میں نے دل میں شرمندگی محسوس کی۔ ''ابھی میں ساری وضاحت کر دیتا ہوں۔''

اب ریشم سے بھی کچھ چھپانے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ میں نے اپنے خزانے میں سے مطلوبہ رقم کے نوٹ نکالے۔ وہ ابھی تک نم آلود تھے۔ بھوسے کے ڈھیر کو برابر کر کے اور ان پر سوکھے پتے پھیلا کے میں پلٹا اور ایک ہاتھ ریشم کے کندھے کے گرد حمائل کر کے اسے سامنے والے حصے میں لے گیا۔ میں نے اس سے اپنے لہجے پر معذرت کی مگر وہ روتی رہی۔ اسے میرے رویّے کا نہیں، اس بات کا دکھ تھا جو اسے مجھ سے معلوم ہوئی تھی۔ بند کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے پھر لہو کی ناگوار بو کا احساس ہوا۔ میں ریشم کو اس کے کمرے میں لے گیا اور پلنگ پر بٹھا دیا۔

''تم کیسے آ گئی ہو اس وقت... میرا مطلب ہے کیا انہیں بتا کے آئی ہو؟'' میں نے اسے پانی کا گلاس دیا۔

اس نے ایک گھونٹ لے کر گلاس مجھے واپس کر دیا۔ ''نہیں، سب لمبی تان کے سو رہے تھے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''کسی کو تمہارے موجود نہ ہونے کا احساس ہوا تو کوئی اچھی بات نہیں ہوگی... یہاں صرف میں ہوں، سب کو معلوم ہے۔ خوامخواہ لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔''

''جس کا جو جی چاہے سمجھے اور کہے۔ اب مجھے یہاں رہنا ہی نہیں ہے۔''

میں نے اس سوال سے گریز کیا کہ وہ کہاں جانے کا سوچ رہی ہے۔ ''یہ بڑی عجیب بات لگی مجھے۔ تم یہاں نسلوں سے آباد ہو پھر بھی یہاں رہنے والوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں... نہ خاندان ہے نہ رشتے دار۔''

''ہم یہاں نسلوں سے آباد نہیں ہیں۔ بابا کہتا تھا کہ ہمارا اپنا گاؤں سیلاب میں بہہ گیا تھا۔ وہاں سب ہمارے اپنے آباد تھے۔ ہم جان بچا کے نکلنے میں کامیاب ہوئے اور یہاں آباد ہو گئے تھے۔ کوئی اور زندہ رہتا تو کبھی مل جاتا۔ بابا نے کبھی بتایا نہیں کہ پہلے ہم کہاں تھے۔ یہی کہتا تھا کہ پرانی باتوں کو کیا یاد کرنا، اب یہی ہے اپنا گاؤں۔ بابا نے بڑی کوشش کی مگر یہاں کے رہنے والوں نے ہم سے وہ رشتہ قائم نہیں کیا جو پرانے رہنے والوں سے تھا۔ ترس کھا کے انہوں نے ہمیں جگہ دے دی تھی اور بابا نے بھی یہ زمین خریدی تھی۔ وہ ہمیں کیسے بے دخل کرتے۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟ کفن

دفن کی ذمے داری بھی سب نے مجبوراً پوری کی۔ اپنا خاندان ہوتا ہے تو لوگ ماتم کے گھر میں آتے ہیں، غم بٹانے کے لیے... پاس پڑوس والے کھانا بھیجتے ہیں، سپارے پڑھتے ہیں۔ یہاں تو میں اکیلی تھی، کسی نے تجھی ٹھہرنا گوارا نہیں کیا۔"

میں نے کہا۔ "اچھے لوگ یہاں بھی ہیں۔ دیکھو، ایک شخص نے مجھ پر اعتبار کر کے فوراً پولیس کو رقم فراہم کر دی تھی ورنہ... خاصی پریشانی ہوتی۔"

ریشم کو قتل کے کیس میں پولیس کے غیر انسانی رویوں کے بارے میں تفصیل سے بتانے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ میں نے اسے مختصراً یہ بتا دیا کہ رشوت نہ دی جاتی تو وہ تفتیش جاری رکھتے اور میرے اور اس کے علاوہ نہ جانے کس کس کو پریشان کرتے۔ پھر میں نے کہا۔ "چلو ابھی تم جاؤ... سونے کی کوشش کرو۔"

اس نے صاف انکار کر دیا۔ "میں یہاں بیٹھ کے سپارے پڑھوں گی۔ سوئم بھی کروں گی بابا کا۔ کوئی آئے نہ آئے۔"

"ضرور کرنا... لیکن ابھی میری مانو... صبح تک آرام کرلو۔"

"جب مجھے نیند نہیں آرہی ہے تو مجھے کیوں مجبور کرتے ہو؟" وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "تم کو سونا ہے تو سو جاؤ... یہ بُو کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس جگہ کو صاف کرنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم مجھے پانی لا کے دو۔ میں فرش کو دھوتی ہوں۔"

وہ ماننے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ وہی کرتی تھی جو اس کے دماغ میں آجائے۔ نتیجہ یہ کہ اس نے وہ کام کیا جو میرے خیال میں انتہائی صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ میں کنوئیں سے بالٹی بھر بھر کے پانی لایا اور اس نے بڑی ہمت اور محنت سے لہو کو جھاڑو سے رگڑ رگڑ کے دھو ڈالا۔ یہ خون اس کے باپ کا تھا جسے مرے ہوئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ پانی کے ساتھ اس کے چھوٹے بڑے منجمد لوتھڑے بہہ کر باہر گئے اور یہ خون آلود پانی زمین نے پی لیا۔ فرش کو پہلے جیسا صاف کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا اور دھونے کے بعد بھی خون کی بُو باقی رہی۔ وہ یقیناً تھک گئی ہوگی۔ اس کے کپڑے بھی بھیگ گئے تھے۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کے دوسرے کپڑے بدلے اور قرآن کھول کے بیٹھ گئی۔

میں لوٹ کے پیچھے والے کمرے میں آگیا اور اذان کی آواز سنائی دینے تک تخت پر لیٹا اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا جو صحرا میں بھٹکنے والے دیوانے کی طرح سمت راستوں پر بھٹک رہی تھی۔ اس پر سے میرا اختیار بالکل ختم ہو گیا تھا۔ مجھے یہ سوچنا بھی لاحاصل لگتا تھا کہ آگے کیا ہوگا اور تقدیر مجھے کہاں لے جائے گی۔ نورین کا غم ایک حادثہ تھا۔ اس کا زخم اتنی جلدی کیسے مندمل ہو سکتا تھا۔ ابھی میں نے آئندہ کے بارے میں نہ کچھ سوچا تھا اور نہ طے کیا تھا کہ ایک اور چٹان مجھ پر آگری۔ میں کیسے فرض کر سکتا تھا کہ یہاں سے میں ہاتھ جھاڑ کے خود کو ریشم کی ذمے داری سے لاتعلق رکھتے ہوئے کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ نورین کا خیال ذہنی طور پر پس منظر میں اس لیے چلا گیا تھا کہ اس کی جگہ ریشم کے خیال نے لے لی تھی۔ ایک بوجھ سے سبکدوش ہونے کا احساس بھاگا بھی نہ تھا کہ ویسا ہی بوجھ دوسرے شانے پر آگیا۔ چٹان تو چٹان ہی ہوتی ہے۔ پتھر کسی بھی پہاڑ کا ہو۔

اذان کی آواز کان میں پڑتے ہی میں گھر سے نکل کے مسجد میں جا بیٹھا۔ میں ریشم کو شک کی نظر اور الزام کی زبان سے محفوظ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ نماز کے لیے آنے والوں نے مجھے وہاں تلاوت کرتا پایا۔ نماز کے بعد میں نے یہ جھوٹ بھی بولا کہ میں رات بھر اسی جگہ بابا رحیم کو ایصالِ ثواب پہنچانے میں مصروف رہا تھا۔ جس گھر میں ریشم تھی وہاں جانے والے اسے غیر حاضر پا کے کچھ پریشان ہوئے۔ انہوں نے ریشم کو اپنے گھر میں دریافت کر لیا۔ دن میں لوگ آتے جاتے رہے۔ کسی حد تک ریشم کی یہ شکایت بھی رفع ہو گئی کہ کسی نے شرافت نہیں دکھائی اور حقِ ہمسائیگی بھی نہیں نبھایا۔ دراصل گزشتہ رات سب بہت تھک گئے تھے اور سب نے دوسروں کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ ریشم کے ساتھ ہوں گے اور کسی نے مجھے بھی کھانا پہنچا دیا ہوگا۔

دوپہر کے قریب میں نے چالیس ہزار کا قرضہ بے باق کر دیا۔ وہ چودھری کہلانے والے زمیندار کا بھائی اور خود بھی زمیندار تھا لیکن تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو شہر میں ٹھیکے داری کر چکا تھا۔ "یہ نوٹ کچھ بھیگے ہوئے ہیں؟" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "ہاں، جب میں یہاں آرہا تھا تو بارش میں بھیگ گئے تھے۔"

"کوئی بات نہیں، سوکھ جائیں گے۔ تم یہاں کب تک رہو گے؟"

میں نے کہا۔ "کچھ پتا نہیں، مجھے ریشم کی فکر ہے۔ اسے میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"کیوں نہیں لے جا سکتے۔ تمہارا گھر ہوگا۔ کام کیا کرتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "ساہیوال کے ایک اسکول میں پڑھاتا تھا لیکن اب دبئی جا رہا ہوں۔ گھر میں میرا بھائی اور بھاوج ہیں۔ ریشم وہاں نہیں رہ سکتی۔ وہ میرے ساتھ بھی نہیں جا سکتی۔"

"اس کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ گاؤں کے بڑے زمیندار چودھری اللہ دتہ میرے بھائی ہیں۔ وہ بیمار رہتے ہیں، کل بھی جنازے میں ان کا بیٹا شریک ہوا تھا۔ چودھری، ریشم کو اپنی بہو بنانا چاہتا تھا مگر اس لڑکی نے انکار کر دیا تھا۔ الٹا بے عزت کیا تھا انہیں۔ اگر تم اسے سمجھاؤ..."

میں نے کہا۔ "میں ضرور کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کر سکتا۔ ابھی تو اس پر صدمے کا اثر ہے۔ بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ وہ اکیلی کیسے رہے گی یہاں؟"

"وہ چاہے تو میرے گھر میں آجائے۔ ورنہ یہاں بھی اس کی حفاظت کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لوگ رات تک آتے جاتے رہے۔ میں نے خود کو سب کی نظر سے اوجھل رکھا۔ گزشتہ رات اوپر کے علاقے میں شدید بارش ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ندی پہلے سے بھی زیادہ چڑھ گئی تھی۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک نادر شاہ نے ان لوگوں کے لاپتا ہونے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا جو مجھے گرفتار کر کے واپس لانے پر مامور تھے لیکن لاپتا ہو گئے تھے۔ وہ بھولنے والا آدمی نہیں تھا۔ انتظار کی حد ختم ہو جانے کے بعد وہ نئے لوگوں کو گم ہو جانے والوں کی تلاش میں روانہ کرے گا اور وہ اسی راستے پر پوچھتے ہوئے نکلیں گے تو آسانی سے جائے حادثہ کا سراغ لگا لیں گے۔ پھر وہ اپنے وسائل استعمال کریں گے اور ندی کی تہ سے پک اپ کا ڈھانچا بھی نکال لیں گے اور لاشیں بھی۔ ان میں میری اور نورین کی لاش نہیں ہوگی تو وہ تلاش کا دائرہ وسیع کریں گے۔ ان کے لیے پھر مجھ تک پہنچنا مشکل ضرور ہوگا، ناممکن نہیں۔

میں رات کو واپس آیا تو ریشم اکیلی اپنے کمرے میں بیٹھی تلاوت کر رہی تھی۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "سارا دن گزر گیا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ "کل بابا کے سوئم کے بعد میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ "کھانا کھا لو۔ دوپہر سے آیا رکھا ہے۔"

اس نے سلور کی پتیلی کے ساتھ دو اسٹیل کی پلیٹیں تخت پر رکھ دیں۔ ایک پیالی میں دہی تھا، ایک شیشی میں آم کا اچار۔ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں نے ریشم کا ساتھ دیا۔ باپ کی موت کا اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے میں اس نے حیرت انگیز ہمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ اس گھر میں ماں ہوتی یا بہن بھائی ہوتے، ماموں اور چچا ہوتے تو وہ جی بھر کے رو سکتی تھی اور سوگ منا سکتی تھی لیکن اس کا سر سینے سے لگا کے تسلی دینے والا، اس کے ساتھ آنسو بہانے والا اور اسے مستقبل کے اندیشوں سے تحفظ کا یقین دلانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے صرف اپنے حوصلے اور خدا کے سہارے پر جینا ہے اور حالات سے اکیلے ہی لڑنا ہے۔

"میرے جانے کے بعد تم اکیلی کیسے رہو گی؟"

"اس کی فکر تمہیں کیوں ہے؟" اس نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔

"تم جیسی لڑکی اکیلی نہیں رہ سکتی۔ تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔ پھر تمہارا ایک گھر ہوگا۔"

"تم کرو گے مجھ سے شادی؟ گھر تو یہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "چودھری صاحب کا لڑکا تم سے اب بھی شادی کرنا چاہتا ہے، اس کے چچا نے بات کی تھی مجھ سے۔"

"اس کا چچا کر لے مجھ سے شادی... میں تیار ہوں۔"

"یہ کیا فضول بات ہے؟"

"فضول بات تم نے کی ہے۔ کیا تم جانتے ہو چودھری کے بیٹے کو کہ اس کی سفارش کر رہے ہو... ایک نمبر کا آوارہ اور عیاش ہے۔ میری بات پر اعتبار نہیں تو کل غلیفے سے پوچھ لینا۔ گاما کا ماما بتائے گا ورنہ میں تمہیں ان لڑکیوں سے اور شادی شدہ عورتوں سے ملوا دیتی ہوں جن کو اس نے خریدا یا زبردستی اٹھوایا۔ ایک میں ہوں جو اس کے قابو نہیں آئی۔ یہی ایک چیلنج بنا ہوا ہے اس کے لیے۔ عزت کا سوال ہے میرے لیے۔ بے عزتی کی بات ہے اس کے لیے۔ اس کے یار دوست حرامزادے... شہدے لفنگے اسے اکساتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ شکار کرنے کے بعد شیر کا پیٹ بھر جاتا ہے تو لومڑی اور گیدڑوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ آخر میں آجاتے ہیں ہڈیوں پر سے گوشت نوچنے والے گدھ... میں کیا کروں؟ بھاگ جاؤں؟ بھاگ کے کہاں جاؤں؟ یہ بتا دو۔ کون سی جگہ ہے جہاں میں محفوظ ہو جاؤں گی؟ مجھے تو مسجد میں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ مولوی صاحب نکال باہر کریں گے۔ ابھی ساتھ کے گاؤں میں یہ ہوا تھا۔ بے چاری نے خودکشی

کرلی۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا۔ "میں نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے تمہیں۔ میری زندگی تو ایک مسلسل فرار ہے۔"

"نورین کی تلاش میں... تمہارے لیے ایک خبر تھی جو آج ہی سنی ہے میں نے... ایسے واقعات یہاں سننے میں آتے ہیں۔ ندی میں کوئی لاش بہتی آجاتی ہے، ہمیشہ کوئی عورت ہوتی ہے۔ کبھی شوہر قتل کرتے ہیں، کبھی اغوا کرنے والے تو کبھی غیرت کے نام پر خود اپنے گھر والے۔ بات مشہور ہوتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔ نہ کوئی تفتیش ہوتی ہے، نہ کوئی والی وارث آتا ہے۔ لوگ اتنا ضرور کرتے ہیں دفنا دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے نہانے اور کپڑے دھونے والی عورتوں نے ایک عورت کو بہتا دیکھا تھا۔ انہوں نے شور مچایا تو دو لڑکے ندی میں تیرتے گئے۔ وہ اسے پکڑ نہ سکے۔ ایک لڑکا کنارے کے ساتھ دوڑتا گیا۔ اس نے بتایا کہ آگے لاش کنارے کی طرف آ کے کہیں گھاس یا جھاڑیوں میں اٹک گئی تھی۔ لیکن وہ عورت زندہ تھی۔ اس لڑکے نے قسم کھا کے بتایا کہ وہ ہاتھ ہلا رہی تھی مگر لڑکا تیرنا نہیں جانتا تھا اور وہاں کنارہ نیچے تھا۔ بعد میں لوگ گئے تو کچھ نہیں ملا۔ سب نے سمجھ لیا کہ لاش آگے بہہ گئی۔ میرا مطلب ہے وہ عورت... لیکن اگلے روز وہ لڑکا پھر گیا تو اس نے ایک جگہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دیکھ لیں۔ وہ قسم کھا کے کہتا ہے کہ یہ اسی عورت کی چوڑیاں تھیں۔ جب اس نے ہاتھ ہلتا دیکھا تھا تو چوڑیاں نظر آئی تھیں... پیلے رنگ کی۔"

میں چونکا۔ "پیلے رنگ کی... یعنی سونے کی یا پلاسٹک کی؟"

"نہیں، نہ پلاسٹک کی نہ سونے کی... وہ کانچ کی تھیں۔"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "اور اس کے کپڑے... اس لڑکے نے لباس بھی دیکھا ہوگا؟"

"اس نے کہا کہ شلوار پیلی تھی... قمیص گلابی سی... چوڑیوں کے ٹکڑے ملنے کا کیا مطلب ہے؟ یہی کہ اس کو کسی نے نکالا تھا۔"

"چوڑیاں اس نے زرد بھی پہن رکھی تھیں لیکن کپڑے مختلف تھے۔ شرٹ میں لال اور کالا رنگ تھا اور شلوار نارنجی تھی۔"

"ہو سکتا ہے اس لڑکے نے لال کو گلابی سمجھا ہو... زرد اور نارنجی تو پانی میں ایک نظر آ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ کب کی بات ہے... کون تھا لڑکا؟"

"یہ تم معلوم کر سکتے ہو، شاید بار بر صبح تمہاری [illegible] بنانے آئے۔ وہ یہاں کا اخبار ہے چلتا پھرتا۔ اسے [illegible] معلوم ہوتا ہے ورنہ وہ معلوم کر لیتا ہے۔ کل سویم میں کچھ لوگ آئیں گے۔ باتوں باتوں میں پوچھنا۔ کیا پتا وہ نورین ہی [illegible] مگر تم نے تو نکل جانے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے... نورین کے [illegible] بھی نہیں رکو گے ایک دو دن؟"

میں نے کہا۔ "ریشم! خدا کے لیے میری پوزیشن سمجھو۔ میں وہ شکار ہوں جس کے پیچھے شکاری لگے [illegible] ہوئے ہیں۔ میں کہیں بھی ایسے نہیں رہ سکتا جیسے سب [illegible] ہیں... اور یہ جگہ تو بہت خطرناک ہے۔ حادثہ اسی جگہ پیش [illegible] تھا۔ وہ معلوم کرتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔ پولیس [illegible] کرے نہ کرے، وہ پک اپ کو بھی نکال لیں گے اور لاشیں بھی۔ میری اور نورین کی لاش نہ ملی تو وہ فرض نہیں کریں [illegible] کہ ندی کا پانی بہا کے لے گیا۔ وہ آگے تک پوچھیں گے۔ انہیں وسائل کی کیا کمی۔ وہ پیشہ ور غوطہ خوروں کو لا سکتے ہیں [illegible] ندی کی تہ کھنگال کے دیکھ لیں گے۔ پانی کے اوپر سے [illegible] تصویریں لینے والے کیمرے لا سکتے ہیں اور اس کے بعد [illegible] ندی کے دونوں طرف ہر گاؤں چھان ماریں گے۔"

"پھر تو یہاں بھی آ سکتے ہیں وہ؟" ریشم کے لہجے میں کچھ خوف آ گیا۔

"ہاں اور اب ان کی تفتیش کا نشانہ تم بنو گی۔ جب ثابت ہو جائے گا کہ مجھے پناہ تم نے ہی دی تھی۔ تمہارا بابا [illegible] ہے نہیں... وہ تمہیں اٹھا کے لے جائیں گے... اسی لیے [illegible] ہوں کہ اس گھر سے چلی جاؤ... کسی محفوظ گھر میں۔"

"اب بھی اس بھیڑیے کے گھر کو تم میرے لیے محفوظ کہتے ہو؟"

"چلو اسے چھوڑو... یہ گاما کا ماما... یہ بھی تو تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

وہ تلخی سے بولی۔ "اور مجھے بچا بھی سکتا ہے ان سے [illegible] اتنے خطرناک مجرم ہیں کہ تم بھاگے پھر رہے ہو؟ خیر، تم میری فکر چھوڑو... پہلے میں تمہارا حساب بے باق کر دوں۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "حساب... کون سا حساب؟"

وہ مجھے جواب دیے بغیر اٹھ کر گئی اور اس نے تخت کے نیچے سے ایک ٹین کا صندوق کھینچ کر نکالا۔ کپڑوں کے درمیان سے اس نے پرانے میلے کپڑوں کا چھوٹا سا بنڈل نکالا اور تخت پر رکھ کے کھولا۔ اس کے اندر چھوٹے بڑے نوٹ کاغذ کے پرزوں کی طرح بندھے ہوئے تھے۔ زیادہ نوٹ سو پچاس کے تھے مگر مجھے پانچ سو ہزار کے نوٹ بھی دکھائی دیے۔ "کیا ہے یہ؟"

وہ ایک ایک نوٹ اٹھا کے ترتیب سے تہ در تہ جمع کرتی گئی۔ "یہ ہماری کئی سال کی بچت ہے۔ تم بھی گنو۔"

وہ تقریباً ستر ہزار روپے تھے۔ "اتنی بچت ہو جاتی تھی تمہیں؟"

"کہیں سے چوری تو نہیں کیے ہیں میں نے... بابا تو ایک ہی بات سمجھتا تھا کہ میری شادی میں کام آئیں گے۔ اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی... یہ لو۔" اس نے نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"چالیس ہزار جو تم نے دیے تھے۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "تم بے عزت کر رہی ہو مجھے۔ تم کیا سمجھتی ہو، میں یہ رکھ لوں گا؟"

"اور تم کیا سمجھتے ہو میں تم سے لے لوں گی؟ مدد یا قرض... وہ میرا باپ تھا اور یہ اسی کی کمائی ہے۔ تم نے وقت پر سارے معاملات کو سنبھالا اس کے لیے تمہارا شکریہ۔ یہ احسان باقی رہے گا مگر پیسے تم لو گے... لو پکڑو۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو ریشم! میں نے جو کیا تھا بابا رحیم بخش کے لیے تھا۔"

وہ بگڑ گئی۔ "کس رشتے سے؟ کیا حق تھا اس کا تم پر؟ تم تو مہمان تھے۔ مرنے والے کا قرض وارث چکاتے ہیں۔"

مزید بحث اور تلخی سے بچنے کے لیے میں نے نوٹ پکڑ لیے لیکن میرے ذہن اور اعصاب کے لیے آزمائش کا عذاب بڑھ گیا۔ میں اس مشکل صورتِ حال سے فرار چاہتا تھا لیکن ہر طرف ایک ہی سوال میری راہ میں دیوار بن جاتا تھا۔ جانتے بوجھتے اپنی آنکھیں بند کر کے تم اس اکیلی لڑکی کو درندہ صفت اور ہوس کے مارے بھیڑیے جیسے انسانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتے ہو؟ فرار کی صورت کوئی نہ تھی۔ میں محصور ہوتا جا رہا تھا۔ یہ میرے لیے انتہائی ناقابلِ قبول ذمے داری تھی لیکن اس سے بچنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ امید کا راستہ ایک ہی تھا کہ میرے جانے سے پہلے ریشم کسی کی ہو جائے۔ زمیندار کے بیٹے کی زندگی کے کارنامے اور مقاصد جان لینے کے بعد میں ریشم کے سامنے اس کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس کا ایک پرستار گاما کا ماما کہلاتا تھا مگر وہ واقعی مٹی کا مادھو تھا۔ دوسری طرف ریشم تھی جو ہار ماننا، خود کو کمزور سمجھنا یا

مصلحت کے تحت سمجھوتا کرنا نہیں جانتی تھی اور میں اسے غلط نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک ذہین اور باہمت لڑکی سے میں کیسے کہتا کہ تم روایتی کمزور اور بھیڑ بکری کی طرح مرد کی ملکیت بن کر رہنے والی لڑکی بن جاؤ۔ پھر وہ تمہارے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرے، کسی کو بیچے یا بخش دے... مارے کوٹے یا قتل کر دے، صبر شکر کرو اور اس کے بچے جنتی رہو۔

ایک ساتھ میرے گرد اندیشے یوں اکٹھے ہو رہے تھے جیسے اکیلے مسافر کو آسیب زدہ جنگل میں بھوت پریت گھیر لیں۔ یہ خطرہ ناگزیر محسوس ہوتا تھا کہ میں نے فرار کا راستہ اختیار نہ کیا تو میرے پیچھے لگے ہوئے دشمن مجھے آ لیں گے۔ ایک امید میرا راستہ روکتی تھی کہ کیا پتا دریا سے نکالی جانے والی عورت نورین ہی ہو۔ اسے تلاش کرنا بھی میرے لیے مقصدِ حیات تھا کیونکہ اب اس کے بغیر مجھے زندگی ادھوری محسوس ہوتی تھی۔ تیسرا بوجھ ریشم کا بنتا جا رہا تھا جسے اٹھانے کی مجھ میں سکت نہ تھی لیکن اس سے بچنا محال تھا۔

معلوم نہیں کب اپنے کمرے میں تخت پر لیٹ کر چھت کو گھورتے گھورتے میں سو گیا۔ اچانک جیسے قیامت آ گئی۔ میں نے ریشم کے چیخنے چلّانے کی آواز سنی۔ وہ نہ جانے کس کو گالیاں دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اٹھتا، تاریکی میں دو سائے سے نمودار ہوئے۔ ایک نے ہاتھ گھما کے میرے سر پر ہاکی ماری۔ اندھیرا گہرا ہو گیا اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل گئی ہے اور میں کنوئیں کی گہرائی میں اترتا جا رہا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرے حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگا۔ پھر میں نے اس پختہ دیواروں والے کمرے کو دیکھا۔ اس میں ایک مسہری لگی ہوئی تھی۔ اس پر بستر بچھا ہوا تھا اور دیوار کے ساتھ دو طرف گاؤ تکیے پڑے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک میز کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ میز پر شراب کی ایک خالی بوتل نظر آ رہی تھی اور چار گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار میں لکڑی کے پٹوں والی کپڑوں کی الماری تھی۔ فرش پر پرانا قالین تھا جس کے پھول اور داغ دھبے ایک ہو رہے تھے۔ بیڈ کے بالکل سامنے والی دیوار پر چھ فٹ لمبا اور چوڑا آئینہ ایک ڈریسنگ ٹیبل کا حصہ تھا لیکن بیڈ کا پورا منظر دکھاتا تھا۔

دوسری طرف غسل خانہ جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر پانی گرنا بند ہو گیا اور گیلے بالوں کو تولیے میں لپیٹے ایک عورت

برآمد ہوئی۔ اس کا بدن خشک تھا مگر اس نے کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ بڑی بے نیازی سے اس نے الماری کا ایک پٹ کھولا اور اپنے لیے لباس کا انتخاب کرنے لگی۔ وہ فربہی مائل گداز اور گورے بدن والی عورت تھی جس کا اعتماد ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے ہی بیڈ روم میں ہے اور اس کا شوہر جو رات کو ساتھ ہوگا، اٹھ کے کہیں جا چکا ہے۔ اس نے ایک شرٹ ہینگر کے ساتھ نکال کے الماری بند کی اور بیڈ تک گئی۔ مقابل کے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ چونکی لیکن نہ اس نے چیخ ماری اور نہ خود کو چھپانے کی کوئی کوشش کی۔ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے وہ مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے کہا۔ ''آپ کون ہیں؟ اور یہ کس کا گھر ہے؟''

وہ مسکرائی۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ یہ چودھری اکبر کی جگہ ہے... میں اس کی... دوست ہوں۔''

دوست کا لفظ سے میرے خیال کی تصدیق ہوگئی کہ وہ چودھری اکبر کی گھر والی اور مالکن نہیں ہے۔ وہ گزشتہ رات یہاں تھی اور اکبر اس کے جاگنے سے پہلے ہی اٹھ کے چلا گیا تھا۔ ''وہ خود کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم۔'' اس نے ایک ایک کر کے کپڑے پہننے شروع کیے۔ ''میں نے تمہیں صبح دیکھا۔ اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ میں اب جا رہی ہوں۔''

صاف ظاہر تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے ایک تھی جو چودھری اکبر کے اس عشرت کدے میں رات گزارنے آتی تھیں اور اپنی قیمت وصول کر کے چلی جاتی تھیں۔ اپنے چہرے کو اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی چیزوں سے نیا روپ دیا پھر تکیے کے نیچے سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے اپنے بیگ میں ڈالی۔ یہ اس کا معاوضہ تھا جو چودھری اکبر جاتے وقت چھوڑ گیا تھا۔ مجھ پر ایک نظر ڈال کے وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد ایک لمبے چوڑے، خوفناک مونچھوں اور درشت چہرے والے شخص نے اندر جھانکا جس نے کندھے پر خودکار رائفل لٹکا رکھی تھی۔ مجھے اس سوال کا جواب مل گیا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے اور ریشم کو اٹھانے والوں نے چودھری اکبر کے ڈیرے پر پہنچا دیا تھا اور یہ وہی چودھری اکبر تھا جس نے ریشم کے حصول کو اپنی مردانگی کے لیے چیلنج اور اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔

چودھری اکبر کی ذاتی طور پر مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ بس گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے... اس کے حکم پر جو لوگ ریشم کو اٹھاتے گئے تھے، وہ کسی چشم دید گواہ کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ افسوس مجھے یہ تھا کہ چودھری اکبر نے حد سے زیادہ بے صبری دکھائی اور چار دن صبر نہ کر سکا۔ ایک دن پہلے وہ ریشم کا ہمدرد بن کے اس کے باپ کا جنازہ اٹھانے والوں میں شامل ہوا تھا۔ دل ہی دل میں تو وہ خوش ہوا ہوگا کہ اب ریشم لاوارث ہوگئی۔ اطلاع اسے مل چکی ہوگی کہ ریشم کے گھر میں کوئی مہمان بھی ٹھہرا ہوا ہے اور اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ کہیں یہ مہمان اس کے گھر میں گھر والا نہ بن جائے۔ اس نے مجھے دیکھا ہوگا اور میرے بارے میں معلومات بھی حاصل کی ہوں گی۔ شاید کسی چمچے نے کہا ہو کہ چودھری صاحب! اب مزید مہلت کی گنجائش نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ شرافت میں انتظار کرتے رہ جائیں اور آپ کی ریشم اپنے ابا کے چہلم سے پہلے اس مہمان کی ہو جائے یا اس کے ساتھ گاؤں چھوڑ جائے۔

اس خیال نے میرے ذہن میں ایک سوال کو جنم دیا۔ ابھی تک ریشم بھی یقین کے ساتھ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی کہ بابا رحیم بخش کو کس نے ایسی بے رحمی سے قتل کیا ہوگا اور کیوں؟ میرا ذہن اس کی زمین پر کاشت کرنے والے کی طرف جاتا تھا جو اب تک اس کی زمین پر قابض تھا اور اس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ شاید اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی ہو کہ جس دن رحیم بخش نہ رہا، زمین عملاً اس کی ہو جائے گی۔ ریشم مجبور ہوگی کہ اس پر انحصار کرے۔ جب میں مہمان بن کے وارد ہوا اور اسے نوٹس دیا کہ اگلی فصل کے حساب کتاب کے بعد اس کی چھٹی کر دی جائے گی تو زمین پر قبضے کا خواب ٹوٹ گیا ہوگا اور اس نے رحیم بخش کو قتل کر کے سوچا ہوگا کہ الزام میرے سوا کس پر آ سکتا ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ اس وقت ریشم میرے ساتھ تھی اور وہ میرے حق میں صفائی کی گواہ بنی۔ باقی معاملات میری تجربہ کاری سے طے ہوئے اور میں صاف بچ گیا۔

اب مجھے خیال آیا کہ یہی مقصد ذہن میں رکھ کے چودھری اکبر بھی رحیم بخش کو قتل کرا سکتا تھا کہ مجھے تو براہ راست شک میں پولیس پکڑ لے گی۔ واقعات، شہادت میرے خلاف ہوتی اور گواہ بنائے جاتے۔ میری گرفتاری کے بعد ریشم کا آگے پیچھے کوئی نہ رہتا اور چودھری اکبر کا ہاتھ تھام لینے کے سوا اس کے پاس چارہ نہ رہتا۔ یہ اسکیم فیل ہوگئی تو اس نے اپنے چچا کے ذریعے ایک پیغام مجھے بھیجا تاکہ ریشم تک پہنچ جائے اور اگر میرے عزائم اس بے سہارا لڑکی کو زندگی بھر سہارا فراہم کرنے کے ہیں تو پتا چل جائے۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن جس طرح ریشم کسی کی پروا کیے بغیر اس گھر میں میرے ساتھ تھی، اس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ وہ کوئی فیصلہ کر چکی ہے اور اب اسے کسی کے باتیں بنانے کی پروا نہیں۔ بے صبرا ہو کے چودھری نے ریشم کے ساتھ مجھے بھی اٹھوا لیا۔

ہوش میں آنے کے بعد جسمانی اذیت کا احساس جاگ اٹھا تھا۔ میرے سر پر جہاں کوئی ڈنڈا یا ہا کی ماری گئی تھی، وہ جگہ پھوڑے کی طرح دکھ رہی تھی۔ پھر فرش پر ایک ہی جگہ پڑے پڑے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔ کیا یہ چودھری اکبر کے باپ کی حویلی کا کوئی حصہ تھا یا اس کی اپنی عشرت گاہ؟ میرے سامنے رخصت ہونے والی عورت اس گاؤں کی نہیں تھی۔ شہر سے لائی جانے والی کسی کرائے کی عورت کو وہ باپ کے گھر میں نہ رکھتا جہاں اس کی نام نہاد پہلی خاندانی بیوی بھی تھی۔

باہر سے کسی کے بولنے کی آواز پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ کسی نے کہا۔ ''تجھے بتایا نا وہ نہیں ہیں یہاں... کہاں اندر گھسا جا رہا ہے؟''

''میں تیری مانوں کہ چودھری صاحب کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ٹھیک نو بجے آتا ہے۔'' کسی نے مانوس آواز میں کہا اور میں نے باربر کو اندر آتے دیکھا۔ مجھے فرش پر پڑا دیکھ کے وہ ٹھٹکا لیکن کچھ سوچ کے انجان بن گیا۔

محافظ اس کے پیچھے اندر آیا۔ ''وہ کچھ بول کے نہیں گئے تھے کب آئیں گے... تُو جا۔''

''روز اسی وقت آتا ہوں نا میں... دس منٹ بھی انتظار نہ کیا تو وہ ناراض ہوں گے کہ تُو بڑا نواب ہے۔ یہ بندہ کون ہے؟'' باربر نے ظاہری بے اعتنائی سے اجنبی کی طرح پوچھا اور بیڈ پر ٹک گیا۔

''یہ تو انہی سے پوچھنا۔ مجھے وہ کہہ گئے تھے کہ ٹنڈے لاٹ کو بھی اندر مت آنے دینا۔ میری شامت آ جائے گی۔ میں کہہ دوں گا ان سے کہ خلیفہ وقت پر آیا تھا اور انتظار کر کے چلا گیا۔ میں نے واپس کر دیا... تو نکل یہاں سے۔''

خلیفہ نے اٹھتے ہوئے پھر میری طرف دیکھا اور محافظ کی نظر بچا کے مجھے آنکھ ماری۔ ''او یار! بندے کو نیچے کیوں ڈال ہوا ہے... بیڈ خالی پڑا ہے۔''

''تجھے بڑی تکلیف ہے۔ تُو ماما لگتا ہے اس کا... چل نکل۔'' محافظ اپنی پریشانی میں مبتلا تھا کہ چودھری صاحب احکامات کی خلاف ورزی پر ناراض نہ ہو جائیں۔ بے شک نائی ایک وقت پر روز آ کے ان کی شیو بناتا ہے مگر انہوں نے کہا تھا کہ کوئی نہیں تو کوئی نہیں... اس نے نائی کو تقریباً دھکیل کر باہر کر دیا۔ نہ جانے کیوں خلیفہ کے خفیہ اشارے نے میرے دل میں امید کی ایک کرن جگا دی تھی۔ اس کا مجھے پہچان لینا اور حیرت یا پریشانی کا اظہار کرنا کسی صورت میرے حق میں اچھا نہ ہوتا۔ اس کے آنے سے مجھے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ ابھی صبح کے نو بجے ہیں۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں اپنی کلائی کی گھڑی دیکھنے سے قاصر تھا۔ اندازے کے مطابق ریشم کو اور مجھے نمازِ فجر سے کچھ دیر قبل ہی اٹھایا گیا تھا۔ یعنی اس بات کو ابھی پانچ گھنٹے ہوئے تھے۔ میرے ذہن میں یہ سوال بھی آیا کہ آخر مجھے قید رکھنے کے لیے چودھری نے اسی عشرت گاہ کو ترجیح کیوں دی جہاں وہ کسی کے ساتھ دادِ عیش دے رہا تھا؟

اس سوال کے بہت سے جواب ہو سکتے تھے۔ اس حویلی میں یہی جگہ محفوظ تھی جہاں اس کے سوا کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کا اپنا اور بیوی کا بیڈ روم الگ ہوگا۔ اگر اسے معلوم ہوگا تب بھی اس کی مجال کہاں کہ اپنے مجازی خدا کی نجی محفل میں قدم رکھ سکے۔ بڑے چودھری صاحب خود اس سے صرفِ نظر کرتے ہوں گے کہ یہ تو خاندانی روایت ہے اور وہ خود بھی اپنی جوانی میں گھر کو اپنی عشرت گاہ سے الگ رکھتے ہوں گے۔ بڑے اور رئیس لوگ ایسے ہی وضع داری نبھاتے ہیں۔ ایک امکان یہ تھا کہ چودھری اکبر نے اپنا عشرت کدہ کہیں گھر سے دور آباد کیا ہو مگر ٹھیک وقت پر خلیفہ کا شیو بنانے کے لیے حاضر ہو جانا روز کے معمول کی نشاندہی کرتا تھا۔

میری جسمانی اذیت میں وقت کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک پہلو پر پڑے رہنے سے میرا آدھا جسم سن ہو رہا تھا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی اور میرے لیے پیشاب کو روک کے رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ محافظ کو متوجہ کرنے کے لیے میں نے حلق سے ایک بھیانک آواز نکالی۔ یوں جیسے کسی نے میری گردن پر چھری پھیر دی ہو۔ ''ہائے... ہائے میں مر گیا۔''

محافظ نے اندر جھانکا۔ ''چپ کر کے پڑا رہ... مرتا ہے تو مر جا... شور مت کر۔''

''تجھے خدا رسول کا واسطہ... مجھے تھوڑا سا پانی دے دے۔ اوئے مرنے والے کے حلق میں پانی ٹپکاتے ہیں۔''

اس بات پر وہ کچھ جذباتی ہوا اور ایک گلاس میں پانی لے آیا۔ اس نے سہارا دے کر میرا سر اونچا کیا اور گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اسی وقت باہر شور ہوا۔ محافظ

گلاس چھوڑ کے بھاگا۔ باہر سے کسی کے چلّانے کی آواز آرہی تھی۔ ذرا سی دیر بعد ساٹھ ستّر سال کا ایک دبلا پتلا بڈھا اندر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سہارے کے لیے عصا تھا۔ وہ شیروانی سے، کلف لگے شملے والی پگڑی اور سفید مونچھوں سے ایک بہت پرانے ٹی وی ڈرامے ''وارث'' کا مرکزی کردار چودھری حشمت نظر آتا تھا۔ اس کے پیچھے ایک خادم تھا جس نے حقہ تھام رکھا تھا۔ حقّے کی ربر والی نلکی چودھری کے ہاتھ میں تھی۔ وہ سخت غصے میں تھا۔

''اوئے کدھر ہے اکبر؟ یہ کیا بدمعاشی کررہا ہے وہ چودھری اصغر کی حویلی میں؟ میں کیا مر گیا ہوں... یا اس نے خود کو میرا باپ سمجھ لیا ہے؟ کون ہے یہ؟''

محافظ نے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے کچھ نہیں معلوم چودھری صاحب۔''

''بکواس مت کر سور دے پتر... ادھر کھڑا پہرے داری کررہا ہے اور کہتا ہے مجھے معلوم نہیں۔''

میں نے مصلحت دیکھتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اور بے ہوش بن گیا تھا۔ چودھری اب میرے قریب آکے کھڑا ہوگیا تھا۔ ''اوئے کون ہے تو؟'' اس نے پوچھا اور کوئی جواب نہ پاکے بولا۔ ''کیا یہ مر گیا ہے؟ چل اوئے اس کو اٹھا کے مسہری پر ڈالو... ہاتھ پیر کھولو اس کے۔''

دو افراد نے مل کے میرے ہاتھوں پیروں کی رسیاں کھولیں اور مجھے اٹھا کے بیڈ پر لٹا دیا۔ چند منٹ تو میرے جسم کے سن ہوجانے والے حصے میں خون کی گردش بحال ہونے سے سوئیاں سی چبھتی رہیں۔ پھر رفتہ رفتہ سکون اور راحت کا احساس بحال ہوا۔ میں نے بے ہوشی کے مکر کا ڈراما ختم کرتے ہوئے کراہنا شروع کیا اور ہاتھ پاؤں ہلائے۔

''شکر کرو بندہ مرا نہیں ورنہ مصیبت پڑ جاتی... اوئے پانی پلاؤ اسے... ہوش میں لاؤ... یہ اکبر نے اپنی بیٹھک بنائی ہے کہ تھانے کی حوالات۔'' چودھری اصغر اس کرسی پر بیٹھ گیا جو ایک ملازم نے آگے رکھ دی تھی۔

چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور فلمی انداز میں سوال کیا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

چودھری نے حقّے کے کش کا دھواں خارج کیا۔ ''یہ چودھری اصغر کی حویلی ہے... کون ہے تو؟ کہاں سے آیا ہے؟''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''سلیم احمد ہے میرا نام چودھری صاحب! مجھے بابا رحیم بخش کے گھر سے اٹھا کے لائے تھے۔''

''رحیم بخش! جس کا قتل ہوا تھا پرسوں؟''

''جی چودھری صاحب! دو بندے تھے، میرے سر پر ہا کی ماری تھی... یہاں... آہ۔''

''تو ادھر کیا کررہا تھا؟ اس کی تو ایک دھی ہے... کیا نام ہے اس کا ریشم؟''

میں نے کہا۔ ''جی چودھری صاحب! میں ان کا مہمان تھا۔ ساہیوال سے آیا تھا۔ قتل کی وجہ سے رک گیا تھا... میرے ساتھ ریشم کو بھی اغوا کرلائے تھے۔ آپ معلوم کریں جناب عالی... وہ یتیم بچی ہے۔ دو دن پہلے اس کے باپ کو بھی انہی لوگوں نے مارا ہوگا جو اسے اٹھا کے لائے ہیں۔''

چودھری کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ ریشم کو بھی اٹھایا گیا تھا؟ تو نے دیکھا خود؟''

''جی چودھری صاحب! میں نے اس کے چیخنے کی آواز پہلے سنی تھی۔ آپ تو گاؤں کے محافظ ہیں، مائی باپ ہیں۔ اس یتیم لاوارث کو بچالیں۔''

بڑے چودھری کی فطرت کا میں نے اندازہ کرلیا تھا۔ ہوسکتا ہے اپنی جوانی میں وہ بھی یہی کرتا رہا ہو مگر جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، بڑھاپے میں خونی بھیڑیا بھی خدا ترس اور پرہیزگار بن جاتا ہے۔ میں اس کو جذباتی کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اب وہ دہاڑ رہا تھا۔ ''اس بندے کو اندر لاؤ میرے مہمان خانے میں۔ اس کو کچھ کھلاؤ پلاؤ... گرم دودھ دو۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ ''اوئے تو آ ذرا میرے ساتھ... مجھے پتا ہے تجھ سے بڑا کمینہ کسی ماں نے نہیں جنا۔''

محافظ گڑگڑانے لگا۔ ''وڈے چودھری صاحب! ہم تو حکم کے غلام ہیں آپ کے بھی اور چھوٹے چودھری کے بھی۔''

''مجھے سچ سچ بتادے گا تو بچ جائے گا ورنہ تیری چمڑی کے جوتے بنوا کے ماروں گا تجھے... وہ لڑکی ریشم کدھر ہے؟ میرے پاس لاؤ اسے جہاں بھی ہے۔'' بڑا چودھری اب شیر کی طرح دہاڑ رہا تھا۔

ایک معمولی اتفاق نے بازی میرے حق میں پلٹ دی تھی اور وقتی طور پر ہی سہی، ریشم کی جان اور آبرو بچ گئی تھی۔ مجھے وہی محافظ سہارا دے کر اس قید خانے سے لے گیا اور بڑے چودھری صاحب کے مہمان خانے میں پہنچا دیا۔ پریشانی محافظ کی صورت سے عیاں تھی۔ بڑے چودھری کی ناراضی اس کے حق میں اتنی خطرناک نہیں تھی جتنی چھوٹے چودھری کی ہوتی۔ محافظ نے راستے میں مجھ سے سوال کیا۔ ''بڑے چودھری کو کس نے بتایا؟'' یہ سوال محافظ کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چھوٹا چودھری واپس آنے کے

بعد سب سے پہلے یہی پوچھے گا۔

میں نے کہا۔ ''چودھری صاحب نے خبروں میں سنا ہو گا بی بی سی سے۔''

محافظ اس مذاق کو خاک انجوائے کرتا جبکہ اسے اپنی شامتِ اعمال سامنے نظر آرہی تھی۔ ''مجھے سب پتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر مجھ سے کیوں پوچھا تھا؟ سب پتا ہے تو یہ بتادو کہ بابا رحیم بخش کو کس نے قتل کرایا تھا۔''

''وہ کمینہ نائی آیا تھا نا تمہارے پاس؟'' محافظ اپنے خیال میں بولتا رہا۔ ''یہ اسی کی کارستانی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آج تو میں نے کسی سے بھی شیو نہیں بنوائی، تم کس نائی کی بات کررہے ہو؟''

چودھری صاحب کا مہمان خانہ بھی ایک عشرت کدہ تھا یا رہا ہوگا جب آتش جوان تھا۔ یہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں شاید آٹھ سو ہزار گھر ہوں گے۔ میں نے اس گاؤں کا نام تک نہیں سنا تھا اور نقشے میں اس کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس گاؤں کے زمیندار کی حویلی کے ٹھاٹ باٹ شاہانہ تھے۔ فرنیچر بالکل نیا اور ماڈرن تو نہیں تھا لیکن خوب صورت اور قیمتی تھا جس میں شیشم کی بہترین لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ اس کے ڈیزائن میں قدامت اور تھوڑا سا دیہاتی انداز تھا۔ یہاں مضبوطی اہم سمجھی جاتی تھی اور چیزوں کی قدامت باعثِ فخر تھی۔ صوفے، میز، کرسیاں سب اس علاقے کے بہترین کاریگروں نے اپنی تمام مہارت صرف کر کے بنائے ہوں گے۔ پردے اور لائٹس بھی شہر کے حساب سے پرانے ڈیزائن کے تھے۔

قیدی سے اچانک میں سرکاری مہمان بن گیا تھا۔ حویلی کا سربراہ ابھی بڑا چودھری تھا اور حویلی میں اسی کا حکم چلتا تھا۔ دوپہر تک میں نہا دھو کے نئے کپڑے بدل چکا تھا اور خاطر تواضع کے نام پر مجھے خالص ملائی والے دودھ میں دیسی گھی اور بادام ڈال کے پلانے کے بعد میرے سامنے دیسی مرغی کی یخنی رکھ دی گئی تھی۔ اگر میں وہ پی لیتا تو آگے دوپہر کے کھانے کا مرحلہ تھا۔ شام تک میری ہلاکت نظر آتی تھی جس کے بعد میری پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا جاتا ''زیادہ کھا کے ہلاک ہوا۔'' موقع ملتے ہی میں نے پہلے دودھ کا تین چوتھائی گلاس فلیش میں بہایا پھر یخنی کا... اس ملک میں جہاں غریب سوکھی روٹی کو ترستے ہوں اور بچے کوڑے میں سے سڑے گلے پھل چن کر کھاتے ہوں، یہ کفرانِ نعمت، گناہ اور جرم تھا لیکن میں مجبور تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں سو گیا اور شام تک سوتا رہا۔ اب مجھے

ریشم کی طرف سے کوئی فکر لاحق نہ تھی۔ چودھری صاحب نے اسے بھی برآمد کرالیا ہوگا اور اندر زنان خانے میں وہ بھی خاطر مدارات کے اسی عمل سے گزر رہی ہوگی۔ معلوم نہیں سارا دن بڑے چودھری کی کیا مصروفیت رہی کہ وہ پھر میری خبر لینے نہ آیا۔ شاید وہ مطمئن ہوگیا تھا کہ اب میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی۔ شام کو میری آنکھ کھلی تو کرسی پر ایک جوان آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ اور صحت بہت اچھی تھی۔ وہ ایک رجسٹر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ صورت کی مشابہت سے میں نے اندازہ کیا کہ وہی چھوٹا چودھری ہوگا اور میرا اندازہ درست تھا۔

اس نے رجسٹر بند کرکے ملازم کے حوالے کیا اور میری طرف متوجہ ہوا... ''تم خوش ہو کہ اباجی نے تمہیں بچالیا؟''

''چھوٹے چودھری صاحب! آخر مجھ سے کیا خطا ہوئی تھی؟ آپ مجھے بلاتے تو میں حاضر ہوجاتا۔''

میرے لہجے نے اس کے چہرے کی خشونت کچھ کم

کی۔ ”سلیم احمد! تمہارے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہو رہی ہیں۔ تم کہتے ہو ساہیوال کے رہائشی ہو اور ٹیچر ہو۔ رحیم بخش سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟“

”کچھ نہیں، میرا دادا اور وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں مارا گیا تھا۔“

”شامو نے بتایا کہ تم رحیم بخش کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔“

”جھوٹ بولا اس نے... اگر آپ سے ایسا کہا۔“

”جھوٹ تم بول رہے ہو۔ تم نے نہیں کہا تھا اس سے کہ مار کے اسی زمین میں گاڑ دوں گا؟“

”وہ غصے کی بات تھی۔ بابا رحیم بخش کو اس سے شکایت تھی کہ پورا حصہ نہیں دیتا... تین چوتھائی خود رکھ لیتا ہے اور زمین کا مالک بنا ہوا ہے کیونکہ رحیم بخش مجبور ہے۔“

”وہ اپنا جھگڑا لے کر میرے پاس آتا۔ تم بیچ میں کہاں سے آ گئے خدائی فوجدار بن کے... تم نے اس سے کہا تھا کہ اب زمین پر تم کاشت کرو گے... کہا تھا یا نہیں؟“

”ہاں، یہ بھی کہا تھا۔“

چودھری گرم ہو گیا۔ ”تمہارا کیا حق تھا اس کی زمین پر؟ جب رشتہ کوئی نہیں تھا۔ کیوں آئے تھے تم اس گاؤں میں اس سے ملنے؟ اصل بات یہ ہے کہ تم اس کی لڑکی ریشم کے چکر میں تھے۔ وہ ریشم کی شادی تم سے کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”چھوٹے چودھری! ایک باپ جہاں چاہے بیٹی کو بیاہ سکتا ہے۔“

”یہ شادی نہیں تھی، سودا تھا۔ کتنے پیسے لیے تھے اس نے تم سے ریشم کے؟“

”آپ شاید ہوش میں نہیں ہیں۔“

”سب جانتے ہیں کہ تم نے اسے ایک لاکھ میں خرید لیا تھا۔ اس کی زمین بھی اور بیٹی بھی۔“

”بکواس کرتا ہے جو ایسا کہتا ہے۔“ میں نے بھی دہاڑ کے جواب دیا۔

”سارا گاؤں جانتا ہے کہ پولیس کو تم نے پچاس ہزار روپے ادا کیے تھے۔ میرا چاچا گواہ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر میں ایسا نہ کرتا تو ریشم کے لیے بہت پریشانی ہوتی اور لوگ بھی مشکل میں پڑتے۔“

چودھری نے تلخی سے کہا۔ ”اور کون؟ صرف تم... خود اپنی جان بچائی تم نے... قتل کے الزام میں تم پکڑے جاتے۔“

میں نے کہا۔ ”ریشم جانتی ہے کہ قتل میں نے نہیں کیا تھا۔“

”وہ کیسے جانتی ہے؟ کیا اس وقت وہ تمہارے ساتھ تھی جب شامو... میرا مطلب ہے...“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب مطلب کی ضرورت نہیں۔ نام خود تمہاری زبان نے لیا ہے قاتل کا“

”کسی ثبوت گواہ کے بغیر نام لینے سے کچھ نہیں ہو“ سب جانتے ہیں کہ ریشم نے تمہارے حق میں بے گناہی گواہی کیوں دی تھی۔ وہ مجبور تھی۔ تمہیں کیسے نہ بچاتی تمہارے ساتھ ہی زندگی گزارنی تھی اسے... لیکن تم قانون کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ اس تھانے دار کی نوکری تو گئی۔“

”دیکھو چودھری! مجھے بابا رحیم بخش نے سب بتا دیا کہ تم اس کی لڑکی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔“

”میں شادی کرنا چاہتا تھا اس سے... یہ کوئی نہیں۔“

”لیکن تم پہلے سے شادی شدہ ہو اور کون نہیں جانتا تم کتنے عیاش ہو۔ اس کا ثبوت آج صبح میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کون تھی وہ فاحشہ... اس گاؤں کی تو نہیں ہو سکتی شہر سے لائی گئی ہو گی۔“

”اس حرامزادی سے بھی میں نمٹ لوں گا۔ مجھے ڈر تھا اس نائی پر لیکن ابا جی کو خبر پہنچانے والی وہ طوائف تھی۔ اس نے فون کیا تھا ابا جی کو... تیزاب سے اس کا چہرہ نہ بگاڑ دیا تو اکبر نام نہیں۔“

یہ میرے لیے بھی ایک انکشاف تھا۔ ”وہ عورت ایک طوائف ہے۔ جسم بیچتی ہو گی کسی مجبوری سے مگر اس۔ ایک موقع ملا تو نیکی بھی کمائی۔ تمہارے پاس کیا ہے سوا گناہوں کے اور جرائم کے۔ تمہارا نامۂ اعمال اس طوائف سے زیادہ سیاہ ہے۔“

”بکواس مت کرو۔ ریشم کو چودھری اکبر سے بچانے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔ شکر کرو جان ابھی بچ گئی۔ ریشم کو بھول جاؤ اور نکل جاؤ ادھر سے... دوبارہ یہاں نظر آئے تو قبر تو نہیں ملے گی کہیں۔“ وہ باہر جاتے جاتے بولا۔

”میں یہ بھی بتا دوں گا تمہارے باپ کو۔“ میں نے چلا کے کہا۔

وہ دروازے میں رکا۔ ”بتا دو مگر وہ بڈھا کیسے بچائے گا تمہیں یا ریشم کو... جو خود مرنے والا ہے۔“

بڑے چودھری سے میری ملاقات دو گھنٹے بعد ہوئی اس وقفے میں مجھے بہت کچھ سوچنے کا موقع ملا۔ یہ بات ا

کھل کے سامنے آ گئی تھی کہ بابا رحیم بخش کو شامو نے قتل کیا تھا۔ اس نے چھوٹے چودھری کی حمایت حاصل کر لی تھی اور ایک طرح سے وہ دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر بن گئے تھے۔ اکبر کو ریشم کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ لاحق تھا تو شامو کو زمین پھر ملکیت سے محرومی کا۔ اس زمین سے وہ سارا فائدہ خود حاصل کر رہا تھا۔ چودھری اکبر نے اسے یقین دلایا ہو گا کہ وہ بیٹی کا رشتہ طے کرنے سے قبل ہی رحیم بخش کو ٹھکانے لگا دے تو سارے معاملات خود ٹھیک ہو جائیں گے۔ قتل کے شبے میں ہم دونوں کا مشترکہ حریف جیل جائے گا۔ ریشم مجھے مل جائے گی اور زمین تمہارے پاس ہی رہے گی۔ ممکن ہے اس نے شامو کو یقین دلایا ہو کہ زمین اس کے نام کر دی جائے گی۔

ان کی پلاننگ ابھی فیل ہو گئی تھی۔ میں قانون کی گرفت میں آنے سے بچ گیا تھا اور ابھی ریشم بھی چودھری اکبر کی گرفت سے دور تھی لیکن دریا میں رہ کے مگرمچھ سے دشمنی مول لینا خطرناک کام تھا۔ شامو کو قاتل ثابت کرنا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کی پشت پر چودھری اکبر کا ہاتھ تھا۔ وہ خود بھی گواہی دے سکتا تھا کہ رحیم بخش کے قتل کی رات تو شامو اس کے ساتھ ساہیوال یا لاہور میں تھا اور اس کے برعکس ریشم کی گواہی کو جھوٹا ثابت کرنا بہت آسان تھا۔ وہ مجبور تھی کیونکہ اسے زندگی میرے ساتھ گزارنی تھی۔

بڑے چودھری کی حمایت حاصل کرنا کسی صورت نہ مجھے بچا سکتا تھا اور نہ ریشم کو... چنانچہ بہت سوچ سمجھ کے میں نے خود کو کمزور فریق تسلیم کرتے ہوئے اپنی شکست تسلیم کر لینا بہتر سمجھا۔ چودھری اکبر کو یہ پیغام ملنا بہتر تھا کہ نہ میں اس کا حریف ہوں اور نہ رقیب... مجھے موقع ملا ہے تو میں نے جان بچا کے پسپا ہو جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ریشم جائے بھاڑ میں۔ بڑے چودھری صاحب نے مجھے رات کے کھانے پر شرفِ ملاقات بخشا۔ پہلے وہ مجھ سے میرے گاؤں کے متعلق... بات کرتے رہے اور میں نے انہیں وہی کہانی سنائی جو سب نے سنی تھی۔

”تو نے بتایا تھا کہ ساہیوال میں پڑھاتا ہے کہیں... پھر کیا نوکری چھوڑے گا؟“

”نہیں چودھری صاحب! ایسا تو میرا کوئی ارادہ نہیں۔“

”میں نے سنا تھا کہ تُو رحیم بخش کی زمینوں کو سنبھالے گا جو تھوڑی بہت ہے۔“

”پتا نہیں ایسی باتیں کیوں مشہور ہو رہی ہیں۔ میں تو کل صبح ہی نکل جاؤں گا۔ ریشم کا آگے پیچھے کوئی نہیں رہا۔“

”تو اس کی فکر نہ کر۔ وہ ادھر بھی رہ سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھ سے آپ کے چھوٹے بھائی صاحب نے کہا تھا کہ... آپ اسے اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں؟“

چودھری چونکا۔ ”یہ اکبر کے چاچا نے کہا؟“

”ہاں جی، چھوٹے چودھری صاحب تو خیر سے پہلے ہی شادی شدہ ہیں۔“

بڑے چودھری نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مرد کر سکتا ہے دو شادیاں اور یہ تو نیکی۔ ریشم ایک یتیم لاوارث لڑکی ہے۔“

میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ”لیکن بڑے چودھری صاحب! اس کی مرضی۔“

”اوئے اس غریب کی کیا مرضی... اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات اس کے لیے کیا ہو گی کہ وہ اس حویلی میں آ جائے۔ اوئے پترا اکبر... تجھے تو اعتراض نہیں ہو گا نا؟“

چھوٹے چودھری نے دل کی خوشی چھپاتے ہوئے سعادت مندی سے سر جھکا لیا۔ ”جیسی آپ کی مرضی ابا جی۔“

”لو جی مسئلے ہی ختم ہو گئے ہیں۔ صبح میری گاڑی چھوڑ آئے گی تمہیں۔“

چھوٹے چودھری کی آنکھوں میں ایک شاطر کی فاتحانہ چمک تھی۔ رات کو میں مہمان خانے کے بیڈ پر اکیلا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا کہ چودھری اکبر نمودار ہوا۔ ”یہ اچھا عقل مندی کا فیصلہ کیا تم نے ماسٹر۔“

”فیصلے مجبوری کراتی ہے چودھری صاحب۔“

”ہاں، کیا فائدہ ہوتا... تم خوامخواہ جیل جاتے اور عمر قید تو کم سے کم کاٹتے... تم شہری بندے ہو۔ یہ زمین کاشت کرنا تمہارے لیے مشکل تھا۔ اور رہی ریشم تو ابا جی نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ حویلی میں وہ عیش سے رہے گی۔“ جاتے جاتے اس نے مجھ سے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا۔ ”کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ؟“

میں نے کہا۔ ”ایک درخواست ہے۔ اس طوائف کے جرم کو بھی معاف کر دیں۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”اس نے تمہیں بچایا، تم اسے بچا رہے ہو۔ کیا چکر ہے؟“ اس نے مجھے آنکھ ماری اور باہر نکل گیا۔

میں نے براہِ راست تصادم سے گریز کیا تھا کیونکہ میری پوزیشن بہت نازک اور کمزور تھی۔ لیکن اب میرے سامنے زیادہ مشکل مرحلہ تھا۔ درمیان میں صرف ایک رات

تھی جس میں مجھے ریشم کے ساتھ نکلنا تھا۔ اس کی زندگی اور اپنی جان بچانے کا مسئلہ سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ نورین کا معاملہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اگر وہ زندہ تھی تو اس کی تلاش کی جاسکتی تھی۔ اگر وہ اسی علاقے میں تھی تو یہاں سے کہیں اور نہیں جاسکتی تھی۔ جیسے مجھے اس کی تلاش تھی، اسے بھی ہوگی۔ اسے بھی امید ضرور ہوگی کہ اگر میں زندہ ہوا تو اسی علاقے میں ملوں گا ورنہ اسے تلاش کرتا ہوا آؤں گا۔ ریشم میری نئی ذمے داری بن گئی تھی۔ اس نے نورین کی جگہ لے لی تھی۔ اس کے گھر اور زمین کے معاملات اتنے اہم نہیں تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنے دل کی بات اسے کیسے پہنچاؤں۔ اسے تو شاید یہ پتا چلے گا کہ میں صبح جا رہا ہوں اور بڑے چودھری صاحب نے بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ اس کی شادی چودھری اکبر سے کر دی جائے۔ وہ کس قدر دل گرفتہ اور مایوس ہوگی۔ مشکل یہ تھی کہ اسے حویلی کے زنان خانے میں عورتوں کے ساتھ رکھا گیا تھا اور بڑے چودھری کی اجازت کے بغیر اس سے بات کرنا بھی ناممکن تھا۔ اب شاید یہ بھی محال تھا کیونکہ اسے حویلی کی بہو بنانے کا اصولی فیصلہ ہو چکا تھا۔ اگر کچھ امید تھی تو خود ریشم سے کہ وہ ملاقات کا کوئی وسیلہ تلاش کرلے۔ حویلی کے اندر کوئی خادمہ اس کی مددگار بن سکتی تھی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ معلوم نہیں رات کا کون سا پہر تھا جب کسی نے آہستہ سے قریب آ کے میرا نام لیا۔ ”صاحب جی... ماسٹر صاحب!“ میں سویا نہیں تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میں نیم خوابیدہ سا خیالوں کے خواب بُن رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو نیم تاریکی میں ایک سایہ سا دکھائی دیا جو مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ یہ کوئی عورت تھی۔ ایک انگلی ہونٹوں پر رکھ کے اس نے مجھے خاموش رہنے کا اور پھر پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اٹھا اور ایک دروازے سے نکل کے باہر آ گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ریشم نے کسی خادمہ کو وسیلہ بنا لیا ہے اور وہ مجھے اس کے پاس لے جارہی ہے۔

ریشم حویلی کے باہر دیوار کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ باہر ایک بہت وسیع صحن تھا جس کی چار دیواری دس فٹ کے قریب اونچی تھی۔ اندر پھل دار درخت... پھولوں کے پودے اور سبزیاں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف طویل برآمدے میں گائے، بھینسیں نظر آرہی تھیں۔ آخر شب کی چاندنی کو بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کچھ دیر کے لیے غائب کر دیتے تھے۔

ریشم مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑی۔ ”سلیم! مجھے تم سے ایسی بزدلی کی اور خود غرضی کی امید نہیں تھی۔“

میں نے کہا۔ ”آہستہ بولو اور میری بات سنو۔“

”اب کیا سنوں... سب کچھ سن چکی ہوں میں۔ بھاگ جاؤ گے مجھے اس چودھری اکبر کے حوالے کر کے۔“

میں نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہوگا ریشم! میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میری بات غور سے سنو۔ میں صبح سب کے سامنے چلا جاؤں گا لیکن رات کو میں لوٹ کر آؤں گا۔ تمہارے گھر میں تمہارا انتظار کروں گا... تم وہاں آسکو گی؟“

”میں ضرور آؤں گی۔ میں نے ایک خادمہ کو ہمراز بنا لیا ہے۔“

”اندھیرا ہو جانے کے بعد میں دس بجے تمہارے کمرے میں ملوں گا۔ صبح تک ہمیں نکل جانا ہے۔“

”ہم کہاں جائیں گے سلیم؟“

”اس کی فکر تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ میں نے کہا مگر میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ دو طرف سے چار آدمی جیسے دیوار میں سے نکل آئے۔ ان میں چودھری اکبر بھی تھا۔

”تیری یہ ہمت دو کوڑی کے ماسٹر! میری ہونے والی بیوی کو ورغلا رہا ہے۔“ چودھری نے چیخ کے کہا اور اس کے ساتھ ہی لاٹھی اٹھائی۔ میں نے اس کے وار کو ہاتھ سے روک لیا۔ دو طرف سے چار ہاتھوں نے مجھے پکڑ لیا۔

ریشم چلائی۔ ”اکبر! چھوڑ دو اسے۔“

اکبر نے اس کو کلائی سے پکڑ کے گھسیٹا۔ ”حرامزادی! یار کے ساتھ بھاگنا چاہتی تھی۔“

حویلی میں ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ساری لائٹس جلا دی گئی تھیں۔ ہمیں مجرموں کی طرح اندر لے جا کے بڑے چودھری کے قدموں میں پھینک دیا گیا۔ وہاں ایک عورت پہلے سے بے سدھ پڑی تھی۔ یہ وہی خادمہ تھی جس نے ریشم کی مجھ سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ ایک نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے مار دیا گیا ہے۔ بڑے چودھری صاحب فرطِ غضب سے آتش فشاں بنے بیٹھے تھے۔

اب مجھے اپنے انجام کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ ریشم کی چیخ پکار کوئی نہیں سن رہا تھا۔ اب وہ میرے لیے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ بڑے چودھری صاحب کی عدالت سے میرے خلاف سزائے موت کا فیصلہ صادر ہونے ہی والا تھا کہ باہر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ کسی نے ایک دردناک چیخ ماری۔

هر محاذ پر ایک نئے داؤ کی منتظر
جواری کی تدبیریں اگلے ماہ پڑھیے

ٹھگ بازی

مختار آزاد

تپتے صحرا میں چلتے مسافر کو اچانک نظر آنے والا پانی سرابِ نظر اور اس کی حقیقت نگاہوں کا دھوکا ہوتی ہے... ضروری نہیں کہ جو نظر آئے، وہی حقیقت ہو... کبھی کبھی حقیقت کے پردے میں اسرار... حماقت کے پردے میں دانائی اور غلطی کے پیچھے دانشمندی پوشیدہ ہوتی ہے... اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا... وہ فرض کے عشق میں مبتلا... اور فریب کے لبادے میں حقیقت کا متلاشی تھا...

دھوکا گر کا روپ سجا کر ٹھگوں کی چال اختیار کرنے والے

ذہین سراغ رساں کا قصہ... مغرب سے تروتازہ تحفہ

”لگتا ہے ہمارا دوست کیپٹن کوپر سخت مشکل میں پھنس چکا ہے۔“ ٹوئن برادرز بیل بانڈ نامی قانونی سہولیات فراہم کرنے والی فرم کے مالک کریس جانسن نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہانگ کانگ کے نہایت مہنگے تجارتی مرکز میں واقع نہایت آرام دہ کرسی پر بیٹھے جانسن کے چہرے پر تشویش صاف ظاہر تھی۔ اس کی جسمانی کیفیت اندرونی پریشانی کا صاف اظہار کر رہی تھی۔

میز کی دوسری جانب کرسی پر اس کا ایگزیکٹیو سیکریٹری موک لال فرنگیا اور فرم کا ایجنٹ تھیوڈور آسکر بیٹھے تھے۔

”تو کیا پولیس نے کیپٹن سے کچھ تفتیش کی ہے؟“ آسکر نے متجسس لہجے میں کہا۔

”ہماری جیب میں صرف کوپر ہی ہے اور کوئی دوسرا افسر نہیں جو اندر کی بات بتا سکے۔“ جانسن نے جواب دیا۔

آسکر خاموش رہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ جانسن کے لہجے سے اسے ہلکا سا خوف جھلکتا محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اس کی بات سمجھنے کے لیے کافی سوچنا پڑتا تھا۔ جانسن کی گفتگو شتر بے مہار کی طرح کہیں سے کہیں نکل جاتی تھی۔ جانسن نے جب بھی اس سے کسی موضوع پر گفتگو مکمل کی، اس کے بعد کافی دیر تک اسے کئی سوالوں کے جوابات خود تلاش کرنا پڑتے تھے۔ وہ عام طور پر گفتگو کو بے سمت ہی چھوڑ دیتا تھا۔ ایسا شاید لاشعوری طور پر ہوتا ہو یا پھر اس کی پرانی عادت ہو لیکن آسکر کئی برس بعد بھی یہ فرق سمجھ نہیں سکا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اگر اطراف میں کوئی نہ ہو تو جانسن اُلٹے ہاتھ سے کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا حالانکہ اس کا اُلٹا بازو ٹوٹا ہوا تھا اور چھنگلی انگلی کی ہڈی ٹوٹ کر اس طرح جڑی تھی کہ وہ پوروں سے حرکت کرنے کے بجائے بالکل سیدھی اور اکڑی رہتی تھی۔ ویسے جانسن کے پیچھے پولیس تو تھی اور کچھ عرصے سے اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ کیپٹن کی گرفتاری بھی کچھ اسی سلسلے کی کڑی لگتی تھی۔ ویسے یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ جب تک پولیس کے ساتھ معاملات نمٹ نہیں جاتے، فرم کے دفتر میں افراتفری رہنی تھی۔ جانسن کی خواہش تھی کہ سب کچھ اس کے حق میں ہو۔ وہ ایسی کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس سے اس کے ہاتھ سے کچھ جاتا ہو۔ ویسے بھی وہ جاننے والوں میں بلا کا شاطر اور خود غرض مشہور تھا۔ آسکر کے لیے فرم کے معاملات ویسے ہی پریشانی کا سبب تھے اور اب کیپٹن کوپر کی گرفتاری سے نئی مصیبت کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اسے حیرانی تھی کہ کئی برس سے جو تناؤ اسے برداشت کرنا پڑ رہا تھا، اسے مزید سہنے سے اب تک اس کی ہمت نے جواب کیوں نہیں دیا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے سامنے کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں یہ پتا چلانے کی کوشش کروں کہ آخر کیپٹن کے ساتھ مسئلہ کیا پیش آیا ہے؟“

جانسن نے جواب دینے میں کوئی جلدی نہیں کی۔ اس کی نگاہیں پہلے تو چھت پر لگی رہیں پھر اس نے لیمپ کا رخ موڑ کر، سامنے رکھے کاغذ پر روشنی ڈالی اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ کافی دیر بعد اس نے نگاہیں اٹھا کر آسکر کو دیکھا۔ ”کچھ دیر پہلے کسی نامعلوم شخص کے ذریعے یہ پیغام ہمارے دفتر کو ملا ہے۔“ اس نے ایک کاغذ آسکر کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے مطابق ہمارے دوست کیپٹن پر قتل کا الزام ہے۔“

”لیکن اُس نے کس کو قتل کر دیا؟“ آسکر کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

”مرنے والا کوئی پرائیویٹ سراغ رساں تھا جو کسی بدعنوانی اور غیر قانونی معاملے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”اوہ....“ آسکر نے ہونٹ سکیڑ کر جواب دیا۔ جانسن کی پوری گفتگو کے ردِعمل میں یہ واحد لفظ تھا جو اس کے منہ سے نکلا لیکن وہ سوچ ضرور رہا تھا۔ قتل کا سن کر اس کے ماتھے پر پسینے کی چند بوندیں نمودار ہو گئیں۔ ”یہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔“ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ”دیکھ لینا، ایک دن یہ بات ظاہر ہو کر ہی رہے گی کہ جو کچھ کیا جاتا رہا، وہ ٹھیک نہیں تھا۔“ وہ پریشانی اور بے چینی کے باعث ہتھیلیاں ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”دھندے اپنی جگہ مگر اب اس میں تو لوگوں کی جانیں لی جا رہی ہیں۔“

”اس سے پہلے کہ صورتِ حال مزید خراب ہو جائے ہمیں اپنے اثاثوں کو پولیس سے بچانے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا۔“ کچھ دیر آسکر کی طرف سے کچھ کہنے کا انتظار کرنے کے بعد، جانسن نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے خود ہی بات شروع کی۔

آسکر حیران تھا کہ کس طرح صورتِ حال خراب سے خراب تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ حالات کیا ہوں گے لیکن حالات جو بھی ہوں، وہ اس کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ”سر....“ اس نے کھنکھارتے ہوئے بات شروع کی۔ ”آپ کے خیال میں ہمیں پولیس سے محفوظ رہنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے جانسن کی بات کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔

”سب سے پہلے تو ہمیں خود اپنے طور پر تحقیقات کر کے یہ پتا چلانا ہوگا کہ حقیقت میں ہوا کیا تھا۔“ آسکر سے یہ کہنے کے بعد اس نے دوسری طرف دیکھا۔ ”فرنگیا....“

موک لال فرنگیا، صرف ہندو انگریزی ناموں کا مرکب ہی نہیں تھا بلکہ یہ اس کے اجداد کا پس منظر بھی تھا۔ آسکر نے گردن گھما کر اُس کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنے جسم کے بالائی حصے پر سے اختیار کھو بیٹھا ہو۔ وہ چاہتے ہوئے بھی سر، گردن حتیٰ کہ ہاتھوں تک کو جنبش نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ تو سُن ہو گیا لیکن دماغ بدستور صحیح حالت میں کام کر رہا تھا۔

لمبا تڑنگا، رنگ سیاہ، چہرہ مکروہ لیکن مضبوط جسم والا موک لال فرنگیا نسلی طور پر شمال مغربی ہندوستان کے اُن ٹھگ مشہور ٹھگوں کی اولادوں میں سے تھا جو نظر بندی کے ہنر میں یکتا تھے اور اسی کی بدولت شکار کو سحر میں جکڑ کر لوٹتے ہی نہیں، اپنے مخصوص رومال سے گلا گھونٹ کر، دنیا سے ہی چلتا کر دیتے تھے۔

جانسن کی فرم کا ایگزیکٹیو سیکریٹری بننے تک، موک لال کی زندگی کے بارے میں خفیہ فائلوں میں جو کچھ لکھا گیا، وہ آسکر پڑھ چکا تھا۔ رپورٹوں میں ہندوستان کے ٹھگ خاندان سے اس کے نسلی تعلق کا ایک حوالہ موجود تھا لیکن اس ایک جملے کے سوا اور کوئی بات تحریر نہیں تھی۔ اُس وقت آسکر کو یہ بات اس لیے چونکا گئی کہ جانسن سے گفتگو کے دوران غیر اختیاری طور پر اُس نے اپنا ایک ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھایا تو اس کی قمیص کے داہنے ہاتھ کی آستین کے کف سے باہر زرد رنگ کا ایک ریشمی رومال ذرا سا جھلک رہا تھا۔ اگرچہ اس کا وجود سُن ہو چکا تھا لیکن اس کا دماغ بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ اس کے لیے نہایت تشویش کی بات تھی۔ اگر اسے رومال رکھنا تھا تو کوٹ کی جیب میں رکھتا لیکن یہ آستین کے اندر.... اسے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

جب انٹرپول کی فائل کے ذریعے آسکر پر فرنگیا کا نسلی تعلق ٹھگ خاندان سے ہونے کا انکشاف ہوا، اس کے بعد اس نے اپنے طور پر بھی بعض تحقیقات کی تھیں۔ انٹرنیٹ پر گوگل سرچ کے ذریعے اسے ٹھگوں سے متعلق جو مفید اور معتبر معلومات ملیں، ان کا حوالہ سن اٹھارہ سو تیس میں، انگریز راج کے محکمہ انسدادِ ٹھگ و ڈکیٹ کے سربراہ میجر سلیمن کی تحریر کردہ وہ دستاویزات تھیں جن میں ان سے متعلق تفصیل سے تحریر کیا گیا تھا۔ اس میں یہ پورا قصہ تحریر تھا کہ کس طرح ٹھگ اپنے شکار کو چکنی چپڑی باتوں میں گھیر گھار کر قریب کرتے ہیں اور پھر اسے مسمریزم یا نظر بندی کے ذریعے سُن کر کے نہ صرف اس کا مال و اسباب لوٹ لیتے تھے بلکہ ایک رومال کو شکار کی گردن میں ڈال کر نہایت ہی مہارت سے صرف انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے گرہ لگا کر پل بھر میں گلا گھونٹ کر مار دیتے تھے۔ اگرچہ ٹھگوں اور ہندوستان کی افراتفری کو گزرے زمانہ بیت چکا لیکن آسکر کا ماننا تھا کہ نسلی تعلق، سرزمین اور اجداد کے پیشے انسان کے خون میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

اظہارِ تاسف

ایک بوڑھی غیر شادی شدہ عورت نے اخبار پڑھتے ہوئے اپنی ہم عمر غیر شادی شدہ سہیلی کو بتایا۔ ”کل لیزا کا تیسرا شوہر بھی انتقال کر گیا اور وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔“

بوڑھی سہیلی نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔ ”کیسی عجیب دنیا ہے ہم میں سے کچھ ایسی ہیں کہ جنہیں ایک شوہر بھی نصیب نہیں ہوتا اور کچھ ایسی بھی ہیں جو شوہر پر شوہر نذرِ آتش کرتی جا رہی ہیں۔“

(قیصر اعوان کا تعاون، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا)

آسکر ایک مرتبہ ہندوستان گیا جہاں ایک روز اس کے گلے میں بہت زور کا درد ہوا تھا۔ اس کا دوست اسے مساج کے لیے لے گیا۔ مالشیے نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے اس کی گردن اور حلق کا مساج کیا جس سے اسے فوری سکون ملا۔ اسے یاد ہے کہ مساج کے دوران وہ کچھ دیر کے لیے سو بھی گیا تھا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے مالشیے سے مساج کا راز پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ ٹھگ نسل سے ہے اور جانتا ہے کہ انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے رومال کو کس طرح گرہ لگائی جاتی ہے اور صرف دو انگلیوں کی مدد سے ہی انسان کو کس طرح اور کتنی دیر تک بے ہوش رکھا یا مارا بھی جا سکتا ہے۔

اُسے یہاں فرنگیا کی موجودگی سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن ایک تو اس کا بے جان جسم، اوپر سے اُس کی قیمتی سفید قمیص کے کف سے جھلکتا سِلک کا زرد رومال۔ یہ بھی پریشانی کا سبب نہیں بنتا اگر اس کا تعلق ٹھگ خاندان سے نہ ہوتا اور وہ یہ رومال ایک بار اس کی میز پر نہ دیکھ چکا ہوتا۔ اس وقت آسکر شدید ذہنی ہیجان میں تھا۔

”ہاں تو فرنگیا....“ چند لمحوں کے توقف کے بعد جانسن نے پھر اُسے مخاطب کیا تو آسکر نے بھی جسم کو جنبش دیے بنا آنکھیں فرنگیا پر لگا دیں۔ وہ پوری طرح جانسن کی جانب متوجہ تھا۔ ”ہاں تو موک لال.... تم ایسا کرو کہ جیل جاؤ اور اپنی فرم کا حوالہ دے کر انتظامیہ سے ملو اور کوشش کرو کہ کیپٹن سے بات کر سکو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ جو الزامات اس پر لگائے گئے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔“

موک لال نے تابع داری سے اثبات میں سر ہلایا۔

اچانک آسکر کو محسوس ہوا کہ اُس کا جسم ڈھیلا پڑ رہا ہے۔ اُس کا تن جسم واپس نارمل حالت میں آرہا تھا لیکن اس پر توجہ دینے کے بجائے اس نے جانسن کی طرف دیکھا، وہ خاموشی سے چھت کو گھور رہا تھا۔ ''اور سر! میرے لیے کیا حکم ہے... مجھے بھی کچھ کرنا ہوگا؟''

یہ سن کر جانسن نے آہستگی سے گردن نیچے کر کے اسے دیکھا اور پھر رائٹنگ پیڈ کھسکا کر کچھ لکھنے لگا۔ ''یہ لو...'' اس نے کاغذ علیحدہ کر کے آسکر کی طرف بڑھایا۔ ''تم اس پتے پر جاؤ۔ یہاں تمہیں داخلی معاملات سے تعلق رکھنے والی ایک سیکریٹری سے ملنا ہے۔ وہ تمہیں ایک لفافہ دے گی جس میں اس کیس سے متعلق اب تک جتنی بھی دستاویزات تیار ہوئی ہیں، وہ ہوں گی۔ لیکن خبردار جو اس کے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کی۔'' جانسن نے تنبیہ کی۔

''ٹھیک ہے سر!''

''ایک اور بات...'' جانسن نے کہا۔ ''اگر تم کبھی دوبارہ اس سے ملے تو قطعاً یہ یاد نہ رکھنا کہ پہلے مل چکے ہو۔''

''میں سمجھ گیا۔'' لیکن اگلے ہی لمحے اس نے ایک سوال پوچھ لیا۔ ''کیا انہیں کچھ پیش بھی کرنا ہوگا... میرا مطلب ہے کہ رقم وغیرہ؟''

''نہیں...'' جانسن نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ ''ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب معاملات طے کیے جاچکے ہیں۔ بس تمہیں جا کر اُس سے دستاویزات لے کر آنی ہیں۔''

آسکر نے دونوں ہتھیلیوں کو باہم ایک دوسرے سے رگڑا۔ اس نے وضاحت کے لیے یہ بات پوچھ لی تھی ورنہ وہ جانتا تھا کہ جانسن ایسے معاملات میں سارے انتظامات پہلے ہی کر دیتا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ صورتِ حال شاید مزید پیچیدہ ہونے جارہی ہے۔ اس نے گردن موڑے بنا کن انکھیوں سے برابر میں دیکھا۔ موک لال خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ جانسن ایک فائل دیکھ رہا تھا۔

جب وہ چند منٹ تک انہیں نظر انداز کیے اپنے کام میں مشغول رہا تو موک لال اٹھا۔ ''سر! میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جواب سنے بنا دروازے کی طرف بڑھا۔

آسکر بھی جلدی سے اٹھا۔ ''سر! میں بھی جارہا ہوں سیکریٹری کے پاس۔'' جانسن کا دیا پتا جیب میں رکھتے ہوئے اس نے کہا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ تب تک موک لال دروازے تک پہنچ چکا تھا لیکن آسکر لپک کر اس تک پہنچا اور سرگوشی میں کہا۔ ''جو کچھ بھی ہوا، وہ اس کا ذاتی معاملہ ہے مگر پھر بھی کیپٹن کے لیے میری خواہشات نیک ہیں۔'' ... نے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔

''پرانا قول ہے، تم بھی سن لو۔'' موک لال نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ آسکر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''بھیڑ کی موت کا الزام بھیڑیے کو دینا ٹھیک نہیں۔ غلطی بھیڑ کی تھی۔ وہ کیوں بھیڑیوں کی کچھار میں پہنچی۔'' کہتے ہوئے موک لال تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

آسکر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ موک لال یہ کیوں کہہ کر گیا ہے۔ ''ایک منٹ...'' اس نے کوریڈور میں آگے جاتے موک لال کو پکارا۔ ''یہ تم نے بھیڑیا کس کو کہا ہے؟'' وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے کیپٹن کی ساری کارروائیاں دیکھی ہیں، سب جانتا ہوں اور سُن لو...'' اس نے موک لال کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی کم عقل اور مجبور بھیڑ نہیں ہوں۔''

یہ سن کر موک مسکرایا... ''اگر تم کوئی بھیڑ نہیں تو پھر یہاں تمہیں پکڑنے والا کون ہے؟'' اس نے پُراسرار لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اُس نے جس سرد مہری اور پُراسرار انداز سے یہ کہا، اسے سن کر آسکر ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوبصورت سفید گھنے اونی بالوں والی معصوم بھیڑ کی تصویر ابھر آئی تھی۔ ساتھ ہی سامنے ایک بھیڑیا بھی تھا جو نہایت خوفناک انداز میں اپنی سرخ آنکھوں سے معصوم صورت بھیڑ کو گھور رہا تھا۔ آسکر کا تصوراتی بھیڑیا، تیزی سے بھیڑ کی طرف لپکا اور لمحہ بھر میں اسے چٹ کر گیا۔ اس کے ساتھ ہی بھیڑیے کی شبیہ بدلتی گئی۔ وہ انسان بن چکا تھا۔ اس نے بھیڑ کی کھال اٹھا کر شانوں پر ڈالی۔ ذرا آگے بڑھا تو آسکر چونک گیا۔ وہ کیپٹن تھا۔ اچانک اس کے کوٹ کی جیب میں رکھے موبائل فون کی گھنٹی بجی اور وہ جاگتے میں دیکھے جانے والے خواب سے باہر نکل آیا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ اسے یقین تھا کہ کیپٹن کے دو رخ ہیں۔ وہ بھیڑ بھی تھا اور بھیڑیا بھی۔ ہوسکتا ہے کہ اب اس کے لیے بھیڑ کا کردار ادا کرنے کا وقت آپہنچا ہو۔

☆☆☆

فوڈ کورٹ سے سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک خریدنے کے بعد وہ بل ادا کر رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اس کے شانے پر زور سے ٹہوکا دیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور اس سمت دیکھنے لگا جہاں اندازے کے مطابق کندھا مارنے والا جاتا نظر آنا چاہیے تھا لیکن اس کے پیچھے یا اطراف میں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ پلٹا تو سامنے کی جانب اسے ایک عورت تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھتی دکھائی دی۔ وہ صرف اس کی پشت دیکھ پارہا تھا جس سے پہچاننا مشکل تھا کہ وہ کون ہے البتہ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا، اس سے آسکر اتنا اندازہ ضرور لگا سکا کہ ضرور وہ کسی دفتر میں کام کرتی ہوگی۔ وہ چاہتا تو اس کا پیچھا کر کے باز پرس کر سکتا تھا لیکن دو وجوہات کی بنا پر اس نے یہ خیال چھوڑ دیا۔ ایک تو اسے سخت بھوک لگی تھی اور دوسرا یہ کہ جانسن نے جس خاتون افسر سے ملاقات کی ہدایت کی تھی، اس میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ خوامخواہ عورت سے اُلجھ کر سینڈوچ کھانے کا لطف خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھہر کر معذرت کرنا تو دور کی بات، بعض لوگ اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ اس طرح کی غلطیوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ اس نے سر جھٹکا اور اسٹال والے کو ادائیگی کے لیے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن سخت حیرت ہوئی۔ جیب میں اس کے اندازے سے زیادہ سکے موجود تھے۔ حیرانی کی ایک اور بات بھی تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا تو وہ ایک چابی تھی۔ یہ چابی نہ تو اس کی تھی اور نہ ہی پہلے سے جیب میں موجود تھی۔ آسکر نے سوچا کہ یقیناً یہ اسی دفتری لباس میں ملبوس عورت نے ڈالی ہوگی اور کندھا مارنا ایک اشارہ تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جس خاتون افسر سے ملنا تھا، اس سے رابطہ ہو چکا مگر پوری بات اب تک اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ جانسن نے ملنے کو کہا تھا اور پتا بھی دیا تھا لیکن اس طرح نہ تو ملاقات طے تھی اور نہ ہی دستاویز ملی تھیں... تو پھر یہ سب کیا تھا؟ وہ بدستور سوچ میں غرق تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ لنچ ٹائم ہے۔ اس کے پیچھے اور لوگ بھی کھڑے تھے۔

''سر...'' ایک مردانہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''مسٹر سینڈوچ اور دیکھیے، ذرا جلدی کریں۔ دوسرے بھی انتظار کر رہے ہیں۔'' اسٹال والے کا لہجہ مہذب تھا لیکن وہ یوں اس کے ایک ہی جگہ جم جانے پر ناراض نظر آرہا تھا۔

سینڈوچ باکس اور کولڈ ڈرنک تھام کر، ایک ہاتھ سے اپنا شولڈر بیگ ٹھیک کرتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ اگرچہ ملنے والی پُراسرار چابی نے اسے پریشان کر دیا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ جانسن نے جس عورت سے ملاقات کا کہا تھا، وہ اس کی سوچ سے زیادہ محتاط نکلی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ صرف ایک چابی تھی لیکن کس لاکر کی اور وہ کہاں تھا، اسے قطعی علم نہیں تھا۔ نمکین فرنچ فرائز چباتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہا تھا۔ یہ اس کے دفتر کے کسی لاکر کی چابی نہیں ہوسکتی تھی۔ دہشت گردی کے خطرے کے سبب وہاں سے تمام لاکر ہٹا دیے گئے تھے۔ اس نے یہ امکان فی الفور مسترد کر دیا۔ یہ کسی بس یا ٹرین اسٹیشن یا پھر ائرپورٹ لاکر کی بھی نہیں ہوسکتی... اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سب یہاں سے خاصے دور تھے۔ کولڈ ڈرنک کے آخری گھونٹ کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں خیال کوندا۔ سامنے ہی شاپنگ مال تھا، یہ وہاں نصب کسی لاکر کی چابی ہوسکتی تھی۔ یہ بات اس کے دل کو لگی لیکن لاکر نمبر کیا ہوگا، یہ خیال اسے پریشان کر گیا۔ اس نے فوراً ٹشو سے ہاتھ صاف کیے تاکہ چابی نکال کر یہ پتا چلائے کہ لاکر نمبر کیا ہے۔ اس نے جیب سے چابی نکالی۔ اس کے سرے پر نمبر کندہ تھا: لاکر نمبر 23۔

وہ اٹھا اور مال کی طرف بڑھا۔ جلد ہی اسے وہ حصہ نظر آگیا جہاں لاکر لگے تھے۔ اس نے ایک نظر ڈالی اور 23 نمبر لاکر میں چابی گھمائی، لاک کھٹ سے کھل گیا۔ اس نے ہینڈل اپنی طرف کھینچا، ہلکی سی چرچراہٹ ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ رک گیا۔ آسکر نے چور نگاہوں سے اِردگرد دیکھا۔ وہ یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لاکر میں کیا ہے اور نہ ہی چاہتا تھا کہ اندر جو کچھ بھی ہے، اسے نکالتے ہوئے کوئی دوسرا دیکھے۔ دروازہ ترچھے انداز میں ذرا سا ہی کھلا تھا۔

اس کی نظر کوریڈور پر تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا البتہ سرے پر واقع لیڈیز روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے غور سے اندر کی طرف دیکھا۔ تین پہیوں کی بائیک پر ایک بزرگ عورت بیٹھی تھی۔ بائیک پر انٹینا نما سلاخ پر چھوٹی سی سرخ جھنڈی لہرا رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ دوسری گاڑیوں کے لیے دور رہنے کا اشارہ تھا۔ آسکر نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ بائیک کے پیچھے ایک آکسیجن سلنڈر نصب تھا اور شفاف پلاسٹک کی ٹیوب اُس عورت کی ناک میں لگی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے وہ کسی مشکل میں پھنس چکی ہے۔ معذوروں والی اس کی بائیک...... دروازے کے بیچ میں ہی رکی تھی۔ اسی دوران بوڑھی عورت کی بائیک آگے بڑھی۔ وہ کوریڈور میں اسی سمت آرہی تھی جہاں لاکر کے ساتھ آسکر کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ عورت اسے اشارہ کر رہی ہے کہ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ وہ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کے پیچھے سے ہوتے ہوئے آگے بڑھی اور کوریڈور کے دوسرے سرے سے دائیں ہاتھ پر مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ آسکر نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے لاکر کا

دروازہ کھول کر اندر جھانکا، نیلے رنگ کا ایک بڑا لفافہ رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے نکالا اور اس شولڈر بیگ میں ڈال کر، لمبے ڈگ بھرتا ہوا شاپنگ مال سے باہر نکل آیا۔ وہ مطمئن تھا کہ جانسن نے جو ذمے داری سونپی تھی، وہ پوری ہوئی لیکن پھر بھی وہ محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ اس نے ممکنہ تعاقب سے بچنے کے لیے مال کے گرد واقع بلاک کے دو تین بے مقصد چکر کاٹے اور جب اچھی طرح یقین ہوگیا کہ کوئی اس کی نگرانی نہیں کر رہا تو وہ واپس دفتر کے لیے چل پڑا لیکن اس کی شکی طبیعت اب بھی محتاط رویہ اپنانے کا کہہ رہی تھی۔ اس کے اردگرد وقفے وقفے سے ٹیکسیاں آجا رہی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ کوئی ٹیکسی کے ذریعے بھی تعاقب کرسکتا ہے۔ یہی سوچ کر اس نے دفتر سے تین بلاک دور گاڑی روکی اور بے مقصد انداز میں گلیاں بدل بدل کر، اِدھر اُدھر تکتا ہوا دفتر لوٹ آیا۔

"وہ کہتا ہے کہ اس کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔" جیسے ہی آسکر کمرے کے دروازے پر پہنچا، اسے موک۔۔۔ کی آواز سنائی دی۔ وہ جانسن کو اپنی کارگزاری بیان کر رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کیپٹن سے متعلق ہی بات ہو رہی ہے۔ اس کے قدم جہاں تھے، وہیں رُک گئے۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اگر کیپٹن کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں تو پھر ٹوئن برادرز فرم کے لیے پولیس ڈپارٹمنٹ کے اندر اپنے ایک اہم ترین بندے کو بچانا بہت مشکل ہوگا۔ خواہ وہ رہائی ضمانت پر ہی کیوں نہ ہو۔ صرف یہی نہیں، اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ کیپٹن پر لگے الزام کی تفتیش اور تحقیقات کے دوران وہ بھی پھنس سکتے ہیں۔ بات یہیں تک نہیں رہتی۔۔۔ جانسن کے دھندے میں قانون سے زیادہ لاقانونیت چلتی تھی اور کیپٹن اس کا ایک اہم ترین آلۂ کار تھا۔ اسی کے ذریعے وہ باخبر رہتے تھے کہ پولیس کب چھاپا مارنے کی منصوبہ بندی کر رہی ہے یا ان کے غیر قانونی دھندے اور کالا دھن سفید کرانے کے پیچھے کون کون لوگ ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ پولیس کا کون سا محکمہ تفتیش کر رہا ہے یا پھر یہ کہ ان کے بارے میں محکمے کے اندر کون کون سی باتیں زیر بحث ہیں۔ کیپٹن کوپر، جانسن کے دھندوں کو پولیس سے بچانے کے لیے ایک اہم ڈھال تھا لیکن اب اس کے بعد۔۔۔ وہ پریشان ہو رہا تھا کہ قانون کے پردے میں ہونے والا غیر قانونی کاروبار ہی نہیں، وہ سب خطرے کی زد میں تھے۔ آسکر اس دھندے میں جانسن کا ایک اہم کارندہ تھا۔ اب اسے یہ فکر بھی ستا رہی تھی کہ اگر کیپٹن کے اندر رہنے کے دوران وہ پکڑا گیا تو کون بچائے گا؟ یہ تو جانسن پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ایک [illegible] کے سوا پورا پولیس ڈپارٹمنٹ ان کے پیچھے تھا۔ انہیں موقع کی تلاش تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کیپٹن ہی اُن کے لیے یہ موقع [illegible] ہوتا۔ ایک لمحے کے لیے آسکر کے تخیل میں ماضی کے اُن [illegible] کلائنٹس کی تصویریں ابھر آئیں جو بہت اونچے تھے لیکن حفاظتی انتظامات دھندے کے گہرے سمندر میں پارٹنر [illegible] کودے اور پھر گہرائیوں میں بے نام ونشاں ہوگئے۔ ہر [illegible] نے کوئی نہ کوئی چھوٹی یا بڑی غلطی کی تھی اور پھر وہی ہوا جو [illegible] قانونی دھندے میں غلطی کا انجام ہوتا ہے۔ کچھ مارے [illegible] گئے، کچھ پولیس کے ہتھے چڑھے اور محل نما گھروں [illegible] سیدھے جیل کی کوٹھری میں پہنچا دیے گئے۔ یہ سوچ کر اسے جھرجھری آگئی۔ وہ دھندے کا ایک اہم کارندہ تھا مگر [illegible] زندگی کا انجام جیل کی کوٹھری میں ہوتے دیکھنا وہ ہرگز [illegible] نہیں کرتا۔ ویسے جانسن سمیت کوئی بھی اندر جائے، اسے [illegible] پروا نہ تھی۔

اچانک جانسن کی نظر شیشے کے دروازے [illegible] پار کھڑے، خیالوں میں ڈوبے آسکر پر پڑی تو وہ اٹھ کر [illegible] بڑھا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر نہایت سخت لہجے میں کہا۔

"کیا تم دن میں سپنے دیکھ رہے ہو؟"

آسکر نے ہڑبڑا کر ہاتھ اپنے بیگ پر رکھا اور سٹپٹا [illegible] لہجے میں کہا۔ "سر۔۔۔ وہ رپورٹ مل گئی ہے۔"

"تو لاؤ۔" اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

آسکر نے جلدی سے بیگ کھولا اور لاکر سے نکالا [illegible] نیلے رنگ کا بڑا سا لفافہ اسے تھما دیا۔ جانسن لفافہ کھول [illegible] ہوئے اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ آسکر بھی اس کے پیچھے [illegible] پیچھے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ کافی دیر تک کمرے [illegible] خاموشی کا راج رہا۔ جانسن انہماک سے وہ دستاویزات [illegible] رہا تھا۔ موک لال اور آسکر خاموشی سے اس کا منہ [illegible] رہے تھے۔

"اس خفیہ رپورٹ کے مطابق دوراتِ پہلے وزارتِ خارجہ سے متعلق سراغ رساں اپنے ایک نائب کے ساتھ [illegible] پب میں تھا جہاں اس نے اپنی پسندیدہ کافی کے دو کپ [illegible] پیے۔" آخر جانسن نے خاموشی توڑی اور ان دونوں [illegible] طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "نو بج کر پندرہ منٹ [illegible] ہوئے تھے جب اسے ایک فون موصول ہوا اور اس کے [illegible] وہ اپنے نائب سے یہ کہہ کر نکلا کہ فوری طور پر اپنے ایک [illegible] مخبر سے ملنے جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلی صبح وہ دفتر نہیں پہنچا۔

"تو پھر وہ ملا کہاں سے؟" اس نے جلد بازی میں بات کاٹتے ہوئے سوال کر دیا۔

"صبر کرو آسکر۔۔۔" جانسن نے اسے گھورا۔ "بات مکمل نہیں ہوئی، ہم اس طرف ابھی آتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سامنے رکھی دستاویزات پر ایک نظر ڈالی اور دوبارہ بات شروع کی۔ "اگلی دوپہر، اس کی لاش قصبے کے باہر ویرانے کی ایک گرد آلود سڑک کنارے کھڑی کار سے ملی۔ یہ اس کی سرکاری کار تھی لیکن اس پر پولیس کی مخصوص شناخت کا کوئی نشان نہیں تھا۔ یہ ایک عام سی کار تھی۔ اسے خودکار نائن ایم ایم پستول سے تین گولیاں ماری گئی تھیں اور تینوں کے خول جائے وقوعہ سے مل چکے ہیں۔"

"تین گولیاں۔۔۔" آسکر نے حیرت سے کہا۔ "یقیناً جس نے بھی یہ کیا، وہ اسے قتل کرنے کا پکا تہیہ کر چکا ہوگا۔"

"پولیس نے مقتول کے جسم سے نکالی گئی تینوں گولیاں فرانزک ٹیسٹ کے لیے بھیج تو دی ہیں لیکن فی الوقت انہیں کوئی اہم ثبوت نہیں مل سکا ہے۔" جانسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دوبارہ بتانا شروع کیا۔ "جائے وقوعہ سے ملنے والے گولیوں کے خول پر یا گاڑی سے انہیں فنگر پرنٹس نہیں مل سکے ہیں۔ پولیس اب سارا زور یہ دیکھنے پر لگا رہی ہے کہ نائن ملی میٹر گولی والا پستول کون کون استعمال کرتا ہے اس کے لیے وہ اپنا ریکارڈ بھی کھنگال رہے ہیں۔"

"جب حقیقت یہ ہے تو پھر وہ کس طرح کیپٹن کو اس قتل میں پھنسا سکتے ہیں؟" بظاہر آسکر بڑی دور کی کوڑی لایا تھا۔

"وجہ ہے۔" جانسن نے دستاویزات کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ "ایک دوسری رپورٹ کا کہنا ہے کہ پولیس کو نامعلوم شخص کی طرف سے ایک فون ملا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سراغ رساں کے قاتل کی تلاش میں اِدھر اُدھر سر کھپانے کے بجائے پولیس اپنا ریکارڈ چیک کرے، پتا چل جائے گا کہ نائن ایم ایم کا خودکار پستول کس کے پاس ہے۔ جب تلاش کی تو پتا چلا کہ ایسا ایک ہی افسر ہے جس کے پاس یہ پستول ہے اور وہ ہے کیپٹن کوپر۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "یہ پستول اسے ڈپارٹمنٹ نے جاری کیا تھا اور اس کا سارا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو پولیس کو کیپٹن کی گرفتاری تک لے گیا۔" جانسن کے چہرے پر بھی فکرمندی صاف جھلک رہی تھی۔

"تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ پولیس ڈپارٹمنٹ اپنے جاری کردہ اسلحے کا ریکارڈ رکھتا ہے اور اسی کے ذریعے وہ کیپٹن تک پہنچے؟" آسکر کا لہجہ استفساریہ تھا۔ یہ سن کر وہ بھی کافی پریشان لگ رہا تھا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تقریباً ہر جگہ پولیس ڈپارٹمنٹ اپنے افسران کو جاری کردہ ہتھیار، گولیوں۔۔۔ حتیٰ کہ استعمال کی گئی گولیوں تک کا بھی پورا حساب کتاب رکھتا ہے۔" جانسن نے آسکر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"اوہ۔۔۔" اپنی لاعلمی پر ہونے والا طنز سن کر آسکر نے جھینپ مٹانے کے لیے زبردستی مسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "مجھے یہ علم نہیں تھا۔"

"کیپٹن کا کہنا ہے کہ اس نے سراغ رساں کو قتل نہیں کیا۔" جانسن نے آسکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے موک لال ایسے کسی ٹھوس ثبوت کی تلاش میں ہے جس سے اس پر لگے الزام کی تردید ہوسکے۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے خود موک لال کے منہ سے یہ سنا تھا کہ کیپٹن کے پاس اپنے دفاع میں کوئی ثبوت موجود نہیں؟" آسکر نے جلدی سے کہا۔

"تم نے بالکل درست سنا۔" جانسن معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "کیپٹن کے پاس اپنے دفاع میں واقعی کوئی ثبوت نہیں لیکن ثبوت ہونا چاہیے اور یہ کام اس نے ہم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب ہمیں وہ ٹھوس اور مناسب ثبوت ڈھونڈنا ہے یا پھر۔۔۔" اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ جانسن کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اٹھ کر دفتر کے عقبی حصے میں چلا گیا۔

"ویسے تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ ٹھوس ثبوت کیا ہوسکتا ہے؟" جانسن کے جاتے ہی آسکر، موک۔۔۔ کی طرف مڑا اور سرگوشی میں کہا۔

"ابھی کچھ خاص اندازہ تو نہیں ہے۔" موک۔۔۔ نے نارمل لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "جس رات سراغ رساں کا قتل ہوا، اس سے اگلا دن کیپٹن معمول کی تربیتی مشق پر تھا۔ فائرنگ رینج میں اس کی شوٹنگ تربیت تھی۔ پہلے دن اس نے پندرہ، بیس اور پچیس فٹ کی دوری سے نشانہ بازی کی مشق کی۔ اس میں وہ کافی نمایاں رہا۔ دوسرے دن اسے ہنگامی صورتِ حال میں مشتبہ ملزمان کو نشانہ بنانے کی مشق کرنا تھی۔"

"لیکن اسے تو بطور ثبوت پیش نہیں کرسکتے اور نہ ہی اس سارے عمل سے کوئی ٹھوس ثبوت مل سکتا ہے۔" آسکر نے یہ سن کر منہ بناتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے ثبوت مل سکتا ہے۔" اسی دوران میں جانسن بھی لوٹ آیا تھا۔ اس نے آسکر کی بات سن کر مداخلت

کی اور موک ..... کی طرف دیکھا۔ "تم دوبارہ جیل جاؤ اور کیپٹن سے پوچھو کہ فائرنگ رینج میں مشقوں کے دوران اس کے ساتھ اور کون کون تھا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی پر بیٹھا۔ "ہمیں کیپٹن کو بچانے کی ابتدا یہیں سے کرنا ہوگی۔ مجھے مزید تفصیلات چاہئیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" موک ..... نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جب تم ملاقاتیوں کے کمرے میں اس سے بات کررہے ہو تو بہتر ہوگا کہ موبائل فون پر اس سے میری بات بھی کرادینا لیکن احتیاط سے۔" اس نے غور سے موک..... کی جانب دیکھا۔ "میں خود اس سے کچھ درست سوالات کرنا چاہوں گا۔"

"اوکے سر!" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ جیسے آپ نے ہدایت کی، سب کچھ ویسے ہی ہو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

"اور میرے لیے کیا حکم ہے؟" آسکر نے اس کے باہر جاتے ہی کہا۔

"تم جا کر اپنے کمرے میں بیٹھو۔" جانسن نے اس کی طرف دیکھا۔

"اوکے سر!" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں کچھ کام کررہا ہوں۔ امید ہے کہ تم اب وہیں جا کر سہ پہر کا ناشتا بھی کرو گے جہاں لنچ کررہے تھے۔" جانسن مسکرایا۔

"ٹھیک ہے سر!" وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔ "میں آپ کے حکم کا منتظر رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھا۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے آسکر نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، جانسن ایک بار پھر تاریک عقبی کمرے کی طرف جارہا تھا۔ اونچی چھت اور ہمیشہ تاریک رہنے والے اس کمرے میں یوں تو کوئی خاص بات نہیں تھی، ماسوائے ایک کرسی یا دو چار اور چیزوں کے لیکن دن میں کئی بار جانسن اس کمرے میں جا کر کچھ دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ آسکر کو جانسن کی ماتحتی میں کام کرتے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ وہ اُس کی اس عادت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید ذہنی طور پر تھک کر کچھ دیر کے لیے وہاں آرام کرنے یا کسی یوگا آسن یا پھر مراقبے کے لیے جاتا ہوگا لیکن آج جس طرح کمرے سے باہر آتے ہوئے اس نے کہا کہ ثبوت تلاش کرنے کی ابتدا کیپٹن کی فائرنگ مشقوں سے ہی کی جائے گی، اس سے وہ وقتی طور پر کچھ ڈر گیا تھا لیکن ایک بار پھر اسے اندر جاتا دیکھ کر واقعی وہ خوف زدہ ہوگیا۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ اسے جانسن [illegible] اُس تاریک اور پُراسرار گوشے سے خوف محسوس ہوا تھا۔ [illegible] سوچ رہا تھا کہ جانسن یقیناً کسی پُراسرار علوم کے چکر میں [illegible] ہے۔ اسے ماورائیت سے بہت ڈر لگتا تھا۔ یہ سوچتے ہی اس [illegible] خوف کے مارے جھرجھری آگئی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا [illegible] اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

اس کے ہاتھ میں ایک بھاری اور سربمہر لفافہ تھا۔ [illegible] شاپنگ مال کے مرکزی داخلے کے عین سامنے واقع [illegible] کورٹ پہنچا تو سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ اسے سیدھی سادی [illegible] ہدایت ملی تھی۔ کسی فوڈ اسٹال سے ایسا کچھ خریدنا تھا جسے [illegible] بڑے لفافے میں رکھ کر دیتا۔ وہیں کہیں بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہونا تھا اور جب کھانا کھاچکے تو کاغذ کی پلیٹ، [illegible] ڈرنک کا ٹن، کیچپ کے خالی پیک وغیرہ سب اُسی لفافے [illegible] واپس ڈال کر، سب کی نظروں سے بچتے بچاتے، جانسن [illegible] دیے لفافے کو اس میں رکھ دینا تھا۔ اس کے بعد لفافے کا [illegible] بند کر کے اُس ڈسٹ بن میں ڈالنا تھا جہاں کوئی اور بھی [illegible] ڈال رہا ہو۔ یہ خاص ہدایت تھی کہ کسی ایسے ڈسٹ بن [illegible] طرف نہ جائے جہاں کوئی نہ ہو۔

آسکر جاننا تو چاہتا تھا کہ لفافے کے اندر کیا ہے مگر [illegible] بمہر لفافہ کھول کر حماقت کا ثبوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ البتہ [illegible] اتنا علم ضرور تھا کہ محکمۂ داخلہ کی جس افسر نے دوپہر [illegible] دستاویزات پہنچائی تھیں، اس میں اُسی خاتون کے لیے [illegible] ہدایات تھیں۔ جانسن کا کہنا تھا کہ کیپٹن کو پولیس تحویل [illegible] باہر نکالنے کے لیے یہ سب کچھ کیا جارہا تھا۔ ہدایت [illegible] مطابق آسکر کو لفافہ ڈسٹ بن میں ڈالنا اور پیچھے مڑ کر دیکھے [illegible] واپسی کی راہ لینی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ سب کچھ توقع کے [illegible] مطابق جلد ہوجائے گا۔

اس وقت فوڈ کورٹ تقریباً خالی تھا اور اس کے سا[illegible] ہی کچھ دیر پہلے وہاں رکھے تمام ڈسٹ بن صاف [illegible] گئے تھے۔ آسکر بہت آرام سے کھارہا تھا۔ وہ سوچ رہا [illegible] کہ سہ پہر ڈھل چکی اور یقیناً شاپنگ مال سے شفٹ ختم [illegible] کے نکلنے والے یہاں پہنچیں گے تو چہل پہل ہوگی اور [illegible] جانسن کی ہدایت کے مطابق کچرے کا لفافہ ڈال کر [illegible] لے گا۔ ویسے بھی اس وقت سارے ڈسٹ بن صاف [illegible] اور وہاں کھانے پینے کے اسٹال بھی خالی پڑے [illegible] ایسے میں وہ ہدایت کے خلاف ایک قدم اٹھانے کی [illegible] جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

کچھ دیر بعد منصوبے کے مطابق موقع دیکھ کر اس نے سارا کچرا لفافے میں ڈالا اور پھر اچھی طرح چاروں طرف دیکھ کر تسلی کرنے کے بعد، جانسن کا دیا ہوا لفافہ بھی اس میں ٹھونس کر منہ بند کردیا۔ کولڈ ڈرنک کین خاصا بڑا تھا، وہ لفافے کے اندر نہیں آرہا تھا، سواس نے کین کو ربربینڈ سے بند لفافے پر رکھ کر باندھ دیا۔ نادانستگی میں وہ کم ازکم اپنے لفافے کو ایک شناخت دے چکا تھا۔ ایک بار پھر اسے جانسن کے دیے لفافے سے متعلق جستجو ہورہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ بھاری لفافے کے اندر صرف کاغذات نہیں اور بھی کچھ ہوسکتا ہے جس کے بارے میں جانسن نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

آخر وہ کچرا پھینکنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر برگر کھاتا بوڑھا کچرا ڈالنے کے لیے اس ڈسٹ بن کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس سے بھی صرف چند قدم کے فاصلے پر ہی ہوگا۔ موقع غنیمت دیکھ کر وہ بھی اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے اپنا لفافہ ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ اصولاً تو سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوچکا تھا۔ اب اسے دفتر لوٹنا تھا لیکن وہ کچھ آگے جا کر ایسے مقام پر کھڑا ہوگیا جہاں سے وہ ڈسٹ بن اسے نظر آرہا تھا۔ تقریباً دس منٹ گزر گئے لیکن وہاں کوئی نہیں آیا۔ اگرچہ آسکر اس بے مصرف نگرانی سے اُکتا گیا تھا لیکن پھر بھی وہ یہ دیکھنے کا خواہش مند تھا کہ اسے نکالتا کون ہے۔ اس نے فوڈ کورٹ پر نگاہ ڈالی، وہ لگ بھگ خالی تھا۔ آخر اس نے شاپنگ مال کے میزنائن فلور پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ وہاں سے وہ بہ آسانی پورے فوڈ کورٹ اور اُس مخصوص ڈسٹ بن پر اچھی طرح نگاہ رکھ سکے گا۔ وہ بے فکر انداز میں شاپنگ مال کی طرف بڑھا لیکن اس دوران بھی کن انکھیوں سے اُسی طرف دیکھے جارہا تھا۔ اگرچہ آسکر کی طبیعت میں کچھ شکی پن اور تجسس تو تھا ہی لیکن یہاں ایک اور اہم بات بھی تھی۔ جانسن نے کہا تھا کہ کیپٹن کو باہر نکالنے کے لیے ہدایت پر اچھی طرح عمل ضروری ہے۔ یہ بھی ایک پہلو تھا کہ وہ یہ جانے بغیر کہ آیا لفافہ درست ہاتھوں تک پہنچ چکا، وہاں سے ہلنے کو تیار نہ تھا حالانکہ کچرا ڈالتے ہی، پیچھے مڑ کر دیکھے بنا واپس دفتر پہنچنا تھا مگر شاپنگ مال کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ تھوڑی خلاف ورزی کر بھی لی، تب بھی کون ہے یہاں اسے دیکھنے والا۔

اندر پہنچ کر میزنائن فلور تک جانے کے لیے اُس نے لفٹ کے بجائے بجلی سے چلنے والے زینے کا انتخاب کیا۔ وہاں خریداروں کا کوئی خاص ہجوم نہ تھا۔ وہ میزنائن فلور کی

ریلنگ پر آکر کھڑا ہوا، فوڈ کورٹ اس کی نگاہوں کے سامنے اور جس ڈسٹ بن میں لفافہ ڈالا تھا، وہ اس سے اتنی دوری پر تھا کہ اگر یہ آواز دیتا تو وہاں کھڑے شخص کو صاف سنائی دیتی۔ اسی دوران میں اس نے دیکھا کہ ایک صفائی کرنے والا کچرے کی ٹرالی تھامے ڈسٹ بن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ اب تک اس کا لفافہ مطلوبہ شخص نے نہیں نکالا لیکن اگر وہ اس صفائی کرنے والے کی ٹرالی میں پہنچ گیا تو کیپٹن کو بچانے کے لیے جانسن کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ اسی دوران میں صفائی کرنے والا وہاں تک پہنچ گیا۔ اس نے کچرا نکال کر ٹرالی میں ڈالا تو اس کے ساتھ ہی آسکر کا ڈالا ہوا لفافہ بھی نکل آیا۔ یہ دیکھ کر وہ سخت پریشان ہوگیا۔

"ارے او لڑکے..." آسکر وہیں کھڑے کھڑے چلایا لیکن شاید وہ سنی ان سنی کر گیا تھا۔ ٹرالی تھامے وہ آہستہ آہستہ اسی جانب بڑھ رہا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایک اور صفائی والا اُس وقت گیا تھا جب آسکر ہیم برگر کھا رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف دوڑا اور لوگوں کو ہٹاتا، ان کے بیچ سے راستہ بناتا ہوا نیچے پہنچا اور سیدھا فوڈ کورٹ کی طرف دوڑ پڑا۔ لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر اس وقت اسے کسی کی پروا نہیں تھی لیکن جب وہ قریب پہنچا تو اس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ وہ صفائی کرنے والا کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اگرچہ یہ لفافہ جانسن اور اس پُراسرار خاتون افسر کے درمیان گفتگو میں طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق یہاں پھینکا گیا ہوگا لیکن آسکر کو لفافہ ڈسٹ بن میں ڈالنے کے سوا کوئی اور ہدایت نہیں تھی اور نہ ہی وہ یہ جانتا تھا کہ یہ اس تک کیسے پہنچے گا لیکن جو صورتِ حال پیش آچکی تھی، وہ اسے سخت پریشان کررہی تھی۔

آسکر کچھ دیر تک یونہی کھڑا رہا مگر پھر اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ جو ہونا تھا، سو ہو چکا۔ اب وہاں رہنا بے سود ہے۔ وہ ایک بار پھر دفتر چل پڑا۔ سارے راستے طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں ہلچل مچاتے رہے لیکن ایک بات وہ طے کرچکا تھا۔ جو کچھ ہوا، وہ جانسن کی ہدایت کے بالکل خلاف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کسی کو یہ نہیں بتائے گا کہ کیا واقعہ پیش آچکا ہے، انکار ہی سب سے مضبوط دفاع ہے... اس نے سوچا۔

"گڈ آفٹر نون۔" آسکر اندر داخل ہوا تو جانسن کسی دستاویز کا مطالعہ کررہا تھا۔

"تو تم آگئے۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "امید ہے کہ میری ہدایت کے مطابق کام کر آئے ہو۔" اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

"یس سر!" آسکر نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

"بہت خوب۔" جانسن نے ہنکارا بھرا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ "ایک بار سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوجائے تو پھر کیپٹن پر لگے قتل کے الزام کا رخ ہی پلٹ جائے گا۔ اس الزام کو خود ایک دوسری وضاحت کی ضرورت پیش آئے گی۔" اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ طاری تھی۔

"معاف کیجیے گا۔" وہ خاموش ہوا تو آسکر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "کیپٹن پر قتل کا الزام ہے۔" جانسن اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ "لیکن ایک بات سمجھ نہیں آرہی کہ اس الزام کی دوسری وضاحت سے کیا مراد ہے؟"

"تم خودکار ہتھیاروں کے بارے میں شاید کچھ زیادہ نہیں جانتے۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ہم یہ ثابت کریں گے کہ وہ خودکار سسٹم کی حامل نائن ایم ایم کی پستول جسے کیپٹن کی تحویل سے برآمد کیا گیا، کس طرح جان لیوا گولیاں چلا سکتی ہے۔"

آسکر نے خاموشی سے اس کی بات سنی مگر جیسا کہ وہ برسوں سے جانتا تھا کہ اس کی بات ہمیشہ ذو معنی ہوتی ہے، اس وقت بھی ایسا ہی تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ جانسن کہنا کیا چاہتا ہے۔ ویسے بھی اسے تو صرف سیدھے سادے انداز میں کی بات سمجھ آتی تھی لیکن جانسن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ وہ پیچ دار گفتگو کا عادی تھا۔

"تمہارے پاس بھی تو ریوالور ہے نا؟" جانسن نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

"جی ہاں..." آسکر نے اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے کہا۔ "چھ گولیوں والا ہے لیکن وہ خودکار نہیں۔"

"خودکار ہو، نیم خودکار ہو یا سادہ... ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔" جانسن نے جلدی سے کہا۔ "خودکار پستول ایک بٹن سے وہی کام کرسکتا ہے جو انگلیوں کو ہر بار کرنا پڑتا ہے۔ پستول ہو یا بندوق، اصل ہلاکت خیزی اس کی نال میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ ویسے خودکار اور نیم خودکار پستول میں نال لمبی کرنے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن دوسروں میں یہ سہولت نہیں۔"

وہ خاموش ہوا تو آسکر نے اثبات میں سر ہلایا۔ بظاہر اس کا پورا دھیان جانسن کی طرف تھا لیکن اس کے پلّے...

کچھ نہیں پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس سے کیپٹن کیسے بے قصور ثابت ہوسکتا ہے۔

"پولیس فائرنگ رینج میں عام طور پر ہتھیاروں کے استعمال کے بعد ان کی صفائی کی جاتی ہے۔" جانسن نے دوبارہ بات شروع کی۔ "میں نے موگ... کو یہ پتا چلانے کے لیے بھیجا تھا کہ جس روز کیپٹن فائرنگ کی تربیت پر تھا، اُس دن اُس کے ساتھ اور کون کون وہاں پر یہ مشق کررہا تھا۔"

"او کے..." اس نے پھر سر ہلا کر کہا۔

"یہ بات نوٹ کی گئی ہے کہ عام طور پر تربیتی مشقوں کے دوران بڑی نال اور اعلیٰ ٹیکنیکل سے بنی معیاری گولیوں کا استعمال کیا جاتا ہے ورنہ عموماً نال سے نکلنے کے بعد گولی ہوا یا آواز کی لہروں سے ذرا سی ڈولتی ہے اور یوں نشانہ باز کا ہدف چوک جاتا ہے۔ اس لیے چہرے اور دل کا نشانہ بالکل ٹھیک لینے کے لیے لمبی نال کا استعمال عام طور پر کیا جاتا ہے۔" جانسن نے چھت کی طرف تکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ "اگر کوئی افسر نشانہ بازی کی اس مشق میں ناکام رہے تو اسے گشت کی ذمے داریاں نہیں سونپی جاتیں اور یہ کسی بھی افسر کی اہلیت کے لیے نہایت بری بات تصور ہوتی ہے۔ اس لیے تمام شرکا کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ فائرنگ مشق میں ضرور کامیاب ہوں۔ اس کے لیے سب ہی کڑی محنت کرتے ہیں۔"

آسکر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یہ جانسن کی پہلی بات تھی جو واقعی اس کے بھیجے میں بالکل ٹھیک اتری تھی۔

"اس دو روزہ مشقوں کے دوران ہمارے کیپٹن کے ساتھ جو دیگر لوگ وہاں تھے، اُن میں اس کا نائب لیفٹیننٹ ہنری بھی شامل ہے۔" کچھ وقفے کے بعد جانسن نے آسکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن لیفٹیننٹ یہ سب کچھ کیوں کرے گا؟" آسکر نے پوچھا۔

"تمہارا سوال درست ہے۔" جانسن مسکرایا۔ "جب میری کیپٹن سے بات ہوئی تو اس نے میرے دوسرے سوال کے جواب میں بتایا کہ تربیت کے دوران وہ نہایت مصروف تھا۔ اس دوران اس کے پاس نہ موبائل تھا اور نہ ہی لینڈ لائن فون اس کے قریب تھا۔ تربیتی مشق کے دو دنوں میں صرف اس وقت اسے فرصت میسر آئی تھی جب وہ فائرنگ کے بعد اپنا اپنا اسلحہ صاف کررہے تھے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا۔ "یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ پہلے دن کی مشق مکمل ہونے کے بعد جب تمام زیرِ تربیت پولیس افسران اسلحہ صاف کرنے میں مصروف تھے، تب لیفٹیننٹ نے موقع دیکھ کر وہ فون کیا ہوگا جس کے بعد سراغ رساں کلب سے نکلا تھا۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ نے کیپٹن کے سرکاری پستول میں لگی لمبی نال چرائی اور جب سراغ رساں بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو اپنی پستول کے ذریعے اس پر نائن ایم ایم کی گولیاں چلائیں اور پھر واپس پہنچ کر نال پھر اُس کی جگہ پر رکھ دی۔ اس کے بعد دوسرے دن اس نے پولیس ڈپارٹمنٹ کو گمنام کال کی اور افسران کو جاری کردہ سرکاری اسلحہ ریکارڈ چیک کرنے کو کہا۔ صاف ظاہر ہے کہ گمنام کال کرنے والا کسی کو پھنسانے کی چال چل رہا تھا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا۔ "اب یہ اتفاق کہ پورے محکمے میں نائن ایم ایم کا پستول صرف کیپٹن کو ہی جاری کیا گیا تھا۔"

"لیکن..." آسکر نے ہچکچاتے ہوئے بات شروع کی۔ "ہم نے صورتِ حال کو جس طرح واضح کیا ہے، اس سے یہ کیسے ثابت ہوگا کہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا اور اس کے لیے پولیس کا ہی ایک افسر ذمے دار ہے۔"

"یہ بات کہنے سے پہلے تم ذرا سوچ لیتے کہ ہم نے کیس کی کڑیاں ملانے کی کوشش کی ہے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔" جانسن نے کہنا شروع کیا۔ "ورنہ پستول کی اضافی نال تبدیل کرنے کا کوئی ثبوت اور سراغ رساں پر گولیاں چلاتے وقت لیفٹیننٹ کو دیکھنے والا کوئی عینی گواہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔" اس نے گمبھیر لہجے میں بات مکمل کی۔

"تو اب ہمیں کیا کرنا ہوگا... ہمارا پلان کیا ہے؟" آسکر نے لگ بھگ بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

"ہم نے اپنے پلان پر پہلے ہی عمل شروع کردیا ہے۔" وہ یہ سن کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ لفافہ جسے تم نے میری ہدایت کے مطابق داخلہ امور کی سیکریٹری کے لیے ڈراپ کیا، وہ اس پلان کا ایک اہم حصہ ہے۔ اب وہ اس سارے معاملے سے نمٹ لے گی۔"

"لیکن وہ کس طرح؟" آسکر نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیپٹن کا پستول اب بھی بطور ثبوت محکمۂ داخلہ کی تحویل میں ہے۔" جانسن نے کہنا شروع کیا۔ "آیا سراغ رساں کی موت کا سبب بننے والی گولی اسی سے چلائی گئی تھی، یہ جاننے کے لیے اس پستول کا اب تک فرانزک ٹیسٹ نہیں کرایا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ حسبِ عادت چند لمحوں تک چھت کو گھورتا رہا

اور پھر آسکر کی طرف دیکھا۔ ”میں نے سیکریٹری داخلہ سے معاملہ طے کرلیا ہے۔ وہ ثبوت بدل دے گی۔“

”لیکن کیسے؟“ آسکر نے بات کاٹ کر کہا۔

”سیدھی سی بات ہے۔“ وہ پھر مسکرایا۔ ”پولیس کے پاس کیپٹن کا جو پستول ہے، اس کی نال بدل دی جائے تو فرانزک ٹیسٹ ثابت نہیں کرسکتا کہ وہ گولی جو سراغ رساں کی موت کا سبب بنی، اُسی سے چلائی گئی تھی۔ اس لیے میں نے اسے پولیس تحویل میں موجود پستول کے ماڈل کی ایک نال دی ہے۔ وہ اسے رکھ دے گی اور جو وہاں رکھی ہے، اسے لے آئے گی۔“

”لیکن وہ نال...“

”تم اسے پہنچا آئے ہو۔“ جانسن نے بات پوری کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ”ڈسٹ بن میں جو لفافہ ڈالا گیا اس میں وہ نال رکھی تھی جسے وہاں اصل سے بدل کر رکھنا ہے۔“

”اوہ...“ یہ سنتے ہی آسکر نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ ”لیکن یہ نئی نال ملی کہاں سے؟“ اس نے حسبِ عادت پھر سوال کرڈالا۔

”یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں، پیسے سے ہر کام آسان ہوسکتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ اب وہ سمجھا کہ لفافہ خاصا بھاری کیوں تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ اب تک تو وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ لفافے میں رشوت کے پیسے ہوں گے لیکن اب پتا چلا کہ معاملہ تو کافی آگے کا تھا۔ پھر اسے صفائی کرنے والے یاد آگئے۔ وہ سمجھ گیا کہ سب کچھ منصوبے کا طے شدہ حصہ ہوگا مگر پھر بھی وہ خود کو آمادہ نہ کرسکا کہ جانسن کی ہدایت کے برخلاف جو کچھ کر بیٹھا تھا، اس غلطی کا اعتراف کرلے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا جو کیا، اسے بھول جائے... جو ہوگا، وہ دیکھا جائے گا۔

”اس کے علاوہ بھی میں نے ایک اہم کام کیا ہے۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جانسن نے آسکر کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولا لیکن اس کی پوری توجہ بظاہر اسی کی طرف تھی۔ ”میں نے اُس لیفٹیننٹ سے رابطہ کیا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ آسکر نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”جو شخص اتنی صفائی سے کیپٹن کو پھنسا سکتا ہے، وہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہوسکتا ہے... خاص کر ہمارے لیے۔“

”لیکن کیپٹن...“

”فرض کرو کہ اگر تمام تر کوشش کے باوجود ہم اسے بچا نہ سکے تو دھندے کے لیے پولیس کے اندر ایک کام کا بندہ تو چاہیے ہوگا نا۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ ”اسی لیے میں نے کیپٹن کو بچانے کے ساتھ ساتھ اُس کے متبادل کی تلاش بھی شروع کردی ہے۔ ویسے بھی صرف کیپٹن پر انحصار کرنا آگے مشکلات کھڑی کرسکتا ہے۔“ جانسن کے چہرے پر اس وقت شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”پر وہ ہمارے ساتھ کام کرے گا؟“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے غیر یقینی لہجے میں کہا۔ اس وقت آسکر کا دماغ مختلف سمتوں میں دوڑ رہا تھا۔ اگرچہ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن پھر بھی اس کی بھرپور کوشش تھی کہ اندر کی بے چینی گفتگو سے ظاہر نہ ہونے پائے۔ یہ تو وہ جانتا ہی تھا کہ بات کو بھانپ لینے میں جانسن نہایت کائیاں شخص تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی شک ہوجاتا تو وہ اس کے ذہن و دل میں مچی ہلچل کو بوجھ لیتا۔ دوسری پریشانی کی بات یہ تھی کہ جانسن نے کیپٹن کو بچانے کے لیے پستول کی جو نال خفیہ طور پر پہنچانے کے لیے دی تھی، اس کی دانست میں وہ سیکریٹری داخلہ کے بجائے کہیں اور پہنچ چکی تھی۔ اس کا سزاوار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب اسے غلطی کی، ہدایت سے انحراف اور اپنے کیے کرائے پر پانی پھرنے کا علم ہوگا تو پھر آسکر کے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، وہ ہرگز اچھا نہیں ہوسکتا۔ وہ جانسن کے ساتھ بظاہر گفتگو میں حصہ لے رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ تیزی سے یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جو ہوچکا، اس کی تلافی کس طرح ہوسکتی ہے۔

”ویسے ایک بات اور بھی ہے۔“ جانسن نے کہا اور پھر حسبِ عادت چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ آسکر اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ ”ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جائے وقوعہ سے خالی گولیوں کے تین خول بھی ملے تھے۔ اگر فرانزک ماہرین کسی طرح لیفٹیننٹ کا پستول حاصل کرلیں اور پھر دونوں پستولوں کا اچھی طرح معائنہ کریں تو وہ یہ بات ضرور پتا چلا سکتے ہیں کہ گولیاں کیپٹن کے بجائے لیفٹیننٹ کے پستول سے فائر کی گئی تھیں لیکن اس میں ایک مشکل ہے۔“

”وہ کیا...“ ایک بار پھر آسکر نے قطع کلامی کی۔

”لیفٹیننٹ اب تک ان کے لیے مشکوک نہیں اور نہ ہی پولیس وہ جاننے کی کوشش کرے گی جو ہم اب تک جان چکے ہیں۔“ جانسن نے کہنا شروع کیا۔ ”ویسے ہم یہ کام کرسکتے

ہیں کہ پولیس کو لیفٹیننٹ کے پیچھے لگادیں یا پھر اسی بات پر اسے اپنا ساتھی بنالیں..... میرا ذاتی خیال ہے کہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں دشمنیاں بنانے کے بجائے ہم دوست بنائیں اور ویسے بھی ہم صرف کیپٹن کو بچانا چاہتے ہیں، کسی کو پھنسانا نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا۔ ”ویسے لیفٹیننٹ جی دار بندہ ہے۔ اس نے کیپٹن کو پھنسانے کے لیے خود کو ہی داؤ پر لگا دیا۔ ایسے لوگ ہمارے دھندے میں بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں۔“

”بہت شاندار...“ آسکر نے بے ساختہ کہا۔ بظاہر اس کے چہرے سے اطمینان ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں سخت پریشان تھا کہ اگر اسے سیکریٹری داخلہ کا فون ملا اور اس نے کہہ دیا کہ جو پارسل بھیجا تھا، وہ نہ مل سکا تو پھر جانسن کا سارا منصوبہ ہی چوپٹ ہوجائے گا۔ یہ سوچ کر اسے ہول اٹھ رہے تھے کہ اس انکشاف کے بعد نوکری تو خیر جانی ہی تھی مگر اس کی جان سلامت رہنے کی بھی کوئی ٹھوس امید نہیں تھی۔ جانسن کے دھندے میں کیپٹن کی اہمیت تھی اور وہ کسی طور گوارا نہیں کرتا کہ اسی کے ملازم کی غلطی اس کا دھندا مندا کردے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ جانسن نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آگیا۔

”ہیلو...“ اس نے آہستگی سے کہا۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے دوسری طرف سے کی جانے والی بات سنتا رہا۔ جانسن کے چہرے پر جو تاثرات تھے، اس سے بھانپنا مشکل تھا کہ وہ کس سے بات کررہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے صرف ایک جملہ کہا۔ ”تمہیں بھی مبارک ہو، ویسے اس احمق سے میں نمٹ لوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک نظر آسکر پر ڈالی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”ملیں گے تو سب ٹھیک ہوجائے گا... بائے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون رکھا اور چھت کی طرف گھورا۔

دوسری طرف آسکر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اس نے جو خلاف ورزی کی ہے، اس کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ”کیا ہوا سر!“ چند منٹوں تک جب وہ بدستور خاموش رہا تو آسکر نے ہمت کرکے خود ہی بات شروع کی۔ ”کیپٹن کا معاملہ...“

”کیپٹن آج رات تک رہا ہوجائے گا۔“ اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”سیکریٹری کا فون تھا، اسی نے اطلاع دی ہے کہ ہر کام منصوبے کے عین مطابق ہوگیا ہے۔“

”وہ پستول کی دوسری نال...“ آسکر نے اٹکتے ہوئے نامکمل جملہ کہا۔

”اسی کی بنا پر کیپٹن کی رہائی ممکن ہوئی ہے۔“

”اوہ...“ آسکر نے گہری سانس لی۔ وہ خوش تھا کہ گڑبڑ کے باوجود معاملہ سلجھ گیا۔

”تم سے مجھے یہی امید تھی۔“ جانسن نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکریہ سر!“ یہ سن کر آسکر کا جیسے سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ اس نے فخریہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے سب کچھ آپ کی ہدایت کے مطابق...“

”بالکل بھی نہیں کیا تھا۔“ جانسن نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

”وہ سر!“ آسکر گڑبڑا گیا۔

”تم نے جو غلطی کی ہے، اس پر سیکریٹری سخت ناراض ہے۔ ایک تو تم نے کھانے میں اتنی دیر لگائی، اوپر سے اس کے بندوں کی نگرانی کرتے رہے۔ کس نے کہا تھا تمہیں یہ سب کچھ کرنے کو؟“ وہ سخت غصے میں تھا۔

”کسی نے بھی نہیں۔“ وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

”تو پھر...“

”بس ذرا وہ کیپٹن کی وجہ...“ آسکر اٹکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ لفافہ کسی اور جگہ نہ پہنچ جائے۔“

”بکومت...“ خاموش طبع اور دھیمے لہجے والا جانسن دہاڑا۔ ”دفع ہوجاؤ اور پھر کبھی اپنی شکل مت دکھانا۔“

”اوکے سر!“ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور جیسے ہی دروازے کی طرف بڑھا، موک ...ندر داخل ہو رہا تھا۔

”مبارک ہو باس...“ اس نے وہیں سے چلا کر کہا اور حقارت بھری نظر آسکر پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک نصیحت ہے۔“

”اب بک دو۔“ آسکر نے بھی بدتمیزی سے کہا۔ وہ یہ جان چکا تھا کہ نوکری گئی۔ اب موک لال سے بدتمیزی اس کا مزید کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

موک آسکر.... اس کے چہرے پر سخت حیرت تھی۔ اس نے کبھی آسکر کو اس انداز سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

”دفع کرو اسے... اِدھر آؤ۔“ آسکر کے کمرے سے نکلتے ہی جانسن نے موک.... کو پکارا۔ ”لیفٹیننٹ ہنری سے کب ملاقات ہو رہی ہے؟“ جیسے ہی وہ قریب آیا جانسن

نے بے صبری سے کہا۔
"آج رات ڈنر پر آرہا ہے۔" اس نے کرسی گھسیٹی اور بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "ویسے افسوس ہے کہ ہم کیپٹن کو اپنے ہی ہاتھوں کھو رہے ہیں۔"
"نہیں۔۔۔" جانسن نے جلدی سے کہا۔ "اب ہمیں اپنے دھندے کے لیے ذرا طاقت ور اور بہادر آدمی کی ضرورت ہے۔ بس کیپٹن کی ذمے داری بدل گئی ہے۔ وہ صرف جاسوسی کرے گا اور ہنری۔۔۔"
"وہ تو ہمارا زرخرید غلام بن چکا ہے۔" موک۔۔۔ نے خباثت بھری ہنسی ہنس کر کہا۔ "زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی اور وہ تو جوان بھی ہے۔ کیوں سراغ رساں قتل کیس میں پھنس کر جوانی جیل میں گزارنا پسند کرے گا۔"
"ویسے چال اچھی تھی۔" جانسن نے کہا۔
"کیپٹن کا ایک اچھا متبادل ملا، سراغ رساں سے بھی جان چھوٹی۔" یہ کہہ کر اس نے موک۔۔۔ کی طرف دیکھا۔ "نشانہ تمہارا ابھی اچھا ہے۔"
"مردے پر گولی چلانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔" جانسن نے ہاتھ میں پکڑے زرد ریشمی رومال کو لہراتے ہوئے کہا۔ "اس پر لگے کلوروفارم سے پہلے بے ہوش کیا اور کیپٹن کے پستول سے کام تمام کردیا۔"
"واہ موک لال ٹھگ۔۔۔"
جانسن نے زوردار قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ڈائننگ ہال میں جانسن، موک لال اور لیفٹیننٹ ہنری ڈنر سے فارغ ہوچکے تھے۔ جانسن اپنی جگہ سے اٹھا اور ہنری کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے، دوسرے سے ایک بڑا اور بھاری لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "ہمارے ساتھ کام کرنے کے معاہدے کی خوشی میں۔"
"شکریہ۔۔۔"
"ہینڈز اپ۔۔۔" اس کے ساتھ ہی کمرے میں ایک آواز گونجی۔ تینوں نے دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ آواز آسکر کی تھی۔ اس کے ساتھ کئی پولیس والے تھے۔ جانسن اور موک۔۔۔ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کیپٹن کے پستول کا رخ اس کی طرف تھا اور سیکریٹری داخلہ بھی انھی کے ساتھ کھڑی تھی۔
"آسکر تھامسن۔۔۔" اس نے تینوں کی طرف باری باری نظر ڈالنے کے بعد مسکرا کر کہا۔ "چھوڑیں۔۔۔ نام تو آپ سب ہی جانتے ہیں۔ کام کی بات سن لیں۔" یہ کہہ کر اس نے جیب سے کارڈ نکال کر لہرایا۔ "سینئر انویسٹی گیو... آفیسر انٹرپول۔"
"کیا۔۔۔" جانسن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
موک لال بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"مسٹر جانسن۔۔۔ قانون کے نام پر فرم چلا کر تمام غیر قانو... دھندوں اور منشیات کی بین الاقوامی اسمگلنگ کے الزام میں تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے توقف کیا۔ "... کا الزام اور اس کے ثبوت تمہیں بونس میں ملیں گے۔"
"کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" جانسن نے خو... سنبھالتے ہوئے کہا۔
"سب کچھ، حتیٰ کہ سراغ رساں کو قتل کرنے اور کرا... کا بھی۔"
"مگر۔۔۔" موک۔۔۔ نے کچھ کہنا چاہا۔
"خاموش رہو۔۔۔ ہمیں تم سے کچھ نہیں سننا۔" یہ کہ... وہ ہنسا۔ "ویسے اگر تم سننا چاہو تو ہم تمہاری آواز میں سب کچھ سنا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس سب کچھ ریکارڈ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "ارے موک لال۔۔۔ تمہارا اسلک کا زرد رومال۔" یہ کہہ کر اس نے ایک سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہتھکڑیاں لگا کر اس کی جیب سے رومال نکال لینا۔ خود اس کا۔۔۔ تو کہنا تھا کہ اُسی کے ذریعے سراغ رساں کو کلوروفارم سنگھایا تھا۔"
پولیس والے آگے بڑھ کر انہیں ہتھکڑی پہنانے لگے۔ لیفٹیننٹ ہنری نے کیپٹن کی طرف دیکھا۔ "اس کا کیا کر... سر!" اس کے ہاتھ میں رقم والا لفافہ تھا۔
"خاموشی سے جیب میں ڈالو اور چلتے بنو۔" کیپٹن... مسکرا دیا۔
"چلیں۔۔۔" ہانگ کانگ پولیس ڈپارٹمنٹ وا... جانسن اور موک لال کو گرفتار کرکے باہر لے جارہے تھے۔
ہنری اور کیپٹن بھی باہر آگئے تھے۔ اسی دوران... آسکر نے کوٹ کی بیرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس... ہاتھ میں نیند کی گولیوں کی ڈبیا تھی۔ "ساتھ دینے کا شکریہ۔۔۔ اب تمہاری ضرورت نہیں رہے گی۔" اس... ڈبیا دور اچھالتے ہوئے کہا۔ "سات سال کی شدید... کے بعد مشن مکمل ہوچکا ہے۔" اس نے جماہی لی، ا... یقین تھا کہ آج وہ برسوں۔۔۔ بعد سکون کی گہری نیند سو سکے گا۔

بازی

تنویر ریاض

محبت و عشق کی بازی ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔۔۔ وہم و گمان کے اَن گنت اندیشے کبھی منزل کے قریب کردیتے ہیں اور کبھی منزل سے دور۔۔۔ اس کا عشق سچا تھا۔۔۔ وہ اپنے محبوب کے قریب تر مگر قلب و نظر میں کوسوں کے فاصلے حائل تھے۔۔۔ وقت کی ستم ظریف لہروں نے اسے اس مقام تک پہنچا دیا۔۔۔ جہاں ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔۔۔

ایک شہ نشیں اور عشق پیشہ کے درمیان ہونے والا سنسنی خیز معرکہ۔۔۔

جسٹن کی محبوبہ مرینا، میڈم ڈیزی کے بورڈنگ اسکول سے اغوا ہوگئی تھی۔ جسٹن کے دوست سلویٹر نے اس کی بازیابی کے لیے سراغ رساں جیکل سے درخواست کی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ جسٹن اغوا ہونے والی لڑکی کا محبوب ہے تو وہ اس سے بہت اچھی طرح پیش آیا اور اس سے جاننا چاہا کہ کوئی شخص باغ یا کھڑکی کے راستے اندر تو نہیں آیا۔
"نہیں موسیو!" جسٹن نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ خاصا گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے؟"
"ہاں، یہ رہی باغ کی چابی۔"
"اور مرینا کے کمرے کی چابی کہاں ہے؟"
"وہ کمرا اندر سے بند ہے۔"
جسٹن کی راہنمائی میں وہ ایک بیٹھک نما کمرے میں پہنچا جو صحن اور باغ کے درمیان تھا۔ اس نے پوچھا۔ "اس بورڈنگ ہاؤس کی مالکن کون ہے؟"
اسی لمحے مادام ڈیزی کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "میں ہی اس بورڈنگ اسکول کی مالک ہوں۔"
جسٹن نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "مادام! یہی وہ سراغ رساں ہیں جن کا میں انتظار کر رہا تھا۔"
جیکل نے مادام سے پوچھا۔ "موسیو جسٹن کے آنے سے پہلے تمہیں مرینا کی گمشدگی کا علم ہو گیا تھا؟"
"نہیں، بلکہ مجھے تو ابھی تک اس کی گمشدگی کا یقین نہیں ہے۔" مادام ڈیزی نے جذباتی انداز میں کہا۔ "کیونکہ ہم ابھی تک اس کے کمرے میں نہیں گئے۔"
"اطمینان رکھو، ہم بہت جلد وہاں جائیں گے۔"
اس نے ناک پر اپنا چشمہ جماتے ہوئے میڈم ڈیزی کے چشمے کی طرف دیکھا۔ اس کے شیشے اتنے بڑے تھے کہ انہیں محض آنکھوں کو چھپانے کے لیے لگایا گیا ہے۔ تاہم اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔
"کیا تم ملاقاتی کمرے میں چلنا پسند کرو گے؟" مادام ڈیزی نے کہا۔ "وہ جگہ زیادہ آرام دہ ہے۔"
جیکل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ سب بڑے ملاقاتی کمرے میں آ گئے۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد مادام کو مخاطب کیا۔ "تمہارے اسکول سے ایک لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ کیا میں امید کروں کہ تم ایک ذمے دار ہیڈ مسٹریس ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے خوب سوچ سمجھ کر میرے سوالوں کا جواب دو گی؟"
"اوہ موسیو، میں اس وقت اپنے آپ کو بہت تکلیف میں محسوس کر رہی ہوں۔" مادام ڈیزی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور میں سمجھتی ہوں کہ تمہارے سوالوں کا جواب دینے سے پہلے سوچنا ضروری نہیں کیونکہ میں سب سچ کہوں گی۔"
جیکل نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "اس بورڈنگ اسکول میں رہنے والے عام طور پر کتنے بجے سو جاتے ہیں؟"
"سردیوں میں آٹھ بجے۔ اس کے بعد کسی کو کمرے سے باہر آنے کی اجازت نہیں۔"
"اور تمہارا اسٹاف کب سوتا ہے؟"
"نو بجے۔"
"کیا ان کے علاوہ کوئی دیر تک رکتا ہے؟"
"ہاں صرف ایک عورت ساڑھے گیارہ بجے تک جاگ رہتی ہے۔ اس کا کمرا پچھلی منزل پر ہے۔"
"اور تم کہاں رہتی ہو؟"
"پچھلی منزل پر۔ ملاقاتی کمرے سے متصل۔"
"تمہارے کمرے کی کسی کھڑکی سے باغ نظر نہیں آتا؟"
"نہیں۔ البتہ میرے باتھ روم کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے۔"
"گزشتہ شب تم کتنے بجے سو گئی تھیں؟"
"تقریباً گیارہ بجے۔"
جیکل نے سوال و جواب کا سلسلہ ختم کیا اور بولا۔ "اب ہم اس عمارت کا ایک چکر لگائیں گے۔ سلویٹر تم میرے ساتھ آؤ اور جسٹن تم مادام کے پاس رہو۔"
ان کے جانے کے بعد مادام ڈیزی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا اور وہ شدید صدمے سے دوچار نظر آ رہی تھی۔ جسٹن کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہ تھی اس لیے وہ مادام ڈیزی کی دل جوئی کرنے سے قاصر تھا۔
"عورت کا اس معاملے سے کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا۔" جیکل نے صحن پار کرتے ہوئے کہا۔
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" سلویٹر نے پوچھا۔
"اس کے آنسوؤں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ قصوروار روتے نہیں صرف غم زدہ نظر آنے کی اداکاری کرتے ہیں۔"
جیکل عمارت کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ یہ ایک سڑک اور نیم پختہ گلی کے کونے پر واقع تھی۔ جیکل نے گلی میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ اس کے بائیں جانب بورڈنگ اسکول کے باغ کی پچاس فٹ طویل دیوار تھی اور اس دیوار کے دوسری جانب درختوں کے بالائی سرے نظر آ رہے تھے۔ جیکل دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ سلویٹر بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جیکل نے گلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح کی گلیاں رات کے وقت بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ چوریوں اور اغوا کی وارداتوں کے لیے بنائی جاتی ہیں۔"
پچیس فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیکل ایک جگہ جھکا اور اس نے پلاستر کا ایک ٹکڑا اٹھایا جو دیوار کے اوپر

سرے سے ٹوٹ کر گرا تھا۔ اسے دو ٹکڑے اور ایسے ملے اور اس نے انہیں بڑی احتیاط سے ایک رومال میں لپیٹ لیا پھر اس کی نظر ایک ٹائل کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے پر گئی۔ اس نے وہ ٹکڑا اٹھایا اور دیوار کی دوسری جانب پھینک دیا۔ سلویٹر نے اس پوری کارروائی کو غور سے دیکھا اور بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ یہاں سے اندر گئے ہوں گے۔"
"ہم بہت جلد معلوم کر لیں گے۔" جیکل نے جواب دیا۔ "اس دوران ہم اندر کا چکر لگاتے ہیں۔"
وہ دونوں واپس آئے تو جسٹن اور مادام ڈیزی اسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے جہاں وہ انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی جسٹن اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔ جیکل نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم کام کر رہے ہیں۔"
"موسیو! مجھے بتاؤ کہ تم نے کچھ دیکھا۔ کوئی سراغ ملا؟" جسٹن مضطرب لہجے میں بولا۔
"تم ایک موسیقار ہو تو جوان، تو تم نے وہ کہاوت بھی سنی ہو گی۔ وائلن سے زیادہ تیز مت بجاؤ۔ یوں سمجھ لو کہ میں وائلن ہوں اور تمہیں میرے پیچھے چلنا ہو گا۔ مجھ سے آگے نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ لاؤ باغ کی چابی مجھے دو۔"
جسٹن نے اسے چابی دی اور کوریڈور کے ساتھ چلتا ہوا ایک دروازے کے پاس رکتے ہوئے بولا۔ "یہ مرینا کا کمرا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ ہم اسے بعد میں دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور اس نے باغ کا دروازہ کھول دیا اور وہاں رک کر ایک نظر ان تمام جگہوں پر ڈالی جن کا وہ بعد میں تفصیلی معائنہ کرنا چاہ رہا تھا۔
"اگر تم لوگ چاہو تو میرے پیچھے آ سکتے ہو لیکن ہمیں ایک ترتیب سے آگے بڑھنا ہو گا۔ میرے پیچھے سلویٹر، اس کے بعد جسٹن اور سب سے آخر میں مادام ڈیزی ہوں گی۔"
یہ واضح تھا کہ جیکل دیوار کے اسی حصے کی طرف جائے گا جس کا معائنہ وہ پہلے ہی دوسری جانب سے کر چکا ہے لیکن اس نے باغ کے درمیان سے جانے کے بجائے وہ راستہ اختیار کیا جو دیوار کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ مرینا کے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس کے پٹ بند تھے۔ اس نے مخصوص انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ راستہ زرد رنگ کی ریت سے بنایا گیا تھا اور اس میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو کسی کی دلچسپی کا سبب بن سکتی لیکن پچیس فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا اور اس نے وہی ٹائل کا ٹکڑا اٹھا لیا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے دیوار کی دوسری جانب سے پھینکا تھا۔ اس نے پھولوں کے تختے پر بنے ہوئے قدموں کے نشانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہی وہ جگہ ہے جہاں سے کارروائی ہوئی۔"
"گویا تمہارا خیال ہے کہ لڑکی کو اس راستے سے لے جایا گیا۔" سلویٹر نے پوچھا۔
"مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔" سراغ رساں نے جواب دیا۔
"اوہ میرے خدا۔" مادام ڈیزی کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرے بورڈنگ اسکول میں اس طرح کا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔"
جسٹن بڑی بے چینی سے جیکل کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی نظریں مسلسل گراؤنڈ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بالآخر اس نے اپنا چشمہ اتارا اور رومال سے اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا۔ "میں زمین پر دو گڑھے دیکھ رہا ہوں جن کے درمیان ایک لکیر نظر آ رہی ہے۔"
"کیا تم نہیں سمجھتے کہ یہ کسی سیڑھی کے نشان ہیں؟" سلویٹر نے کہا۔
"واقعی، یہی لگتا ہے۔" جسٹن نے تحسین آمیز انداز میں سلویٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ سیدھی لکیر کیسی ہے؟"
"یہ سیڑھی کے نچلے زینے کا نشان ہے جو زمین نرم ہونے کی وجہ سے ایک انچ دھنس گیا تھا۔"
"اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہو گا کہ اس سیڑھی پر کتنے لوگ چڑھے تھے جن کے وزن سے زمین میں گڑھے اور یہ لکیر پڑ گئی۔" جیکل نے کہا۔
"اس کے لیے ہمیں قدموں کے نشانات دیکھنا ہوں گے۔"
"ہاں لیکن اس کے لیے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہو گا۔" جیکل نے کہا پھر وہ مادام ڈیزی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیا یہاں کوئی سیڑھی ہے؟"
مادام نے بتایا کہ شیڈ میں ایک سیڑھی موجود ہے جو مالی کے استعمال میں رہتی ہے۔ جیکل نے ان لوگوں کو وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا اور خود اس شیڈ کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیڑھی اٹھائے واپس آیا اور اسے گڑھوں پر رکھ دیا۔ سیڑھی کے دونوں عمودی ڈنڈے ان گڑھوں میں بیٹھ گئے۔ جیکل خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "یہی سیڑھی اس واردات میں استعمال ہوئی ہے۔"

"کیا تمام سیڑھیاں ایک سائز کی نہیں ہوتیں؟" سلویٹر نے پوچھا۔

"نہیں، یہ عام سیڑھیوں کے مقابلے میں زیادہ چوڑی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مالی اپنے ساتھ کسی اور کو بھی رکھتا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مادام؟"

"ہاں، اس کا ایک بارہ سالہ بیٹا بھی ہے جو کام کے دوران اس کی مدد کرتا ہے۔"

جسٹن کو ان باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "معافی چاہتا ہوں۔ اب ہمیں مرینا کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔"

"ہم اسی طرف جا رہے ہیں لیکن اس کے لیے ہمیں لمبا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"

"لیکن اس میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔" جسٹن نے شکوہ کیا۔

"میرے پیارے دوست!" سراغ رساں بولا۔ "اس طرح کے معاملات میں وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ہمارے سامنے دو ہی امکانات ہیں۔ تمہاری محبوبہ کو اغوا کرنے والے فرانس چھوڑ کر جا چکے ہیں تاکہ ہم انہیں نہ پکڑ سکیں یا وہ یہیں کہیں پیرس کے آس پاس کہیں چھپے ہوئے ہیں۔ بہرحال، ہم تین دن کے اندر یہ معلوم کرلیں گے کہ وہ کہاں ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ اس واردات میں ایک سے زیادہ لوگوں نے حصہ لیا ہوگا؟"

"میں یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر جیکل نے سیڑھی اٹھائی اور اسے ایک میٹر کے فاصلے پر لے جا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا پھر اس نے چند زینے چڑھے اور ہر ایک پر رک کر اندازہ لگانے لگا کہ سیڑھی زمین کے اندر کتنی گہرائی تک گئی ہے جو تین انچ سے زیادہ نہیں تھی وہ نصف زینے چڑھ پایا تھا۔ وہاں سے اسے پورا باغ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک آدمی کو راہداری کی سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا تو وہیں سے آواز لگائی۔ "اے، تم کون ہو؟"

اس شخص نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ "میں یہاں کا مالی ہوں۔"

جیکل نے مادام ڈیزی سے کہا کہ وہ مالی کو یہاں لے آئے۔ وہ کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو مالی اس کے ساتھ تھا جو ایک اجنبی شخص کو اپنے باغ میں سیڑھی پر کھڑا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"کیا تم کل کام پر آئے تھے؟" جیکل نے اس سے پوچھا۔

"میں گزشتہ تین روز سے تعطیلات کے سبب کا[م پر] نہیں آیا۔"

جیکل نے اسے سیڑھی پر چڑھنے کے لیے کہا۔ مالی [نے] مادام ڈیزی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ "تم سے جو کہ[ا جا رہا] ہے، وہی کرو۔"

مالی نے حکم کی تعمیل کی اور تین زینے چڑھ گیا۔ جی[کل] نے سلویٹر کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"سیڑھی تھوڑی سی زمین کے اندر گئی ہے لیکن ا[ب] اس کا آخری زینہ باہر ہی ہے۔"

جیکل نے مالی کو نیچے آنے کے لیے کہا پھر بولا۔ "[اب] تم مادام کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لو۔"

مادام ڈیزی جھلاتے ہوئے بولی۔ "یہ تم کیا کہہ ر[ہے] ہو موسیو؟"

"میں ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔" مالی نے کہا۔

جیکل نے اسے دوبارہ سیڑھی پر چڑھنے کے لی[ے کہا] اور خود مادام ڈیزی کے قریب آکر اپنا ایک بازو اس [کے] کندھے اور دوسرا گھٹنوں کے نیچے ڈال کر اوپر اٹھا لیا۔ [وہ] حیرت زدہ ہو کر چلانے لگی لیکن جیکل نے اس کی پروا نہیں [کی] اور اسے گود میں اٹھائے چار پانچ زینے چڑھ گیا اور سلو[یٹر] سے پوچھا کہ اب سیڑھی کی کیا پوزیشن ہے۔ سلویٹر نے [کہا] کہ سیڑھی مزید زمین میں دھنس گئی ہے لیکن ابھی اس کا [آخری] زینہ اوپر ہی ہے۔ جیکل نے اس سے کہا کہ وہ اپنا پاؤ[ں] دوسرے زینے پر رکھے۔ اس بار نچلا زینہ بھی زمین کے اند[ر] چلا گیا۔ جیکل نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور مادام ڈیزی [کو] لے کر نیچے آگیا۔ اس نے مالی کو بھی اترنے کے لیے کہا [پھر] جسٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری محبوبہ کو تین افراد نے اغوا کیا ہے۔ دو اسے لے کر سیڑھی سے اترے جبکہ تیسرا اسے اپنی جگہ پر قائم رکھنے کے لیے آخری زینے پر پاؤں رکھے کھڑا ہوا تھا۔ اب ہمیں تینوں آدمیوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

اس نے مالی سے کہا کہ وہ سیڑھی لے جا کر اپنی جگہ رکھ دے پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا اور ایک شاخ کاٹ کر زمین کی پیمائش کرنے لگا اور بولا۔ "قدموں کے نشانات سے پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ دیوار سے کھڑکی تک [گئے] اور وہاں سے واپس آئے۔ انہیں یہاں پر رہنے والوں کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔ لہٰذا انہوں نے بہت زیا[دہ] احتیاط کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن قدموں کے نشانات [بتا] رہے ہیں کہ ان کے جوتے ایک ہی ناپ کے تھے۔ یہ

ممکن ہے کہ ان میں سے ایک شخص نے کارروائی کی ہے اور دوسرا نگرانی کر رہا ہو۔"

"جوتے ایک ہی سائز کے ہیں لیکن ان میں ایک نمایاں فرق ہے۔" سلویٹر نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"ان کے تلوؤں میں کیلوں کی ترتیب مختلف ہے۔ اس کے علاوہ ان میں سے ایک شخص کی دائیں ٹانگ میں کچھ نقص تھا۔ اگر قدموں کے نشانات پر غور کیا جائے تو یہ چیز واضح ہو جاتی ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" جیکل نے کہا۔ "کیا تم پولیس میں رہ چکے ہو؟"

"نہیں۔" سلویٹر شرماتے ہوئے بولا۔ "میں کبھی شکاری ہوا کرتا تھا۔"

"مجھے یہاں ایک تیسرے شخص کے قدموں کے نشان بھی نظر آرہے ہیں۔ ایسے جوتے عموماً امرا، رؤسا یا بڑے پادری ہی پہن سکتے ہیں۔"

"میرا تو خیال ہے کہ یہ کوئی رئیس زادہ ہے کیونکہ پادری گھوڑے پر سواری نہیں کیا کرتے اور اس قسم کے جوتے گھڑسوار ہی استعمال کرتے ہیں۔" سلویٹر نے کہا۔

"تم تو بالکل پیشہ ور سراغ رساں معلوم ہوتے ہو۔" جیکل نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔ "آؤ کھڑکی کی طرف چلتے ہیں۔"

وہ چاروں قدموں کے نشانات کی سمت چل دیے۔ جیکل نے دیکھا کہ کھڑکی کے دونوں پٹ بند تھے۔ جیکل نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی اور بولا۔ "انہیں بھی اندر سے بند کیا گیا ہے۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جب کمرے کا دروازہ اور کھڑکی دونوں اندر سے بند تھے تو وہ لوگ اندر کس طرح داخل ہوئے۔ اس نے ایک بار پھر جسٹن سے پوچھا کہ کیا وہ یقین سے کہہ سکتا ہے کہ دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ جسٹن نے اثبات میں سر ہلایا۔

جیکل سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی معلومات کے مطابق شہر میں صرف دو افراد مقفل دروازوں اور کھڑکیوں کو کھولنے کے ماہر تھے۔ ان میں سے ایک جیل کی ہوا کھا رہا تھا جبکہ دوسرا کافی عرصہ پہلے شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی پھر عمارت کے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "مادام! تمہارے پاس یقیناً ہر کمرے کی ڈپلیکیٹ چابی ہوگی؟"

مادام بولی۔ "اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ دروازے کی چٹخنی اندر سے لگی ہوئی ہے۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ تم چابی لے کر آؤ۔"

وہ منہ بناتی ہوئی چلی گئی اور چند لمحوں بعد اس نے چابی لاکر جیکل کے حوالے کردی۔ اس نے تالے میں چابی گھمائی اور سمجھ گیا کہ دروازہ اندر سے لاک نہیں ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ دروازے کو باہر سے تالا لگایا گیا ہے۔"

"لیکن جب اندر سے چٹخنی لگی ہوئی ہے تو اغوا کرنے والے نے باہر سے تالا کس طرح لگایا؟"

"اس کا بھی پتا چل جائے گا۔" جیکل نے کہا۔ "کیا کسی قفل ساز کا انتظام ہوسکتا ہے؟"

تھوڑی دیر میں قفل ساز بھی آگیا۔ اس نے ایک لوہے کی سلاخ دروازے میں پھنسائی اور پوری قوت سے زور لگایا تو دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ سب لوگ اندر جانے کے لیے بے تاب تھے لیکن جیکل نے انہیں باہر ہی روک دیا اور خود کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس نے ایک بار پھر دروازے کے تالے اور چٹخنی کا معائنہ کیا لیکن مطمئن نہیں ہوا۔ پھر اس نے اپنا چشمہ اتارا اچانک ہی اس کے چہرے پر فاتح جیسی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے کوئی چیز پکڑی اور اسے فضا میں لہرایا۔ وہ تقریباً پندرہ سینٹی میٹر دھاگے کا ٹکڑا تھا جو چٹخنی اور دروازے کی لکڑی میں پھنسا ہوا تھا۔ سلویٹر فوراً معاملے کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے کہ انہوں نے اس دھاگے کی مدد سے دروازہ بند کیا تھا۔"

"ہاں۔" جیکل نے جواب دیا۔ "پورا دھاگا آدھے میٹر لمبا تھا اور یہ اسی کا ٹوٹا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔"

قفل ساز حیرت سے بولا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ مجھے تالا کھولنے اور بند کرنے کے سارے طریقے آتے ہیں لیکن اب پتا چلا کہ مجھ سے بھی بڑے فنکار موجود ہیں۔"

"میں بتاتا ہوں کہ یہ کیسے کام کرتا ہے۔ دھاگے کو دہرا کر کے اس کی گرہ چٹخنی کی ناب کے گرد ڈال دو۔ جب دھاگا باہر سے کھینچا جائے گا تو چٹخنی اوپر کو اٹھے گی اور دروازہ اندر سے بند ہوجائے گا۔"

"موسیو جیکل!" جسٹن نے بے چینی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ ہم کمرے میں چل کر دیکھیں کہ ان لوگوں نے کس طرح اپنی کارروائی کی؟"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" جیکل نے کہا پھر کمرے کے فرش کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "دروازے سے بستر تک اور اس سے آگے کھڑکی تک قدموں کے نشان موجود ہیں۔"

پھر اس نے بستر پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگا۔ ''لڑکی سونے سے پہلے کچھ پڑھ رہی تھی پھر اس نے موم بتی بجھائی اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس وقت تک سب کچھ ٹھیک تھا۔''

''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا ہو۔'' سلویٹر بولا۔

''بستر پر بکھرے ہوئے خطوط اور بجھی ہوئی موم بتی یہی ظاہر کرتی ہے۔'' جیکل نے کہا۔

''سلویٹر! ذرا غور سے قدموں کے نشانات دیکھو۔ تمہیں کوئی خاص بات نظر آرہی ہے؟''

سلویٹر نیچے جھک گیا اور اونچی آواز سے بولا۔ ''ہاں، ان میں ایک عورت کے پاؤں کا نشان بھی ہے جو کافی محتاط معلوم ہوتی ہے۔ اس نے یہاں آنے کے لیے باغ والا راستہ اختیار کیا تاکہ اس کے جوتے گندے نہ ہوں۔ اس کے قدموں کے نشانات میں زرد ریت کے دھبے نظر آرہے ہیں۔''

''اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔'' جیکل نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''وہ لڑکی مرینا معمول کے مطابق اپنے کمرے میں آئی۔ وہ بستر پر گئی اور کچھ خطوط پڑھنے لگی۔ اس دوران وہ روتی بھی جارہی تھی۔ یہ دیکھو اس کا رومال جس میں سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں۔''

جسٹن نے لپک کر وہ رومال اٹھالیا اور اسے چومنے لگا۔ جیکل اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر اس نے موم بتی بجھائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ہی کسی نے دروازے پر دستک دی۔ یقیناً یہ وہی عورت تھی جس کے قدموں کے نشانات کمرے میں نظر آرہے ہیں۔ مرینا بستر سے اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔''

''لیکن وہ یہ جانے بغیر دروازہ کیوں کھولے گی کہ دستک دینے والا کون ہے؟'' مادام ڈیزی نے پوچھا۔

''تمہیں یہ کس نے بتایا کہ وہ دستک دینے والے کو نہیں جانتی تھی؟'' جیکل نے کہا۔

''لیکن وہ کسی دشمن کے لیے دروازہ نہیں کھول سکتی تھی۔''

''نہیں، اس نے اپنی دوست کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ بورڈنگ اسکولوں میں ایسے دوست بھی ہوتے ہیں جو بعض اوقات خطرناک دشمن بن جاتے ہیں وہ عورت بھی ایسی ہی ایک نام نہاد دوست تھی۔ مرینا نے دروازہ کھولا تو اس عورت کے پیچھے دو اجنبی مرد کھڑے ہوئے تھے جن میں سے ایک وہی تھا جس کے تلووں میں کیلیں تکونی شکل میں لگی ہوئی تھیں۔''

جیکل نے لمحہ بھر توقف کیا پھر مادام ڈیزی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم بتا سکتی ہو کہ مرینا رات کو [illegible] وقت کون سا لباس پہنتی تھی؟''

''وہ سردیوں میں عموماً قمیص اور ڈریسنگ گاؤن [illegible] کرتی ہے۔''

''انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے [illegible] پر رومال رکھا اور کسی شال یا بستر کی چادر میں لپیٹ کر کھڑ[illegible] کے راستے نکل گئے۔ یہ دیکھو بستر کے نیچے اس کے جو[illegible] اور موزے نظر آرہے ہیں جبکہ اس کا لباس اور پیٹی کوٹ کر[illegible] پر پڑا ہوا ہے۔''

''کھڑکی کے راستے کیوں؟'' جسٹن نے پوچھا۔ ''دروازے سے کیوں نہیں گئے؟''

''کیونکہ اس طرح انہیں راہداری سے گزرنا پڑتا [illegible] کوئی بھی انہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کے لیے زیادہ آسان یہ تھا کہ وہ لڑکی کو کھڑکی کے راستے نیچے لے جا[illegible] اس شخص کے حوالے کردیں جو باغ میں ان کا انتظار کررہا تھا۔ کھڑکی کے پٹ کا مضبوطی سے بند ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف اسی راستے سے لے جایا گیا ہے۔'' لڑکی نے سیڑھی لے جاکر شیڈ میں رکھی۔ واپس عمارت میں آئی۔ مرینا کے کمرے کی کھڑکی اندر سے بند کی پھر دروازے کی چٹخنی میں ریشمی دھاگے کی گرہ لگائی۔ دروازہ بند کرکے دھاگے کو کھینچا تاکہ اندر سے چٹخنی لگ جائے اور اطمینان سے اپنے بستر پر جاکر سوگئی۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا پھر مادام ڈیزی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا تمہارے بورڈنگ میں کسی اور کے پاس مرینا کی طرح ذاتی کمرا ہے؟''

''ہاں صرف ایک کے پاس اس طرح کا کمرا ہے۔''

''پھر یہ وہی عورت ہوسکتی ہے جس نے یہ کام کیا ہوگا۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ مرینا کی دوست اس کی ذمے دار ہے؟'' سلویٹر نے پوچھا۔

''اگر ذمے دار نہیں تو کم ازکم اس نے مجرموں کا ساتھ ضرور دیا ہے۔''

''تمہارا اشارہ سوزن کی طرف ہے۔'' مادام ڈیزی چلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے یقین ہے یہ اسی کی حرکت ہوسکتی ہے۔'' جسٹن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟'' مادام نے ناگواری سے کہا۔

''میں اسے شروع سے ہی ناپسند کرتا تھا اور اسے دیکھ کر

یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اس کی وجہ سے کوئی نہ کوئی خوفناک واقعہ رونما ہوسکتا ہے۔ جیسے ہی مسٹر جیکل نے عورت کا ذکر کیا۔ میرا ذہن اس کی جانب چلا گیا۔ اس پر الزام لگانے کی جرأت تو نہیں کرسکتا لیکن مجھے اس پر شبہ ضرور ہے۔ خدا کے واسطے موسیو جیکل اسے یہاں بلاؤ اور اس سے پوچھ گچھ کرو۔''

''نہیں۔'' جیکل نے جواب دیا۔ ''ہم اسے یہاں بلانے کے بجائے اس کے کمرے میں جاکر بات کرنا چاہیں گے مادام پلیز ہمیں اس کے کمرے تک لے چلو۔''

اس کا کمرا پہلی منزل پر راہداری کے آخر میں تھا۔ جیکل کے کہنے پر مادام ڈیزی نے دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ مادام بولی۔ ''شاید وہ وقفے کے دوران میں باہر چلی گئی ہو۔ کیا میں اسے بلاؤں؟''

''نہیں۔'' جیکل نے جواب دیا۔ ''پہلے ہم اس کا کمرا دیکھ لیتے ہیں۔''

''لیکن دروازہ تو لاک ہے۔'' مادام نے کہا۔

''تمہارے پاس دوسری چابی ہوگی۔ وہ لے آؤ اور اگر وہ کہیں نظر آجائے تو اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات تم اچھی طرح اپنے دماغ میں بٹھالو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس کی غیر موجودگی میں کمرا کھولیں؟''

''مادام! ہم ایک اہم معاملے کی تحقیقات کررہے ہیں اور دورانِ تفتیش ہمیں ایسا کرنے کا اختیار ہے۔''

مادام ڈیزی منہ بناتی ہوئی چلی گئی لیکن اس کے تاثرات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سوزن کا کمرا کھولنے سے ہچکچا رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اسے سوزن کی ناراضی کا ڈر ہے۔ کہیں وہ بعد میں اسے آڑے ہاتھوں نہ لے۔

چند لمحوں بعد وہ چابی لے کر آگئی۔ جیکل نے کمرا کھولا اور دونوں لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں باہر ہی رہو۔ میں اور مادام کمرے کا معائنہ کریں گے۔''

وہ دونوں اندر چلے گئے۔ جیکل نے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نظر ایک الماری پر گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر الماری کا دروازہ کھول دیا۔ اس کے ایک خانے میں نیلے رنگ کے چمکدار جوتے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے جوتوں کو پلٹ کر دیکھا۔ ان کے تلووں پر پوری لمبائی میں زرد بجری کی ہلکی سی تہ نظر آرہی تھی۔

جیکل نے جوتے واپس اسی جگہ رکھ دیے اور بولا۔ ''میں جو جاننا چاہ رہا تھا، وہ معلوم ہوگیا ہے۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ سوزن اس وقت کہاں ہوگی؟''

فریاد

ایک صاحب قبر کے پاس کھڑے رو رو کر کہہ رہے تھے۔ ''تم تو چلے گئے ہو مگر میری زندگی کو خزاں بنا گئے۔''

ایک راہ گیر نے ان سے ہمدردی سے پوچھا۔ ''اس قبر میں آپ کا کوئی عزیز، رشتے دار یا کوئی دوست دفن ہے؟''

ان صاحب نے جواب دیا۔ ''جی نہیں، یہ میری بیوی کے پہلے شوہر کی قبر ہے۔''

تاخیر

''آپ مجھے کتنا چاہتے ہیں؟'' بیوی نے بڑے ارمان سے اپنے شوہر سے پوچھا۔

''جتنا...... جتنا شاہ جہاں اپنی محبوب ملکہ کو چاہتا تھا!''

''پھر آپ میرے مرنے کے بعد میری یاد میں تاج محل بھی بنوائیں گے!''

''ضرور...... میں نے تو پلاٹ بھی بک کرالیا ہے۔ تم ہی دیر کررہی ہو۔''

(کراچی سے منیر شگفتہ کے ارمان)

''وہ وقفے کے دوران میں کھیل کے میدان میں ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم ملاقاتی کمرے میں جارہے ہیں۔ تم اسے وہیں بلالو۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر آگیا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ ''سلویٹر! میرا خیال ہے کہ ہم نے اس عورت کا پتا لگالیا ہے۔''

☆☆☆

سوزن نے پہلے تو انکار کیا کہ وہ مرینا کے اغوا کے بارے میں کچھ جانتی ہے لیکن وہ زیادہ دیر تک جیکل کی جرح کا سامنا نہ کرسکی اور بالآخر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس کے بیان کے مطابق مرینا کو وال گینوس کے نواب لیونارڈو نے اغوا کرایا تھا۔ وہ ایک عیاش شخص تھا اور ہمیشہ خوب صورت لڑکیوں پر اس کی نظر رہا کرتی تھی گوکہ سلویٹر اس جاگیر کا حقیقی وارث تھا لیکن لیونارڈو اپنی چالاکی اور بدمعاشی کے بل بوتے پر جاگیر پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ نہ جانے کس طرح اس کی نظر مرینا پر پڑ گئی اور وہ اسے اپنے بستر کی زینت بنانے کے لیے بے تاب ہوگیا۔ اس نے مرینا کے بارے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ وہ سلویٹر کے دوست جسٹن کی محبوبہ ہے۔ سلویٹر کو نیچا دکھانے کا اس سے اچھا موقع

اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ اس نے مرینا کے اغوا کا منصوبہ بنایا اور اس کے آدمیوں نے عمارت میں داخل ہونے کے لیے سوزن کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب اسے بھاری انعام کا لالچ دیا گیا تو وہ تعاون پر آمادہ ہو گئی۔ بصورتِ دیگر اسے دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو اسے بھی اغوا کرلیا جائے گا۔ چنانچہ سوزن کے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ سلویٹر نے ساری کہانی سننے کے بعد کہا۔ ”جب وہ لڑکی کو کھڑکی کے راستے باہر لے گئے تھے تو انہوں نے سوزن کو کھڑکی اور دروازہ بند کرنے کے لیے کیوں بھیجا؟“

”تاکہ کمرا بند ہونے کی صورت میں لوگ یہی سمجھیں کہ مرینا اپنے کمرے میں ہے۔ دراصل انہیں اتنی مہلت درکار تھی کہ وہ پیرس کی حدود سے نکل جائیں۔ ایک بار وہ اپنی جاگیر تک پہنچ جاتے تو ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم جانتے ہو کہ بادشاہ کی عملداری پیرس تک ہے اور پورے ملک میں جاگیرداروں نے اپنی متوازی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں۔ میں نے مجرم کا سراغ تو لگا لیا ہے لیکن اس پر ہاتھ ڈالنا میرے اختیار میں نہیں۔ وہ میری پہنچ سے باہر ہے۔“

”بہت بہت شکریہ موسیو جیکل! تم نے ہمارے لیے اتنی زحمت اٹھائی اور بظاہر کوئی سراغ نہ ہونے کے باوجود مجرموں کی نشاندہی کرنے میں کامیاب رہے۔ واقعی ایسی تحقیقات کوئی ماہر سراغ رساں ہی کر سکتا ہے۔“

”لیکن ایسی تحقیقات کا کیا فائدہ۔ مرینا تو ہم سے بچھڑ گئی۔“ جسٹن نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”مرینا کو واپس لانا میری ذمّے داری ہے۔“ سلویٹر نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا بھی دشمن ہے اور میرا خیال ہے کہ اب اس سے حساب لینے کا وقت آگیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر چلا گیا۔

سلویٹر کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ غصے اور جوش کے عالم میں دندناتا ہوا جاگیر جا پہنچا۔ حویلی کے پہرے دار اسے پہچانتے تھے اس لیے کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ لیونارڈو حسبِ معمول عیش و عشرت میں مگن تھا گو کہ اسے اپنی خلوت میں اس کی مداخلت ناگوار گزری لیکن وہ اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا تھا لہٰذا اس نے اشتعال میں آنے کے بجائے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور کہا کہ مرینا اس کے پاس نہیں ہے لیکن جب سلویٹر نے انکشاف کیا کہ سوزن نے پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہے تو وہ بولا۔

”جب تم جان ہی گئے ہو کہ وہ میرے پاس ہے تو یہاں کیوں آئے ہو؟“

”میں اسے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ وہ میرے دوست کی امانت ہے۔“

”کبھی ہو گی لیکن اب وہ میری ملکیت ہے اور تم جانتے ہو کہ لیونارڈو کو جو لڑکی پسند آجائے وہ اس سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہوتا۔ جس طرح تم اپنی جاگیر مجھ سے واپس نہیں لے سکے۔ اسی طرح لڑکی کو بھی نہیں لے سکو گے۔“

”مجھے جاگیر کی پروا نہیں ہے۔ جانتا ہوں کہ تمہارے مرنے کے بعد میں ہی اس کا وارث ہوں۔ فی الحال یہ لڑکی میرے لیے اہم ہے۔ اس کے لیے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔“

”اگر یہ بات ہے تو تمہیں مجھ سے ڈوئل لڑنا ہوگا۔ اگر میں مارا گیا تو جاگیر اور لڑکی دونوں تمہیں مل جائیں گی اور مرنے کی صورت میں بھی تم اپنے دوست کی نظروں میں سرخرو ہو جاؤ گے۔“

سلویٹر سمجھا کہ وہ اس سے مذاق کر رہا ہے لیکن لیونارڈو کو اپنی نشانہ بازی پر ناز تھا۔ اس نے سوچا کہ سلویٹر سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کا اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

مقررہ وقت پر ڈوئل کا اہتمام کیا گیا۔ سلویٹر کو اپنی کامیابی کا بہت کم یقین تھا لیکن وہ لیونارڈو کا چیلنج قبول کرنے پر مجبور تھا۔ اسے اپنی جان سے زیادہ دوست کی ناموس کا خیال تھا لہٰذا وہ پورے عزم اور جذبے کے ساتھ لیونارڈو کے مقابلے پر آگیا جو اسے بچوں کا کھیل سمجھ رہا تھا لیکن قدرت سلویٹر کی مدد کر رہی تھی۔ اس کی چلائی ہوئی پہلی گولی ہی لیونارڈو کے سینے میں پیوست ہو گئی اور مروجہ قوانین کے تحت سلویٹر اس مقابلہ کا فاتح قرار پایا۔ سلویٹر کو اس کی جاگیر مل گئی اور وہ مرینا کو بحفاظت واپس لانے میں کامیاب ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد جسٹن اور مرینا کی شادی ہو گئی۔ اس شادی میں جیکل بھی شریک ہوا جسے اس بات کا شدید رنج تھا کہ وہ مرینا کو بازیاب کرانے میں ناکام رہا اور یہ کارنامہ سلویٹر کے حصے میں آیا لیکن دلہن بنی مرینا سمیت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سلویٹر خود بھی مرینا سے شدید محبت کرتا تھا اسی لیے اس نے مرینا کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔

(+)

کردار و عمل کی یکسانیت اور مزاجوں کے تضاد کا اعصاب شکن فسانہ...

کچھ حساب ایسے ہوتے ہیں... جو انسان کو ہمہ وقت الجھائے رکھتے ہیں... کوشش کے باوجود حصے میں سود و زیاں ہی آتا ہے... ایسے ہی کرداروں کی نقاب کشائی کرتی تحریر... جو اپنے اپنے دائرے میں رہ کر سارے حساب برابر کر دینا چاہتے تھے...

جیسے کو تیسا

سرینا راض

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اب میں جینٹ کے ساتھ مزید گزارہ نہیں کر سکتا۔“ فیلکس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”اپنے غیر معقول مشغلوں اور مسلسل بک بک سے اس نے میرا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ وہ مجھے پاگل کر دے گی۔“

”تو پھر اسے طلاق دے دو۔“ سینڈرا نے چہکتے ہوئے کہا۔ ”تب ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے اور اس طرح چوری چھپے ایک دوسرے سے اِدھر اُدھر ملنے کے جھمیلوں سے بھی بچ جائیں گے۔“

"تم بہ خوبی جانتی ہو کہ میں اسے طلاق نہیں دے سکتا۔" فیئر فیکس نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ بدستور شکایتی تھا۔ "اپنے خاندانی ورثے سے ملنے والی تمام دولت اسی کے پاس ہے۔ طلاق دینے کی صورت میں ایک پھوٹی کوڑی بھی میرے ہاتھ نہیں آئے گی۔"

"لیکن جب تم اپنا ناول فروخت کرو گے اور مشہور ہو جاؤ گے تو..." سینڈرا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ فیئر فیکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوہ۔ ہم کس سے مذاق کر رہے ہیں؟ میں تو اپنا ایک آرٹیکل یا کوئی مختصر کہانی تک فروخت نہیں کر سکتا۔ اور وہ میرا نام نہاد ناول ردّی کے ایک پلندے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی ایڈیٹر اسے خریدنے پر غور بھی نہیں کرے گا۔ نہیں، سینڈی... تلخ حقیقت یہ ہے کہ مجھے جینٹ کی دولت درکار ہے... اور شدت کے ساتھ!"

"ویل، کیا تم اسے قائل نہیں کر سکتے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے؟ اس طرح کم از کم تصفیے کے ذریعے کچھ نہ کچھ رقم تو تمہارے ہاتھ آجائے گی۔" سینڈرا نے کہا۔

"کیا تم مذاق کر رہی ہو؟ میں جینٹ کے لیے ایک چھوٹے سے شوپیس کی طرح ہوں۔ ہم جب کبھی کسی پارٹی میں جاتے ہیں تو وہ مجھے اپنے مصنف شوہر کی حیثیت سے متعارف کراتی ہے۔ اس سے وہ ایک طریقے کی سنسنی محسوس کرتی ہے۔ اسے اپنی اہمیت کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے۔ تب مجھے ان تمام شرمندہ کرنے والے سوالات کے جوابات دینا لازمی ہو جاتے ہیں کہ میں نے اب تک کیا کچھ لکھا ہے اور میری کون کون سی تحریریں فروخت ہو چکی ہیں۔"

تب ان دونوں پیار کرنے والوں کے درمیان ایک طویل خاموشی چھا گئی اور ان کی خالی نظریں دیر تک فرش پر جمی رہیں۔

اس طویل خاموشی کو سینڈرا نے توڑا۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں گویا ہوئی۔ "اس کا ایک اور راستہ ہے۔ تم تو جانتے ہو۔"

یہ سنتے ہی فیئر فیکس نے ایک جھٹکے سے سر کو اٹھایا اور اس کی نگاہیں سنہری زلفوں والی اس دلکش محبوبہ کے چہرے کا طواف کرنے لگیں جو اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہی ہو کہ..." فیئر فیکس نے اپنا جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

"ویل، تم ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ تمہاری بیوی حادثات سے مانوس ہے۔ یہ بات اس کی تمام سہیلیاں اور دوست بھی بہ خوبی جانتے ہیں۔ وہ اکثر انہیں بتاتی رہتی ہے کہ وہ کس طرح چیزوں کو چھلکا دیتی ہے، انہیں گرا دیتی ہے اور ان سے ٹکرا جاتی ہے۔ اسی مانوسی کی بنا پر اس کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ بھی پیش آسکتا ہے جو اس کے لیے ہلاکت کا باعث بن جائے۔" سینڈرا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا تم یہ بات واقعی سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟" فیئر فیکس نے متشکک لہجے میں کہا۔

سینڈرا نے شانے اچکا دیے۔ "تم جینٹ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں، یقیناً لیکن..." اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"تم ایک رائٹر ہو۔ اس بے چاری جینٹ کے لیے ایک ایسا پلاٹ تیار کرو کہ اسے کوئی حادثہ پیش آجائے۔ اس سے تمہارے دونوں مسئلوں کا حل نکل آئے گا۔"

"لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ کہنے میں لگ رہا ہے۔" فیئر فیکس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"یقیناً ہے۔" سینڈرا نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ نہا رہی ہو تو اس کا ہیئر ڈرائر باتھ ٹب میں گر جائے اور پانی میں کرنٹ دوڑ جائے۔"

"وہ ہیئر ڈرائر استعمال نہیں کرتی۔ اس کے بال اس چھوٹی وضع کے ہیں جنہیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور وہ باتھ ٹب میں بھی نہیں نہاتی، وہ شاور لیتی ہے۔" فیئر فیکس نے بتایا۔

"اوہ، تب یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ رش کے اوقات میں تیز رفتار ٹریفک کے درمیان میں ہو تو اس کی کار کے بریک فیل ہو جائیں۔" سینڈرا نے ایک اور تجویز دی۔

"وہ ڈرائیونگ نہیں کرتی۔ وہ ہر جگہ یا تو ٹیکسی میں جاتی ہے یا پھر میں اسے لے جاتا ہوں۔" فیئر فیکس نے بتایا۔

یہ سن کر سینڈرا نے برا سا منہ بنایا پھر بولی۔ "ویل، تمہارا کہنا ہے کہ وہ الیکٹرانکس کے معاملات میں خود کو بہت ماہر سمجھتی ہے اور ڈینگیں مارتی رہتی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جب وہ ٹی وی سیٹ درست کر رہی ہو یا اپنے کمپیوٹر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی ہو تو اسے شاک لگ جائے؟"

"نہیں۔" فیئر فیکس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ اس معاملے میں اتنی محتاط اور پرفیکٹ ہے کہ ایسی کوئی غلطی نہیں کر سکتی جو اس کے لیے ہلاکت کا باعث بن جائے۔"

سینڈرا یہ سن کر خاموش رہی۔

"دیکھو سینڈی! حادثات کا معاملہ تو بھول جاؤ۔ یہ کارگر ثابت نہیں ہوگا۔"

"ضرور کارگر ثابت ہوگا۔" سینڈرا نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بس ایک صحیح حادثے کے درست اجزائے ترکیبی درکار ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اگلے چند دنوں تک اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ ہم کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالیں گے۔"

☆☆☆

"فیئر فیکس! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اداکار رابرٹ کیومنگو کا گاڈ فادر اور ول رائٹ تھا؟ وہی اور ول رائٹ جس نے نارتھ کیرولینا کے قصبے کٹی ہاک میں دنیا کا پہلا ہوائی جہاز اڑایا تھا؟"

"نہیں جینٹ! مجھے علم نہیں۔" فیئر فیکس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کے ہاتھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارے ہاتھ پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟"

"میں ایک پرانے ریڈیو کو ٹھیک کرنے کے لیے اس کا پچھلا کور کھول رہی تھی کہ اسکرو ڈرائیور پھسل گیا اور میرا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ تم تو جانتے ہو کہ میں حادثات سے کتنی مانوس ہوں۔"

"ہاں لیکن تمہیں خاص احتیاط برتنی چاہیے۔ اس حادثاتی مانوسی کی بنا پر کسی دن تمہیں شدید نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" جینٹ نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ "اوہ، کیا تمہیں پتا ہے کہ آج میں کہاں گئی تھی؟"

"نہیں۔" فیئر فیکس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کہاں گئی تھیں؟"

"شہر کے مرکز میں ہر قسم کے مختصر اور چھوٹے الیکٹرانک آلات کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ جیسے کہ ٹی وی جسے آپ اپنی کلائی پر پہن سکتے ہیں... ڈک ٹریسی کی طرح۔ کیمرے جو کہ ٹائی کے کلپ میں فٹ ہو سکتے ہیں۔ ایسی ہی دیگر چھوٹی اور نازک اشیا وہاں موجود تھیں۔ نمائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"

"کیا یہ تمہارے مشغلوں میں ایک جدید ترین اضافہ ہے؟" فیئر فیکس نے پوچھا۔ "تم اس شوق پر کتنی رقم لٹانے کا ارادہ رکھتی ہو؟ اور جب تمہارا دل اس مشغلے سے بھر جائے گا تو تم کسی اور مشغلے کی طرف متوجہ ہو جاؤ گی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے... ہے نا؟"

"کسے پروا ہے؟" جینٹ نے چہکتے ہوئے کہا۔ "رقم میری ہے اور میں اپنی تفریح کے لیے اسے جس طرح خرچ کرنا چاہوں... کر سکتی ہوں۔ اور جب بات رقم کی ہو رہی ہے تو کیا تمہیں معلوم ہے کہ ایک ڈالر کے نوٹ کے پچھلے حصے پر اہرامِ مصر کی طرح ایک مخروط بنا ہوا ہے جس کی تیرہ سیڑھیاں ہیں۔ ادائیگی کے بارے میں جو الفاظ تحریر ہیں ان کی تعداد تیرہ ہے۔ امریکا کی سرکاری مہر کے موٹو کے الفاظ کی تعداد بھی تیرہ ہے۔ جو شاہین ہے اس کے سر کے اوپر تیرہ ستارے بنے ہوئے ہیں۔ اس کی شیلڈ پر تیرہ دھاریاں ہیں، اس کے بائیں پنجے میں تیرہ تیر موجود ہیں اور اس کے داہنے پنجے میں دبی ہوئی زیتون کی شاخ میں موجود پتوں کی تعداد بھی تیرہ ہے؟"

"نہیں ڈیئر! مجھے ان سب کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

"واقعی؟" جینٹ نے کہا۔

"ہاں۔"

"فیئر فیکس! اپنی اس لاعلمی کی بنا پر تم اب تک کس طرح زندہ ہو؟"

گندے چینل

ایک محفل میں نئی نسل کے فکری اور اخلاقی زوال پر گفتگو ہو رہی تھی۔ رام گوپال کہہ رہے تھے۔ "ٹیلی وژن کو ہی لے لیں۔ چینل کس قدر گندے اور خراب آرہے ہیں..."

دھیان سنگھ نے چونک کر ان کی بات کاٹ دی۔ "میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں، میرے گھر میں تو سارے چینل صاف آرہے ہیں۔ آپ اپنی لیڈ سے زنگ شنگ صاف کرالیں، ساری خرابیاں دور ہو جائیں گی۔"

امریکا

نیویارک کے ایک اسکول میں دو بچے باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "میری دو بہنیں اور دو بھائی ہیں، تم کتنے بہن بھائی ہو؟"

"میں اکلوتا ہوں۔" دوسرے نے اُداسی سے جواب دیا۔ "کوئی بہن بھائی نہیں ہے مگر اپنی سگی ماں کی طرف سے میرے تین سوتیلے باپ ہیں اور سگے باپ کی طرف سے چار سوتیلی مائیں ہیں۔ آج کل ممی مجھے ایک نئے آدمی سے ملاتی رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میرا چوتھا سوتیلا باپ ہو!"

(شاہین انور، سرگودھا)

''میرا خیال ہے، یہ میری خوش قسمتی ہے۔''
''میں بھی یہی کہوں گی۔'' جینٹ نے تائید کی۔
اتنے میں فیئرفیکس کو اپنے داہنی جانب سے ہلکی سی خرخراہٹ کی آواز سنائی دی تو وہ اچھل پڑا۔
''یہ کیا ہے؟'' اس نے چار ٹانگوں والی فر کی گیند کی طرح بلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو کمرے میں موجود تھی اور جس کی جانب وہ ابھی تک متوجہ نہیں ہوا تھا۔
''ہماری بلی!''
''بلی؟ ہم کسی بلی کے مالک کب سے ہوئے ہیں؟'' فیئرفیکس نے جاننا چاہا۔
''آج ہی سے۔ میں نے ٹی وی پر سنا تھا کہ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں کتوں اور بلیوں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے کیونکہ ان کے مالکان ان کی نگہداشت نہیں کرتے۔''
''تو پھر؟''
''سو میں اس پونڈ میں چلی گئی جہاں انہیں موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے اور اس بلی کو اپنا لیا۔ ورنہ اسے بھی موت کی نیند سلا دیا جاتا۔'' جینٹ نے بتایا۔
''ونڈرفل!'' فیئرفیکس کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔ ''اب یہ غالباً شہر کی ہر ایک بلی کا پیچھا کیا کرے گا کیونکہ یہ بلی نہیں بلا ہے۔''
''احمق پن کی باتیں مت کرو۔ یہ ایک دوغلی بلی ہے خچر اور لائیگر کی طرح۔ اور کیلکولس میں کوئی نر نہیں ہوتا۔''
''لائیگر؟ یہ لائیگر کیا ہوتا ہے؟''
''یہ ببر شیر اور باگھ کی مادہ شیرنی کا دوغلہ بچہ ہوتا ہے۔ تمہاری معلومات کا ایک بار پھر اظہار ہو رہا ہے، فیئرفیکس۔''
فیئرفیکس منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔
پھر بولا۔ ''میں کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔''
''آج کل تم کچھ زیادہ ہی باہر نہیں جانے لگے ہو۔'' جینٹ نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''کیا تم کسی چکر میں تو نہیں ہو؟''
''نہیں، میں کسی چکر وکر میں نہیں ہوں۔ تمہیں سچ بات بتاؤں۔ میں تمہارے معمولی حقائق، سوالات اور اعتراضات کو بس ایک حد تک برداشت کر سکتا ہوں۔ جب یہ باتیں میری برداشت سے باہر ہو جاتی ہیں تو پھر میں نکل پڑتا ہوں۔ کیا اب تمہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا؟'' فیئرفیکس نے تند لہجے میں کہا۔
جینٹ کے چہرے پر دکھ کے تاثرات امڈ آئے جیسے اس کی بات سے اسے تکلیف پہنچی ہو۔
''ہاں، میرا خیال ہے مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میں تمہارا کوٹ لے کر آتی ہوں۔''
☆☆☆
''بلی؟'' سینڈرا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''یہ بالکل پرفیکٹ رہے گی۔''
''پرفیکٹ؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' فیئرفیکس کے لہجے میں شکوہ عیاں تھا۔ ''وہ بے زبان جانور گھر بھر میں گندگی پھیلاتی پھرے گی، فرنیچر پر اپنے پنجے مار کر خراشیں ڈال دے گی اور ہر جگہ اس کی بدبو بس جائے گی۔''
''اور پیروں کے نیچے بھی آئے گی۔'' سینڈرا نے جملہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔
''ہاں، یہ بھی ہوگا۔'' فیئرفیکس نے تائید کی۔ ''وہ کسی دن میرے پیروں میں الجھ کر مجھے گرا دے گی اور میں اپنی گردن تڑوا بیٹھوں گا۔''
''یا جینٹ اپنی گردن تڑوا بیٹھے گی۔''
فیئرفیکس نے سوالیہ نظروں سے سینڈرا کی طرف دیکھا۔
''کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا؟'' سینڈرا نے قدرے حیرانی سے کہا۔ ''یہی تو وہ پرفیکٹ حادثہ ہوگا جس کی ہمیں تلاش تھی۔ تمہاری بیوی بلی کے پیروں میں الجھنے سے لڑکھڑا جائے گی اور تہ خانے کی سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا گرے گی۔''
فیئرفیکس ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔
''جانتی ہو سینڈی... جب تم نے پہلے اس حادثے کی تجویز پیش کی تھی تو میں نے سوچا کہ تم پاگل ہو گئی ہو۔ لیکن اس عورت نے اپنی بک بک، جھک جھک سے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ اب میں اسے مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ میں کوئی بھی کوشش کرنے کے لیے رضامند ہوں۔''
''گڈ! پھر میں اور تم شادی کر لیں گے اور جینٹ کی دولت سے خوب عیش کریں گے۔'' سینڈرا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''لیکن کیا یہ مشکل نہیں ہوگا کہ جینٹ عین صحیح وقت پر اس بلی سے الجھ کر تہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے لڑھک جائے اور ہمارا کام بن جائے؟'' فیئرفیکس نے تشویش کا اظہار کیا۔
''احمق پن کی باتیں مت کرو، فیئرفیکس۔ وہ حقیقت میں بلی سے الجھ کر سیڑھیوں سے نیچے نہیں لڑھکے گی۔ تمہیں ظاہر یہی کرنا ہوگا جیسے وہ بلی سے الجھ کر تہ خانے میں جا گری تھی۔''
''ہاں، یہ ہوئی نا بات۔'' فیئرفیکس نے بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے ہاتھ کو ایک جھٹکا دیا۔ ''میں اسے فرش پر سے کوئی چیز اٹھانے کے لیے جھکنے پر مجبور کر دوں گا اور پھر اس کے سر پر آتش دان کی راکھ کریدنے والی سلاخ سے ضرب لگا دوں گا۔ پھر اس کی لاش کو تہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکا دوں گا۔ اس طرح اس کے سر پر گومڑے بھی پڑ جائیں گے اور جسم پر خراشیں اور زخم بھی آجائیں گے۔ اور اس طرح یہ پورا حادثہ ایک حقیقی روپ میں بدل جائے گا اور دیکھنے والوں کو یہی تاثر ملے گا جیسے جینٹ واقعی بلی کے اچانک پیروں میں آنے سے ہڑبڑا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور ڈگمگاتی ہوئی تہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گئی۔''
''رائٹ!'' سینڈرا نے اتفاق کیا۔ ''اور تم اس کے ریشمی لمبے موزوں پر بلی کے چند بال بھی چپکا دینا تاکہ یہ تاثر اور حقیقی معلوم ہو کہ وہ واقعی بلی کے پیروں میں آنے سے الجھ کر زینے سے نیچے لڑھکی ہے۔''
فیئرفیکس مسکرا دیا۔ ''اور جینٹ کی حادثات سے مانوسی کے گزشتہ تمام واقعات کی روشنی میں کوئی بھی ایک لمحے کے لیے یہ شک نہیں کرے گا کہ اصل میں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔''
''تو پھر تم یہ کام سرانجام دو گے؟'' سینڈرا نے پوچھا۔
''مجھے دینا ہوگا۔'' فیئرفیکس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''میں اب اس عورت کو مزید برداشت نہیں کر سکتا۔''
☆☆☆
''فیئرفیکس! جب تم باہر جاتے ہو تو کہاں جاتے ہو؟'' جینٹ نے پوچھا۔
''بس باہر نکل جاتا ہوں۔ کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی۔ تمہیں اس بات کی فکر کیوں ہے؟''
''میں تو بس حیران تھی کہ تم کرتے کیا ہو گے؟''
''میں سڑکوں پر ادھر سے اُدھر گاڑی دوڑاتا رہتا ہوں، کیوں؟'' فیئرفیکس نے سوال کیا۔
''اس سوال کی کوئی وجہ نہیں تھی۔'' جینٹ نے کہا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے ریاست ہائے متحدہ امریکا کی طویل ترین سڑک لاس اینجلس میں واقع ہے اور اس کا نام فگوروا سٹریٹ ہے؟''
''نہیں۔''
''اور اس کی لمبائی تیس میل ہے۔''
فیئرفیکس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے۔
''اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
''اوہ، دیکھو تم نے یہ کیا کیا۔'' جینٹ کراہ اٹھی۔ ''میری انگوٹھی تمہارے اس طرح بوکھلا جانے سے فرش پر گر گئی ہے۔''
''اپنا رونا دھونا بند کرو۔ میں تلاش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر فیئرفیکس فرش پر جھک گیا اور نظریں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا۔ جب اس کی نگاہوں نے انگوٹھی کو تلاش کر لیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے آگے کی جانب جھکا اور بولا۔ ''یہ رہی تمہاری انگوٹھی۔''
تب عین اسی لمحے جینٹ نے آہنی بیلن سے فیئرفیکس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ایک بھرپور ضرب لگا دی۔
☆☆☆
''اس کی پتلون پر چپکے ہوئے بلی کے بالوں کی موجودگی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ وہاں تمہاری پالتو بلی کے پیروں میں آجانے سے الجھ کر لڑکھڑاتا ہوا تہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے جا گرا تھا مسز فیئرفیکس۔'' پولیس کے تفتیشی افسر نے کہا۔
''اوہ!'' جینٹ سسکیاں لینے لگی۔ ''یہ تو ایک بھیانک حادثہ ہے۔''
تفتیشی افسر نے تائید میں سر ہلا دیا۔
''جانتے ہو آفیسر کہ اس گھر میں، جو حادثات سے مانوس ہے وہ میں ہوں۔ میرے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ میں کسی نہ کسی حادثے سے دوچار ہوتی رہتی ہوں۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ میرے بجائے فیئرفیکس کو اس طرح مرنا پڑا۔'' جینٹ نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔
''ہاں میڈم! بعض اوقات ایسا بھی ہو جاتا ہے۔'' تفتیشی افسر نے جینٹ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔
جینٹ کی انگلیاں مضبوطی کے ساتھ اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کی جیب میں موجود اس تختی سے ٹرانسمیٹر پر جمی ہوئی تھیں جو اس نے اس روز فیئرفیکس کے کوٹ کی جیب میں خاموشی کے ساتھ رکھ دیا تھا۔
''کیا تم جانتے ہو آفیسر کہ ریڈیو کی لہریں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں؟ اس لحاظ سے براڈکاسٹر کی آواز یہاں سے تیرہ ہزار میل کے فاصلے پر پہلے سنائی دے جائے گی... اس سے قبل کہ وہ اس کمرے کے عقبی حصے تک پہنچے!''

اسما قادری

قسط :52

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہر یار عادل ایک پُر جوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیر نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیر دار ہے جو شہر یار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہر یار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہر یار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہر یار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہر یار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہر یار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہر یار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہر یار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہر یار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہر یار، ماہ بانو اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہر یار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک چلے جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہر یار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر اچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شائستہ کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہر یار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ راوا کے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اسے ایک مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شاز مین وہاں خودکشی کر لیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ شہر یار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہر یار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہر یار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ انہیں اب اپنی دستاویزات بنوائی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو سینیئر را کا ایجنٹ ہے۔ ادھر سلو اور شہر یار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا نامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو سینیئر را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہر یار کو۔۔ گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہر یار اندو اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں اور انہیں مار کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر شہر یار اور سلو پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اور اسے اغوا کر لیتے ہیں لیکن ان کے پیچھے پولیس لگ جاتی ہے اور انہیں پریم ناتھ کو گاڑی میں چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ ادھر ماہ بانو چیک اپ کے لیے اسپتال جاتی ہے مگر واپس گھر نہیں پہنچتی۔ اسلم اپنے طور پر ماہ بانو کی تلاش کا کام کرتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ ماہ بانو اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی ہے۔ ادھر شہر یار، سلو کو بھائی جی کے آدمی گھیر لیتے ہیں تاہم عبدل سے واقفیت کی بنا پر انہیں رعایت دی جاتی ہے اور انہیں بھائی جی کے پاس پہنچایا جاتا ہے۔ بھائی جی ان کی مدد کرنے کا وعدہ کرتا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ وہ لوگ اشوک کو قتل کر دیں۔ اسلم، ماہ بانو کا سراغ لگاتے لگاتے اس بات کا پتا لگا لیتا ہے کہ ماہ بانو کو جنگل میں کہیں رکھا گیا ہے۔ وہ جنگل میں نکل پڑتا ہے۔ ادھر عبدالرحمٰن، شہر یار کو ارجن کے بارے میں بتاتا ہے جو را کا سینیئر افسر ہوتا ہے۔ وہ اس کے خلاف کارروائی کرتے ہیں اور ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اسے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو کو قید کر لیا جاتا ہے۔ اسے قید میں پہنچانے والا ڈاکٹر طارق ہوتا ہے۔ شہر یار اور سلو ڈاکٹر فرحان کو را کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم انہیں عارضی طور پر عائشہ نامی عورت کے گھر پناہ لینی پڑتی ہے۔ ادھر اسلم، ماہ بانو کو قید کرنے والوں کے خفیہ ٹھکانے تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ وہاں موجود کمروں کی تلاشی لے رہا ہوتا ہے کہ اس کی گردن میں سوئی پیوست ہو جاتی ہے اور اسے اپنا جسم سن ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ اسے بے ہوش کرنے والا مارک نامی شخص ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

"میں کچھ دیر کے لیے اپنے دفتر جانا چاہتی ہوں۔" عائشہ کے اس مطالبے کو سن کر وہ بری طرح چونک گئے۔

"کیا کہا تم نے؟" شہر یار نے کچھ حیرانی سے جوستا اس کی تصدیق چاہی۔

"مجھے آفس جانا ہے۔" اس نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم تمہیں کیسے اس بات کی اجازت دے سکتے ہیں؟" شہر یار نے نفی میں سر جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ بہت ضروری ہے۔ میری نئی جاب ہے اور موجودہ حالات میں ہرگز بھی یہ پسند نہیں کیا جائے گا کہ میں چھٹی کروں۔ اس کوتاہی پر مجھے جاب سے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ میں کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ میرے لیے یہ نقصان برداشت کرنا بہت مشکل ہوگا۔" اپنے مطالبے پر قائم رہتے ہوئے عائشہ نے اس کے حق میں دلائل دیے۔

"وہ سب ٹھیک ہے لیکن تم خود سوچو کہ کیا ہمارے حالات اتنا بڑا خطرہ مول لینے کی اجازت دیتے ہیں؟ تم باہر جا کر ہمارے لیے کوئی بھی مصیبت کھڑی کر سکتی ہو۔" شہر یار نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"اس سلسلے میں، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ابھی میں نے یہ فیصلہ تو نہیں کیا ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں گی یا نہیں لیکن اتنی یقین دہانی ضرور کروا سکتی ہوں کہ جب تک تم اس چار دیواری میں ہو، میری زبان کسی کے سامنے نہیں کھلے گی۔ میرے خیال میں تم مجھ پر اتنا اعتماد تو کر سکتے ہو؟" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"بھروسے کی بات تو الگ ہے لیکن ہمارے ساتھ وقت کا بھی مسئلہ ہے۔ تم دفتر میں اپنی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی پوری کر کے آؤ گی تو کیا تب تک ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تمہارے انتظار میں بیٹھے رہیں گے؟ ابھی تمہارا شوہر سو رہا ہے لیکن ظاہر ہے اس کا نشہ اترے گا تو وہ جاگ جائے گا اور اس شخص سے تو ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ وہ ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔ اپنے گھر میں اجنبی افراد کو دیکھ کر وہ شور بھی مچا سکتا ہے اور یہ ہمارے لیے نقصان دہ ہوگا۔" شہر یار نے اس سے بحث کی۔ عائشہ کی جگہ اگر کوئی دوسرا فرد سامنے ہوتا تو اس قسم کے مذاکرات کی نوبت ہی نہیں آتی، وہ سارے فیصلے خود کرتا لیکن عائشہ پر نہ جانے کیوں بھروسا کرنے کا دل چاہتا تھا۔

"میں پورے دن کے لیے دفتر نہیں جاؤں گی، بس ایک دو گھنٹے لگیں گے۔ دفتر میں میرے باس کو معلوم ہے کہ کمال کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔ میں چند ضروری کام نمٹانے کے بعد کمال کی طبیعت کا بہانہ کر کے اس سے چھٹی لے لوں گی۔ ویسے بھی میں سمجھتی ہوں کہ تم دن کی روشنی میں کچھ نہیں کر سکتے۔ دن کے وقت یہاں سے نکلو گے تو لوگوں کی نظروں میں آ جاؤ گے۔ تمہیں ہر حال میں رات ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ رہی بات کمال کے جاگنے کی تو اس کا میرے پاس حل موجود ہے۔ تم لوگ اس سامنے والے کمرے تک خود کو محدود کر لینا۔ کمرے میں اٹیچڈ باتھ موجود ہے۔ پینے کا پانی اور کھانے کے لیے کچھ میں تمہیں فراہم کر دوں گی۔ تم اندر سے دروازہ لاک کر لینا۔ عام طور پر کمال بیڈ روم اور لاؤنج کے علاوہ کسی دوسرے کمرے میں نہیں جاتا۔ لیکن بالفرض اس نے چاہا بھی تو دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکے گا اور یہی سمجھے گا کہ دروازہ میں نے لاک کیا ہے۔ اس کے پاس مین گیٹ کے علاوہ گھر کی چابیاں نہیں ہوتیں اس لیے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بس تم لوگ یہ کوشش کرنا کہ کمرے سے کوئی آواز باہر نہ آنے پائے ورنہ شک ہونے پر کمال ہنگامہ کر سکتا ہے۔" اس کے اعتراضات کے جوابات دینے کے ساتھ ساتھ عائشہ نے تجاویز بھی پیش کیں جس پر شہر یار سوچ میں پڑ گیا۔ اسے عائشہ کی اس بات میں سب سے زیادہ وزن محسوس ہوا تھا کہ وہ دن کی روشنی میں یہاں سے نہیں نکل سکتے اور بہر صورت رات ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

"اوکے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں اور بدلے میں یہ امید رکھتا ہوں کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گی۔" آخر کار شہر یار نے اس کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس وقت اس کے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ چند گھنٹے مزید عائشہ کے گھر میں گزارنے سے ڈاکٹر فرحان کو تھوڑا سا ریسٹ مل جائے گا۔ بے شک اب تک وہ ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے رہے تھے لیکن حقیقتاً ان کی صحت اچھی نہیں تھی اور اب زخموں نے بھی خاصا نڈھال کر دیا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ انہیں آرام کا موقع مل جاتا۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچاؤں۔"

عائشہ نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔ اس کے بعد وہ اپنے اخبار کے دفتر جانے کے لیے تیاری کرنے لگی۔ بلیو جینز پر ڈھیلی ڈھالی پنک ٹی شرٹ پہن کر تیار ہونے کے بعد وہ ان کے سامنے آئی تو اس کی شخصیت کا وہ تاثر برقرار تھا جو انہوں نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ تیار ہونے سے قبل اس نے کچن سمیٹ کر صاف کر دیا تھا۔ ساتھ ہی اپنے شوہر کے لیے ناشتا بھی تیار کر کے رکھا تھا۔ ان لوگوں کے لیے اس نے ایک تھرماس میں کافی تیار کر دی تھی۔ کافی کے ساتھ کچھ ہلکے پھلکے اسنیکس بھی تھے جو کسی وجہ سے اس کے لیٹ ہو جانے کی صورت میں ان کے کام آ سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے تو پھر میں چلتی ہوں۔ میری طرف سے بالکل بے فکر رہنا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی کو تمہاری یہاں موجودگی کا احساس نہ ہو سکے ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی مشکل میں پڑ جاؤں گی۔" گھر سے نکلنے سے قبل اس نے ان لوگوں کو اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ ہدایت کرنا ضروری سمجھا۔

وہ چلی گئی تو وہ تینوں بھی اس کمرے میں منتقل ہو گئے جس کا اس نے بتایا تھا۔ لاؤنج میں سے اپنی موجودگی کے

تمام آثار وہ پہلے ہی مٹا چکے تھے اور ان کا کُل سامان اسلحے سمیت اسی کمرے میں تھا جو عائشہ نے ان کے لیے مختص کیا تھا۔

ڈاکٹر فرحان کو انہوں نے کمرے میں موجود سنگل بیڈ پر آرام کے لیے لٹا دیا تھا۔ عائشہ نے اپنے پاس سے انہیں چند پین کلرز بھی دی تھیں جسے کھانے سے وہ خاصا افاقہ محسوس کر رہے تھے۔

"تم ڈاکٹر صاحب کے پاس رکو۔ میں ذرا گھر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔" عائشہ کو روانہ ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ شہریار اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بے شک عائشہ نے انہیں اس کمرے تک محدود رہنے کی ہدایت کی تھی اور وہ خود بھی اس ہدایت کی خلاف ورزی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے اردگرد سے بالکل بے خبر نہ رہیں۔ کم از کم انہیں اپنی پناہ گاہ کے بارے میں تو مکمل معلومات ہونی چاہیے تھیں۔

کمرے سے باہر نکل کر وہ احتیاط سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے پہلے اس نے بیڈروم میں جھانک کر کمال کو دیکھا۔ وہ ابھی تک لمبی تانے سو رہا تھا۔ اس کی طرف سے تسلی ہونے پر اس نے باقی گھر کا جائزہ لیا۔ سامان سے اندازہ ہو رہا تھا کہ سب کچھ سابق مکینوں کا ہی ہے کیونکہ عائشہ کا پرانا گھر وہ دیکھ چکے تھے۔ وہاں سارا سامان بہت پرانا اور خستہ حال تھا اور انہوں نے گھر میں گنتی کی ہی چند چیزیں اچھی حالت میں دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک تو عائشہ کی کتابیں تھیں اور دوسرے چائے کے برتن۔ ناشتے کے وقت انہوں نے چائے انہی نفیس پیالیوں میں پی تھی جو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ کتابیں بھی ایک کمرے میں نظر آگئیں لیکن ان کی تعداد پہلے کے مقابلے میں کم ہو چکی تھی اور یقیناً اس کے پیچھے کمال کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ پہلے بھی عائشہ کی قیمتی کتابیں بیچ چکا تھا اور ان کتابوں کے ساتھ ہی عائشہ کی تعلیمی اسناد بھی چلی گئی تھیں جس کی وجہ سے اس بے چاری کو ڈپلیکیٹ نکلنے تک ہوٹل میں ویٹرس کی ملازمت کرنی پڑی تھی۔ وہ ملازمت ہی ان کی ملاقات کا سبب بنی تھی لیکن وہاں چھوڑتے وقت انہیں اندازہ نہیں تھا کہ کبھی دوبارہ بھی ایک دوسرے سے سامنا ہوگا۔ پہلے ہی کی طرح ایک اور اتفاق نے ان کی ملاقات دوبارہ کروا دی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت عائشہ مشکل میں تھی اور آج وہ اس کے گھر میں پناہ گزین تھے۔

پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد وہ سب سے آخر میں اسٹور میں آیا۔ اسٹور گرد آلود تھا۔ شاید ملازمت کی مصروفیت کی وجہ سے عائشہ ابھی تک اس طرف توجہ نہیں دے سکی تھی۔ ویسے بھی یہاں زیادہ تر کاٹھ کباڑ ہی بھرا ہوا تھا۔ اسے اپنے کام کی صرف ایک چیز نظر آئی اور وہ تھا ایک ہوادان۔ اس نے ایک جستی صندوق پر چڑھ کر ہوادان سے باہر جھانکا۔ یہاں سے ہاؤسنگ اسکیم کا مین گیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ گیٹ پر اب بھی وہی رات والا بوڑھا چوکیدار موجود تھا لیکن اس کے ساتھ موجود دو پولیس والوں کی موجودگی ذرا تشویشناک تھی۔ وہ دونوں چوکیدار سے کچھ پوچھ رہے تھے جس کا وہ زور زور سے سر ہلا کر بڑی شدومد سے جواب دے رہا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا لیکن اندازہ یہی تھا کہ شاید انہی کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ اس گفتگو کے کسی انجام تک پہنچنے سے قبل ہی اسے گھر میں کھٹ پٹ کا احساس ہوا۔

وہ جلدی سے نیچے اتر کر اسٹور کے دروازے تک آیا اور وہاں سے جھانک کر دیکھا۔ یہ کمال تھا جو آنکھ کھلتے ہی سیدھا کچن میں پہنچ گیا تھا اور ہاتھ منہ دھو کر فریش ہونے کی زحمت کیے بغیر کچن میں کھڑے کھڑے ہی ناشتے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ وہ ایسے رخ پر کھڑا تھا کہ اگر شہریار اسٹور سے نکل کر کمرے میں جانے کی کوشش کرتا تو ضرور اس کی نظروں میں آ جاتا، چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہیں اسٹور میں ہی دبکا رہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کمال ادھر اُدھر ہوتا تو وہ واپس کمرے میں چلا جاتا لیکن ہوا یوں کہ ناشتا کرنے کے بعد کمال نے چائے کا کپ ہاتھ میں تھاما اور لاؤنج میں آ بیٹھا۔ اب تو شہریار کا راستہ بالکل ہی مسدود ہو چکا تھا۔

کمال نے ٹی وی کھول لیا تھا اور نیوز چینل لگائے خبریں دیکھ رہا تھا۔ آواز بلند ہونے کی وجہ سے اسٹور تک بھی صاف پہنچ رہی تھی۔ زیادہ تر خبریں وہی تھیں جو وہ صبح سویرے ہی سن چکے تھے۔ ان خبروں کو دہرانے کے ساتھ ساتھ نیوز اینکرز اس بات پر بھی تشویش کا اظہار کر رہے تھے کہ ایک خطرناک مجرم کو چھڑا کر لے جانے والے دہشت گرد جو پہلے ہی نصف درجن سے زائد افراد کی ہلاکت کے ذمے دار ہیں، ابھی تک آزاد گھوم رہے ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت شہر میں ہی موجود ہیں یا یہاں سے نکل کر کسی اور شہر کا رخ کر چکے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر کڑی تنقید کی جا رہی تھی کہ ان کی ناقص منصوبہ بندی نے

بے شمار افراد کی جان داؤ پر لگا رکھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شہریوں کو بھی تاکید کی جا رہی تھی کہ وہ جیسے ہی کسی مشتبہ شخص کو دیکھیں، فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔ لوگوں کو اپنے گھروں اور ملازمت کی جگہوں پر بھی محتاط رہنے کا کہا جا رہا تھا۔

ان خبروں کو سن کر شہریار کو لگ رہا تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، ان کے فرار کی راہیں اتنی ہی مسدود ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن مسئلہ وہی تھا کہ دن کی روشنی میں تو ان کا یہاں سے نکلنا بھی آسان نہیں تھا۔ حلیہ بدل کر بھی نکلتے تو گیٹ پر موجود چوکیدار تین اجنبیوں کو دیکھ کر ٹھٹک جاتا کیونکہ اس طرح کی رہائشی آبادی میں چوکیدار ہر ایک مکین کا صورت آشنا ہوتا ہے۔ یہاں تو چوکیدار کے ساتھ پولیس والے بھی کھڑے نظر آ رہے تھے جو ذرا سا شک محسوس ہونے پر ہی مصیبت کھڑی کر دیتے۔ اپنی اس مجبوری کو تسلیم کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر کمال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے چائے ختم کر لی تھی اور اب کچھ بے چین سا اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا۔ جب جیبوں سے کچھ برآمد نہیں ہوا تو کمرے میں اِدھر اُدھر تلاشی لینے لگا۔ تلاشی کے اس عمل میں اس پر جھنجلاہٹ بھی طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"سالی پتا نہیں کہاں چھپا کر چلی گئی ہے۔ میرا سارا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ اس کے آنے تک کیا میں ایسے ہی بیٹھا رہوں گا۔" تلاش کے عمل کے ساتھ ساتھ جاری اس کی بڑبڑاہٹ سے ظاہر تھا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے۔ لاؤنج کو الٹ پلٹ دینے کے باوجود جب کچھ نہ نکلا تو وہ پیر پٹختا ہوا بیڈروم میں جا گھسا۔ اب وہاں جا کر بھی یقیناً اسے یہی کارروائی کرنی تھی، چنانچہ شہریار کے لیے موقع اچھا تھا کہ وہ واپس اپنی کمین گاہ میں پہنچ جائے۔ اس نے تیزی سے حرکت کی۔ اس سے قبل کہ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر اس پر مخصوص دستک دیتا، دروازہ کھل گیا۔ یقیناً سلو کی ہول سے آنکھ لگائے بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا اس لیے اس کے لیے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر چند منٹ سکون کا سانس لیا ہی تھا کہ ایک بار پھر کمال کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اب وہ پہلے سے بہت زیادہ بلند آہنگ میں بول رہا تھا اور نشے کی بڑھتی ہوئی طلب کے ساتھ بڑھتی جھنجلاہٹ کے باعث عائشہ کو بے تکان گالیاں دے رہا تھا۔

وہ اور سلو باری باری کی ہول سے جھانک کر مسلسل اس کی کیفیت کا جائزہ لے رہے تھے۔ بیڈروم کے بعد کچن کا بھی حشر خراب ہو چکا تھا۔ کچن سے نکل کر وہ سیدھا اس کمرے کی طرف آیا جہاں وہ لوگ موجود تھے لیکن ظاہر ہے دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے وہ اسے کھولنے میں ناکام رہا۔

"یہیں ہوگی میری پڑیا۔ اسی لیے سالی اس کمرے کو لاک کر کے گئی ہے۔" دروازہ نہ کھلا تو اس نے خود ہی اندازہ قائم کر لیا۔ اپنی طلب پوری نہ ہو سکنے کے غصے میں وہ کئی بار بیوی کو سالی کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کچھ بنا چکا تھا۔ شہریار نے دل ہی دل میں عائشہ کے حوصلے کو سراہا جو ایک لگژری لائف کو چھوڑ کر ایسے آدمی کے ساتھ سر پھوڑ رہی تھی اور نامساعد حالات کے باوجود مایوس نہیں تھی۔

"سالا یہ دروازہ ہی توڑ دیتا ہوں۔" دروازہ کھولنے میں ناکامی ہوئی تو اس نے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور فوراً ہی اس پر عمل پیرا بھی ہو گیا۔ کی ہول سے آنکھ لگائے باہر کا منظر دیکھتے شہریار نے دیکھا کہ وہ دروازے سے ذرا دور جا کر کھڑا ہوا اور پھر دوڑ کر آ کر اسے کندھے کی ایک ضرب لگائی۔ اب وہ کوئی فلمی ہیرو تو تھا نہیں کہ اس کی ایک ضرب سے دروازہ اکھڑ کر دور جا گرتا۔

لکڑی کے مضبوط دروازے کے لیے اس کے نشے سے لاغر جسم کی ضرب قطعی بے اثر تھی البتہ ردعمل میں خود کمال کے شانے پر جو ضرب لگی، اس نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ چیخ کے بعد اس کے منہ سے عائشہ اور دروازے دونوں کے لیے مغلظات کا ایک طوفان برآمد ہوا لیکن پھر دوبارہ اس نے کوشش نہیں کی اور وہاں سے ہٹ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے چلے جانے پر شہریار نے ذرا سکون محسوس کیا کیونکہ اب اسے ڈر محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں اس شور شرابے کو سن کر کوئی اس طرف متوجہ نہ ہو جائے لیکن پھر اگلے ہی لمحے اس کا یہ سکون غارت ہو گیا کیونکہ کمال کمرے سے ہاتھ میں کرسی کا ایک ٹوٹا ہوا دستہ لے کر برآمد ہوا تھا۔ اس نے یہ دستہ لا کر دروازے کے لاک والے حصے میں ضرب لگائی۔ دستے کی ضرب لاک کا تو کیا بگاڑتی لیکن شور ضرور پیدا کیا۔ ناکامی پر ہار ماننے کے بجائے کمال پر جنون سا طاری ہو گیا کیونکہ لاکڈ دروازے نے اس کے اندر یہ یقین پختہ کر دیا تھا کہ اس کی مطلوبہ شے اسی کمرے میں ہے۔ شہریار کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اسے روکنے کے لیے کیا کرے۔ لاک پر ضربیں لگائے جانے کی وجہ سے اسے اپنی آنکھ بھی کی ہول سے ہٹانی پڑی تھی۔

پریشانی کے اس عالم میں دو باتیں ایک ساتھ ہوئیں۔ ایک تو کال بیل زور سے چیخی، دوسرے سلو نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا۔ اس نے مڑ کر سلو کی

طرف دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک پڑیا تھی جس میں سفید رنگ کا سفوف نظر آرہا تھا۔ ادھر کال بیل بجنے کے بعد کمال نے ضربیں لگانے کا عمل روک دیا تھا۔ شہریار نے جھک کر... کی ہول سے باہر جھانکا۔ وہ بکتا جھکتا باہر کی طرف جارہا تھا۔ فوری طور پر ایک فیصلہ کرتے ہوئے اس نے سلو کے ہاتھ سے پڑیا جھپٹی اور دروازہ کھول کر وہیں کھڑے کھڑے اس انداز میں اچھالی کہ وہ سیدھی سینٹرل ٹیبل کے پاس جا... گری۔ پڑیا باہر پھینکنے کے بعد اس نے ایک بار پھر پھرتی سے دروازہ لاک کرلیا۔ کمال کی حرکتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے یہ تو محسوس کیا تھا کہ سلو کمرے میں کچھ تلاش کرتا پھر رہا ہے اور پڑیا مل جانے پر سمجھ بھی گیا تھا کہ وہ کیا تلاش کررہا تھا لیکن افسوس یہ تھا کہ اس پڑیا کے انہیں ملنے میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی ورنہ پہلے ہی وہ اس ہنگامے کو روکنے کا بندوبست کر لیتے۔ اب تو گویا سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔ کمرے کے باہر انہیں کچھ افراد کے بولنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ شہریار نے ایک بار پھر کی ہول پر آنکھ ٹکا دی۔ باہر لاؤنج میں اسے کمال کے ساتھ چوکیدار اور ایک پولیس والا کھڑے نظر آئے۔

''تمہارے گھر میں اتنا شور کیوں ہورہا تھا؟ تمہارے پڑوسیوں نے کمپلین کی ہے کہ شاید گھر میں چور وغیرہ گھس آئے ہیں اور دروازے توڑنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' پولیس والا سخت لہجے میں کمال سے مخاطب تھا۔

''میں نے بتایا ہے نا کہ میرے سوا کوئی گھر میں نہیں ہے۔ ایک کمرے کا دروازہ لاک ہوگیا ہے اور میں اسے توڑنے کی کوشش کررہا ہوں۔'' پولیس والے کے لہجے کو خاطر میں لائے بغیر کمال نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں اسے جواب دیا جس پر پولیس والے کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے اور وہ پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں بولا۔

''تمیز سے بات کرو مسٹر! میں تمہیں پڑوسیوں کو ڈسٹرب کرنے کے جرم میں اریسٹ بھی کرسکتا ہوں۔''

''ہاہاہا......'' اس کی دھمکی سن کر کمال زور سے ہنسا پھر بولا۔ ''تم بھول رہے ہو آفیسر کہ تم لندن یا امریکا کی پولیس میں نہیں بلکہ انڈین پولیس میں جاب کرتے ہو اور یہاں ایسا کوئی لا نہیں چلتا کہ تم پڑوسیوں کو ڈسٹرب کرنے پر مجھے اریسٹ کرلو۔ ویسے بھی میں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ میں جو کچھ کررہا ہوں، اپنے گھر میں کررہا ہوں۔'' اس کے ایسی صاف گوئی سے دیے جواب نے پولیس والے کو مزید مشتعل کردیا اور اس نے گھما کر ایک تھپڑ کمال کے منہ پر دے مارا۔

''میرے ساتھ تھانے چل سالے، میں تجھے اچھی طرح سکھا دوں گا کہ یہاں کون سا لاء چلتا ہے اور کون نہیں۔'' رات ہونے والے واقعے کے بعد یقیناً پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں اور لازماً وہ سب ہی بے حد دباؤ میں تھے، ایسے میں کمال کے رویے نے جلتی پر آگ کا کام کردیا تھا۔

اندر وہ تینوں دم سادھے اس صورتِ حال کے انجام کا انتظار کررہے تھے۔ عملی طور پر اس وقت وہ ایک چوہے دان میں پھنسے ہوئے تھے جہاں سے وقتِ ضرورت بھاگ نکلنا بھی آسان نہیں تھا۔

''جانے دیں سر جی۔ سالا نشئی ہے اور نشے میں الٹا سیدھا بول گیا ہے۔ اسے اپنا ہوش ہوتا تو ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہی کیوں؟'' ایک تھپڑ کے بعد پولیس والے کا ہاتھ رکا نہیں تھا اور وہ مسلسل کمال پر ہاتھ پیروں کا استعمال کررہا تھا۔ نشے کے لیے ٹوٹتا کمال کا جسم ایسی مار کھانے کا اہل نہیں تھا چنانچہ چند ضربوں کے بعد ہی وہ نیچے گر گیا تھا اور چوکیدار شاید اس کی حالت پر رحم کھا کر ہی پولیس والے سے اس کی جان بخشی کی درخواست کررہا تھا۔

''اس کا نشہ تو میں اتارتا ہوں نا۔ حرام زادے کو کچھ خبر نہیں ہے کہ شہر میں کتنی ٹینشن ہے۔ پتا بھی کھڑکے تو ہماری دوڑیں لگ رہی ہیں اور یہ ہے کہ اس نے یہاں ہنگامہ بپا رکھا ہے۔'' پولیس والے نے بلا تکلف کمال کی پشت پر ایک اور لات رسید کی۔

''نشہ ملا ہی نہیں تو تم اتارو گے کیسے آفیسر؟ اگر ہمیں ہماری جادو کی پڑیا مل گئی ہوتی تو کاہے کو یہ سارا ہنگامہ کرتے؟'' زمین پر پڑے پڑے کمال نے لہک کر پولیس والے سے کہا جس پر وہ ''تیری تو......'' بولتا ہوا ایک بار پھر اس کی طرف لپکا لیکن اس بار چوکیدار نے اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر کھینچ لیا۔

''کیا کرتے ہیں سر جی! اس کی چچی جرنلسٹ ہے۔ اسے خبر ہوگی کہ کسی پولیس والے نے گھر میں گھس کر اس کے چچی کو مارا پیٹا ہے تو ہنگامہ کھڑا کردے گی۔ آپ کو تو خبر ہے کہ آج کل یہ جرنلسٹ کتنے سر پر چڑھے ہوئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ہی مشکل میں پڑ جاؤ۔''

اتفاق سے چوکیدار، پولیس والے کو کمال کے پاس سے گھسیٹ کر اس کمرے کے دروازے کے قریب لے آیا تھا جس میں وہ تینوں موجود تھے اس لیے اس کی دھیمی آواز

پولیس والے کو سمجھانے کی آوازیں ان تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ جرنلسٹ بیوی کا ذکر سن کر پولیس والے کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی البتہ اپنی افسرانہ شان دکھانے کے لیے وہاں سے جاتے جاتے بھی وہ کمال کو دھمکی دینا نہیں بھولا۔

''ابھی تجھے چھوڑ رہا ہوں لیکن پھر کمپلین آئی تو سیدھا تھانے لے جاکر الٹا لٹکا دوں گا۔''

''لٹکا دینا۔ شاید اسی طرح دنیا سیدھی نظر آنے لگے۔ ابھی تو سب کچھ الٹا دکھائی دے رہا ہے۔ تم بھی الٹے نظر آرہے ہو آفیسر! تمہاری یہ جو ٹانگیں ہیں نا یہ مجھے اوپر نظر آرہی ہیں۔'' حالت خراب ہونے کے باوجود کمال بولنے سے باز نہیں رہا اور اپنی بات کہہ کر خود ہی زور زور سے ہنسنے بھی لگا۔ اس کے اس انداز نے پولیس والے کو طیش تو دلایا ہوگا لیکن چوکیدار نے جو کہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا، اسے وہاں رکنے نہیں دیا اور اپنے ساتھ لے کر گھر سے نکلتا چلا گیا۔

''سالے نے حلیہ ٹائٹ کر دیا، پر کوئی بات نہیں...... بس ذرا اپنی جادو کی پڑیا مل جائے تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' ان کے جانے کے بعد کمال خود کلامی کے انداز میں بولتا ہوا اٹھا اور لہراتا ہوا صوفے کی طرف بڑھا۔ صوفے پر گرنے سے قبل ہی اس کی نظر میز کے قریب گری پڑیا پر پڑ گئی۔ پڑیا دیکھ کر وہ ساری چوٹیں دو منٹ میں بھول کر کھل اٹھا۔

''او میری نیلم پری تُو ادھر پڑی ہے اور میں تجھے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔'' خوشی سے لہک کر کہتے ہوئے اس نے لپک کر نیچے پڑی پڑیا اٹھالی۔ اس کے بعد یقیناً اسے مصروف ہوجانا تھا۔ شہریار ایک گہرا سانس لیتا ہوا دروازے کے پاس سے ہٹ گیا۔ سامنے سلو اور ڈاکٹر فرحان کے چہرے تھے۔ سلو حسبِ معمول حالات سے بے نیاز نظر آرہا تھا جبکہ ڈاکٹر فرحان بستر پر ہی دیوار سے ٹیک لگائے پریشان سے بیٹھے تھے۔ اتنے برسوں بعد قید سے رہائی ملنے کے بعد دوبارہ پکڑے جانے کا خیال یقیناً ان کے لیے سب سے زیادہ وحشت ناک تھا۔ شہریار بے اختیار ہی ان کے قریب جا بیٹھا اور تسلی دینے والے انداز میں ان کا شانہ تھپکنے لگا۔

''آپ فکر نہ کریں سر! چاہے ہمیں اپنی جانیں قربان کرنی پڑیں، ہم آپ کو پاکستان ضرور پہنچائیں گے۔'' تسلی کے یہ الفاظ ڈاکٹر پر نہ جانے کس طرح اثر انداز ہوئے کہ ان کے چہرے پر تلاطم سا نظر آنے لگا اور کچھ کہنے کی کوشش

سر کا استعمال

سردار بوٹا سنگھ کی پیشانی زخمی تھی اور وہ ڈاکٹر کے مطب کی طرف دوڑے جارہے تھے۔

راستے میں ایک شناسا نے ازراہِ ہمدردی احوال پرسی کی تو انہوں نے بتایا۔ ''بس جی! دیوار میں زنبور سے کیل ٹھونکنے کی کوشش کررہا تھا، کیل لگ ہی نہیں رہی تھی...''

''کیل نہیں... میں تمہارے زخم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''پوری بات سنو، پھر بولنا۔'' بوٹا سنگھ کو وہ قطعِ کلامی ناگوار گزری پھر انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بھابی آکر بولی کہ زنبور سے کیل لگا رہے ہو، کبھی اپنا سر بھی استعمال کرلیا کرو۔ مجھے غصہ آگیا۔ زنبور رکھ کر کیل پر سر سے پہلی ہی چوٹ لگائی تو یہ حال ہوگیا... اس لیے کہتے ہیں کہ عورتوں کے مشورے پر کبھی عمل نہیں کرنا چاہیے۔ پتا نہیں سر سے کیل کیسے ٹھونکتے ہیں!''

(کراچی سے میمونہ عزیز کا مشورہ)

میں ہونٹ صرف کپکپا کر رہ گئے۔

''آپ کچھ نہ کہیں سر! ہمیں آپ کی ہر صعوبت کا اچھی طرح اندازہ ہے اور ہم اپنے ہیرو کو اب دوبارہ اس جہنم میں نہیں جانے دیں گے۔ یہ ایک مجاہد کا وعدہ ہے جسے میں اپنی آخری سانس تک نبھاؤں گا۔'' شہریار نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے جس پر ان کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے۔ یہ آنسو شاید اس شکر کے تھے کہ ان کی برسوں پر محیط تکلیف بے ثمر نہیں تھی اور وہ ایسے لوگوں کے لیے اذیتیں سہتے رہے تھے جن کے دل میں ان کی قدر و عزت تھی۔

☆☆☆

''میں کہتا ہوں مجھے یہاں سے باہر نکالو۔'' اسلم بہت دیر ہوئی اس دوا کے اثر سے باہر آگیا تھا جس کی مدد سے مارک نے اسے بالکل مفلوج کردیا تھا۔ دوا کے زیرِ اثر وہ کئی گھنٹے تک بالکل ساکت پڑا رہا تھا اور ہاتھ پیر ہلانا تو دور کی بات، زبان ہلانے سے بھی معذور رہا تھا۔ بے بسی کا کئی گھنٹوں پر مشتمل یہ عرصہ اس نے ایک ہال نما کمرے کے بیرک میں گزارا تھا۔ وہاں اس سائز کے تقریباً آٹھ بیرک موجود تھے۔ ان بیرکوں کی دیواریں لوہے کی چادروں پر

مشتمل تھیں جبکہ دروازہ مضبوط سلاخوں سے بنایا گیا تھا۔
جس بیرک میں اسلم موجود تھا، اس کے علاوہ صرف دو بیرک آباد تھے اور وہاں اسے جنگل میں دکھائی دینے والے ایڈی ہی کی طرح کے دو وجود دکھائی دیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایڈی دیکھنے میں مغرب کا باسی لگتا تھا جبکہ یہ دونوں اپنے نقوش اور رنگت سے ایشیائی محسوس ہو رہے تھے۔ چھوٹی قامت کے ان مرد نما بچوں یا بچے نما مردوں کو دیکھ کر اس کے اندر اشتعال کی لہریں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ ان کی ہیئت دیکھ کر سمجھ چکا تھا کہ یہ جس حال میں بھی نظر آ رہے ہیں، اس حال میں لانے کی ذمے داری قدرت کے بجائے ان انسانی ہاتھوں کی ہے جنہوں نے اللہ کے کاموں میں دخل اندازی کی ہے۔ اس کی چشم تصور اسے دکھا رہی تھی کہ اس کا ہونے والا بچہ بھی کل کو اسی حال میں پیدا ہوگا اور ماں کی مہربان آغوش کے بجائے ایسے ہی کسی بیرک میں پلے گا جہاں انسانوں کو جانوروں کی طرح رکھا گیا تھا۔

دوا کا اثر معدوم ہونے پر جب اس کے ہاتھ پیر حرکت کرنے لگے تھے تو اس نے دروازے کی سلاخوں کو توڑنے کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن مضبوط سلاخیں اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھیں۔ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہ بیرک کے محدود رقبے میں کسی زخمی درندے کی طرح ٹہلنے اور دہاڑنے لگا لیکن اس کی اس حرکت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اگر کوئی ردِعمل ظاہر ہوا تھا تو بس اتنا کہ آباد بیرکوں میں سے ایک میں موجود بچہ اپنی بیرک کے سلاخ دار دروازے پر آ کھڑا ہوا تھا اور اسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے نے اتنی بھی زحمت نہیں کی تھی اور بالکل ایسے اپنے بستر پر پڑا رہا تھا جیسے کچھ سنائی نہ دے رہا ہو۔ اسلم نے ایک چیز نوٹ کی تھی کہ سوائے اس کی بیرک کے تمام بیرکوں میں کچھ نہ کچھ سامان موجود تھا۔ اس سامان میں بستر، دیوار میں نصب پانی کا کولر، چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور لکھنے پڑھنے کا سامان نمایاں تھا۔ اسے بیرک میں منتقل کرنے سے پہلے شاید بیرک سے یہ سارا سامان ہٹا دیا گیا تھا کیونکہ ظاہر ہے ایک نارمل انسان اس پستہ قامت مخلوق کی طرح اس سارے سامان کے ساتھ اتنی مختصر بیرک میں نہیں سما سکتا تھا۔

کافی دیر ہنگامہ کرنے کے بعد جب کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تو آخر کار اسے تھک ہار کر ایک طرف بیٹھنا ہی پڑا اور وہ خود کو سمجھانے لگا کہ اس طرح جذباتی ہو کر ہنگامہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے اسے قیدی بنایا ہے، وہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں اس لیے ان کے چنگل سے نکلنے کے لیے عقل اور صبر سے کام لینا ہوگا۔ مگر سکون بیٹھنے کا دورانیہ چند منٹوں پر ہی مشتمل تھا۔ یکدم ہی ہال کا دروازہ کھلا اور اس نے مارک کو ایک اسٹریچر دھکیلتے ہوئے اندر آتے دیکھا۔ اسٹریچر پر سنہری بالوں والا ایڈی لیٹا ہوا تھا۔ اسلم اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخ دار دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

ایڈی..... جسے اس نے جنگل میں کسی خرگوش کی طرح پھرتی سے اچھلتے کودتے دیکھا تھا، اسٹریچر پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت زرد تھی۔ اس کا جسم سینے سے لے کر پیروں تک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسلم کو یاد تھا کہ مارک نے اس کی ٹانگ پر گولی ماری تھی اور پھر شانے پر لاد کر اپنے اس زیرِ زمین ٹھکانے تک لایا تھا۔ مارک نے اسے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ وہ اس کے زخم کا علاج کرنے کے بجائے یونہی اس کی بیرک میں لے جا کر پھینک دے گا تاکہ زخم سڑ جانے پر اس کی ٹانگ کاٹ سکے۔ اس وقت ایڈی کو اسٹریچر پر دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ مارک نے اپنی دھمکی پر عمل نہیں کیا تھا اور یقیناً اس کی ٹانگ سے گولی نکالے جانے کے بعد ہی اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ گولی نکالنے کا کام مارک نے خود کیا تھا یا کسی اور نے، اس کی اسلم کو خبر نہیں تھی لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ مارک تنہا ہی ایڈی کا اسٹریچر دھکیلتے ہوئے یہاں تک لایا تھا اور ایک بیرک کا دروازہ کھولنے کے بعد نہایت آسانی سے تنہا ہی ہلکے پھلکے ایڈی کو اس کے بستر پر منتقل کر دیا تھا۔

”مجھے یہاں سے باہر نکالو۔“ مارک، ایڈی کی بیرک کا دروازہ لاک کر کے واپس جانے لگا تو اسلم نے اس سے مطالبہ کیا۔ اتنی دیر سے وہ ایڈی کو دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ کچھ بولنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مارک پلٹ کر واپس جانے لگا تو وہ چونکا اور اس سے مطالبہ کیا۔ اس کا مطالبہ سن کر مارک ٹھٹک کر رکا اور اس کی بیرک کے دروازے کے عین سامنے کھڑا ہو کر اسے گھورتے ہوئے استہزائیہ انداز میں مسکرانے لگا۔

”ان کمزوروں کو زیر کر کے تم خود کو بہت شہ زور سمجھتے ہو۔ اگر ایسے ہی شہ زور ہو تو مجھے یہاں سے نکال کر دو بدو مقابلہ کرو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دھوکے سے میرے جسم میں مفلوج کر دینے والی دوا داخل کر کے زیر کرنے کے مقابلے میں، ہاتھ پیروں کی طاقت آزمانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“ اسلم نے جواباً شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے چیلنج کیا جس پر وہ زور سے ہنس دیا اور پھر سخت کھردرے لہجے میں بولا۔

”یہ کوئی ریسلنگ ونگ نہیں ہے مسٹر جہاں ریسلرز ایک دوسرے کو چیلنج دے سکیں۔ میں تمہاری اس قسم کی گفتگو سن کر جذباتی ہونے والا نہیں ہوں۔ تمہاری حیثیت یہاں ایک ایسے قیدی کی ہے جس نے ہماری حدود میں داخل ہونے کا سنگین جرم کیا ہے اور اس جرم کی سزا دینے میں صرف اس لیے تاخیر ہو رہی ہے کہ فی الحال ماسٹر یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ آئے گا تو تمہاری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ جب تک تم یہاں سکون سے رہو۔ چیخنے، چلّانے اور شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یہاں کا انچارج میں ہوں اور میں ایسی حرکتوں کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارا ہنگامہ میری برداشت کی حد سے بڑھ جائے تو مجھے دوبارہ تم پر مفلوج کر دینے والی دوا استعمال کرنی پڑے۔“

وہ اسلم کو دھمکی دینے کے بعد ہال سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز پر اسلم نے شدید سبکی اور جھنجلاہٹ محسوس کی لیکن فوراً ہی خود پر قابو بھی پا لیا کیونکہ اتنی دیر میں اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ جھنجلاہٹ کا اظہار کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ اس کی چیخ و پکار پر یہاں کوئی کان دھرنے والا نہیں تھا اور نہ ہی وہ اپنے بازوؤں کی طاقت سے لوہے کا یہ مضبوط دروازہ توڑ کر باہر نکل سکتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ صبر سے اپنے لیے بہتر موقع کا انتظار کرے۔ مارک اسے یہ خوش خبری تو سنا ہی گیا تھا کہ ماسٹر کی عدم موجودگی میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا، چنانچہ ابھی اس کے پاس مہلت تھی لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مہلت کتنی مدت کے لیے ہے کیونکہ مارک نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ماسٹر کب واپس آئے گا۔

وہ مجبور و بے بس سا بیرک کی ایک دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے ہی وہ بیرک تھی جہاں ایڈی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھنے لگا جسے پانچ سال کی عمر میں ہی اس کے بچپن سے محروم کر دیا گیا تھا اور وہ جوان اور بچے کا عجیب سا کمبی نیشن بن کر رہ گیا تھا۔ اس بے چارے کے ماں باپ جانے کون تھے اور کہاں تھے جن سے الگ کر کے اسے یہاں ایک ایب نارمل زندگی گزارنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ایڈی پر افسوس کرتے کرتے اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آ گیا۔ اگر ماہ بانو یہاں موجود تھی تو یقینی طور پر ان کا بچہ سخت خطرے میں تھا۔ جنگل میں اس نے ایڈی اور مارک کے مابین جو گفتگو سنی تھی، اس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اسے بھی کسی تجربے کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ ایک ناقابلِ برداشت بات تھی۔ اسے اپنے بچے اور ماہ بانو کو بچانے کے لیے کچھ تو کرنا تھا لیکن اس کے لیے ایک موقع ملنا شرط تھا اور اس موقع کے انتظار میں ہر گزرنے والا پل اسے کانٹوں پر گزارنا تھا۔

☆☆☆

ماہ بانو کے سامنے فروٹ باسکٹ رکھی ہوئی تھی جس میں سے وہ انگور کے دانے چن چن کر کھا رہی تھی۔ انگور بے حد میٹھے اور رسیلے تھے اور اسے ان کے لیے اتنی رغبت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے ٹوکری میں موجود کسی دوسرے پھل کی طرف نظر ہی نہیں ڈالی۔ ابتدائی چند دنوں کے بعد اس نے اپنی اس تعیش بھری قید سے مفاہمت کر لی تھی۔ شروع میں وہ بے حد پریشان اور ہراساں رہی جس کی وجہ سے کھانے پینے پر بھی اثر پڑا تھا لیکن پھر اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ کھانا پینا ترک کرنے سے فائدہ ہونا تو مشکل ہے، الٹا اس کی اور بچے کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اس نے بلتستان کے برفانی پہاڑوں میں قید کے جو دن گزارے تھے، انہی میں یہ بات سیکھ لی تھی کہ دشمن کی قید میں رہ کر کھانا پینا چھوڑنے کا مطلب ہے کہ خود کو دشمن کے مقابلے میں مزید کمزور کرنا، چنانچہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ اسے یاد تھا کہ وہاں اس نے اس سبق پر عمل کیا تھا جب ہی عمران نامی نوجوان کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے پر اس قابل رہی تھی کہ ان برف زاروں میں زندگی کے لیے جدوجہد کر سکے۔ اب پھر اسے ایسا ہی امتحان درپیش تھا اور توانائی کی زیادہ ضرورت اس لیے تھی کہ اس کے ساتھ اس کے بچے کی صحت اور زندگی بھی جڑی تھی۔

بلتستان کے پہاڑی قید خانے کے مقابلے میں یہاں ایک بڑا فرق یہ تھا کہ وہاں جو غذا ملتی تھی، وہ بس ایسی ہوتی تھی کہ انسان اپنا پیٹ بھر لے جبکہ یہاں اسے ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔ ہر روز انواع و اقسام کے کھانوں کے ساتھ ساتھ تازہ پھل اور مشروبات بھی پابندی سے فراہم کیے جاتے تھے۔ وہ یہ سب چیزیں اعتدال سے استعمال کرتی تھی کیونکہ اسے یاد تھا کہ اس کی ڈاکٹر نے اسے اچھی غذا، اعتدال کے ساتھ استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی اور سمجھایا تھا کہ بعض حاملہ خواتین بچے کی اچھی صحت کے نام پر کھانے پینے کو ہی اپنا مقصدِ زندگی بنا لیتی ہیں جو کسی طور مناسب نہیں ہے۔ اس عمل سے بے بی پر اچھا اثر پڑے یا نہ پڑے، ماں خود بے ڈھب اور بے ڈول ہو جاتی ہے۔

ماہ بانو ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنی

غذائی ضرورت پوری کر رہی تھی۔۔۔۔ کیونکہ اس نے ماہ بانو کو سمجھایا تھا کہ اگر وہ چست و توانا رہنا چاہتی ہے تو اپنے کھانے پینے، سونے جاگنے اور کام و آرام کے درمیان توازن قائم رکھنا ہوگا۔ ڈاکٹر نے اسے چند ایسی مخصوص ورزشیں بھی بتائی تھیں جو حاملہ خواتین کی صحت کے لیے مناسب ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق ماں جتنی متحرک اور چست ہو، ڈیلیوری کا عمل اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے۔ اپنے موجودہ ماحول کو قبول کرنے کے بعد اسے ڈاکٹر کی ہدایات یاد آنے لگی تھیں اور وہ ان پر عمل پیرا بھی تھی۔

روزانہ اس کے چیک اَپ کے لیے وہاں آنے والے ڈاکٹر نے بھی اس کے معمولات کو سراہا تھا اور تسلی دی تھی کہ اس کا بے بی بالکل ٹھیک ہے اور ایک صحت مند بچے کی طرح نشوونما پا رہا ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مارک وقت پر اسے دوائیں بھی فراہم کرتا تھا اور اس وقت تک اس کے سر پر کھڑا رہتا تھا جب تک وہ دوا منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس حلق سے نیچے نہیں اتار لیتی تھی۔ دو تین دن تک اس نے فراہم کی جانے والی دوائیں بغیر مزاحمت کے کھائی تھیں لیکن پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ جو اسے اغوا کر کے یہاں لانے کے بعد ہر طرح کا عیش و آرام فراہم کر رہے ہیں، ان کا کوئی مقصد تو ضرور ہوگا۔ اسے خود کو دی جانے والی دوائیں اپنے لیے خطرہ محسوس ہونے لگیں۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ وہ دوائیں کسی پیکنگ میں نہیں ہوتی تھیں جس سے انہیں ان کے نام یا فارمولے پتا چل سکتے۔ چنانچہ اس نے یہ ترکیب استعمال کی کہ جب مارک اسے کوئی گولی کھانے کو دیتا تو وہ اسے زبان کے نیچے چھپا کر اوپر سے پانی کا گلاس پی لیتی اور مارک کے باہر جانے کے بعد اس دوا کو واش روم میں پھینک کر پانی سے بہا دیتی لیکن اس کے پاس ان انجکشنز سے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہیں تھی جو ہر تین دن بعد اسے باقاعدگی سے لگائے جا رہے تھے۔ اس نے ان سے بچنے کے لیے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ مارک جیسے توانا آدمی کے سامنے اس کی کوئی پیش نہیں چلی تھی۔ اس نے سیکنڈوں میں اسے بے بس کر کے ڈاکٹر کے حضور پیش کر دیا تھا کہ وہ اسے انجکشن لگا دے۔ مارک طاقتور اور چست تھا جبکہ وہ اس کے مقابلے میں کمزور ہونے کے علاوہ ایسی حالت میں تھی جو احتیاط کی متقاضی تھی۔ ضرورت سے زیادہ مزاحمت کی کوشش میں اگر کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو ہونے والا نقصان ناقابلِ تلافی بھی ہو سکتا تھا، اس لیے اسے ہار ماننی پڑی۔ ویسے بھی بظاہر کوئی ایسی علامت نظر نہیں آ رہی تھی جس سے یہ لگے کہ اسے یا ہونے والے بچے کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت اچھی ہو گئی ہے اور بچے کی MOVEMENTS سے بھی ظاہر تھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ایسے میں حالات سے سمجھوتا کر لینا ہی مناسب تھا۔

ایک ماں کی حیثیت سے اسے بس اپنے ہونے والے بچے کی زندگی اور صحت کی فکر تھی۔ اس وقت بھی وہ انگور کھاتے ہوئے بس اسی بارے میں سوچ رہی تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ آواز بہت بلند نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بہت دور سے یا کسی بند جگہ سے آ رہی ہو۔ یہاں تک کہ وہ بولنے والے کے الفاظ بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی پھر بھی بری طرح مضطرب ہو گئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ یہ آواز اسلم کی ہے۔ اسلم کے اپنے آس پاس ہونے کا احساس اتنا خوش کن تھا کہ وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکی۔ ہینڈل گھمانے پر جب دروازہ نہ کھلا تو اسے یاد آیا کہ سارے عیش و آرام کے باوجود وہ یہاں ایک قیدی کی حیثیت رکھتی ہے اور اپنی مرضی سے اس کمرے کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتی۔ آواز بدستور آ رہی تھی اور اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ اسلم ہی ہے جو غصے کے عالم میں چیخ چلا رہا ہے اور کسی وجہ سے وہ اس کی آواز واضح طور پر نہیں سن پا رہی ہے۔ شدید جذباتی کیفیت میں اس نے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا جس کا فوری ردِعمل ظاہر ہوا اور دروازہ کھول کر مارک اندر داخل ہوا۔

''اینی پرابلم میڈم؟'' اندر داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے پیچھے دروازے کو دوبارہ بند کر دیا تھا لیکن دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے مختصر وقفے میں ماہ بانو نے کچھ اور وضاحت سے وہ آواز سنی تھی اور اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ اسلم ہی ہے۔

''یہ آواز کس کی ہے؟'' مارک کے لہجے کی درشتگی کو خاطر میں لائے بغیر اس نے پوچھا۔

''تمہیں اس سے کیا غرض؟ یہ ہمارا اپنا معاملہ ہے۔'' مارک نے رکھائی سے جواب دیا۔

''یہ تمہارا ذاتی معاملہ نہیں ہے۔ میرا اس سے تعلق ہے کیونکہ وہ میرا شوہر ہے اور یقیناً مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہے۔ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ یاد رکھو کہ اگر تم نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی تو میں کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر تمہارے ساتھ تعاون کرنا چھوڑ دوں گی۔''

مارک کے جواب پر اسے غصہ آ گیا اور اس نے طیش سے دھمکی دی۔

''اس طرح تم اپنا ہی نقصان کرو گی اور اپنے ساتھ ساتھ اپنے بچے کی زندگی خطرے میں ڈالو گی۔'' مارک پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور الٹا وہ اسے ہی تنبیہ کرنے لگا۔ اس کی دھمکی سن کر ایک پل کے لیے تو ماہ بانو سہم گئی لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا اور دل کڑا کر کے بولی۔

''مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں ہے۔ میں اپنی اور اپنے بچے کی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں سمجھتی۔ ہم ایک فیملی ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر کچھ بھی نہیں۔''

''اوہ۔۔۔۔ یہ تو رومیو جولیٹ والا کیس لگتا ہے۔ وہاں وہ بے چین ہے اور یہاں تمہیں سکون نہیں۔ لیکن بے بی تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ دنیا کی ہر لو اسٹوری میں کوئی نہ کوئی ولن ضرور ہوتا ہے اور تمہاری لو اسٹوری میں وہ ولن میں ہوں اور میری مرضی کے بغیر تم دونوں ایک جگہ موجود ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی جھلک نہیں دیکھ سکتے۔ سو پلیز کام ڈاؤن۔۔۔۔ اور ہاں، اب شور مچانے اور دروازہ پیٹنے کی حماقت مت کرنا کیونکہ مجھ پر ان حرکتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ دیکھو تمہارا رومیو بھی چیخ چلا کر بالآخر تھک گیا ہے اور اب بالکل خاموش ہے۔'' استہزائیہ انداز میں اس سے گفتگو کرتے ہوئے مارک نے اس کی توجہ دلائی تو اسے احساس ہوا کہ واقعی اب اسلم کی آواز نہیں آ رہی ہے۔

''تم لوگوں نے اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا ہے؟'' وہ یکدم ہی متوحش ہو گئی۔

''تم اتنے عرصے سے یہاں ہو، ہم نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو تمہارے نر کو کیسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اسے نقصان پہنچانا ہوتا تو میں اسی وقت اس کا کام تمام کر دیتا جب اس نے یہاں داخل ہونے کی حماقت کی تھی۔ شاید اس احمق کو اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کے داخلی و خارجی راستے کی خودکار کیمروں سے ہر وقت نگرانی کی جاتی ہے اور ہماری نظر میں آئے بغیر چڑیا کا بچہ تک یہاں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس نے جیسے ہی یہاں آنے کا راستہ کھولنے کی کوشش کی تھی، نظر میں آ گیا تھا۔ میں نے پہچان لیا کہ وہ تمہارا شوہر ہے اس لیے ماسٹر کے سامنے پیش کرنے کے لیے سنبھال کر رکھ دیا۔ اب تم دعا کرو کہ ماسٹر اسے اپنے لیے کارآمد سمجھے تاکہ اس کی زندگی کے دنوں میں اضافہ ہو جائے ورنہ ہمارے پاس بیکار چیزوں کو رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

وہ اس انداز میں بات کر رہا تھا جیسے انسانوں کے بجائے زیرِ تجربہ جانوروں کا ذکر کر رہا ہو۔ اس کے جواب نے جہاں ماہ بانو کو یہ تسلی دی کہ فوری طور پر اسلم کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے، وہیں وہ مزید الجھن میں بھی گرفتار ہو گئی کہ جانے اسے یہاں لانے کا کیا مقصد ہے اور اب وہ لوگ یہاں پہنچ جانے والے اسلم کے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔

''اوکے، میں چلتا ہوں۔'' اس کی دگرگوں ہوتی حالت پر ایک طنزیہ سی نظر ڈال کر مارک نے دروازے کا رخ کیا۔ ماہ بانو میں اتنی تاب نہیں تھی کہ اسے روک پاتی۔ وہ وہیں فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بُری طرح رو پڑی۔

''کیوں اتنی شدت سے چاہتے ہو مجھے کہ میرے سامنے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتے؟ کیا ضروری تھا کہ تم میری تلاش میں یہاں تک پہنچتے اور اپنی جان مصیبت میں پھنساتے۔ تمہاری اتنی محبت کا قرض میں کیسے اتاروں گی؟ میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ جواب میں تم سے اتنی ہی محبت کر سکوں جتنی محبت تم مجھ سے کرتے ہو۔'' روتے ہوئے وہ غائبانہ اسلم سے مخاطب تھی جس کی محبت نے واقعی اسے بہت قرض دار کر دیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ ایسی بے لوث محبت کا جواب کیونکر دے سکے گی۔ اس کے پاس اسے دینے کے لیے بس دعائیں ہی تھیں جن سے وہ اسے دل کی گہرائیوں کے ساتھ نوازتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کا دل پوری شدت سے اس کی سلامتی کے لیے دعاگو تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس ملعون ڈاکٹر طارق کے لیے بددعائیں بھی نکل رہی تھیں جس نے دوسری بار اسے دھوکا دیا تھا اور اچھی بھلی پُرسکون زندگی سے الگ کر کے اس جنجال میں پھنسا دیا تھا۔

☆☆☆

''نام کیا ہیں تم لوگوں کے؟'' جاوید علی کے مخاطب وہ عورت اور دونوں بچے تھے جو اس کے عین سامنے بیٹھے تھے اور ان کے چہروں پر خوف رقم تھا۔ خوف کی ایک وجہ تو وہ گن تھی جو ایک آدمی ان کے دائیں طرف لیے کھڑا تھا اور اس کا رخ ان تینوں کی طرف تھا۔ دوسری وجہ وہ طریقۂ کار تھا جس کے تحت انہیں یہاں لایا گیا تھا۔ سی ایف پی والوں نے انہیں عین اس وقت اسلحے کے زور پر قابو کر کے یہاں منتقل کر دیا تھا جب عورت بچوں کو اسکول چھوڑنے کے لیے جا رہی تھی۔ یہ عورت گوندا نامی اس آدمی کی بیوی تھی جسے را کے خلاف آپریشن میں وہ لوگ زخمی حالت میں گرفتار کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ گوندا کو سر پر چوٹ آئی تھی جس کی

وجہ سے وہ کئی گھنٹوں تک اسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹرز نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا تھا اور سر کے زخم کے علاوہ اسے مکمل فٹ قرار دیا تھا لیکن گووندا کا رویہ عجیب وغریب تھا۔ وہ کسی بھی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر رہا تھا اور بظاہر یوں لگ رہا تھا کہ سر کی چوٹ نے اس کے دماغ کو متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹرز اس حوالے سے اس کا بھرپور ٹریٹمنٹ کر رہے تھے لیکن وہ کسی طور تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کے رویے کی وجہ سے ایک سینئر ڈاکٹر نے یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ شاید وہ جان بوجھ کر اس طرح کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے اور اس کا دماغ متاثر نہیں ہوا ہے۔ گووندا کے اس ڈھول کا پول کھولنے کی ترکیب سلمان کو سوجھی تھی۔ اس کیس کی مختلف جزئیات پر کام کرتے ہوئے وہ یہ جاننے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ گووندا کا گھر کہاں ہے؟ گھر معلوم ہونے کے بعد دیگر معلومات حاصل کرنا کیا مشکل تھا۔ نتیجتاً اب اس کی خوب صورت بیوی اور دونوں بیٹے یہاں موجود تھے۔ بیٹوں کی عمریں بالترتیب نو اور بارہ سال تھیں اور دونوں ہی ماں کی طرح خوب صورت تھے۔

"دیکھو، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم زیادہ روپے پیسے والے لوگ نہیں ہیں۔ میرے پتی کا چھوٹا سا بزنس ہے جس سے ہمیں بس اتنا پرافٹ ہوتا ہے کہ ہم اپنے لائف اسٹائل کو مین ٹین رکھتے ہوئے بچوں کو اچھے اسکول میں پڑھا رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی خاص بینک بیلنس نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس بہت قیمتی زیور اور گہنے ہیں۔ اس لیے تم میرے پتی سے ہماری رہائی کے بدلے کوئی بڑا تاوان حاصل نہیں کر سکتے۔" عورت نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود ہی یہ اندازہ لگا کر کہ وہ اغوا برائے تاوان کی واردات کا شکار ہوئی ہے، بولنا شروع کر دیا۔

"میں نے تم لوگوں کے نام پوچھے ہیں۔" جواب میں علی نے غرا کر اپنا سوال دہرایا۔

"میرا نام راگنی ہے اور یہ میرے بیٹے امیش اور مہیش ہیں۔" اس پر جاوید علی کا لہجہ اتنا اثر انداز ہوا کہ اس نے ایک ہی سانس میں جواب دے ڈالا۔

"تمہارا شوہر کہاں ہے؟" یہ بڑے تعجب کی بات تھی کہ گووندا اس کی حراست میں تھا لیکن اس کی بیوی پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ روزانہ اپنے معمول کے مطابق بن ٹھن کر بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لینے جاتی رہی تھی۔ اس کے کسی انداز سے یہ ظاہر نہیں تھا کہ وہ اپنے شوہر کے گھر نہ آنے پر تشویش کا شکار ہو۔ اسی لیے جاوید علی نے اس سے یہ سوال کیا تھا۔

"وہ بزنس کے سلسلے میں سیالکوٹ گئے ہوئے ہیں۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اس کی واپسی کب ہوگی؟"

"دو تین دن تک واپس آجائیں گے۔" راگنی کے جواب سے واضح ہو گیا کہ وہ کیوں تشویش یا پریشانی میں مبتلا نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے حساب سے تو اس کا شوہر کاروباری دورے پر تھا۔

"گووندا کب سے را کے لیے کام کر رہا ہے؟" بالکل اچانک یہ سوال کرتے ہوئے جاوید علی نے اپنی نگاہیں پوری طرح راگنی کے چہرے اور آنکھوں پر مرکوز رکھیں۔ سوال سن کر وہ سخت حیرت میں نظر آئی۔

"میں آپ کا سوال سمجھی نہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرے پتی بزنس مین ہیں اور آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ کب سے را کے لیے کام کر رہا ہے۔" اس کے تاثرات بالکل حقیقی تھے۔

"حیرت ہے کہ بیوی ہو کر تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے حالانکہ ایک سیکرٹ ایجنٹ کے معمولات ایسے ہوتے ہیں کہ اس کی بیوی کو ضرور چونکنا چاہیے۔" اس کی لاعلمی پر جاوید علی نے طنز آمیز حیرت کا اظہار کیا۔

"بھگوان کی سوگند مجھے بالکل نہیں پتا۔ ان کی روٹین پر میں کئی بار چونکی ضرور لیکن پھر اس وجہ سے چپ ہو گئی کہ میں نے ان کی کئی ایسی ٹیلی فون کالز پکڑیں جو عورتوں کی تھیں اور مجھے لگا کہ ان کا ان عورتوں سے سمبندھ ہے۔ گووندا پر شک ہونے کے باوجود میں نے کبھی ان پر اپنا شک ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ابھی جو ناتا چوری کا ہے میرے زبان کھولنے کے بعد کہیں کھل کر سامنے نہ آجائے۔ میری ماں کہتی تھی کہ جب تک مرد کی چوری پکڑی نہ جائے، اس کی آنکھ میں کچھ لاج رہتی ہے۔ پکڑے جانے پر وہ شرمندہ نہیں ہوتا بلکہ الٹا سینہ زوری پر اتر آتا ہے اس لیے ایک سمجھدار پتنی کو چاہیے کہ اسے چھیڑے بغیر ہوشیاری سے اپنی طرف پلٹانے کی کوشش کرے۔" اس نے ذرا تفصیل سے اپنے لاعلم ہونے کی وضاحت کی۔

"اوکے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پاکستان میں رہ کر بھارت کے لیے کام کرنے والے ایجنٹ کی بیوی ہونے کا کچھ نہ کچھ خمیازہ ضرور

بھگتنا پڑے گا۔" وہ صاف گوئی سے بولتا ہوا انٹرکام کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"بھیج دو۔" دو الفاظ پر مشتمل مختصر حکم دے کر اس نے انٹرکام کا ریسیور واپس رکھا۔

"ہم ہندو ضرور ہیں لیکن ہمارا جنم اسی دھرتی پر ہوا ہے اور ہم یہیں کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ دھرتی ہمیں ماں سمان لگتی ہے، ہم اسے نقصان پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے پتی کے معاملے میں تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"پلیز چپ ہو جاؤ۔" جاوید علی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔ "اس وقت تم کسی ٹی وی چینل کی ٹیم کے سامنے نہیں بیٹھی ہو کہ تمہاری اس طرح کی باتیں سن کر کوئی واہ واہ کرے۔ ہم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے مجھے تمہاری اس قسم کی باتیں سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس کے الفاظ نے راگنی کا راگ بند کر دیا اور وہ چہرے پر پریشانی لیے بے چینی سے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ بچے صورتِ حال کا مکمل ادراک نہیں رکھتے تھے لیکن پھر بھی خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور وہیل چیئر پر بیٹھے گووندا کو اندر لایا گیا۔

"پاپا۔" اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی دونوں بچے بیک وقت چلائے اور اٹھ کر اس کی طرف بھاگے۔ گووندا نے بے ساختہ ہی اپنے بازو وا کر دیے۔ دونوں بچے اس کے کھلے ہوئے بازوؤں میں سما گئے۔ راگنی بھی مضطرب سی ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی لیکن قدم آگے نہ بڑھائے۔ گووندا کی اس پر نظر پڑی تو گویا حقیقت کا ادراک ہوا اور بچوں پر سے بازوؤں کی گرفت خودبخود ہی ڈھیلی پڑ گئی۔

"پاپا! آپ کو یہ چوٹ کیسے لگی؟ کیا آپ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا؟" بچے باپ کو سامنے پا کر سب بھول گئے تھے اور پوری طرح اس میں محو اس سے پوچھ رہے تھے لیکن گووندا کی زبان کو تو تالا لگ چکا تھا اور وہ خود کو ان سے بے نیاز ظاہر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا دماغ صحیح کام نہیں کر رہا ہے۔ لیکن اس کے پہلے ردِعمل کے بعد اس اداکاری کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی، چنانچہ جاوید علی نے اشارہ کیا اور کمرے میں پہلے سے موجود مسلح شخص نے دونوں بچوں کو گووندا سے دور لے جانے کی کوشش کی۔ اس دوران وہیل چیئر کو دھکا دے کر لانے والا پوری طرح چوکس کھڑا رہا۔ چوکس تو جاوید علی بھی تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں کسی قسم کا اسلحہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"پاپا..... پاپا! ہمیں پاپا کے پاس جانے د...
باپ سے دور لے جائے جانے پر بچے احتجاج کرنے لگے
البتہ گووندا نے ہاتھ پیروں سے تو کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ...
لیکن اس کی آنکھوں سے چھلکتی کربناک کیفیت سے ظاہر ...
گیا کہ اسے تکلیف ہو رہی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم اپنا ڈراما بند کر دو کیونکہ
کچھ چند لمحوں میں ہم نے دیکھ لیا ہے، اس کے بعد اس بات
کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ تمہارا د...
صحیح طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ ہاں، اگر تم یہ ڈراما جاری
رکھنے پر مصر ہو تو ایسا کر کے بھی دیکھ لو۔ تمہاری اس ہٹ
دھرمی کا خمیازہ تمہارے بچوں اور بیوی کو بھگتنا پڑے گا۔ ...
نہیں خیال کہ جب ہم ان تینوں کو چھت سے الٹا لٹکا کر ...
کے نازک جسموں پر بید برسائیں گے تو تم یہ منظر آسانی ...
دیکھ سکو گے۔" جاوید علی نے اس کے عین سامنے کھڑے ...
کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اتنی سفاکی سے ...
جملے ادا کیے کہ گووندا کو جھرجھری سی آگئی اور بالآخر اسے ا...
زبان پر پڑے خاموشی کے قفل کو توڑنا ہی پڑا۔

"اپنے مطلب کے لیے معصوم بچوں اور کمزور عورت
کو استعمال کرنا بزدلی ہے۔"

"تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مینارِ پاکستان
سمیت شہر بھر کے مختلف مقامات پر دھماکے کرنے کا
منصوبہ بنایا تھا، وہ تو بہت دلیرانہ تھا نا؟ میں تمہاری آ...
اچھی طرح پہچان سکتا ہوں۔ یہ تم ہی تھے جس نے ...
جوزف کو مشورہ دیا تھا کہ مینارِ پاکستان کے علاوہ ...
مقامات پر بھی بلاسٹ کیے جائیں۔ یہ سفاکانہ مشورہ د...
ہوئے تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ اس کے نتیجے میں کتنے ...
گناہ لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے؟ کتنوں کو ...
کے لیے معذوری کا عذاب سہنا پڑے گا؟ کتنی ماؤں ...
گودیں اجڑ جائیں گی..... کتنے بچے یتیم ہو جائیں گے ...
کتنی کمزور عورتیں بیوگی کا عذاب کاٹیں گی؟" گووندا ...
اعتراض کا اس نے کاٹ دار لہجے میں جو جواب دیا، اسے ...
کر جہاں وہ دم بخود رہ گیا، وہیں راگنی نے بھی منہ پر ...
رکھ کر زوردار سسکی لی۔

"مجھے وشواس نہیں ہوتا کہ تم اتنے بڑے را... کھشس
ہو۔ دھرم اور دھرتی سے پہلے اگر تم انسانیت کے بارے ...
سوچ لیتے تو ہرگز ایسے گھناؤنے کام میں نہیں پڑتے۔ تم ...
تو ایک پل میں میرے من سے اپنے لیے پریم مٹا ...

ہے۔ میں کیسے ایسے شخص کو اپنا پتی دیو مان سکتی ہوں جو
سرے سے انسان ہی نہیں ہے۔"

"تم چپ رہو راگنی۔ تمہاری عقل میں یہ بات نہیں
آسکتی۔" اس نے سر اٹھا کر روروکر بولتی بیوی کو ڈپٹا۔

"میرے کیا کسی بھی انسان کی سمجھ میں یہ بات نہیں
آسکتی۔ جو انسانیت پر یقین رکھتے ہیں، وہ کسی بھی کارن بے
گناہوں کا خون نہیں بہاتے۔" چپ ہونے کے بجائے اس
نے دوبدو جواب دیا جس پر گووندا نے بری سی شکل بناتے
ہوئے منہ پھیر لیا۔ اس کے منہ پھیرتے ہی جاوید علی نے اس
کے پیچھے کھڑے شخص کو اشارہ کیا تو وہ اس کی وہیل چیئر کو
حرکت دیتا ہوا کمرے سے باہر لے جانے لگا۔ بچے جو
خاموش ہو گئے تھے، باپ کو واپس جاتا دیکھ کر ایک بار پھر
شور مچانے لگے۔

"جانے دو بیٹا، یہ تمہارا باپ نہیں ایک درندہ ہے جو
نردوش انسانوں کا خون پی جاتا ہے۔" راگنی نے باپ کی
طرف لپکتے بچوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ واقعی
گووندا کے بارے میں ہونے والے انکشافات کو سن کر
بہت دکھی نظر آرہی تھی۔ جاوید علی نے اس انسانیت پسند
عورت پر ایک افسردہ سی نظر ڈالی اور خود بھی کمرے سے باہر
نکل گیا۔

"مناسب وقت دیکھ کر ان ماں بچوں کو آزاد کر
دینا۔" باہر نکل کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو ہدایت کی اور
خود اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں گووندا کو لے جایا گیا
تھا۔ اس سفاک قاتل کے لیے اس کے دل میں رحم یا
ہمدردی کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے یہ طے تھا کہ
چاہے اسے اس شخص کا ریشہ ریشہ ہی کیوں نہ الگ کرنا
پڑے، وہ اس کی زبان کھلوا کر ہی دم لے گا۔

☆☆☆

"اس کی قید میں گزرنے والے پانچ سال میرے
لیے پانچ صدیوں کے برابر تھے۔ ان پانچ سالوں میں وہ
کون سا ذہنی اور جسمانی تشدد تھا جو ان سفاک قصائیوں نے
مجھ پر نہیں کیا۔ میرے ہاتھ پیر کے ناخنوں کا حال تم لوگ
دیکھ ہی رہے ہو۔ ایک ایک ناخن نکلنے کی اذیت ایسی تھی جو
مجھے آج تک نہیں بھولتی ہے۔ الیکٹرک شاک سے لے کر
برف کی سلوں پر لٹانے تک انہوں نے مجھ پر ہر حربہ آزما
ڈالا لیکن میں نے انہیں اپنی ریسرچ اور اس کے مقاصد کے
متعلق کچھ بتا کر نہیں دیا۔ اپنی پوری زندگی میں، میں نے
تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں کبھی ایسے تشدد سے گزروں گا اور
اسے سہہ بھی لوں گا۔ عام حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا لیکن
میں نے اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اسے ممکن کر
دکھایا۔ بس یوں سمجھ لو کہ مجھ پر ایک ضد سوار ہوگئی تھی کہ
چاہے میری جان چلی جائے، میں ایک ایسے دشمن کے
سامنے اپنی زبان ہرگز نہیں کھولوں گا جو بار بار میرے وطن
پر جنگ مسلط کرتا رہا ہے۔ اتنا زیادہ تشدد سہنے کا نتیجہ یہ ہوا
کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور مجھے علاج کی غرض سے
اسپتال منتقل کر دیا گیا۔

"اسپتال میں گزرنے والے ایک ڈیڑھ سال کے
بارے میں تو مجھے خبر نہیں کہ یہ مرحلہ کیسے گزرا اور میں کس
حال میں رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ میری ذہنی حالت بہتر
ہونے لگی۔ ڈاکٹرز نے میری بحال ہوتی ذہنی حالت کے
تسلسل کو اس بات سے مشروط کر دیا کہ میرے ذہن پر کوئی
دباؤ نہ ڈالا جائے۔ مجبوراً راوالوں کو مجھ سے دور رہنا پڑا اور
اس چیز کا مجھ پر اچھا اثر پڑا۔ آہستہ آہستہ میری ذہنی حالت
اس حد تک سنبھل گئی کہ مجھے خود اپنے حالات کا احساس ہوگیا
اور اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان لوگوں پر اپنی مکمل
صحت یابی کو ظاہر نہیں ہونے دوں گا کیونکہ تشدد سے بچنے کا
میرے پاس یہی واحد طریقہ تھا۔

"انہی دنوں میں میرا خودبخود اللہ سے رابطہ قائم ہوگیا
اور خود کو ہر طرف سے بے یار و مددگار پا کر اس سے لو لگا لی کہ
وہی سب سے بڑا کارساز ہے۔ جب اس کی مدد مل جائے تو
سارے راستے خودبخود ہی کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کے
مالک و مختار ہونے کا سبق شاید ہر مسلمان کو ہی رٹوایا جاتا ہے
لیکن کم ہی ہوتے ہیں جو اس سبق کو اپنی عملی زندگی میں اپلائی
کرتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ عیدین اور جمعے کی
نمازیں پڑھ کر سمجھتا تھا کہ اپنے مسلمان ہونے کا حق ادا کر رہا
ہوں۔ نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کبھی خیال ہی
نہیں آتا تھا کہ دل کی گہرائی سے اس ہستی کا شکر ادا کیا جائے
جس نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے۔ قید اور ٹارچر نے مجھے
احساس دلایا کہ سابقہ زندگی میں، میں کن کن نعمتوں کو شکر
گزاری کے احساس کے بغیر برتتا چلا جاتا تھا۔ بس پھر اس
احساس کے بعد دل کی دنیا بدل گئی۔ باہر کی دنیا میں ہوتا تو
اپنے ہر ہر عمل سے اپنے بدلے ہوئے احساسات کا اظہار
کرتا۔ قید و بند میں بس اتنا کر سکا کہ زیادہ سے زیادہ اللہ کے
سامنے حاضر رہنے لگا۔ اس حاضری نے دل کو سکون اور
تقویت دونوں نعمتیں بخشیں چنانچہ جب راوالوں کو شک ہوا
کہ میں ٹھیک ہوگیا ہوں اور ردِعمل میں انہوں نے دوبارہ

تشدد کا سلسلہ شروع کیا تو میرے لیے تکلیف کو سہنا پہلے کے مقابلے میں بہت آسان ہو گیا۔ میں ہر درد کو بس اس یقین کے ساتھ سہتا رہا کہ وہ جو کارساز ہے، ایک نہ ایک دن مجھے ان حالات سے نجات ضرور دلائے گا اور میں واپس جا کر اس پاک سرزمین کی خدمت کر سکوں گا جو آباد ہی اللہ کے نام پر کی گئی ہے اور جسے اسلام کا قلعہ کہا جاتا ہے۔ میرے اللہ نے مجھے جو علم دیا ہے، اس کی مدد سے میں اس قلعے کی فصیلوں کو بلند اور مضبوط کرنے میں اپنا جو کردار ادا کر سکتا ہوں، وہ ضرور کروں گا..... اور دیکھو، اللہ نے تمہیں میرا مددگار بنا کر بھیج دیا۔ تم اللہ کی طرف سے میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہو اس لیے مجھے کامل یقین ہے کہ چاہے کتنے ہی نامساعد حالات سے گزرنا پڑے، ایک دن انشاء اللہ میں اس دھرتی پر قدم ضرور رکھوں گا جس کا قرض اتارنے کے لیے میں نے اپنی زندگی اور رہائی کی بہت دعائیں مانگی ہیں۔"

کمال ہیروئن کی پڑیا ملنے کے بعد بالکل شانت ہو گیا تھا اور اب انہیں باہر سے اس کی ذرا بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اس لیے کافی دیر دم سادھے بیٹھے رہنے کے بعد انہیں یہ موقع مل گیا تھا کہ آپس میں گفتگو کر سکیں۔ ڈاکٹر فرحان کو اسپتال سے لے کر فرار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ان سے ان کے بارے میں کچھ سن رہے تھے اور سن کر متاثر ہو رہے تھے کہ بعض لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں ٹھوکر گرانے کے لیے نہیں بلکہ سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ قابلیت ان کے پاس پہلے بھی تھی لیکن قید و بند کی صعوبتوں نے انہیں بھٹی میں پک کر کندن بن جانے والے سونے کی طرح مکمل کر دیا تھا۔

"آپ کا یقین غلط نہیں ہے۔ انشاء اللہ جلد آپ ارضِ وطن پر ہوں گے۔" شہریار نے ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دباتے ہوئے یقین دہانی کروائی تو وہ مسکرا دیے۔ اسی وقت انہیں باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ سلو جلدی سے لپک کر دروازے کے قریب گیا اور کی ہول سے باہر جھانکا۔ اسے عائشہ نظر آئی جو لاؤنج کے وسط میں کھڑی پریشان نظروں سے وہاں کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں تک وہیں کھڑے رہنے کے بعد اس نے اپنے بیڈروم کا رخ کر لیا۔

"عائشہ واپس آگئی ہے۔" سلو نے سرگوشی میں ان لوگوں کو اطلاع دی اور خود بدستور کی ہول سے آنکھ لگائے رہا۔ بیڈروم سے نکل کر عائشہ اب اس طرف ہی آرہی تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ عائشہ نے کی ہول میں چابی ڈال کر گھمائی لیکن فوراً ہی دروازہ کھولنے کے بجائے آہستہ سے دستک دی۔

"کم اِن۔" شہریار نے دستک کا جواب دیا۔ عائشہ کے اطوار ایسے تھے کہ وہ اس کے لیے پسندیدگی محسوس کرتا تھا۔ غیر معمولی حالات میں بھی وہ خود پر کنٹرول رکھنے کا جانتی تھی اور ایٹی کیٹس بھی نبھاتی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اچھی تربیت کے ساتھ ساتھ وہ مضبوط قوتِ ارادی کی بھی مالک ہے۔ ورنہ عام لوگ عموماً غیر معمولی حالات میں سب سیکھا پڑھا بھول جاتے ہیں۔

"سوری، مجھے اندازے سے کچھ زیادہ وقت لگ گیا۔ تم لوگ بتاؤ میرے پیچھے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" دروازہ کھول کر اندر آنے کے بعد اس نے فوراً معذرت کی اور ساتھ ہی ان کا احوال بھی دریافت کیا۔

"کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی، بس تمہارے شوہر نے تھوڑی سی گڑبڑ کی تھی جس کے بعد ہم بال بال بچ گئے۔" شہریار نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے تفصیل سے آگاہ کیا کہ کیسے کمال ہیروئن کی طلب میں اس کمرے کا دروازہ توڑنے پر تل گیا تھا اور نتیجے میں پولیس اس طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"باہر چوکیدار نے بھی مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔" سارا قصہ سننے کے بعد عائشہ نے بولنا شروع کیا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "کمال اتنی بری طرح نشے کی لت میں مبتلا ہو چکا ہے کہ اسے یکدم اس نشے سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ آہستہ آہستہ اس کی یہ عادت چھڑواؤں اس لیے اس کی پڑیاں چھپا کر رکھتی ہوں لیکن بعض اوقات زیادہ طلب ہونے پر وہ خود اس زہر کو ڈھونڈ نکالتا ہے۔ میں ابھی اسے دیکھ کر آرہی ہوں، بالکل بے سدھ پڑا ہوا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ اب رات سے پہلے جاگے گا۔ یہ چیز اس کے لیے اچھی نہیں ہے۔ ریکور کرتے کرتے اچانک دوبارہ پیچھے کی طرف چلا جاتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ہلکی سی تھکن تھی۔

"نشے میں مبتلا مریضوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے افراد کو بھرپور علاج اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ تم جاب کرتی ہو۔ پیچھے کمال گھر پر اکیلا رہ جاتا ہے اور کوئی اس کی نگرانی کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم اس کا مکمل علاج ہونے تک اسے کسی ایسے ادارے میں داخل کروا دو جہاں ایسے افراد کے رہنے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس طرح تم بھی بے فکر ہو جاؤ گی اور وہ بھی جلد صحت یاب ہو جائے گا۔" اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے شہریار نے خلوص سے مشورہ دیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ایسے ادارے بہت بھاری فیس لیتے ہیں اور اپنی اس جاب سے مجھے اتنی انکم نہیں ہوتی ہے کہ روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ یہ خرچہ بھی اٹھا سکوں۔ بہرحال چھوڑو..... میرا یہ مسئلہ کبھی نہ کبھی حل ہو ہی جائے گا۔ تم لوگ بتاؤ کہ اپنے لیے کیا سوچا ہے؟" نہایت صاف گوئی سے اپنی مجبوری بیان کرنے کے بعد اس نے فوراً ہی موضوعِ گفتگو بدل دیا۔

"ہم تمہارے فیصلے کے منتظر ہیں۔ تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ہمارا ساتھ دینے یا نہ دینے کے حوالے سے کیا فیصلہ کیا ہے۔ تمہارے فیصلے کی بنیاد پر ہی ہم اپنے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔" شہریار نے اسے جواب دیا تو وہ جو اس دوران ایک کرسی پر ٹک چکی تھی، سوچ میں پڑ گئی پھر سر اٹھا کر بولی۔

"میں دفتر اسی مقصد کے لیے گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور تم لوگوں کے بارے میں ہر طرف وہی خبریں گردش کر رہی ہیں جو تم نے خود بھی ٹیلی ویژن پر دیکھ لی تھیں۔ لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے میں جانتی ہوں کہ اس قسم کی خبریں کن اصولوں کی بنیاد پر بھی بنائی جاتی ہیں کہ جھوٹ اس حد تک بولو کہ سچ محسوس ہونے لگے۔ اس لیے میں نے خبروں پر مکمل یقین کرنے کے بجائے اس کی تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔ میرا ایک فرینڈ ہے بھٹناگر..... وہ بہت اونچے درجے کا جرنلسٹ ہے اور اس کی پہنچ حکومتی ایوانوں سے لے کر آرمی ہیڈ کوارٹر تک ہر جگہ ہے۔ تمہارے معاملے کی سچائی جاننے کے لیے میں نے اس سے رابطہ کیا اور بہانہ بنایا کہ مجھے اس موضوع پر ایک فیچر لکھنے کا حکم ملا ہے، اب تم بتاؤ کہ اس قصے میں کتنے پرسنٹ سچائی ہے تاکہ میں فیصلہ کر سکوں کہ مجھے یہ فیچر لکھنا بھی چاہیے یا نہیں۔ بھٹناگر میرے اس دور کا فرینڈ ہے جب میں اپنے باپ کی محل جیسی کوٹھی میں شہزادیوں کی طرح رہتی تھی اور مجھے جاب کرتے ہوئے بے روزگار ہونے کی بالکل بھی پروا نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے جاب سے نکالے جانے کی پروا کیے بغیر صرف وہ لکھتی تھی جو مجھے سچ لگتا تھا۔ میری اس عادت سے واقف بھٹناگر نے مجھے ایک رازدار دوست کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتا دیا جس سے تمہارے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ پریم ناتھ اور ارجن اگروال نے صرف اس وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو پھنسا کر را

کے چنگل میں دے دیا کہ یہ ایک پاکستانی سائنس داں ہیں اور اپنی بدنیتی کی وجہ سے را والے چاہتے تھے کہ جو کچھ یہ پاکستان کے لیے کر رہے ہیں، وہ بھارت کے لیے کریں یا کم از کم پاکستان کے لیے کچھ کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اب بھی انہیں تم لوگوں سمیت پکڑنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ شہر کے داخلی اور خارجی راستوں پر سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ تم لوگ ان سمیت یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو سکو۔"

"اللہ نے چاہا تو راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ سچائی جاننے کے بعد تو تم ہماری مدد کے لیے تیار ہو نا؟"

"ہاں لیکن یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں تمہاری کیا مدد کر سکوں گی اور کیا اس کے بعد خود میں اور میرا خاندان محفوظ رہے گا؟ مسلمانوں سے ویسے ہی یہاں امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ تو میرا خاندان مالی طور پر بہت مضبوط ہے اس لیے ہمیں زیادہ پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن کمال سے شادی کے بعد میں اپنے خاندان کا حصہ بھی نہیں رہی ہوں اس لیے کمال، مجھے اور میری بچی کو اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ معاملہ اگر صرف میری ذات کا ہوتا تو میں پروا نہیں کرتی لیکن میں کمال اور اپنی معصوم بچی کو کسی تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔" اپنی تمام تر خصوصیات کے باوجود بہرحال وہ ایک عورت تھی اور اپنے قریبی لوگوں کے لیے فکرمند ہونا بھی فطری بات تھی۔

"اس سلسلے میں تم فکر مت کرو۔ ہم تم سے بس اس حد تک مدد لیں گے جو تمہارے لیے پریشانی کا سبب نہ بنے۔ یوں سمجھ لو کہ اس سلسلے میں تم کہیں منظرِ عام پر نہیں آؤ گی۔" اس کے محسوسات کو سمجھتے ہوئے شہریار نے اسے تسلی دی پھر بولا۔ "اور ہاں، تم ہمارے خلاف فیچر ضرور لکھنا کیونکہ تم نہیں بھی لکھو گی تو اور بہت سارے لوگ لکھیں گے البتہ لکھنے کی صورت میں یہ ہوگا کہ تمہاری پوزیشن اور بھی مضبوط ہو جائے گی اور تمہاری حب الوطنی پر بھروسا کیا جانے لگے گا۔"

"مشورے کا شکریہ لیکن شاید میں اس پر عمل نہ کر سکوں کیونکہ تھوڑے سے فائدے کے لیے مجھ سے اپنے قلم کی سچائی کا سودا نہیں ہو سکے گا۔" وہ بولتی ہوئی کھڑی ہوئی تو شہریار مسکرا دیا۔ عائشہ کو اب تک اس نے جتنا جانا تھا، اس کے بعد اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔

"لنچ تو میرے لیٹ ہونے کی وجہ سے گول ہو گیا ہے۔ اب میں ایسا کرتی ہوں کہ جلدی سے ڈنر تیار کر لیتی ہوں

تاکہ تم لوگ جلدی کھاپی سکو۔ ویسے کہو تو ابھی چائے کے ساتھ کچھ ہلکا پھلکا بنا دیتی ہوں، ڈنر تیار ہونے تک سہارا ہو جائے گا۔'' کمرے سے باہر نکلنے سے قبل اس نے مہمان داری میں ناکام رہ جانے والے میزبان کی سی شرمندگی سے کہا۔

''کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہاری تیار کی ہوئی کافی اور اسنیکس سے ہمارا اچھا گزارہ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی ہم کوئی پکنک پر نہیں نکلے ہوئے کہ کھانے پینے کی فکر میں پڑے رہیں۔ تم جا کر آرام سے فریش ہو جاؤ اور چاہو تو تھوڑی دیر ریسٹ کر لو۔ ڈنر کے لیے دال چاول یا کھچڑی جیسی کوئی بھی ہلکی پھلکی آسان سی ڈش تیار کر لینا۔ اس طرح ہمارے معدوں پر زیادہ بوجھ پڑے گا، نہ ہی تمہیں کلکنگ میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا۔'' شہریار نے کھلے دل سے اسے جواب دیا تو وہ ہنس دی پھر بولی۔

''اب میں اتنی بھی بُری میزبان نہیں ہوں کہ مہمان کو دن بھر بھوکا رکھنے کے بعد جو واحد کھانا کھلاؤں وہ بھی دال چاول یا کھچڑی کی شکل میں ہو۔''

''ہم مہمان ہیں بھی کب؟ ہم تو بلائے جان بن کر زبردستی تمہارے گھر میں آگھسے ہیں۔'' شہریار نے بے ساختگی سے اسے جواب دیا تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔

''پلیز مجھے شرمندہ مت کرو۔ پہلے ہی میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہی ہوں کہ انہیں میرے ملک میں اتنے ظلم کا نشانہ بنایا گیا اور میں ایک صحافی ہونے کے باوجود کھل کر اس ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتی کیونکہ ایسا کرتے ہی میری ملک کے ساتھ وفاداری مشکوک ہو جائے گی۔ حالانکہ سچ پوچھو تو مسلمان ہونے کے باوجود میرا اور میرے گھر والوں کا رویّہ بھی ان بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کی طرح نہیں رہا جو ہندوستان میں رہ کر پاکستانی ٹیم کی جیت پر خوش ہوتے ہیں اور جنہیں پاکستان کے ساتھ اپنا ایک روحانی تعلق محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے بچپن سے یہی سبق سیکھا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سے مذاہب اور رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں۔ ہم بے شک مسلمان ہیں لیکن ہماری وفاداریاں اسی سرزمین سے ہونی چاہئیں جہاں ہم رہتے بستے ہیں کیونکہ دنیا میں یہی ملک ہماری شناخت ہے۔'' اس کے لب و لہجے میں گھلی اداسی بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر فرحان والے واقعے کی سچائی نے اس کے احساسات پر گہری ضرب لگائی ہے۔

''اوکے میڈم! تمہارا جو دل چاہے بناؤ، پکاؤ اور کھلاؤ۔ ڈاکٹر صاحب کے طفیل ہم بھی عیش کر لیں گے۔'' ذرا شوخ لہجے میں بولتے ہوئے شہریار نے دانستہ ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو عائشہ اور اچھے لوگ یونہی حساس ہوا کرتے ہیں لیکن یقین کرو کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے لیے میں نے کسی مسلمان تو کیا، بھارت کے ہندو شہری کو بھی قصوروار نہیں سمجھا...... کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ہم جیسے تیسری دنیا کے شہری حکومتی پالیسیوں پر اپنا کوئی اثر رکھتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے لیے فیصلے کہیں اور کوئی دوسرا کرتا ہے۔ ہمارے ادارے اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی من مانیاں کرتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ایک عام شہری کا کوئی کردار رہتا ہی کہاں ہے جو اسے مورد الزام ٹھہرایا جا سکے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بالکل ریلیکس ہو جاؤ اور کم از کم میرے سامنے کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہ کرو بلکہ اگر میرے ساتھی بُرا نہ مانیں تو میں یہاں تک کہوں گا کہ اگر تم تلافی کے طور پر ہماری مدد کرنے کے لیے تیار ہوئی ہو تو نہ کرو مدد۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں یہ مدد تمہارے جذبۂ حب الوطنی کے لیے بوجھ بن جائے۔ ہمارا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اللہ ہمیں کسی اور طریقے سے مدد پہنچا دے گا کیونکہ اس کے کارساز ہونے پر ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔'' ڈاکٹر فرحان نے بہت اچانک اس گفتگو میں دخل دیا تھا اور بولنے پر آئے تھے تو بولتے چلے گئے تھے۔

عائشہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ان کی اس گفتگو سے متاثر ہو رہی ہے چنانچہ ان کے خاموش ہونے کے بعد بولی تو اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

''آپ کے اللہ پر اعتماد نے مجھے بہت متاثر کیا ہے ڈاکٹر صاحب..... اور اب میں اپنے اس ارادے میں اور بھی پختہ ہو گئی ہوں کہ مجھے اپنی استطاعت کے مطابق آپ لوگوں کی مدد ضرور کرنی ہے کیونکہ یہ طے ہے کہ جو آپ کی مدد کرے گا، وہ اللہ کا منتخب کردہ بندہ ہو گا۔ تو پھر میں اللہ کا انتخاب ہونے کی سعادت کیوں حاصل نہ کروں؟ ویسے بھی میں نے کسی تلافی کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے ناتے آپ لوگوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا اور الحمدللہ اس فیصلے پر قائم ہوں۔'' وہ اپنی آنکھوں سے بے اختیار چھلک پڑنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے پلٹ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

''چائے والی آفر کو بھول مت جانا میڈم! اتنی اموشنل سچویشن کے بعد تو مجھے پہلے سے زیادہ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' سلو کے ہانک لگانے پر اس کے

بڑھتے ہوئے قدم رکے۔

''ڈونٹ وری، ابھی تھوڑی دیر میں بہت زبردست چائے مل جاتی ہے۔'' مڑے بغیر جواب دے کر وہ باہر نکل گئی تو شہریار نے بیڈ کے نیچے رکھا اپنا بیگ کھینچ کر باہر نکالا اور اس میں سے بڑے نوٹوں پر مشتمل ایک گڈی نکال کر دیوار گیر مقفل الماری کی طرف بڑھ گیا۔ الماری کا قفل کھولنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود نوٹوں کی گڈی الماری میں منتقل ہو کر الماری دوبارہ مقفل بھی ہو گئی اور وہ یوں اطمینان سے اپنی جگہ آبیٹھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ دینے کو وہ یہ رقم کمال کے علاج کے لیے عائشہ کے ہاتھ میں بھی دے سکتا تھا لیکن شاید اس خوددار لڑکی کے لیے یہ قابل قبول نہیں ہوتا اور وہ ہر صورت عائشہ کو یہ رقم دینا چاہتا تھا تاکہ اس عجیب وغریب، انوکھی سوچ رکھنے والی لڑکی کی زندگی میں تھوڑا سا اطمینان و سکون آجائے، ورنہ کمال سے کی جانے والی ہمدردی کی سزا وہ ساری زندگی بھگتتی رہتی اور اسے لگتا تھا کہ کم از کم اس لڑکی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

☆☆☆

''ماہ بانو کا کچھ پتا نہیں چلا..... پتا نہیں بے چاری کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟'' امید کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اس نے ٹی وی کی طرف متوجہ آفتاب سے کہا۔

''تشویش تو مجھے بھی ہے۔ اس کے پیچھے اسلم بھی غائب ہو گیا ہے اور اب تک کہیں سے رابطہ کر کے کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کروا دی جائے لیکن مصطفیٰ خان نے روک دیا۔'' آفتاب ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی بات کا جواب دینے لگا اور پھر یکدم ہی امید کی طرف متوجہ ہو گیا جو مسلسل اس کی جانب لپک رہی تھی۔ اس کی اس حرکت کی وجہ سے کشور کے لیے اس کی فراک کے بٹن بند کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''با..... با!'' باپ کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ زبان سے بھی اسے پکارنے لگی۔ ساتھ ہی اس کی طرف لپکنے کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا۔

''آرام سے بیٹھو امید..... گر جاؤ گی۔ بابا کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں۔ چلی جانا ان کے پاس، پہلے کپڑے چینج کر لو۔'' کشور نے اسے پیار بھری ڈانٹ پلائی جس پر وہ منہ بسورنے لگی۔

''آجاؤ میری جان۔'' بچی کو رونے کے لیے تیار دیکھ کر آفتاب فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچا اور دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ فوراً لپک کر اس کے بازوؤں میں سما گئی۔

''بہت چلبلی ہو رہی ہے۔ آپ کی تو دیوانی ہے۔ فارغ دیکھتے ہی چاہتی ہے کہ آپ فوراً اسے گود میں لے لیں۔'' کشور نے ممتا بھری نظروں سے آفتاب کی گود میں جا کر کلکاریاں مارتی بچی کو دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''بچی آپ سے زیادہ سمجھ دار جو ہے۔ محبت کو پہچانتی ہے اور جانتی ہے کہ باپ اسے اپنی بانہوں میں لے کر خوش ہوتا ہے۔ ایک آپ ہیں کہ دور دور رہ کر تڑپاتی رہتی ہیں اور خیال ہی نہیں آتا کہ بے چارہ شوہر کب سے توجہ کے لیے ترس رہا ہے۔'' بچی کے رخسار کو چومتے ہوئے اس نے کشور کو چھیڑا۔

''زیادہ باتیں مت بنائیں جناب! خود تو دن رات لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں اور الزام میرے سر رکھا جا رہا ہے۔'' کشور نے فوراً ہی اسے دوبدو جواب دیا لیکن آنکھوں کی چمک اور رخساروں کی لالی بتا رہی تھی کہ روزِ اوّل کی طرح آفتاب کی توجہ نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے اور وہ اس کے جذبوں کو پہچان کر شرما رہی ہے۔

''کتابیں پڑھنا تو مجبوری ہے۔ جب آپ کا کتابی چہرہ پڑھنے کو نہیں ملتا تو ہم کاغذی کتابوں سے ہی دل بہلا لیتے ہیں۔'' ٹھیٹ عاشقوں کے لہجے میں جواب دے کر اس نے زور سے بچی کو اچھال کر واپس اپنے ہاتھوں میں سنبھالا۔ بچی اس حرکت پر خوش ہو کر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''آپ بھی بات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔ میں اتنے سیریس ایشو پر بات کر رہی تھی اور درمیان میں آپ کوئی اور قصہ چھیڑ بیٹھے۔'' کشور نے خفگی کا اظہار کیا تو وہ سنجیدہ ہو گیا کیونکہ ماہ بانو کا مسئلہ واقعی ایسا تھا جس پر ان سب کو ہی تشویش تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس معاملے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اصولی طور پر تو گمشدہ افراد کی بازیابی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پولیس میں رپورٹ درج کروائی جائے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امریکا جیسے ملک میں پولیس کا رویّہ اتنا غیر ذمے دارانہ ہے کہ وہ رپورٹ لکھوانے کے باوجود اس معاملے کو سنجیدگی سے لینے کو تیار ہی نہیں ہیں..... بلکہ واضح طور پر ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ اوپر سے مصطفیٰ خان نے اسلم کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے سے بھی منع کر دیا ہے۔ اب ہم ان دونوں کو ڈھونڈیں تو کیسے؟''

''وہ تو خیر انہوں نے صحیح کیا ہے۔ پولیس نے ماہ بانو کے معاملے میں کون سا کچھ کیا ہے جو اس سے اسلم کے سلسلے میں مدد لی جائے۔'' کشور نے منہ بناتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''وہ بات اپنی جگہ ہے لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مصطفیٰ خان جان بوجھ کر پولیس کو اس معاملے میں ملوث کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ اس کا انداز کچھ مشکوک سا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' کشور اس کی بات سن کر حیران ہوئی۔

''میں اپنے اس شک کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ بس میری چھٹی حس ہے جو بتا رہی ہے کہ مصطفیٰ خان کا کردار پراسرار ہے اور وہ جو نظر آتا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔'' آفتاب کا انداز الجھا ہوا تھا۔

''کیا آپ کو لگتا ہے کہ ماہ بانو اور اسلم کے غائب ہونے میں مصطفیٰ بھائی کا کوئی کردار ہے؟'' کشور نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ارے نہیں، ایسا کوئی شک میرے ذہن میں نہیں ہے۔ وہ اور اس کی بیگم بالکل ویسے ہی ان دونوں کے لیے پریشان ہیں جیسے ہم..... بس مجھے یہ لگتا ہے کہ مصطفیٰ خان کو ان دونوں کی گمشدگی کے پیچھے چھپے بھید کی خبر ہے اور اسی وجہ سے وہ اسلم کی گمشدگی کو دانستہ چھپا رہا ہے۔ شاید اسے یہ ڈر ہے کہ پولیس اگر اسلم تک پہنچ گئی تو ماہ بانو کی بازیابی مشکل ہو جائے گی۔ وہ پولیس تک یہ خبر جانے سے روک کر اسلم کو آزادی سے کام کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہے۔'' اس نے اس بار کسی قدر وضاحت سے مصطفیٰ خان کے سلسلے میں اپنے شک کی وضاحت کی۔

''یہ تو واقعی ذرا عجیب سی بات ہے۔ بہر حال، اچھی بات یہ ہے کہ مصطفیٰ بھائی کا کردار نیگیٹو نہیں ہے ورنہ آپ کی پہلی بات سن کر تو میں ڈر ہی گئی تھی۔'' اس کی وضاحت پر کشور نے سکون کا سانس لیا اور آفتاب کی گود میں موجود امید کے گال پر چٹکی لیتے ہوئے بولی۔ ''سونے کی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بابا کے ساتھ کھیلو میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔'' امید جو واقعی ان کے درمیان جاری گفتگو کے دوران اونگھنے لگی تھی، ماں کی بات پر یوں منہ بسورا جیسے خود کو ڈسٹرب کیا جانا پسند نہ آیا ہو۔

اس کی اس ادا پر مسکراتے ہوئے آفتاب اسے بہلانے لگا تو کشور مطمئن سی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی واپسی تک آفتاب بچی کو بہلا کر اس موڈ میں لے آئے گا کہ وہ سونا بھول کر کھیل میں لگ جائے گی اور وہ اطمینان سے اسے اس کا کھانا کھلا سکے گی۔ لیکن ابھی وہ کچن سے دو قدم کے فاصلے پر ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون جس جگہ رکھا تھا، وہاں سے وہ زیادہ قریب تھی اس لیے کال ریسیو کر لی۔

''کیسی ہو کشور؟ میں تمہارا لالہ مراد شاہ بات کر رہا ہوں۔'' اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے کہا گیا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔ حالات ہی اتنے عجیب تھے کہ کسی اپنے سے بات کرنے کی خوشی پر اندیشے غالب آجاتے تھے۔

''السلام علیکم لالہ..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں کہ بھابی اور بچی کیسے ہیں؟'' خود کو سنبھال کر اس نے اخلاق سے بھائی کی بات کا جواب دیا۔

''وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ شاہدہ تمہیں یاد کر رہی تھی۔ کبھی وقت ملے تو اس سے بات کر لینا۔ برسوں سے یہاں رہنے کے باوجود ہم مکمل طور پر یہاں ایڈجسٹ نہیں ہیں کیونکہ یہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنوں کی کمی ہے۔ تمہیں نیویارک میں دیکھ کر ہم سب ہی بہت خوش ہوئے تھے اور لگا تھا کہ ایک خونی رشتے کی موجودگی بہت سی محرومیوں کو دور کر دے گی لیکن تم تو ہم سے دور ہی بھاگ گئیں۔'' بولتے بولتے مراد شاہ کا لہجہ تھوڑا اداس ہو گیا۔ کشور نے پوری شدت سے اس اداسی کو محسوس کیا کیونکہ وہ خود بھی تو زندگی میں بہت کچھ مل جانے کے باوجود ان رشتوں کے لیے تڑپتی تھی جنہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

''آپ میرے حالات سے واقف ہیں۔ میں اس ڈر سے اپنوں سے دور رہنے پر مجبور ہوں کہ اپنے بڑی محنت اور قربانی سے بنائے گئے چھوٹے سے آشیانے کو بکھرنے سے بچانا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کی تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں لوٹ کر گھر جا سکتے ہیں۔ آپ کا تو وہاں کھلے دل سے استقبال ہوگا۔ میری طرح آپ کوئی حویلی والوں کے مجرم تھوڑی ہیں۔ آپ تو وہاں کے والی وارث ہیں جس کا سب کو برسوں سے انتظار ہے۔'' دکھ اور بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں نمی امنڈ آئی۔

''مجبوری کی نوعیت مختلف ہے ورنہ مجبور میں بھی ہوں۔ میرا بھی بہت دل چاہتا ہے کہ اپنوں کے درمیان رہوں اور جو علم حاصل کیا ہے اس سے اپنے وطن کو فائدہ پہنچاؤں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ابا جی کے ساتھ میری نہیں نبھے گی کیونکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں، وہ میرے لیے ناقابل قبول ہے اور جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں، اس کی وہ مجھے اجازت نہیں دیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے دور رہیں اور کسی قسم کے کلیش کی نوبت نہ آئے۔'' مراد شاہ کا جواب حقائق پر مبنی تھا چنانچہ کشور کچھ نہ کہہ سکی۔ خود اسی نے گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔

''میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ میری کمپنی ایک کام کے سلسلے میں مجھے آئرلینڈ بھیج رہی ہے۔ میں چند دن وہاں رہوں گا۔ رہائش کا انتظام بھی کمپنی کی طرف سے ہی ہوگا۔ بس میری اتنی خواہش ہے کہ وہاں آؤں تو تم سے ملاقات کر سکوں۔ کیا تم مجھے اپنے گھر ملاقات کے لیے آنے کی اجازت دو گی؟''

مراد شاہ کے بڑی امید سے پوچھے گئے سوال پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ اس کا بڑا بھائی تھا..... چودھری افتخار عالم شاہ کی وسیع جائداد کا اکلوتا وارث جسے خاندانی اصولوں کے مطابق خاندان کے ہر فرد پر اختیار حاصل تھا کیونکہ جب وہ گدی نشین ہوتا تو سارے سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا اور خاندان کے ہر فرد کو اس کے اپنے سے متعلق کیے گئے فیصلوں کو قبول کرنا پڑتا لیکن اس وقت اس کا بھائی اس سے اتنی سی بات کی اجازت کا طلب گار تھا کہ وہ اس سے ملنے اس کے گھر آجائے۔

''میں آپ کا انتظار کروں گی لالہ۔'' بڑی مشکل سے یہ جواب دے کر اس نے ریسیور کریڈل پر واپس رکھ دیا اور کچن میں گھس گئی اور وہاں وہ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خونی رشتوں سے دوری کا غم ہی ایسا تھا کہ زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی دل درد کے احساس سے نجات نہیں پاتا تھا۔

''کشور! جلدی آجاؤ بھئی۔ امید کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ بھوک سے رونے لگی ہے۔'' آفتاب جو اسے فون پر مصروف دیکھ کر امید سمیت بیڈ روم میں چلا گیا تھا، پکارنے لگا۔ اس کی پکار پر کشور نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور بچی کے لیے ایک باؤل میں پہلے سے تیار کر کے رکھا گیا کسٹرڈ نکالنے لگی۔ کسٹرڈ کا باؤل ہاتھ میں لے کر باہر نکلنے سے قبل اس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا کوئی قطرہ نظر نہ آنے پائے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے آنسو آفتاب کے لیے تکلیف کا سبب بنتے ہیں اور جنہیں چاہا جائے، انہیں تکلیف سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنی پڑتی ہے۔

☆☆☆

''زندگی کتنی اچھی لگنے لگی ہے نا۔'' کھلے صحن میں پڑی چارپائی پر شاہد کے برابر بیٹھ کر اس کے شانے پر سر ٹکاتے ہوئے چاندنی نے مسکراتے لبوں سے اپنے جذبات کی تائید چاہی تو شاہد نے اس کے وجود پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اس نے کھلتے ہوئے سبز رنگ کا سوتی جوڑا پہن رکھا تھا اور چہرہ میک اَپ سے بالکل عاری تھا۔ زیور کے نام پر بھی بس اس کی ناک میں ایک کوکا اور کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کے باوجود وہ اسے اس چاندنی سے کئی گنا زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی جسے وہ کوٹھے پر نک سک سے تیار بیش قیمت لباس اور زیورات میں موسیقی کی تال پر پیروں میں گھنگرو باندھے تماش بینوں کے سامنے رقص کرتا دیکھتا تھا اور تماش بین اس کی ایک ایک ادا پر دل کھول کر داد دیتے ہوئے اس کے قدموں میں ڈھیروں نوٹ لٹا دیتے تھے اور بائی اس کی بلائیں لیتے ہوئے ان نوٹوں کو سمیٹتی رہتی تھی۔ شاہد نے کوٹھے پر برسوں گزارے تھے اور اپنی سگی بہن کو بھی ایسے ہی لوگوں کے سامنے ناچتے دیکھا تھا اس لیے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسے اس سارے عمل سے کوئی ناگواری محسوس نہ ہوتی لیکن شاید رگوں میں دوڑتے شریف ماں باپ کا خون تھا جو شعور کی عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی کوٹھے کی زندگی کا حصہ بن جانے کے باوجود وہ اس سب کو ناپسند کرتا تھا۔ ہاں، اس ناپسندیدگی کے اظہار کی جرأت نہیں تھی کہ بائی جی کے پالے ہوئے خطرناک غنڈے ذرا سے اشارے پر آدمی کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دینے میں ماہر تھے۔

کم سنی سے دل میں بیٹھا ان غنڈوں کا خوف اسے دل پر جبر کر کے اس ماحول میں رہنے پر مجبور کیے ہوئے تھا۔ وہ تو حالات کچھ ایسے بن گئے کہ اس کے اندر اس جہنم سے نکل بھاگنے کی ہمت پیدا ہو گئی۔ بہن کے چودھری کی حویلی میں قتل ہونے کا صدمہ ویسے ہی اس کے دل سے لگا ہوا تھا چنانچہ جب چاندنی نے بتایا کہ کوئی ہے جو اس جگہ سے نکلنے میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہے اور اس کی بہن کے قاتل کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم رکھتا ہے تو اس نے ہر ڈر خوف کو جھٹک ڈالا اور چاندنی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ انہیں وہاں سے نکال کر لانے والا جگو خود تو منظر سے ہٹ گیا لیکن وہ دونوں عمیر آفندی جیسے افسر کی سرپرستی میں آ گئے لیکن یہ سرپرستی خفیہ تھی۔ ان دونوں کی کورٹ میرج، رہائش اور چودھری کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے جیسے تمام کاموں کا سارا بندوبست کروانے کے باوجود عمیر خود کہیں بھی منظر پر نہیں آیا تھا بلکہ بظاہر ایک این جی او نے یہ ساری ذمے داری سنبھال لی تھی اور اب وہ دونوں اس بات کے منتظر تھے کہ چودھری بھارت سے واپس آئے تو اس کے خلاف کوئی کارروائی ہو سکے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' اس کے مسلسل کئی منٹ تک اپنی طرف تکتے رہنے پر چاندنی نے شرماتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ تُو نے یہ اتنا سارا حسن کہاں چھپا رکھا تھا۔ کوٹھے پر تو تُو اتنی خوب صورت نہیں لگتی تھی۔'' اپنے اُلجھے ہوئے خیالات سے نکل کر اس نے بات بنائی۔

''وہاں میں گندگی میں لتھڑی ہوئی تھی نا، اس لیے تجھے خوب صورت نہیں لگتی تھی۔ ہاں وہ جو غلیظ ذہن اور نظریں رکھتے تھے انہیں میرا وہ روپ بہت اچھا لگتا تھا لیکن تُو تو مجھ سے سچی محبت کرتا ہے نا..... اس لیے ظاہری چمک دمک سے زیادہ تجھے میرا یہ اصل روپ اچھا لگتا ہے۔'' ذرا اداس لہجے میں چاندنی نے بڑے فلسفیانہ انداز میں توجیہہ پیش کی تو وہ مسکرا دیا۔

''تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا شاہد..... کچھ بول کیا تجھے میری طرح یہ زندگی اچھی نہیں لگ رہی کیا؟'' جانے ذہن میں کیا وسوسہ آیا کہ اس نے ذرا تشویش سے اپنے سوال کو دہرایا۔

''جھلی نہ ہو تو..... بھلا مجھے یہ زندگی کیسے اچھی نہیں لگے گی جس میں ہم دونوں دن رات ایک دوجے کے سنگ ہیں اور بیچ میں کوئی ظالم سماج بھی نہیں۔'' اس نے رخسار پر جھولتی چاندنی کے بالوں کی ایک موٹی سی لٹ کو پکڑ کر شرارت سے کھینچا تو اس کے لبوں سے ہلکی سی سسکی نکل گئی اور وہ خفگی بھری نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی لیکن شاہد نے اس کے گرد اپنے بازو کا حلقہ بناتے ہوئے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

''چھوڑو، مجھے روٹی بنانی ہے۔'' وہ یوں اس کے بازو میں کسمسائی کہ صاف ظاہر تھا اس قید سے آزادی کی کوئی تمنا نہیں ہے۔

''رہنے دے، روٹی میں تندور سے لے آؤں گا۔ ابھی تو تُو نئی نویلی دلہن ہے۔ میرے بجائے کسی بھرے پُرے خاندان کے مرد سے بیاہی جاتی تو سسرال والے دنوں تجھے سے پیر نیچے نہ دھرنے دیتے اور تیرے ڈھیروں ڈھیر ناز اٹھاتے۔'' اس کے لہجے میں ایک حسرت سی گھل گئی۔ شاید اپنے اس خاندان کا خیال آ گیا تھا جس کے ہوتے

احساس تو تھا لیکن ذہن میں کوئی شبیہہ، کوئی نشانی نہیں تھی کہ جس کی بنیاد پر وہ اپنے اصل کو کھوج سکتا۔

''ناز تو میں نے اتنے سال بہت اٹھوائے ہیں، بائی جی کے کوٹھے پر کہاں ایسا کوئی کام کرنے دیا جاتا تھا جس سے حسن میں ذرا بھی فرق پڑے۔ وہ تو ہم لڑکیوں کو کبھی پھل بھی خود سے کاٹ کر نہیں کھانے دیتی تھی کہ کہیں غلطی سے انگلی پر کٹ لگ جائے اور انگلی بدنما نظر آنے لگے..... لیکن سچ کہوں تو مجھے اس عیش و آرام کی زندگی کے بجائے زندگی کا یہ روپ بہت خوب صورت لگتا ہے جس میں سبزی ترکاری کاٹتے ہوئے میری انگلیاں بھی زخمی ہوئی ہیں اور کلائیوں پر گرم توے اور پتیلے سے چرکے بھی لگے ہیں۔ میں ان چھوٹے چھوٹے زخموں کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے ان سے سج کر ایک مکمل عورت بن گئی ہوں جس سے بڑھ کر اس روئے زمین پر نہ تو کوئی خوب صورت ہے اور نہ ہی خوش قسمت۔'' نہایت جذب سے بولتی وہ اپنے بیان میں بالکل سچی لگ رہی تھی۔ شاہد نے بے ساختہ ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیا اور وارفتگی سے جلنے اور کٹنے کے ان نشانوں کو چومنے لگا جو گھریلو کاموں کی عادی نہ ہونے کے باعث اس کے حسین ہاتھوں پر وجود میں آئے تھے۔

''ایسا نہ کرو شاہد..... یہ زخم میرا فخر اور اعزاز ہیں اور انہیں دیکھ کر میں خوش ہوتی ہوں کہ میں بھی ایک عزت دار عورت ہوں جو صرف اور صرف اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر روپ اپناتی ہے۔'' آنکھوں میں نمی لیے چاندنی نے اسے ٹوکا تو وہ جذباتی کیفیت سے باہر آیا لیکن آنکھوں میں اس نمی کی چمک اب بھی موجود تھی جو چاندنی کے زخم دیکھ کر بے ساختہ ہی امڈ آئی تھی۔

''اچھا بس، اب زیادہ باتیں مت بنا۔ میں تندور سے روٹی لے کر آتا ہوں..... تُو اتنی دیر میں سالن گرم کر کے دسترخوان لگا۔'' وہ اسے ہدایت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکل گیا۔ چاندنی نے بھی اٹھ کر باورچی خانے کا رخ کیا۔ مختصر اسباب کے ساتھ صاف ستھرا باورچی خانہ دیکھ کر اس کے دل میں پھر خوشی کی لہر اٹھی۔ رہائش کے ساتھ ساتھ بنیادی ضرورتِ اشیا بھی انہیں عمیر کی طرف سے فراہم کی گئی تھیں اور اس نے گنتی کی ان چند اشیا کو بھی نہایت قرینے و سلیقے سے رکھا تھا۔ دو کمروں کا چھوٹا سا معمولی گھر اس کی بے پناہ توجہ کے باعث ہر دم چمکتا رہتا تھا اور وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی خوشی کے احساس سے لبریز اس نے بڑے مگن سے انداز میں سالن کی پتیلی چولہے پر رکھ کر اس کے نیچے ہلکی آگ جلائی اور دسترخوان لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دسترخوان پر پلیٹیں، گلاس اور پانی کا جگ رکھنے تک سالن گرم ہو چکا تھا۔ اس نے اسے کٹورے میں نکالا۔ شاہد کی پسند پر آج اس نے بھنڈی گوشت پکایا تھا لیکن کنفیوز تھی کہ جانے اچھا بنا ہے یا نہیں۔ البتہ یہ ضرور جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو، شاہد اس کا پکایا کھانا ذوق و شوق سے ہی کھائے گا۔ اپنے اس یقین کے ساتھ سالن کا کٹورا ہاتھ میں لیے وہ کمرے میں پہنچی تو اتنی بُری طرح لرزی کہ بھرا ہوا کٹورا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ ہاتھ میں چھرا لیے دیوار سے ٹیک لگائے جو شخص اس کے سامنے کھڑا تھا، اس کے لیے قطعی اجنبی نہیں تھا۔

''دلبر خان..... تت..... تم..... یہاں؟'' خوف سے شل ٹوٹے ہوئے لہجے میں اس نے استفسار کیا۔

''ہاں چاندنی بے بی! یہ میں ہی ہوں دلبر خان..... لیکن تم مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو، کیا جانتی نہیں ہو کہ دلبر خان بائی جی کے کوٹھے سے اڑی ہوئی کسی بھی چڑیا کو زیادہ دن آزادی سے کھلی ہواؤں میں اڑنے نہیں دیتا، اس کے پَر کتر کر واپس پنجرے میں پہنچا دیتا ہے۔'' نہایت سفاک نظروں سے اسے گھورتے ہوئے دلبر خان نے طنزیہ لہجے میں اس سے کہا تو وہ اندر تک کانپ کر رہ گئی۔ دلبر خان کی سفاکی سے اس سمیت کوٹھے پر موجود ہر لڑکی ہی واقف تھی۔

''میں واپس وہاں نہیں جاؤں گی۔'' خوف زدہ ہونے کے باوجود اس نے اپنے عزم کا اظہار کر دیا۔

''تمہارے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب دلبر خان تجھے لے جانے آیا ہے تو ساتھ لے کر ہی جائے گا۔ ویسے بھی تو نے کوئی ایک جرم تو کیا نہیں ہے۔ صرف بھاگنے کی سزا تو پھر بھی ہلکی ہوتی لیکن تُو نے تو بائی جی اور چودھری صاحب کے خلاف پرچہ کٹوا ڈالا۔ بائی جی کے ٹکڑوں پر پل کر جوان ہونے والا وہ تیرا خصم کیا سمجھتا ہے کہ اس جیسا کل کا لونڈا مقابلہ کر سکتا ہے؟ بائی جی نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیل رکھی ہیں۔ پولیس والوں کے اپنی چوکھٹ چڑھنے سے پہلے ہی اپنی ضمانت کا بندوبست کر لیا تھا اس نے۔ منہ لٹکا کر خالی ہاتھ جانا پڑا ان سالے وردی والوں کو۔''

دلبر خان کے لہجے میں سخت تحقیر تھی۔ چاندنی کو یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ پولیس بائی جی کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ مقدمے کا اصل ملزم چودھری افتخار تو پہلے ہی منظر سے غائب تھا۔ بے بسی کے شدید احساس کے ساتھ

اس نے غیر اختیاری طور پر بیرونی راستے کی طرف نظر ڈالی۔ شاہد تندور سے روٹیاں لینے گیا تھا اور اب تک اسے آجانا چاہیے تھا لیکن اس کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

''شاہد کی راہ دیکھ رہی ہے؟ بے فکر رہ، اسے بھی میرے آدمی وہیں پہنچا دیں گے جہاں تجھے جانا ہے۔ وہاں بلکہ قبر میں بھی دونوں لیلیٰ مجنوں ساتھ ہی رہنا۔'' سفاکی سے بولتے ہوئے اس نے چاندنی کی طرف قدم بڑھائے تو بے شک اندر سے اس کی حالت ابتر ہوگئی لیکن اس نے دلبر خان پر اپنی یہ کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی اور مضبوط لہجے میں بولی۔

''تم زبردستی مجھے یہاں سے کہیں نہیں لے جاسکتے۔ میں شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کرلوں گی۔''

''تو مچاؤ شور، میں بھی دیکھتا ہوں تیرے اندر کتنا دم ہے۔'' دلبر خان نے اسے جواب دیا۔ اس سے قبل کہ اس کے منہ سے کوئی آواز برآمد ہوتی، دلبر خان اس کے سر پر پہنچ کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور چھرے کی نوک چاندنی کی گردن سے لگادی۔

''شور مچانے کی دھمکی دے رہی تھی نا..... اب مچا شور۔ نرخرہ ہی کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' اس نے غرا کر دھمکی دی۔

''چل اب آگے..... باہر تجھے لے جانے کے لیے گاڑی کھڑی ہے۔'' بولنے کے ساتھ اس نے چاندنی کو دھکا دیا تو وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھی۔ گلے پر جمے تیز دھار چھرے کی موجودگی میں انکار کی تاب ہی کہاں رہ گئی تھی۔ پھر شاہد بھی واپس نہیں لوٹا تھا۔ اگر وہ ان لوگوں کی قید میں چلا گیا تھا تو وہ آزاد رہ کر کیا کرتی؟ اسے بھی اس کے پاس جانا تھا۔ وہ کسی جواری کی طرح بے جان قدموں سے باہر نکلی۔ دونوں جیسے ہی کمرے کے دروازے سے باہر نکلے، کوئی بہت زور سے دلبر خان سے ٹکرایا اور اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا فرش پر جاگرا۔ دھکا چاندنی کو بھی لگا تھا اور وہ لڑکھڑا سی گئی تھی لیکن اس نے خود کو گرنے سے بچا لیا اور اس جانب دیکھنے لگی جہاں دلبر خان اور نو وارد آپس میں گتھم گتھا تھے۔ دلبر خان کا چھرا اس سے کافی فاصلے پر جاگرا تھا۔ وہ اپنے مقابل سے نمٹنے کی کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ چھرے تک پہنچنے کی کوشش بھی کررہا تھا۔ چاندنی نے جھپٹ کر چھرا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور خود ایک بار پھر محو تماشا ہوگئی۔ نو وارد اس کے لیے اجنبی تھا اور اسے اس کی چستی و پھرتی قابلِ داد محسوس ہورہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے دل میں کوئی خوف محسوس نہیں کررہی تھی اسی لیے بجائے موقع کا فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلنے کے، ان دونوں کے درمیان جاری مقابلہ دیکھ رہی تھی۔ نو وارد بتدریج دلبر خان پر غالب آتا جارہا تھا۔ اس وقت تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا جب دلبر خان کے ایک گھونسے کے جواب میں نو وارد نے اس کے منہ کو اپنے توڑ گھونسوں کی زد پر رکھ لیا اور نتیجے میں دلبر خان کے منہ سے خون کے ساتھ ساتھ کئی دانت بھی باہر آگئے۔ یہ وار اتنا زوردار تھا کہ دلبر خان چکرا کر رہ گیا اور نو وارد نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اس کے دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑ کر اس کی دونوں ہتھیلیاں ملا کر اس میں ہتھکڑی لگادی۔

''اسے لے جاکر گاڑی میں ڈالو۔'' ہتھکڑی لگانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھ مٹی جھاڑنے کے انداز میں جھٹکے اور تحکمانہ انداز میں بولا تو چاندنی نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر اس کے مخاطب کو دیکھا۔ وہ پولیس کی یونیفارم میں ملبوس دو افراد تھے جو نہ جانے کب اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے تھے اور اسے اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔

''تم بھی ہمارے ساتھ چلو بی بی..... تمہارا شوہر تھانے میں ہے۔ اس پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا لیکن ہمارے ایک ساتھی کی مداخلت پر وہ بال بال بچ گیا ہے۔ تم اس سے وہیں مل سکوگی۔'' یونیفارم میں ملبوس پولیس والے دلبر خان کو کھینچتے ہوئے باہر لے گئے تو وہ شخص، جس کے بارے میں اب چاندنی کو یقین ہوگیا تھا کہ وہ بھی پولیس والا ہے، اس سے مخاطب ہوا۔ شاہد پر قاتلانہ حملے کا سن کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''شاہد ٹھیک تو ہے نا..... اسے کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے بی بی۔ تم ہمارے ساتھ تھانے چلوگی تو خود دیکھ لینا۔'' اس نے اکھڑے انداز میں جواب دیا تو ناچار چاندنی کو بھی باہر کی طرف قدم اٹھانے پڑے۔ باہر ایک پولیس وین موجود تھی، وہ اس میں سوار ہوگئی۔ وین میں سوار ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اردگرد کے گھروں سے کئی افراد باہر جھانک رہے تھے۔

رات کے وقت ہونے والے ہنگامے نے کئی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور یقیناً انہیں تجسس تھا کہ چند روز قبل ہی اس گھر میں آکر بسنے والی عورت کو پولیس وین میں کیوں لے جایا جارہا ہے؟ لیکن پولیس کے ڈر کی وجہ سے وہ لوگ دور رہنے پر مجبور تھے۔ اس نے اس منظر کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ عزت کی زندگی چند دن سے زیادہ نصیب نہیں ہوئی تھی۔ کوٹھے پر مجبوری اسے تماش بینوں کے سامنے نچاتی تھی اور یہاں بھی وہ لوگوں کی نظروں میں تماشا بن گئی تھی۔ کھوجتی نظروں سے نگاہیں چرا کر اس نے اپنا دھیان پولیس وین کے اندر کی طرف موڑ لیا۔ وہاں فرش پر دلبر خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اگر وہ آج اس کے گھر میں قدم نہیں رکھتا تو یہ سارا تماشا نہیں ہوتا۔

''تو کیا سمجھتی ہے ان پولیس والوں کے سہارے بچ نکلے گی اور میں حوالات میں پڑا رہ جاؤں گا؟ تو بائی جی کی پہنچ کو جانتی نہیں ہے۔ وہ یوں چٹکی بجاتے مجھے مکھن میں سے بال کی طرح نکلوا لے گی اور تو ایک بار پھر اسی کوٹھے پر ہوگی جہاں بائی جی اپنے ہاتھوں سے تیری کھال ادھیڑے گی۔'' دلبر خان کی اس سے نظر ملی تو دھمکیاں دینے لگا۔

''چپ کر کے بیٹھ او حرام کے تخم۔ حوالات چل کر ہم تجھے بتادیں گے کہ تو کتنا تیس مار خان ہے۔ تجھ جیسے سیکڑوں کی بدمعاشی ہم نے دو منٹ میں نکال کر ناک میں رسی ڈالی ہے۔ تو بھی پالتو کتے کی طرح ہمارے تلوے چاٹے گا۔'' اپنے سامنے چاندنی کو دھمکیاں دینا پولیس والوں کو پسند نہیں آیا اس لیے ان میں سے ایک نے دلبر خان کو زوردار لات رسید کرتے ہوئے جوابی دھمکی دی۔ اس لات اور دھمکی کے جواب میں دلبر خان زبان سے کچھ نہ بولا، بس کینہ توز نظروں سے گھور کر رہ گیا۔ منہ سے نکلنے والے خون نے اسے پہلے ہی خاصا بھیانک بنادیا تھا۔ آنکھوں کی سرخی اور نفرت نے اس بھیانک پن میں اضافہ کردیا۔ چاندنی کا دل اسے دیکھ کر متلا سا گیا چنانچہ وہ نگاہوں کا رخ پھیر کر باہر کی جانب دیکھنے لگی۔

پولیس وین مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی تھانے جا پہنچی۔ تھانے پہنچ کر دلبر خان کو تو پولیس والے کھینچ کر جانے کس سمت لے گئے جبکہ اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں ایک میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں اور ان میں سے ایک کرسی پر شاہد بیٹھا ہوا تھا۔ شاہد کو اپنے سامنے پاکر وہ جذباتی ہوگئی۔ ممکن تھا کہ اپنی اس جذباتیت میں وہ شاہد کے گلے ہی لگ جاتی لیکن اپنے ساتھ موجود پولیس والے کی وجہ سے خود پر قابو کیے رہی اور اندرونی کیفیت کا اظہار فقط ان دو آنسوؤں سے ہوا جو بے ساختہ ہی اس کی آنکھوں سے رخساروں پر لڑھک گئے تھے۔ شاہد نے کھڑے ہوکر حوصلہ افزا مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

''تم دونوں تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر انتظار کرو۔ صاحب بعد میں خود تم سے بات کریں گے۔'' چاندنی کے ساتھ وہاں آنے والے سپاہی نے قدرے نرم لہجے میں کہا اور خود پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے ہوئے وہ دروازے کو باہر سے بند کرگیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو نا شاہد؟'' سپاہی کے جانے کے بعد چاندنی اس سے مخاطب ہوئی اور یوں اس کا جائزہ لینے لگی جیسے کسی نادیدہ چوٹ کو ڈھونڈ نکالے گی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں..... تو میری فکر نہ کر اور یہاں آکر آرام سے بیٹھ۔'' شاہد اس کا ہاتھ تھام کر اسے کرسی تک لے گیا اور دونوں بازو تھام کر اسے ایک کرسی پر بٹھانے کے بعد خود بھی اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''مجھے پتا چلا کہ تجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے تو میں ڈر گئی تھی۔'' اس نے نہایت معصومیت سے شاہد کو بتایا۔

''ہاں، کم بخت پتا نہیں کب سے تاک میں کھڑے تھے۔ میں گھر سے نکل کر گلی کے نکڑ تک ہی پہنچا ہوں گا کہ مجھ پر حملہ ہوگیا۔ دور سے ایک آدمی چیخ کر ہوشیار نہیں کردیتا تو میں مارا گیا تھا۔ اس کے چیخنے سے حملہ کرنے والا بھی ذرا گھبرا گیا اور اس کا نشانہ چوک گیا۔ بعد میں اسی آدمی نے اس خبیث کو قابو میں کیا پھر اس نے پولیس کی گاڑی منگوا کر اسے اور مجھے گاڑی میں بٹھا کر تھانے پہنچا دیا۔ میں تیرے لیے فکر مند تھا اور گھر واپس آنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے تسلی دی کہ میری حفاظت کا بھی پورا بندوبست ہے۔ بس اس کے بعد سے میں یہاں بیٹھا تیری راہ تک رہا ہوں اور یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں کہ اللہ کے فضل سے تو بالکل ٹھیک ہے۔'' شاہد نے اسے خود پر گزرنے والی بپتا سنائی اور اس بات پر شکر گزاری کا اظہار کیا کہ وہ صحیح سلامت ہے۔ جواباً چاندنی نے اسے وہ سب کچھ کہہ سنایا جو اس پر گزری تھی۔

''عجیب بات ہے آخر اچانک پولیس والے ہماری مدد کے لیے پہنچ کیسے گئے ورنہ ان لوگوں کے بارے میں تو یہی مشہور ہے کہ یہ واردات کے بھی کئی گھنٹوں بعد جائے وقوعہ پر پہنچتے ہیں اور ہم نے تو انہیں اپنی مدد کے لیے بلایا بھی نہیں تھا۔'' چاندنی کی زبانی سب کچھ جان کر شاہد نے حیرت کا اظہار کیا لیکن ظاہر ہے چاندنی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ دونوں بیٹھے اپنے اپنے اندازے لگاتے رہے اور پھر اس کام سے بھی بور ہوگئے۔ چائے فراہم کرنے کے لیے آنے والے ایک سپاہی سے انہوں نے اپنے گھر واپس جانے کی بابت سوال بھی کیا لیکن اس

نے کوئی واضح جواب دیے بغیر انہیں انتظار کرنے کا مشورہ دیا اور خود باہر نکل گیا۔
دونوں نے اب تک رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا لیکن جن حالات سے وہ دوچار ہوئے تھے، اس میں بھوک مر گئی تھی مگر اب چائے کے ساتھ بسکٹ دیکھ کر دوبارہ چمک اٹھی۔ ایک ایک کر کے دونوں نے سارے بسکٹ چٹ کر ڈالے۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد بھی انہیں کوئی ایک گھنٹا انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑا پھر کہیں جا کر کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کھلے دروازے سے عمیر آفندی کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ دونوں ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنا یہ محسن ان کے لیے بے حد لائقِ احترام تھا۔ کھڑے ہو کر استقبال کرنے کے ساتھ ہی دونوں نے یک زبان اسے سلام بھی کیا۔
''وعلیکم السلام ..... بیٹھو۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے انہیں واپس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھال لی۔
''مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں کو اتنی دیر یہاں انتظار کرنا پڑا لیکن میں تم دونوں سے ملنا ضروری سمجھ رہا تھا اس لیے میں نے اپنے پہنچنے تک تمہیں یہاں رکوائے رکھا۔'' بیٹھنے کے بعد اس نے شائستگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔
''کوئی بات نہیں سر..... ہمیں کون سا واپس جا کر کوئی پہاڑ کھودنے تھے۔ تاہم تو آپ کا قیمتی ہے اور یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ ہم سے ملنے یہاں آئے ہیں۔'' یہ جان کر کہ انہیں اب تک عمیر کے انتظار میں روکا گیا تھا، ساری کوفت دور ہو گئی تھی اس لیے شاہد نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔
''میں اس لیے تم سے ملنے آیا ہوں کہ تم دونوں کو تسلی دے سکوں۔ خود پر ہونے والے حملے کے بعد یقیناً تم دونوں گھبرائے ہوئے ہو گے لیکن اطمینان رکھو..... میرے آدمی مسلسل تمہارے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں اور کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوگا کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے والوں کو آج کی طرح منہ کی کھانی پڑے گی۔''
''اوہ..... تو آپ کے آدمی ہماری نگرانی کر رہے تھے؟''
''ہاں، مجھے پہلے سے ہی اس بات کا خطرہ تھا کہ تم دونوں کو اغوا یا قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی اس لیے میں نے اپنے آدمیوں کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی۔ انہی لوگوں نے گڑبڑ ہوتی دیکھ کر خود ہاتھ پیر چلانے کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی بلا لیا تھا اور اس وقت دلبر خان اور اس کے ساتھیوں کی پولیس والوں کے ہاتھوں ٹھیک ٹھاک دھلائی ہو چکی ہے۔ خاص طور پر دلبر خان کی تو ساری اکڑ نکال کر دی ہے پولیس والوں نے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ بائی جی نے چودھری کے منشی اللہ رکھا سے ساز باز کرنے کے بعد یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہد کو قتل کر دیا جائے اور چاندنی کو اغوا کر کے واپس کوٹھے پر پہنچا دیا جائے۔ اس طرح یہ معاملہ ہی دب جاتا۔ تمہارے بعد کون ہوتا جو تمہارے کیس کے قتل کے مقدمے کی پیروی کرتا اور بے بس چاندنی کیا گواہی دینے عدالت پہنچتی ..... یوں سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ ویسے بھی بائی جی نے اور چالیں بھی چل رکھی ہیں۔ اس نے تمہارے خلاف چاندنی کے اغوا کی ایف آئی آر کٹوانے کے ساتھ ساتھ یہ رپورٹ بھی لکھوائی ہے کہ تم کوٹھے سے لاکھوں کی مالیت کے زیورات چوری کر کے فرار ہوئے ہو۔ ممکن تھا کہ اس جرم میں تمہیں اب تک گرفتار کیا جا چکا ہوتا لیکن میں نے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کر کے فی الحال اس چال کا توڑ کر لیا ہے۔ اب منتظر ہوں کہ چودھری کے پاکستان واپس آنے کے بعد حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔'' عمیر نے انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جنہیں سن کر دونوں کے چہرے لحہ بہ لحہ رنگ بدلتے رہے۔
''بائی جی جھوٹی مکار ہے۔ ہم نے وہاں سے کوئی چوری نہیں کیا ہے۔ اگر کچھ لے بھی آتے تو چوری کیسی؟ کیا لاکھوں کمائے ہیں بائی جی نے میرے ذریعے ..... میں سے اگر میں اپنا حصہ لینا چاہتی تو لے سکتی تھی لیکن میں لعنت بھیجتی ہوں اس حرام کے مال پر۔ میں اپنے شاہد کے ساتھ عزت کی روکھی روٹی کھا کر بھی خوش ہوں۔'' چاندنی نے جذباتی انداز میں لب کشائی کی۔
''میں اس حقیقت کو سمجھتا ہوں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ تم دونوں کو دباؤ میں لے کر ایف آئی آر واپس لینے پر مجبور کرنے کے لیے وہ لوگ ہر چال چل سکتے ہیں۔ نہیں معلوم کہ تم لوگ ان چالوں کے مقابلے میں ٹھہر پاؤ یا نہیں لیکن میں یہ بتا دوں کہ اس کیس میں جان تب تک رہے گی، جب تک تم دونوں ڈٹے رہو گے۔ تم پیچھے ہٹ گئے تو میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ میرے ہاتھ پیر وہیں کی سیٹ کی وجہ سے بندھے ہوئے ہیں اور میں کھل کر کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اب بھی میرے اشارے پر پولیس نے خان پر تشدد کر کے یہ اگلوا تو لیا ہے کہ تم دونوں پر حملہ کرنے میں چودھری کے منشی کا بھی ہاتھ ہے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ عدالت کے سامنے اپنے اس بیان سے مکر جائے گا اور ہم اصل مجرم پر گرفت نہیں کر سکیں گے۔ ان حالات میں چاندنی کی گواہی کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی کیونکہ ہمارے پاس یہ واحد گواہ ہے۔'' عمیر نے کھل کر ان پر صورتِ حال واضح کی۔
''آپ فکر نہ کریں سر! ہم آپ کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ اگر ہم کمزور ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چودھری اور بائی جی جیسے لوگ ہمیں کچل کر ہی رکھ دیں۔ ہم انہیں بتا دیں گے کہ چیونٹی میں بھی ہاتھی کا مقابلہ کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔'' چاندنی نے پُرعزم لہجے میں کہا جس کا شاہد سر کی اثباتی جنبش سے ساتھ دے رہا تھا۔ عمیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کے دل کو یہ یقین ہونے لگا کہ دیر سے ہی، چودھری جیسا درندہ بالآخر پنجرے میں آ ہی جائے گا۔

☆☆☆

''مجھے بہت افسوس ہے عائشہ! میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا لیکن تم بھی سمجھ سکتی ہو کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے ہم کمال کے ساتھ یہ زیادتی کرنے پر مجبور ہیں۔'' شہریار نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنے سامنے کھڑی عائشہ کی طرف دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ عائشہ نے گردن ہلاتے ہوئے اس بات کا اشارہ دیا کہ واقعی وہ اس کی مجبوری سمجھتی ہے لیکن ظاہر ہے ایک بیوی کی حیثیت سے وہ کمال کے لیے پریشان اور دکھی تھی۔ اس کے لیے یہ بات تکلیف دہ تھی کہ وہ نشے میں دھت، اپنی ذات اور حالات سے بے خبر کمال کو یوں بستر پر چھوڑ کر ان کے ساتھ باہر چلی جائے کہ کمال کے ہاتھ پاؤں رسیوں میں جکڑے ہوں اور منہ میں اس طرح کپڑا ٹھنسا ہو کہ وہ کچھ بول بھی نہ سکے۔ شہریار نے اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کے وقت ایمبولینس میں یہاں سے نکل جائیں گے۔ اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے اس نے یہاں سے نکلنے کے لیے عبدالرحمٰن سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس فون نمبر پر رابطہ کر لیا تھا جو عبدالرحمٰن نے اسے دیا تھا۔ جس ایمبولینس میں انہیں یہاں سے نکلنا تھا، وہ عبدالرحمٰن کے آدمی ہی مقررہ وقت پر ان کے لیے لے کر آتا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ عائشہ چوکیدار کو یہ بتائے گی کہ نشے کی زیادتی کی

وجہ سے کمال کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اس لیے وہ اسے ایمبولینس میں اسپتال لے کر جارہی ہے۔ وہ تین تھے اور ایک ہی ایمبولینس میں ان کے نکلنے کی راہ یہی تھی کہ ان میں سے ایک مریض کا روپ دھارے۔ اس روپ کے لیے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس طرح وہ آرام سے سفر بھی کرسکتے تھے۔ سلو کو ان کے اسٹریچر کے نیچے چھپ کر سفر کرنا تھا جبکہ شہر یار ڈرائیو کا مددگار بن جاتا۔ عائشہ کو وہ محفوظ مقام پر پہنچنے کے بعد صبح واپس بھجوا دیتے لیکن یہ سب کرنے کے لیے انہیں کمال کو بے بس کرنا پڑا تھا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ اسے اعتماد میں لے کر اتنا بڑا قدم اٹھایا جاسکتا اور اس کا منظر پر نہ ہونا بھی ضروری تھا۔ وہ لوگ اگر اسے یونہی گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے تو کوئی بھی واقعہ پیش آسکتا تھا۔

رات کے وقت بیوی کو گھر میں نہ پاکر وہ ہنگامہ کھڑا کرسکتا تھا اور ایسی صورت میں ظاہر ہے چوکیدار فوراً پولیس کو مطلع کرتا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ کمال کو بے بس کر کے جاتے تاکہ کسی وجہ سے جاگ جانے کے باوجود بھی وہ کچھ نہ کرسکتا۔ بعد میں عائشہ خود اپنی ذہانت سے اسے سنبھال لیتی۔ بالفرض وہ کسی کے سامنے کہتا بھی کہ اسے اس کی بیوی نے رسیوں سے باندھ کر گھر میں اکیلا چھوڑ دیا تھا تو کون اس کی بات کا یقین کرتا۔ ایک نشے باز کے لیے تو آسانی سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ نشے میں مست ہوکر اول فول بک رہا ہے۔

"میں نے کھانا لگا دیا ہے، تم لوگ کھانا کھالو پھر تمہارا آدمی یہاں پہنچ جائے گا۔" کمال سے نظریں ہٹا کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے عائشہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میں واقعی بہت شرمندہ ہوں عائشہ اور آپ کو اتنی تکلیف دینے پر دل کی گہرائیوں سے معذرت خواہ بھی۔ اگر آپ چاہیں تو ہمارا ساتھ دینے سے انکار بھی کرسکتی ہیں۔ اللہ ہمارے لیے کوئی اور راہ نکال دے گا۔" اس کا موڈ دیکھ کر شہر یار نے نہایت رسان سے اس سے کہا۔

"اب ان ساری باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگرچہ میں نہیں جانتی تھی کہ تم لوگ اپنے مسئلے کا یہ حل نکالو گے لیکن میں نے وعدہ کیا ہے اس لیے میں اب عین موقع پر پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے، اسے ہونے دیا جائے کیونکہ موجودہ پلان پر عمل کرنے سے انکار کا مطلب ہوگا کہ میں مزید تم لوگوں کو اپنے گھر میں ٹھہراؤں اور یہ زیادہ مشکل ہوگا۔ کمال اور اردگرد والے آخر کب تک بے خبر رہیں گے کہ میرے گھر میں تین عدد مفرور افر[اد] رہے ہیں۔ بعد کی مشکل اور تکلیف سے بہتر ہے کہ [میں] موجودہ تکلیف سہہ لوں۔" نہایت صاف گوئی سے کہتی [ہوئی] عائشہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ شہر یار کو بھی اس کی [بات تسلیم] کرنی پڑی۔

کھانا ڈائننگ ٹیبل کے بجائے اسی کمرے میں [فر]ش پر دسترخوان بچھا کر لگایا گیا تھا جس میں وہ تینوں رہائش پذ[یر] تھے۔ یہ پہلے ہی سے طے تھا کہ وہ تینوں اپنی [تمام] ضروریات اسی کمرے میں محدود رہ کر پوری کریں گے [تاکہ] یہاں سے روانگی کے وقت اپنی یہاں موجودگی کی نشانیا[ں] مٹانا دشوار نہ ہو۔

"تم لوگ جلدی سے کھانا کھالو۔ میں اپنے دوسر[ے] کام نمٹاتی ہوں۔" عائشہ بولتی ہوئی واپس پلٹ کر کچن [کی] طرف جانے لگی۔

"آپ بھی کھانا کھالیتیں۔ ہم جہاں ہوں گے وہاں معلوم نہیں آپ کی کوئی خاطر کر بھی سکیں یا نہیں۔" شہر یار نے اسے روکا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" وہ مختصر جواب دے کر د[روازے] سے ہٹ گئی۔ شہر یار بھی دل پر بوجھ سا لیے کھانے کے [لیے] بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر فرحان اور سلو اس کے منتظر ہی تھے۔ اس [کے] بیٹھتے ہی انہوں نے خاموشی سے کھانا شروع کر دیا۔ عائ[شہ] نے وقت کی کمی کے باوجود کھانے میں اہتمام کیا تھا۔ فرائ[ی] دال چاول کے علاوہ اس نے بھنا ہوا گوشت بھی بنایا [تھا] ساتھ ہی سلاد اور ہری مرچوں کی چٹنی بھی تھی۔ [کھانا] خوشبودار، خوش رنگ اور خوش ذائقہ تھا، اس کے باوجود [ڈاکٹر] فرحان اور شہر یار رغبت سے نہ کھاسکے۔ شہر یار کے دل [پر] عائشہ کی طرف سے بوجھ تھا تو ڈاکٹر فرحان اپنی داڑھی [کے] لیے غم زدہ تھے جسے حلیے کی تبدیلی کے لیے منڈھانا پڑا تھا۔ [تینوں کے] حلیے ان تینوں کے ہی تبدیل ہوچکے تھے۔ اس مقصد [کے] لیے انہوں نے اپنے بیگ میں موجود میک اپ کے سامان کے ساتھ ساتھ عائشہ کے پاس موجود اس کے ذاتی [میک] اپ کا سامان بھی استعمال کیا تھا اور خود کو اس حد تک بد[لنے] میں کامیاب ہوگئے تھے کہ دور سے دیکھ کر کوئی ان[ہیں] شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ وقت کی قلت نہ ہوتی تو میک اپ [کا] معیار اور بھی اچھا ہوسکتا تھا کہ شہر یار اور سلو نے تو با[قاعدہ] اس فن کی تربیت حاصل کی تھی۔ بہرحال، اب بھی میک [اپ] ایسا تو تھا کہ کسی عام شخص کے لیے اسے پکڑنا آسان [ن]ہیں ہوتا۔

الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ بے دلی سے کھانا ختم کیا گیا۔ ڈاکٹر فرحان اور اس نے تو بہت ہی کم کھایا البتہ سلو نے پھر بھی کھانے کے ساتھ کچھ انصاف کیا، پر بہت زیادہ اس نے بھی نہیں کھایا کہ بھرا ہوا معدہ تیز رفتار حرکت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب تو ایک طرف بیٹھ گئے لیکن ان دونوں کو باقی ماندہ کام نمٹانے پڑے۔ شہر یار نے دسترخوان سمیٹ کر خالی برتن اور بچا ہوا کھانا باورچی خانے میں پہنچانے کی ذمے داری سنبھالی جبکہ سلو تیزی سے کمرے میں موجود اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ سامان سمیٹنے کے بعد اس نے باریک بینی سے کمرے کا جائزہ بھی لیا کہ کہیں ان کی کوئی نشانی یہاں نہ رہ جائے۔ برتن رکھ کر آنے کے بعد شہر یار بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ انہوں نے ممکنہ طور پر ہر اس جگہ سے فنگر پرنٹس صاف کیے جہاں ان کے خیال کے مطابق ان تینوں کے ہاتھ زیادہ لگے تھے۔ وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو عائشہ ان کے لیے چائے لے آئی۔ اس کے چہرے پر اب بھی سنجیدگی تھی۔ البتہ اس نے چائے ان کے ساتھ ہی پی اور فوراً ہی برتن لے جاکر دھوڈالے۔ اس سلسلے میں شہر یار نے اسے خصوصی ہدایت کی تھی کہ کوئی بھی استعمال شدہ برتن ان دھلا نہیں رہنا چاہیے۔ ان سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد انہیں ایمبولینس کے آنے کا انتظار تھا۔ آخرکار اس طرف سے اشارہ مل گیا۔ عائشہ نے انٹرکام کی مدد سے چوکیدار کو مطلع کردیا کہ کمال کی طبیعت خراب ہے اور اس کی کال پر وہاں ایمبولینس آرہی ہے۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں یہ سہولت تھی کہ ہر مکین انٹرکام پر چوکیدار سے رابطہ کرسکتا تھا۔ ایمبولینس آئی تو چوکیدار نے بغیر کسی رکاوٹ کے اسے عائشہ کے گھر تک آنے دیا۔ اس موقع پر عائشہ کے ذمے ایک کام یہ تھا کہ وہ چوکیدار کو اس طرح مصروف کردے کہ اس کی توجہ ایمبولینس کی طرف نہ رہے۔ عائشہ نے یہ کام نہایت خوبی سے انجام دیا۔ وہ چوکیدار کو اپنے ساتھ لے کر گھر کی بغلی جانب لے گئی اور اسے وہاں ایک کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دکھا کر بتایا کہ نشے کی حالت میں کمال نے یہ شیشہ توڑ دیا ہے۔ اندر گرل ہونے کے باوجود اس نے چوکیدار کو ہدایت کی کہ وہ اس بات کا خیال رکھے کہ اس کے اسپتال میں قیام کے دوران کوئی اس ٹوٹے ہوئے شیشے کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

"آپ چنتا نہیں کرو بی بی صاحب! اس اسکیم کے کسی گھر میں کبھی چوری چکاری نہیں ہوئی۔" چوکیدار نے اسے تسلی دی۔

"پھر بھی تم خیال رکھنا۔ چوری چکاری ہونا ضروری نہیں ہے۔ کبھی کبھار بچے شرارت میں گھر کے اندر کوئی الٹی سیدھی چیز بھی پھینک دیتے ہیں۔" عائشہ نے اسے ہدایت کی۔

"ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا لیکن ابھی تو تم اپنے پتی کو لے کر اسپتال جاؤ۔" چوکیدار نے اسے قدرے بیزاری سے جواب دیا تو عائشہ نے واپسی کے لیے قدم موڑ لیے۔ اسے اندازہ تھا کہ اس دوران میں وہ تینوں ایمبولینس میں سوار ہوچکے ہوں گے۔

"عجیب عورت ہے، اپنے پتی کی چنتا کرنے کے بجائے گھر کی چنتا میں پڑی ہے۔" مڑتے ہوئے اس نے پیچھے سے چوکیدار کی بڑبڑاہٹ سنی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ اس ہاؤسنگ اسکیم میں رہنے والے افراد زیادہ تر اپنے گھروں تک محدود رہنے کے عادی تھے اور یہ تو تھا بھی رات کا وقت اس لیے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ چوکیدار کے پہنچنے تک وہ ایمبولینس میں سوار ہوچکی تھی۔ بدلے ہوئے حلیے میں شہر یار ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ان تینوں نے اپنے حلیے کے ساتھ لباس بھی تبدیل کرلیے تھے اور یہ لباس ظاہر ہے کمال کے تھے۔ خود ان کے کپڑوں کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی چنانچہ انہیں جلا کر ان کی راکھ فلیش میں بہادی گئی تھی۔ ایمبولینس کی آمد کے وقت چوکیدار نے مین گیٹ کھولا تھا تو دوبارہ بند نہیں کیا تھا چنانچہ کھلے گیٹ سے ایمبولینس آندھی طوفان کی طرح باہر نکل گئی اور چوکیدار کو بالکل بھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ ایمبولینس میں کتنے لوگ سوار ہیں۔

یہاں سے کامیابی سے نکلنے کے بعد ایک مرحلہ بخیروخوبی طے ہوا تو باہر کی فکر لگ گئی۔ آج کل شہر میں ہائی الرٹ تھا اور پولیس مختلف مقامات پر گشت کرتی پھر رہی تھی مگر ایمبولینس کا ہوٹر سن کر کسی نے انہیں نہیں روکا لیکن کوئی سر پھرا روک بھی سکتا تھا اس لیے ڈرائیور نے کچھ فاصلہ طے ہونے کے بعد سڑک چھوڑ کر آبادی کا رخ کرلیا۔ آبادی کے درمیان سے ایمبولینس نکالتے ہوئے اس نے ہوٹر بند کردیا تھا۔ وہ اس شہر کا رہائشی تھا اور شہر کی صورت حال سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کا گشت سڑکوں تک ہی محدود ہے اور وہ زیادہ توجہ شہر سے نکاسی کے راستوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ گلیوں، محلوں سے گزرتی ہوئی ایمبولینس نہایت سکون سے اپنی منزل مقصود

تک پہنچ گئی۔

یہ وسیع رقبے پر واقع ایک سنگل اسٹوری عمارت تھی جس میں کھلا حصہ بہت زیادہ تھا اور ایک ڈیری مصنوعات بنانے والی کمپنی کے لوگو والی چار پانچ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ احاطے میں موجود عمارت کے دروازے کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایمبولینس کو رکتے دیکھ کر دو افراد لپک کر قریب آئے۔ ان میں سے ایک نے پچھلا حصہ کھول کر اسٹریچر پر لیٹے ڈاکٹر صاحب کو سہارا دے کر باہر نکلنے میں مدد دی۔ ان کے پیچھے عائشہ بھی اتر آئی اور پھر سلو بھی اسٹریچر کو ہٹا کر اس کے نیچے سے نکل آیا۔ دوسرا آدمی شہریار کی طرف متوجہ تھا جو اپنے قدموں میں رکھا وہ بیگ لے کر نیچے اترا تھا جس میں ان کے ضروری سامان کے علاوہ اسلحہ بھی موجود تھا۔ راستے میں اگر کہیں پولیس سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ اس اسلحے کا بے دریغ استعمال کرنے سے ہرگز بھی گریز نہیں کرتا کہ اب تو مار دو یا مر جاؤ والی صورتِ حال تھی۔ وہ تصادم سے بچنے کی اپنی سی کوشش ضرور کر رہے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر مقابلہ کرنے کے لیے بھی پوری طرح تیار تھے۔

''ہمارے ساتھ موجود خاتون کو کسی آرام دہ جگہ ٹھہرا دو اور صبح ہونے کے بعد انہیں ان کی مرضی کی جگہ پر پہنچا دینا۔ یہ خاتون ہماری ساتھی نہیں ہیں، بس انسانیت کے ناتے ہمارا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی ہیں۔ اس لیے پورا خیال رکھنا کہ انہیں کوئی نقصان نہ ہونے پائے۔'' اس شخص کے مصافحے کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر اس نے سب سے پہلے عائشہ کے سلسلے میں ہدایت دی جس پر وہ فوراً ہی کسی کو آواز دینے لگا۔

''جی سوریا بھائی!'' پکارا جانے والا فوراً خدمت میں حاضر ہو گیا۔

''دیدی کو اندر لے جا کر عزت سے ٹھہراؤ۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور پھر ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عبدل بھائی نے دو دن پہلے ہی اپنے کو فون کر کے بولا تھا کہ اگر آپ لوگ رابطہ کرو تو آپ سے پورا تعاون کرنا ہے۔ آپ نے جو بولا، وہ ہم نے کر دیا۔ اب آگے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟'' ان لوگوں کو اپنے ساتھ عمارت کے اندر لے جاتے ہوئے سوریا نے بے تکلفی سے بتاتے ہوئے فوراً ہی آگے کا پروگرام بھی پوچھ ڈالا۔

''ہمیں اس شہر سے باہر نکلنا ہے۔'' شہریار نے اسے بتایا۔

''تو نکل جاؤ...... کیا پرابلم ہے؟''

''پرابلم یہ ہے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کے لیے پورے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ پولیس ہمیں یہاں سے آسانی سے نکلنے دے۔'' اب وہ لوگ ایک کمرے میں پہنچ چکے تھے جو ایک معمولی دفتر کے انداز میں سجا ہوا تھا۔ اپنے میزبان کے ساتھ ان تینوں نے بھی وہاں پڑی لکڑی کی کرسیاں سنبھال لیں۔ شہریار جس کرسی پر بیٹھا تھا، اس کا ایک پایہ ذرا ہل رہا تھا جس کی وجہ سے وہ پوری طرح متوازن نہیں تھی۔

''بہت زبردست۔'' اس کے انکشاف پر سوریا نے پہلے غور سے ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر داد دینے لگا۔ ''تم لوگوں نے تو خوب بھیس بدلا ہے۔ میں اتنی پاس سے بھی نہیں پہچان سکا کہ تم وہی لوگ ہو۔ ایسے بہروپیوں کے لیے نکلنا کیا مشکل ہے۔ تم تو مزے سے بس یا ٹرین میں بھی بیٹھ کر نکل سکتے ہو۔''

''نہیں، یہ آسان نہیں ہے کیونکہ ہمیں تلاش کرنے والے لوگ بھی کم شاطر نہیں ہیں۔ حلیے کی تبدیلی کے باوجود بھی ان ذرائع سے سفر کرنے پر ہمارے پکڑ لیے جانے کے چانسز ہیں کیونکہ ان کا اندازہ بھی یہی ہوگا کہ ہم ایسے کسی ذریعے سے نکلنے کی کوشش کریں گے اس لیے انہوں نے بس اڈوں اور ریلوے اسٹیشنز پر سیکڑوں آدمی لگائے ہوئے ہوں گے اور یہ وہ آدمی ہوں گے جن کی تیز نگاہیں دور سے بھی اصل اور میک اپ زدہ چہرے میں فرق کرنے کی اہل ہوں گی۔''

''اوہو، یہ تو بڑا گڑبڑ گھوٹالا پرابلم ہے۔ آپ لوگوں کے ذہن میں چھپ کر نکلنے کی کوئی ترکیب موجود ہے کیا؟'' تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس نے الٹا انہی سے تدبیر پوچھی۔

''میں نے سنا ہے کہ بھائی جی کا مختلف سامان، مختلف ذرائع سے یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ اگر تم اس سامان کے ساتھ ہی ہمارے یہاں سے نکلنے کا انتظام کر دو تو یہ بہت اچھا رہے گا۔'' اس نے اپنے ذہن میں موجود تجویز پیش کی۔

''سامان تو واقعی آتا جاتا ہے۔ یہ ڈیری فارم بھی بھائی جی کی ہی ملکیت ہے اور اتفاق سے آج ایک ٹرک مال لے کر یہاں سے ممبئی جانے بھی والا ہے لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اس سے جانے پر تم پکڑے نہیں جاؤ گے؟ عام حالات میں تو خیر کسی کی ہمت نہیں ہے کہ ہماری گاڑیوں کی تلاشی لے سکے لیکن انٹیلی جنس والوں کی موجودگی میں پولیس والے بھی مجبور ہو جاتے ہیں اور انہیں وہی کرنا پڑتا ہے جو اوپر سے حکم ملتا ہے۔ تم پکڑے گئے تو تمہارے ساتھ جو بُرا ہوگا سو ہوگا، بھائی جی کی بھی بدنامی ہوگی۔'' وہ ذرا جھجک کا شکار تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر رہے ہو؟'' شہریار نے تنے ہوئے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔ اس کے ساتھ خاموش بیٹھے سلو اور ڈاکٹر صاحب کے چہروں پر بھی تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

''نہ نہ، میں نے ایسا نہیں کہا لیکن ایک بار اپن کو عبدل بھائی سے بات کرنی پڑے گی۔ تم لوگ یہاں بیٹھو۔ اپن بات کر کے آتا ہے۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی ایک ملازم مشروبات سے بھری ہوئی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا۔ ٹرالی میں انواع و اقسام کی شرابوں کے ساتھ ان کے جملہ لوازمات بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ کچھ سوفٹ ڈرنکس بھی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ سوریا کے رویّے سے یوں لگنے لگا تھا کہ پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کرنے کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر بند گلی میں آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی۔

اس اعصابی تناؤ کے ساتھ لذت کام و دہن میں مصروف ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ تو عائشہ کا بہت خلوص سے تیار کردہ ڈنر بھی رغبت سے نہیں کھا سکے تھے، ان ریڈی میڈ مشروبات میں کیا دلچسپی لیتے...... البتہ ذہن یہ فیصلہ کرنے میں ضرور مصروف تھا کہ یہاں سے انکار کے بعد ان کے لیے کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے۔ چند منٹوں کا انتظار ہی ان پر بہت بھاری گزرا اور جب سوریا واپس لوٹ کر آیا تو وہ اس کی شکل دیکھنے لگے۔

''مبارک ہو، عبدل بھائی نے ہر حال میں تمہارا ساتھ دینے کا آرڈر دیا ہے۔'' سوریا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس حکم کو سن کر خوش نہیں ہے لیکن اوپر سے ملنے والے حکم کو ٹالنے کی جرأت بھی نہیں رکھتا تھا۔

''ٹھیک ہے تو تم مجھے وہ ٹرک دکھا دو جسے مال لے کر ممبئی کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میں اسے دیکھ کر خود فیصلہ کر لوں گا کہ اس میں ہماری گنجائش کیسے بن سکتی ہے۔'' اس کے تاثرات کی پروا کیے بغیر وہ کہتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ سلو نے بھی اس کی پیروی کی۔

''ہم دونوں باہر جا کر معاملات نمٹاتے ہیں، آپ یہیں آرام کریں۔'' اس نے ڈاکٹر فرحان سے کہا اور خود سلو کو ساتھ لے کر سوریا کی راہنمائی میں باہر نکل گیا۔ احاطے میں روشنی تھی اور کچھ افراد دودھ کے پیکٹوں کے کارٹن اندر سے اٹھا کر باہر لا کر رکھتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان کارٹنز کو یقیناً ان ٹرکوں میں لوڈ کیا جانا تھا جن پر ایک مشہور کمپنی کا لوگو نظر آ رہا تھا۔

''اس کمپنی کے مالک بھائی جی ہیں اور یہاں سے دودھ، مکھن اور گھی ممبئی اور دہلی سمیت دیش کے ہر بڑے شہر میں سپلائی کیا جاتا ہے۔ ڈیری پروڈکٹس بنانے والی کوئی دوسری لوکل کمپنی اپنے بھائی جی کی کمپنی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایک دم اے ون کوالٹی کا مال بنتا ہے ادھر۔'' سوریا نے نہایت فخر سے اسے بتایا تو وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بھائی جی کی طرح کے جرائم پیشہ لوگ اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے سائڈ میں اس طرح کے کاروبار بھی کرتے ہیں اور بڑی ایمان داری سے کرتے ہیں کہ اصل کمائی تو انہیں کہیں اور سے ہو جاتی ہے اور ایسے کاروبار سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لیے بے ایمانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

''یہ ٹرک مال لے کر ممبئی جائے گا۔'' ایک بڑے ٹرک کے قریب پہنچ کر سوریا نے اسے آگاہ کیا۔ اس ٹرک میں لوڈنگ کا کام ابھی شروع ہی ہوا تھا اور مزدور پیک شدہ کارٹنز ایک ترتیب سے رکھتے جا رہے تھے۔ ٹرک کا پچھلا حصہ بالکل بند تھا اور اس میں کولنگ سسٹم بھی موجود تھا۔ شہریار کے ذہن میں پہلے ہی سے ایک خیال تھا۔ اس نے فوری طور پر سوریا سے بات کی تو اس نے لوڈنگ کرتے مزدوروں کو روک دیا۔

''یہ عام مزدور ہیں۔ آپ جو چاہ رہے ہیں اس کے لیے مجھے اپنے خاص آدمیوں سے کام کروانا پڑے گا اور اس کے لیے مناسب وقت وہ ہوگا جب باقی ٹرکوں میں لوڈنگ کا کام مکمل ہو جائے۔ اس دوران میں آپ آرام یا جو بھی چاہے کر سکتے ہیں۔'' مزدوروں کے ہٹنے کے بعد اس نے بتایا تو شہریار نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے واپسی کے لیے قدم اٹھا لیے۔ واپس عمارت کی طرف جاتے ہوئے وہ سوریا کو مزید تفصیل سے بتاتا رہا کہ وہ لوگ کیا اور کس انداز میں کرنا چاہتے ہیں۔ سوریا بغیر سوال جواب کے غور سے اس کی بات سنتا رہا۔

شہریار نے اپنے حلیوں میں تبدیلی کے لیے بھی لباس سمیت چند دوسری چیزوں کا مطالبہ کیا جن کے بارے میں

سوریا نے اسے یقین دلایا کہ تھوڑی دیر میں مہیا کر دی جائیں گی۔ شہریار نے اس سے چند دواؤں کی بھی فرمائش کی جن کے بارے میں سوریا نے بتایا کہ پہلے سے ہی موجود ہیں۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ واپس اسی دفتر نما کمرے میں آگئے جہاں ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ سوریا نے دوائیں فراہم کیں تو اس نے سلو کے ذمے ان کی ڈریسنگ کا کام لگا دیا۔ زخم ان دونوں کو بھی آئے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کے زخم ان کی نسبت ذرا شدید نوعیت کے تھے اور انہیں زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ ان کی مرہم پٹی کے ساتھ انہیں کھانے کے لیے پین کلر اور زخم سکھانے والی ادویات بھی دی گئیں۔ شہریار کے اندازے کے مطابق اس جگہ کو صرف ڈیری مصنوعات کے کاروبار کے لیے ہی استعمال نہیں کیا جارہا تھا بلکہ بھائی جی کے لوگ بھی کور کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ ان پروڈکٹس کی سپلائی کی آڑ میں ممنوعہ اشیا جیسے اسلحہ اور شراب وغیرہ کی سپلائی بھی کی جاتی ہو۔ ہیروئن کے لیے تو بھائی جی نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس کاروبار میں ملوث نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ڈریسنگ مکمل ہونے تک سوریا نے انہیں لباس اور دوسری اشیا بھی فراہم کر دی تھیں۔ انہوں نے باری باری ملحقہ باتھ روم میں جا کر لباس تبدیل کیے۔ یہ لباس دھوتی اور کرتوں پر مشتمل تھے جو اس علاقے میں اس کاروبار سے وابستہ لوگوں میں عموماً مستعمل تھا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد ایک بار پھر میک اپ کا مرحلہ پیش آیا۔ میک اپ کے سامان میں خاص طور پر مصنوعی ناخنوں کا سیٹ منگوایا گیا تھا۔ ان ناخنوں کو ایک سلوشن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی انگلیوں پر چسپاں کرنے کے بعد اتنی خوب صورتی کے ساتھ تراشا گیا کہ وہ اصلی ہی معلوم ہونے لگے۔

''معذرت چاہتا ہوں سر..... داڑھی سے محرومی کے بعد آپ کو کچھ عرصے کے لیے ان مصنوعی ناخنوں کو بھی برداشت کرنا پڑے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان ناخنوں کی وجہ سے آپ وضو نہیں کر پائیں گے لیکن ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں اللہ سے معافی کی امید کی جاسکتی ہے۔'' شہریار نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ میں ان باتوں کو سمجھتا ہوں اور فی الحال تو مجھے کوئی پریشانی بھی نہیں ہے۔ میں نے وضو کیا ہوا ہے۔ انشاء اللہ فجر کی نماز تو اسی وضو سے ادا ہو جائے گی۔ آگے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کوئی سبب بنا دے گا۔'' انہوں نے نہایت رسان سے اسے جواب دیا۔

''آپ کو ایک زحمت اور بھی اٹھانی پڑے گی۔ دورانِ سفر ہم آپ کو منظر پر رکھنے کی غلطی نہیں کر سکتے اس لیے میں نے یہ بندوبست کر دیا ہے کہ ٹرک میں کارٹنز کے درمیان کچھ جگہ خالی رکھی جائے جہاں آپ چھپ کر سفر کر سکیں۔ گاڑی میں ایئر کنڈیشنر موجود ہے اس لیے آپ کو حبس وغیرہ کا مسئلہ تو نہیں ہوگا لیکن جگہ کی تنگی برداشت کرنی پڑے گی۔ اس کے لیے میرے پاس کوئی حل نہیں ہے۔''

''میرے لیے اتنے فکر مند مت ہو یار..... میں خاصا سخت جان ہوں۔ اگر نہ ہوتا تو اتنے سال راوالوں کی قید میں رہ کر سلامت کیسے رہتا؟ جس رب نے اتنے عرصے ہمت دی، وہ اب بھی حوصلہ دے گا اور چند گھنٹوں کا یہ سفر بھی گزر ہی جائے گا۔'' اس کی تشویش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی تو وہ مسکرا دیا اور اپنی باقی تیاری مکمل کرنے لگا۔ دھوتی اور کرتے کے ساتھ ان دونوں نے اپنے سروں پر پگڑی بھی باندھی تھی اور اس حلیے میں اتنے مختلف لگ رہے تھے کہ کسی قریبی شخص کے لیے بھی انہیں شناخت کرنا آسان نہیں ہو سکتا تھا۔

''میں نے ٹرک میں کارٹنز لوڈ کروا دیے ہیں۔ آپ چاہیں تو خود دیکھ لیں۔'' سوریا نے آکر اطلاع دی تو شہریار اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ٹرک میں کارٹنز اس کے حکم کے مطابق ہی لوڈ کیے گئے تھے۔ ان کارٹنز کی ترتیب یوں تھی کہ اگلے حصے میں ایک دوسرے کے اوپر جما کر رکھے گئے کارٹنز کی دو دیواریں سی بنا کر ان کے درمیان خلا سا چھوڑا گیا تھا اور پھر آخر تک کارٹنز جما کر بیچ میں وہاں تک پہنچنے کا راستہ چھوڑا گیا تھا۔

''ٹرک کے ساتھ ہمارے دو آدمی جاتے ہیں۔ ایک ڈرائیور اور دوسرا اس کا ساتھی۔ اس لیے آپ میں سے دو کو اسی جگہ چھپ کر سفر کرنا پڑے گا۔'' اسے ٹرک کا معائنہ کروانے کے بعد سوریا نے کہا تو وہ ذرا تذبذب کا شکار ہو گیا۔ کسی بھی طرح کی خراب صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے وہ سلو کو اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ اگر اسے بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اس جگہ ٹھہرا دیا جاتا تو کسی ناگہانی کی صورت میں وہ اس بند جگہ سے اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ درمیانی خلا تک پہنچنے کے لیے جو جگہ چھوڑی گئی تھی، وہ بھی سفر کے آغاز سے پہلے کارٹنز رکھ کر پاٹ دی جاتی۔ ایسے میں سلو اگر چاہتا بھی تو کسی صورت باہر نہیں نکل سکتا تھا، علاوہ یہ کہ باہر سے کوئی کارٹنز ہٹا کر اس کے باہر نکلنے کے لیے راستہ بناتا۔

''کیا ڈرائیور کے ساتھ ایک کے بجائے دو افراد سفر نہیں کر سکتے؟''

''کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں لیکن یہ ہماری روٹین کے بالکل خلاف ہوگا اور آپ لوگ جس خطرے سے دوچار ہیں، اس میں پوری احتیاط کرنی ضروری ہے۔'' اس کے سوال کا سوریا نے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، ایسا ہے تو ایسا ہی صحیح'' وہ تذبذب کی کیفیت سے فوراً ہی نکل کر آہنی لہجے میں بولا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر فرحان اور سلو کو ٹرک کے اس حصے میں پہنچا دیا گیا۔ سلو کو اس طرح سفر کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شہریار کے ساتھ رہے یا پھر اسے ہی اکیلے ڈرائیور کے ساتھ سفر کرنے کی اجازت دے دی جائے لیکن شہریار کے حکم کے سامنے اسے زیادہ بحث کرنے کی عادت نہیں تھی اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اس تنگ جگہ پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سفر کرنے کے لیے راضی ہو گیا۔ اس موقع پر وہاں سوریا اور شہریار کے علاوہ کوئی بھی موجود نہیں تھا اور ایسا شہریار کی خواہش پر ہی کیا گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم سے کم لوگوں کو ہی اس بات کا علم ہو کہ اس ٹرک میں کچھ افراد چھپ کر سفر کر رہے ہیں کیونکہ زیادہ لوگوں کے باعلم ہونے کی صورت میں خطرات و خدشات بڑھ جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اور سلو سوار ہو چکے تو اس نے اور سوریا نے مل کر ہی باقی کی جگہ پر کارٹنز ترتیب سے رکھے اور پچھلا حصہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب کوئی تالا کھول کر اندر جھانکتا بھی تو اسے اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس اٹا اٹ بھرے ٹرک میں دو افراد چھپے ہوئے ہیں۔ کام مکمل ہونے کے بعد سوریا نے ڈرائیور کو بھی وہاں بلا لیا۔ رازداری کے خیال سے اسے بھی ٹرک میں سلو اور ڈاکٹر صاحب کی موجودگی سے لاعلم رکھا گیا تھا اور شہریار کے بارے میں بھی صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ یہ بھائی جی کا خاص بندہ ہے جسے ممبئی تک پہنچانا ہے اور راستے میں کسی ایمرجنسی کی صورت میں اس کی ہدایات پر عمل کرنا ہے۔ شہریار نے ایک دفعہ کو یہ سوچا تھا کہ وہ خود ڈرائیور کی جگہ لے لے اور سلو کو اپنی والی جگہ دے دے لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ اتنے لمبے سفر میں وہ بھی جو ٹرک کے ذریعے کیا جا رہا تھا، تجربہ کار ڈرائیور ہی مناسب تھا کیونکہ ایسا ڈرائیور نہ صرف راستوں سے باخبر ہوتا ہے بلکہ راستے میں پڑنے والی چوکیوں اور ناکوں سے نمٹنے کا بھی تجربہ رکھتا ہے۔ اور یہ تو پھر تھا بھی بھائی جی کا بندہ جس نے لازماً پیسے اور طاقت کے بل پر ہر جگہ تعلقات بنا رکھے ہوں گے اور کوئی اسے روکنے کی کوشش نہ کرتا ہوگا۔ موجودہ حالات میں یہ ڈرائیور زیادہ آسانی سے چیکنگ وغیرہ سے بچا کر نکال سکتا تھا۔

ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھال لی تو وہ بھی سوریا سے ہاتھ ملا کر ٹرک میں سوار ہو گیا۔ فوراً ہی ٹرک چل پڑا اور بڑے سے گیٹ سے گزر کر باہر پہنچ گئے۔ ابھی صبح کا اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا لیکن زندگی جاگنا شروع ہو گئی تھی اور ایسے لوگ جو اخبار یا ڈیری کے کاموں سے وابستہ تھے اپنے گھروں سے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ شہر کی صفائی پر مامور میونسپل کا عملہ بھی اپنی بھاری بھاری جھاڑوؤں اور کچرا جمع کرنے کی ٹرالیوں کے ساتھ کام کے آغاز کے لیے تیار نظر آ رہا تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' ڈرائیور نے اس سے دریافت کیا۔

''گوبندر۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''برا مت ماننا۔ سوریا صاحب نے زیادہ بات چیت سے منع کیا تھا لیکن میں نے اس لیے نام پوچھ لیا کہ کبھی ضرورت پڑی تو تمہیں کیا کہہ کر پکاروں گا۔'' ڈرائیور نے وضاحت دی اور پھر خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ فی الحال وہ شہر کی سڑکوں ہی سے گزر رہے تھے۔ یہاں کسی کسی جگہ انہیں پولیس والے نظر آئے لیکن کہیں بھی انہیں روکا نہیں گیا اور بالآخر وہ اس سڑک پر پہنچ گئے جو شہر سے باہر جاتی تھی۔ یہاں انہیں دور سے ہی ناکا نظر آ گیا اور ناکے پر سے ملنے والے اشارے پر ڈرائیور کو ٹرک روکنا پڑا۔ ٹرک رکتے ہی شہریار کو اپنے اعصاب میں تناؤ محسوس ہوا اور ہاتھ بے ساختہ ہی کرتے کی اس جیب کی طرف چلا گیا جس میں ایک ریوالور رکھا تھا۔ فی الحال ہتھیار کے نام پر اس کے پاس یہی واحد ریوالور موجود تھا۔ البتہ کارآمد گن، ہینڈ گرینیڈ اور باقی کا اسلحہ تو اس نے بیگ میں رکھ کر وہ بیگ سلو کے پاس ہی رکھوا دیا تھا کیونکہ راستے میں کہیں چیکنگ ہونے پر یہ چیزیں سامنے آتیں تو وہ بری طرح دھر لیے جاتے کیونکہ یہی چیزیں تھیں جو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اسپتال سے فرار کرواتے ہوئے استعمال کی تھیں اور ان کی موجودگی میں کسی دوسرے ثبوت کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

''نیچے آؤ۔'' جیسے ہی ٹرک رکا، دونوں جانب سے سپاہی آ کھڑے ہوئے اور حکم دیا۔

''کیا بات ہے بادشاہو... کیا اس دفعہ تم لوگوں کو

تمہیں پہنچا ہے جو اتنے خراب موڈ میں نظر آ رہے ہو؟'' حکم دینے والے کے لہجے کی سختی کے برخلاف ڈرائیور کا لہجہ غیر سنجیدہ تھا۔

''تمہیں کہا ہے نیچے آؤ۔'' ایک بار پھر حکم کو دہرایا گیا۔

''ٹھیک ہے آ جاتے ہیں نیچے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور شہریار کو بھی نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس کے اشارے پر وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔

''ہمیں گاڑی کی تلاشی لینی ہے۔ پیچھے کی چابی دو۔'' ان دونوں کے نیچے اترتے ہی سپاہی نے حکم دیا۔

''کیوں بھائی، کیا پیچھے کی تلاشی لے کر تم دودھ کے ڈبوں کے بیچ میں سے گائے دریافت کر لو گے؟'' شہریار کے مقابلے میں ڈرائیور بہت ریلیکس تھا اور کسی طور سنجیدگی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کے بات کرنے کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان لوگوں سے خاصا بے تکلف ہے اور اس کا ان سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔

''بکواس نہ کرو اور چابی دو۔'' سپاہی نے کڑک آواز میں ڈرائیور کو پھٹکارا تو اس بار اس نے چابی نکال کر سپاہی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''تم کہو تو میں خود وکرم صاحب سے بات کر لوں۔'' چابی دینے کے بعد اس نے سپاہی سے پوچھا۔ اس کے لیے یہ ایک خلافِ معمول بات تھی کہ اسے یوں روک کر اس کے ٹرک کی تلاشی لی جائے لیکن بہرحال اسے تامل یوں نہ تھا کہ وہ بے خبر تھا کہ ٹرک میں دودھ کے پیکٹوں کے کارٹنز کے علاوہ بھی کچھ اور موجود ہے۔

''وکرم صاحب کے پاس بڑے افسر آئے بیٹھے ہیں اور ان ہی کا حکم ہے یہاں سے کوئی گاڑی بغیر تلاشی کے نہ گزرنے پائے۔'' سپاہی نے آخر وہ وجہ گوش گزار کر دی جس کے باعث خلافِ معمول تلاشی لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

''اچھا اچھا، اوپر کا معاملہ ہے تو پھر تم خوشی سے تلاشی لے لو ورنہ میں تو یوں ڈر رہا تھا کہ کہیں وکرم صاحب کسی وجہ سے ہم سے ناراض تو نہیں ہو گئے۔ آدمی اچھے ہیں لیکن ذرا نذرانہ پہنچنے میں دیر ہو جائے تو موڈ خراب کر لیتے ہیں۔'' ڈرائیور کی فراخ دلانہ اجازت پر شہریار کے دل پر کیا گزر رہی تھی، یہ وہی جانتا تھا۔

''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ نئی شکل لگ رہی ہے۔ پہلے کبھی اسے دیکھا نہیں؟'' چابی لے کر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے سپاہی کی نظر شہریار پر پڑی تو اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

''ہاں نیا بندہ ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی نوکری پر چڑھا ہے اور آج پہلی بار ہی میرے ساتھ جا رہا ہے۔'' ڈرائیور نے بتایا تو سپاہی نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور خود پچھلے حصے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے تالا کھول کر دروازہ کھولا اور لبالب کارٹنز سے بھرے ٹرک کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

''انوپ، اجے، آکاش .... یہاں آؤ اور میرے ساتھ ان کارٹنز کو اتارنے میں مدد کرو۔'' اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے بھی یہ مشقت گراں گزر رہی ہے لیکن حکم حاکم مرگِ مفاجات کے تحت عمل کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے آواز دینے پر اس کے ساتھی اس کے پاس پہنچ گئے۔

''تم لوگ بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ اس طرح کام جلدی نمٹ جائے گا اور تم یہاں سے جلد روانہ ہو سکو گے۔'' اب تک ساری گفتگو کرنے والے سپاہی نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تو ڈرائیور کے ساتھ شہریار بھی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس جانب بڑھ گیا۔ سپاہیوں نے کارٹنز نکال کر باہر رکھنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ شہریار نے ان کے ساتھ شامل ہونے سے قبل اندر موجود سلو کو خطرے کا کاشن دیا۔ اس کاشن کے ملنے کے بعد سلو الرٹ ہو جاتا اور ہتھیار تیار کر کے اس پوزیشن میں آ جاتا کہ خود کو کوئی نقصان پہنچنے سے پہلے دوسرے پر قیامت بن کر ٹوٹ سکے۔ ڈرائیور اور اس کے شامل ہو جانے سے کام کی رفتار مزید بڑھ گئی تھی اور ٹرک کے باہر تیزی سے کارٹنز کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ اپنے طور پر وہ تو سستی سے ہی کام کر رہا تھا لیکن باقی سب لوگوں کو تو جلدی تھی۔ کچھ کارٹنز کو کھول کر بھی دیکھا گیا تھا لیکن ظاہر ہے ان میں سے دودھ کے ڈبوں کے سوا کیا نکلنا تھا۔

ٹرک سے سامان اتارنے کا عمل جاری تھا کہ وہاں دو اور مزید گاڑیاں پہنچ گئیں اور ان گاڑیوں کو بھی ان کی طرح روک لیا گیا۔ ان گاڑیوں کے سواروں سے گفتگو کے لیے دو سپاہی اور ان کے ساتھ وہی تیسرا سپاہی جس نے ان کے ساتھ بھی گفتگو کی تھی، وہاں سے ہٹ گئے۔ اس طرح کارٹنز اتارنے کا عمل کچھ سست ہو گیا لیکن اب زیادہ دیر نہیں تھی جب وہ ان کارٹنز کو ہٹاتے ہوئے اس حصے تک پہنچ جاتے جہاں ڈاکٹر صاحب اور سلو موجود تھے۔ گہری تشویش میں مبتلا شہریار نے کام کی رفتار کو مزید سست کرنے کے لیے اپنے ہاتھ روک لیے اور اپنے پیچھے آ کر رکنے والی گاڑیوں کا جائزہ

لینے لگا۔ ان میں سے ایک منی ٹرک تھا جس پر بوریاں سی لدی ہوئی تھیں جبکہ دوسری ہائی ایس نما گاڑی تھی جس میں خواتین، مرد اور بچے سب سوار نظر آرہے تھے۔ اتنی سویرے یوں گاڑی بھر کر نکلنے والے وہ لوگ معلوم نہیں کہاں جارہے تھے۔ ان کی منزل دریا کے کنارے کوئی پکنک پوائنٹ بھی ہوسکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی دور کے علاقے میں کسی شادی میں شرکت کے لیے جارہے ہوں جہاں وقت پر پہنچنے کے لیے انہیں اتنے سویرے نکلنا پڑا ہو۔ سپاہیوں نے چونکہ گاڑی کے سواروں کو نیچے اتروالیا تھا، اس لیے وہ واضح طور پر ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔ عورتوں نے زیادہ تر گہرے رنگوں کے خوش نما لباس پہن رکھے تھے اور آپس میں باتوں میں مصروف تھیں۔ بچے کھلے میں آنے کے بعد ذرا بے قابو ہوئے جارہے تھے اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے ان کی ماؤں کو ڈانٹ پھٹکار سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ مرد حضرات سپاہیوں سے مذاکرات میں مصروف تھے اور شاید یہ خواہش رکھتے تھے کہ انہیں تلاشی کی زحمت سے گزرے بغیر ہی یہاں سے جانے کی اجازت دے دی جائے۔ اس صورتِ حال پر مرد و زن سب ہی کوفت زدہ نظر آرہے تھے۔

"جلدی ہاتھ چلانا ادئے.... یہ کیا تُو عورتوں پر آنکھیں سینکنے میں لگا ہوا ہے۔" کام کی زیادتی سے بیزار سپاہی نے اسے فارغ کھڑا دیکھا تو جھنجلا کر ٹوکا۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ میں کیوں عورتوں پر آنکھیں سینکنے لگا۔ تھک گیا تھا اس لیے رک گیا۔" شہریار نے سخت لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور ایک کارٹن اٹھانے کے لیے جھکا۔

"یہ کیا ہے اوئے۔ تُو جیب میں اسلحہ لے کر گھوم رہا ہے۔" سپاہی کی نظر یک دم اس کے کُرتے کی جیب میں پڑے ریوالور پر پڑی تو وہ زور سے چیخا اور اس کی گدی پکڑ لی۔

"ارے سنتری جی! یہ کیا کر رہے ہو؟ بے چارے نے پستول رکھا ہے کوئی کسی پر گولی تو نہیں چلائی۔ اب بھائی جی کے آدمی اپنی جیب میں پستول نہیں رکھیں گے تو کیا رام جی کی مورتی رکھ کے گھومیں گے؟ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ اپنے سو بجن تو سو دشمن ہیں۔ دشمنوں سے بچاؤ کے لیے اپنے کو یہ انتظام تو رکھنا پڑتا ہے لیکن تم کاہے کو چِنتا کر رہے ہو.... تم تو اپنے سجن ہو نا۔" ڈرائیور نے فوراً ہی مداخلت کرتے ہوئے بیچ بچاؤ کروایا۔

اس دوران شہریار نے بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے ہاتھ پیروں کو قابو میں رکھا ورنہ وہاں بہت بڑا جھگڑا کھڑا ہوسکتا تھا اور وہ قبل از وقت کوئی جھگڑا شروع کرنے سے بچنا چاہتا تھا ورنہ امکان تو یہی تھا کہ جب کارٹنز کی آخری قطار بھی ہٹ جائے گی اور ڈاکٹر فرحان اور ... منظر پر آجائیں گے تو وہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ لیکن بس وہ آخری حد آنے تک تصادم سے بچنا چاہتا تھا اور یہ تصادم بس ہونے کو ہی تھا۔ آٹھ دس کارٹنز ہی مزید ہٹنے کی دیر تھی۔

"حالات بہت نازک ہیں یار.... تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو۔ اگر اتنے خراب حالات نہ ہوتے تو ہم لوگ کاہے کو اتنی محنت کرنے میں لگتے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ممبئی سے ایک بڑے افسر، صاحب کے پاس پہنچے ہیں اور صاحب کو سختی سے حکم دیا ہے کہ کوئی کتنے ہی بھروسے کا آدمی کیوں نہ ہو، تلاشی کے بغیر یہاں سے نہیں نکلنا چاہیے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اپنی کیسی مصیبت آئی ہوئی ہے۔ سارا دن لوڈروں کی طرح گاڑیوں سے سامان اتارتے اور چڑھاتے رہتے ہیں۔ دو دن سے ڈھنگ سے کھانا بھی کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ایسے میں طبیعت چڑچڑی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟" موجودہ صورتِ حال میں ڈرائیور کے پولیس والوں سے دوستانہ تعلقات کام آئے اور سپاہی بات کو مزید بڑھانے کے بجائے اپنی پریشانی کا رونا رونے لگا۔

اس پل شہریار کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ کر باہر کی جانب ہوگئی۔ ناکے پر موجود ٹینٹ نما کمرے سے برآمد ہونے والے دو افراد میں سے ایک کے جسم پر پولیس کی وردی تھی جبکہ دوسرا سادہ لباس میں تھا اور اس سادہ پوش کو دیکھ کر وہ بُری طرح چونک گیا تھا۔ اس بات میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا کہ پولیس یونیفارم میں ملبوس شخص سے گفتگو کرتا سادہ پوش انسپکٹر پریم ناتھ ہے۔ اس کی نگاہوں کے ارتکاز نے شاید پریم ناتھ کو بھی دیکھے جانے کا احساس دلایا اور اس نے رخ موڑ کر شہریار کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور شہریار کو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ نگاہوں کے اس تصادم نے اسے یہ بھی فراموش کروا دیا تھا کہ اس کے پیچھے رکھے کارٹنز میں سے اب کچھ ہی کارٹنز ہٹنے کی دیر تھی پھر یہ سارا کھیل ختم ہوجاتا اور انہیں ایک دوسرا خونیں کھیل شروع کرنا پڑتا۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

سگ بردار

آصف ملک

زندگی کی تمام تر دل کشی اور دل فریبی دوستوں کی سنگت کی بدولت ہوتی ہے... وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے بغیر ادھورے تھے... وقت نے بھی انہیں ایک جان دو قالب کا روپ بخش دیا تھا... مگر اچانک ہی انہیں آگہانی آفت نے آن گھیرا... اور حالات و واقعات نے گمبھیر صورتِ حال اختیار کرلی...

دکھ بھرے لمحات میں ایک ہنستی، مسکراتی، گنگناتی تحریر...

میں اور روبی پارک میں تھے۔ یہ میامی کے ایک پوش علاقے کا پارک تھا اس لیے ہمارے چاروں طرف پوش افراد تھے۔ لوگ اپنے بیوی بچوں اور کتوں کے ساتھ پارک آئے ہوئے تھے۔ جو کسی کے ساتھ نہیں تھے، وہ جاگنگ کر رہے تھے یا پھر اپنے کسی مشغلے میں مگن تھے۔ ویسے پارک میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور جو تھے وہ خاموش تھے۔ میری اور روبی کی توجہ کا مرکز کتوں والے تھے۔ میامی کا یہ علاقہ... نارتھ شور اوپن اسپیس پارک کہلاتا ہے۔ اس کے دونوں

طرف سمندر ہے۔ درمیان میں ایک پتلی سی ساحلی پٹی ہے جو جنوب میں کیپس کین سے شمال میں ہالی ووڈ نارتھ بیچ پارک تک جاتی ہے۔ یہ ساری پٹی انتہائی دولت مند افراد کے لیے مخصوص ہے۔ یہاں اعلیٰ درجے کی ساحلی تفریح گاہیں ہیں۔ ہوٹلز، نائٹ کلبس، بارز اور ریسٹورانٹس ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ یہاں رخ کرنے کا بھی سوچ نہیں سکتے اور بہت دولت مند افراد ہی یہاں ذاتی رہائش گاہ لے سکتے ہیں۔

میرا نام ڈربی ہے اور میری عمر صرف بیس سال ہے۔ روبی مجھ سے ایک سال بڑا یعنی اکیس برس کا ہے۔ ہمارا تعلق اس علاقے سے نہیں ہے بلکہ ہم میامی کے ایک متوسط علاقے کے رہائشی ہیں۔ ہم نے وہیں آنکھ کھولی، وہیں پلے بڑھے اور اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ جیسے تیسے ہائی اسکول پاس کیا اور یہ عہد کرکے وہاں سے نکلے کہ اب کسی تعلیمی ادارے کا رخ نہیں کریں گے حالانکہ روبی کے باپ نے بہت زور لگایا کہ وہ کالج میں داخلہ لے۔ اس کا باپ اصل میں یہ چاہتا تھا کہ روبی میری صحبت سے دور رہے۔ اس کے خیال میں روبی نہایت شریف لڑکا تھا جسے میری صحبت نے خراب کیا۔ اس کے برعکس میری ماں کا خیال تھا کہ میری بربادی میں روبی کا ہاتھ ہے۔ یہ بات صرف ہم دونوں جانتے تھے کہ ہمیں کسی نے برباد نہیں کیا، ہماری فطرت ہی ایسی تھی۔ ہاں آپس میں مل کر ہم ڈبل ہو گئے تھے۔ ہمیں پابندیاں برداشت نہیں تھیں اور ہم اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتے تھے۔

میں اٹھارہ کا ہوتے ہی گھر سے نکل گیا تھا، نہ نکلتا تو ماں نکال دیتی۔ وہ پہلے ہی مجھے آوارہ، نکھٹو سمجھتی تھی۔ روبی کو ایک سال انتظار کرنا پڑا کیونکہ وہ اکیلے نہیں رہ سکتا تھا۔ ہم نے مل کر ایک کمرے کا فلیٹ لے لیا۔ ہم آوارہ اور نکھٹو ضرور تھے لیکن ہمیں کوئی بری لت نہیں تھی جیسے منشیات یا کال گرلز کی۔ حد یہ کہ ہم سگریٹ بھی نہیں پیتے تھے۔ کبھی کبھار کسی بار میں ایک دو جام ہماری واحد تفریح تھی۔ روبی بیس بال کا کھلاڑی بننا چاہتا تھا اور میں دولت مند بننا چاہتا تھا اس لیے روبی کا زیادہ وقت بیس بال کھیلنے میں اور میرا زیادہ وقت دولت مند بننے کی تراکیب سوچنے میں گزرتا تھا۔ گزراوقات کے لیے ہم چھوٹے موٹے کام کر لیتے تھے۔ ایک دن روبی ایک بار میں ویٹر کا کام کرکے واپس آیا تو بری طرح بیزار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"ڈربی! میں اس طرح گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے سے بیزار آگیا ہوں۔ میں کام کروں یا کھیل پر توجہ دوں؟ اس طرح تو میں کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔"

میں روبی کی بات سن کر خوش ہوا کیونکہ میں خود کئی دن سے ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ میری آخری ملازمت دو دن پہلے ختم ہو گئی تھی کیونکہ میں جس کارواش میں کام کرتا تھا، وہاں ایک کار کے رنگ کو میری وجہ سے نقصان ہوا اور مالک نے مجھے نکال دیا۔ شکر ہے اس نے مجھ سے نقصان بھرنے کو نہیں کہا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ مجھ میں اتنی سکت ہی نہیں ہے کہ میں نقصان بھر سکوں۔ اب میرے پاس آخری چند ڈالر بچے تھے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ان معمولی ملازمتوں سے گزارہ مشکل ہے۔ ہم ہمیشہ ہینڈ ٹو ماؤتھ رہتے تھے۔ ایک دن پہلے میں فاسٹ فوڈ شاپ گیا تو وہاں ایک عورت شاپ کے شیشے پر اشتہار کا پوسٹر چپکا رہی تھی۔ اس کا کتا گم ہو گیا تھا اور اشتہار میں کتے کی تلاش میں مدد دینے والے یا اسے تلاش کرکے لانے والے کے لیے پانچ سو ڈالرز انعام کا اعلان تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش وہ کتا مجھے مل جائے۔ کتا تو نہیں ملا لیکن ایک خیال آیا اور میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا۔ روبی نے کہا تو مجھے پھر خیال آیا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے اس سے کہا۔

"میرے پاس ایک تجویز ہے۔"

"قانونی یا غیر قانونی...؟" روبی نے حسب معمول سوال کیا۔ اس سے پہلے جب بھی میں نے اس کے سامنے تجویز رکھی تھی، اس نے یہ سوال ضرور کیا۔ جب اسے پتا چلتا کہ تجویز پر عمل کرنے کی صورت میں گرفتار ہونے اور جیل جانے کے روشن امکانات ہیں تو وہ انکار کر دیتا تھا۔ خود مجھے بھی ایسے جرائم اچھے نہیں لگتے تھے۔

"ایک طرح سے دیکھا جائے تو دونوں ہی ہیں لیکن اس میں گرفتاری کا امکان بہت کم ہے اور جیل جانے کا اس سے بھی کم ہے۔"

روبی نے پوچھا۔ "تجویز کیا ہے؟"

میں نے اسے اپنے خیال سے آگاہ کیا تو وہ اچھل پڑا۔ "ہم کتے اغوا کریں گے؟"

میں نے ملائمت سے کہا۔ "اسے اغوا کرنا نہیں کہتے کیونکہ جانوروں کے اغوا کے بارے میں کوئی قانون نہیں ہے۔"

"تب اسے چوری کہا جائے گا۔"

"چوری وہ چیز ہوتی ہے جسے آدمی چرا کر لے جائے۔ اگر کتا ہمارے پاس سے نکلا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود آیا تھا۔ اب کتا تو بتانے سے رہا کہ ہم اسے لے کر آئے ہیں۔"

جیسے جیسے روبی قانونی پہلو سے مطمئن ہو رہا تھا اس کی مزاحمت کم ہوتی جا رہی تھی۔ بالآخر وہ مطمئن ہو گیا۔ اب اس کا

پہلا سوال تھا۔

"ہم اس کام کا آغاز کب سے کریں گے؟"

"آج اور ابھی سے۔"

اس شام ہم نارتھ شور اوپن اسپیس پارک میں موجود تھے۔ اس کے پیچھے کی آبادی پوش افراد پر مشتمل تھی اور ظاہر ہے وہ سب دولت مند تھے۔ ان کے گھروں میں بچے ہوں یا نہ ہوں، کوئی نہ کوئی پالتو جانور ضرور تھا اور اکثر نے خوب صورت نسل کے ایسے کتے پالے ہوئے تھے جو بے ضرر تھے۔ وہاں اتنے سارے افراد کتوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے، ہمارے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ خاصے غور و خوض کے بعد ہم نے ایک ادھیڑ عمر عورت کے چھوٹے سے پپی کو منتخب کیا۔ وہ اس سے کچھ زیادہ ہی لاڈ اٹھا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کتا اس کے لیے بہت اہم ہے۔ جب وہ پارک سے رخصت ہوئی تو ہم اس کے پیچھے گئے اور اس کا گھر بھی دیکھ لیا۔ وہ پارک سے کچھ ہی فاصلے پر رہتی تھی۔ اب ہمیں طریقۂ کار طے کرنا تھا کہ کم سے کم خطرہ مول لیے بغیر کتا کیسے اغوا کریں۔ اس سلسلے میں روبی نے انٹرنیٹ کی مدد حاصل کی اور بالآخر ایک طریقہ طے کر لیا۔ ہم نے ایک اسپرے دوا کا انتخاب کیا۔ اگر اسے کسی کتے کے منہ پر اسپرے کیا جائے تو وہ چند سیکنڈ میں بے ہوش ہو سکتا ہے۔ یہ بے ضرر تھی یعنی اس سے کتے کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور یہ خطرناک ہو جانے والے کتوں کو قابو کرنے کے لیے تھی۔ پھر کتے کو متوجہ کرنے کے لیے ایک ڈاگ فوڈ کا انتخاب کیا۔ اس کے بنانے والوں کا دعویٰ تھا کہ اس کی اشتہا انگیز خوشبو کتے کو سو گز کے فاصلے سے متوجہ کر لیتی ہے۔

تیسرا کام تھا کتے کو کسی ایسی جگہ رکھنا جہاں وہ محفوظ رہے اور کوئی اس تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ جگہ بھی کسی قدر مشکل سے مل گئی۔ نارتھ شور پارک سے کچھ دور شمال میں ہال اوور پارک تھا۔ اس سے ذرا آگے اسی نام کا نیشنل پارک تھا۔ یہ جزائر پر مشتمل تھا اور یہ تمام جزیرے گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ جگہ کسی کو چھپانے کے لیے نہایت موزوں تھی اور نارتھ شور پارک سے زیادہ دور بھی نہیں تھی۔ ہم نے کامیابی سے اس ننھے سے پپی کو بے ہوش کرکے اغوا کیا اور اسے زیرِ زمین پہنچا دیا۔ اس کے لیے ہم نے ہوا سے بھرنے والی کشتی استعمال کی تھی۔ کتے کو قید رکھنے کے لیے اسے زمین میں گڑی زنجیر سے باندھا۔

جب اسے ہوش آیا تو ہم نے اسے پانی دیا اور کتوں کی خوراک کا ایک ڈبا کھول کر ڈش میں ڈال کر اس کے پاس رکھ دیا۔ پانی اور کھانا دو دن کے لیے کافی تھا۔ وہ ناز و نعم میں پلا ہوا تھا اس لیے ہم نے اس کے آرام و آسائش کا ہر ممکن خیال رکھا تھا۔ جیسے اس کے لیے بیٹھنے اور سونے کے لیے ایک کشن مہیا کیا اور زمین پر صاف پلاسٹک شیٹ بچھائی۔ ساتھ ہی کچھ زمین خالی چھوڑ دی تاکہ وہ رفع حاجت آسانی سے کر سکے۔ ہمیں اطمینان تھا کہ اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم دو دن بعد آکر اسے دوبارہ خوراک اور پانی دے سکتے تھے۔ لیکن اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ دوسرے دن خاتون اس کی بازیابی کے لیے اشتہار بانٹتی اور لگاتی نظر آئی۔ اس نے ٹی وی اور ریڈیو پر بھی اعلان کرا دیا تھا۔ ساتھ ہی ہزار ڈالرز کے پُرکشش انعام کا اعلان کیا تھا۔ دوسرے دن شام کے وقت جب سورج غروب ہو چکا تھا، میں کتے سمیت خاتون کے گھر پہنچا۔ میں نے اپنا بہترین سوٹ پہن رکھا تھا اور حلیہ بھی شریفانہ رکھا تھا۔ میں کتے کو شیمپو سے نہلا کر اور صاف ستھرا کرکے لایا تھا کیونکہ اس نے خود کو اچھا خاصا گندا کر لیا تھا۔ خاتون کا کتے کو دیکھتے ہی خوشی سے برا حال ہو گیا اور وہ اسے سینے سے لگائے بار بار چوم رہی تھی۔ میری طرف قطعی توجہ نہیں تھی، بالآخر مجھے خود متوجہ کرنا پڑا۔

"میم! یہ آپ کا کتا ہے نا؟"

"ہاں، نوجوان! یہ میرا ٹولی ہے۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس کی یاد میں میں نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا... میں سو نہیں سکی۔"

"اب آپ کھا بھی سکیں گی اور سو بھی سکیں گی۔ یہ مجھے جاگنگ کے دوران میں جنگل سے ملا اور بہت گندا ہو رہا تھا۔ میں نے اسے صاف بھی کیا ہے۔ اب مجھے اجازت دیں، میں نے آپ کی امانت آپ تک پہنچا دی۔" میں واپسی کے لیے مڑا لیکن میرے کان خاتون کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ حسب توقع آواز آئی۔

"مسٹر... رک جاؤ۔ تم نے نام تو بتایا نہیں؟"

"رابرٹ روبنسن۔" میں نے پہلے سے طے شدہ شریفانہ نام بتایا۔ "میں میامی یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔"

"تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے... ایک منٹ رکو۔" وہ اپنے کتے سمیت اندر گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں نوٹوں کا ایک چھوٹا سا بنڈل تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"نہیں... نہیں، میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا..."

"پلیز۔" اس نے بنڈل میرے ہاتھ میں تھما دیا جو میں نے فوراً پکڑ لیا اور اس کے بعد بھی کچھ دیر انکار کیا مگر خاتون

نے رقم واپس لینے کا کوئی عندیہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ تو مجھے اندر لے جا کر میری میزبانی پر بھی آمادہ تھی لیکن میں نے انکار کیا اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کے دیے انعام سے میں یونیورسٹی کی فیس زیادہ آسانی سے ادا کر سکوں گا۔ اس پر اس نے مجھے پیشکش کی کہ اگر آئندہ بھی مجھے مالی تنگی ہو تو میں بلا جھجک اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ یہ بھی اچھی بات تھی۔ اگر کبھی حالات خراب ہوتے تو خاتون سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے بارہ سو ڈالرز دیے تھے جو انعام سے دو سو ڈالرز زیادہ تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ اسے کتے کی واپسی کی کتنی خوشی تھی لیکن میں نے روبی کو ہزار ڈالرز کا بتایا۔ یوں دو سو ڈالرز میری جیب میں گئے۔ اس کے بعد ہمارا... کام چل نکلا۔ میامی میں دولت مندوں کی کمی نہیں ہے اور نہ ہی کتے پالنے والوں کی کمی ہے۔ ہم دیکھ بھال کر اپنے شکار کا انتخاب کرتے اور پوری پلاننگ سے کام کرتے۔ ہفتے میں ایک کام کافی ہوتا۔ کبھی کبھی ہمارے پاس کئی کتے جمع ہو جاتے کیونکہ مالکان انعام کے اعلان میں تاخیر کرتے تھے۔ کتوں کو ہم اسی جگہ رکھتے تھے۔ زیادہ کتے ہونے سے یہ فائدہ تھا کہ کتوں کو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ البتہ ہم انہیں ایک دوسرے سے فاصلے پر رکھتے تاکہ وہ آپس میں لڑ کر ایک دوسرے کو زخمی نہ کر دیں۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کسی کتے کا مالک سرے سے انعام کا اعلان ہی نہیں کرتا۔ اس صورت میں ہم رسک لے کر کتا اسے واپس کر دیتے تھے اور ساتھ ہی اپنی غربت کا کچھ اس طرح رونا روتے کہ وہ کچھ نہ کچھ دے دیتا تھا۔ اکثر لوگ اعلان کرتے تھے اور انعامی رقم بھی اچھی خاصی ہوتی تھی۔ ایک کتے کے ہم نے دس ہزار ڈالرز بھی وصول کیے تھے۔ حالانکہ اس کا مالک بہت دولت مند نہیں لگ رہا تھا لیکن اس نے بہ خوشی یہ رقم دے دی تھی۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کوئی مالک کج بحثی پر اتر آیا اور بال کی کھال نکالنے لگا کہ کتا ہمارے پاس کیسے آیا؟ اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہم نے کتا اغوا نہیں کیا؟ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ مالک نے مشکوک ہو کر پولیس کو کال کر دی اور روبی کو موقع سے فرار ہونا پڑا۔ ورنہ ہم ہمیشہ کامیاب رہے۔ پولیس کی نوبت نہیں آئی۔ گرفتاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم بہت زیادہ پُراعتماد ہو گئے تھے اگر پولیس سے واسطہ پڑ جاتا تو اس سے بھی نمٹ سکتے تھے۔ مگر پولیس سے کہیں بڑی مصیبت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

مہینے میں تین چار شکار ہاتھ لگنے سے اب ہمارا آرام سے گزارہ ہونے لگا تھا۔ روبی نے ایک اچھا کلب جوائن کر لیا اور پوری توجہ بیس بال پر دے رہا تھا... سوائے چند گھنٹوں کے، جب وہ میرے ساتھ ذمے داریاں نبھاتا۔ ہم نے ساحل کے پاس ایک ہٹ کرائے پر لے لیا تھا اور میں سارا دن مزے سے ٹی وی دیکھتا یا سمندر میں جا کر تیراکی کرتا۔ یہاں بھی کبھی کبھی کوئی اچھی لڑکی مل جاتی جس کے ساتھ کچھ وقت اچھا گزرتا تھا۔ میں نے کوئی مستقل روگ نہیں پالا تھا کیونکہ اس صورت میں ہمارا پول کھلنے کا خطرہ تھا۔ اس لیے اگر کوئی لڑکی گلے پڑنے لگتی تو میں خود اس سے روکھے پن سے پیش آتا، یہاں تک کہ وہ مجھے برا بھلا کہتی ہوئی رخصت ہو جاتی تھی۔ اس ہٹ میں دو بیڈ روم اور ایک لاؤنج تھا۔ تمام سہولیات تھیں۔ کھانا ہم باہر کھاتے تھے، بس کبھی چائے کافی بنانا پڑ جاتی تھی۔

روبی کا مجھے پتا نہیں تھا لیکن میں رقم جمع بھی کر رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کام زیادہ عرصے نہیں چلے گا۔ لوگ ہمیں پہچاننے لگیں گے۔ بہت سے گھروں میں خفیہ کیمرے لگے ہوتے ہیں جن میں ہماری تصویریں بھی آ جاتی ہوں گی اور اگر کوئی مشکوک ہوتا تو پولیس کو ہماری تصویریں دے سکتا تھا۔ اس کے بعد ہماری تشہیر کی جاتی اور پولیس جلد یا بدیر ہم تک پہنچ جاتی۔ اگرچہ ایسا ہوا نہیں تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ ایسا ہو جائے۔ اس لیے میں ابھی سے بُرے وقت کے لیے رقم بچا رہا تھا کہ مجھے یہاں سے بھاگنا پڑے تو میں خالی ہاتھ نہ ہوں۔ برس میں میں نے کوئی تیس ہزار ڈالرز جمع کر لیے تھے۔ میں نے ایک بینک اکاؤنٹ کھلوا لیا تھا اور رقم اسی میں تھی۔ میں اسے کہیں سے بھی آپریٹ کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا خاندانی نام بھی بدل کر ڈربی کیمنز سے ڈربی جان کر لیا تھا اور اسی نام سے ڈرائیونگ لائسنس اور دوسرے کاغذات بنوائے تھے۔ اگر پولیس مجھے تلاش کرتی تو وہ ڈربی کیمنز کو تلاش کرتی۔

اس دن ہم بال اوور پارک میں تھے کیونکہ ہم کتے اس کے پاس ہی چھپاتے تھے اس لیے لاشعوری طور پر ہم نے اس پارک کا انتخاب کم کیا۔ یہاں سے ہم نے صرف کتے اٹھائے تھے۔ مطلب وہ کتے اپنے مالکوں کے ساتھ یہاں آتے تھے۔ درحقیقت ہم نے کوئی واردات پارک میں نہیں کی تھی کیونکہ اس طرح پارک پولیس کی توجہ کا مرکز بن جاتے اور لوگ بھی اپنے کتوں کے حوالے سے محتاط ہو جاتے۔ اس لیے ہم کتے ہمیشہ ان کے گھروں یا آس پاس سے اٹھاتے تھے لیکن اس روز پہلی بار ایسا ہوا کہ ہم اپنا اصول توڑنے پر مجبور ہو گئے اور ہمیں مجبور اس چھوٹے سے سفید رنگ کے پیڈل ڈاگ نے کیا تھا جو اچانک ہی ان جھاڑیوں میں گھس آیا جہاں ہم موجود تھے۔ دراصل ہم جھاڑیوں کے

دوسری طرف بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لنچ کا وقت تھا اور ہم برگر کھانے میں مصروف تھے۔ اچانک جھاڑیوں کے دوسری طرف سے کتا برآمد ہوا اور ہمارے پاس آ کر نہایت دوستانہ انداز میں منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ روبی نے جلدی سے اٹھ کر جھاڑیوں کے دوسری طرف دیکھا۔

"اس کے پیچھے کوئی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"موقع اچھا ہے... ہمارے پاس اسپرے بھی ہے اور بیگ بھی۔"

میں نے اعتراض کیا۔ "بالکل نہیں... یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔"

"اصول وصول کچھ نہیں... موقع اچھا ہے۔ اس کے گلے میں پٹا ہے اور میں جانتا ہوں یہ بہت اعلیٰ نسل کا مہنگا کتا ہے۔ کوئی شوقین اسے ایک لاکھ ڈالرز میں بھی خرید سکتا ہے۔"

میں حیران ہوا۔ "ایک لاکھ ڈالرز ہے اس کی قیمت؟"

"بالکل۔" روبی اس کا پٹا ٹٹولتے ہوئے بولا۔ "اس پر کسی ایڈ پٹ کا نام لکھا ہے اور ایک فون نمبر بھی ہے۔"

"ایڈ پٹ۔" میں نے کہا۔ مجھے یہ نام جانا پہچانا لگا۔

"امکان یہی ہے۔ یہ ایڈ پٹ بہت دولت مند ہوگا اور یقیناً اس کتے کے عوض اچھے خاصے انعام کا اعلان کرے گا۔"

سچ پوچھیں تو قطع نظر میری جیب ذرا ہلکی ہو رہی تھی اور مجھے رقم کی ضرورت تھی اور اسی لیے ہم اس پارک میں تھے۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔ دور ساحل پر کچھ لڑکیاں والی بال کھیل رہی تھیں اور کچھ لڑکے ان کو محویت سے دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کسی کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی، میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "اوکے... تم ایک بار ذرا جھاڑیوں کے اس طرف جا کر دیکھو کہ کوئی آ تو نہیں رہا ہے۔"

روبی گیا اور ایک منٹ بعد واپس آ گیا۔ "دور دور تک ایسا فرد نہیں ہے جو ذرا بھی پریشان ہو اور کچھ تلاش کر رہا ہو۔"

"اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کتے کا مالک نہایت بے پروا ہے اور اسے کتے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ایسے شخص سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اسے تلاش کرنے کی زحمت کرے گا اور اس کے لیے انعام کا اعلان کرے گا۔"

"وہ کرے گا۔" روبی نے یقین سے کہا۔ "یہ قیمتی کتا ہے اور کوئی اس سے یونہی دست بردار نہیں ہوگا۔ یہ بعد کی بات ہے، ابھی تو تم اپنا کام کرو اور اسے اسپرے کرو۔"

میں نے اسپرے نکالتے ہوئے روبی کو ایک بار پھر نگرانی پر تعینات کیا اور کتے کو پچکار کر بینچ کے پیچھے لے آیا تاکہ کوئی اتفاق سے بھی اس طرف دیکھے تو کتے کو بے ہوش کر کے بیگ میں ڈالنے کی کارروائی کا منظر نہ دیکھ سکے۔ ادھر میں نے کتے پر اسپرے کیا اور ادھر روبی نے کسی قدر بدحواسی سے کہا۔ "ایک لمبا تڑنگا شخص اسی طرف آ رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی میں نے عجلت میں کتے کو بیگ میں ٹھونسا اور بیگ بینچ کے نیچے کر دیا۔ اسپرے بھی واپس رکھ لیا۔ اسپرے کی بو خاصی تیز تھی لیکن مجھے امید تھی کہ ساحل کی طرف سے چلتی تیز ہوا بو اڑا لے جائے گی۔ روبی واپس بینچ پر آ بیٹھا اور ہم پریشانی چھپاتے ہوئے برگر کھانے لگے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے لمبا تڑنگا شخص کسی ڈائمنڈ کو پکارتا ہوا نمودار ہوا اور اس نے نہایت مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ وہ صورت سے خطرناک لگ رہا تھا۔ اب میں پچھتا رہا تھا کہ میں نے روبی کی بات کیوں مانی؟ اگر ڈائمنڈ اسی کتے کا نام تھا تو وہ ہمارے پیروں کے نیچے مست خرام تھا۔ اگر وہ ہمارے پاس سے برآمد ہو جاتا تو یقیناً ہمارے حق میں اچھا نہ ہوتا۔ لمبا تڑنگا آدمی ہمارے پاس آیا اور کتے کی طرح ناک اٹھا کر سونگھا۔ میرا دل حلق میں آ گیا۔ کیا اسے اسپرے کی بو آ رہی تھی؟ پھر وہ کسی بلڈاگ کی طرح غرایا۔ "تم لوگوں نے ڈائمنڈ کو دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے شرافت سے کہا ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے پوچھوں کہ ڈائمنڈ اس کا بھائی ہے۔ اگر ڈائمنڈ سچ مچ ہمارے پاس نہ ہوتا تو میں شاید سوال کر بھی لیتا۔ "ویسے یہ ڈائمنڈ کون ہے؟"

"چھوٹا سا کتا ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر تفصیل سے ڈائمنڈ کا حلیہ بتایا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں، اس حلیے کا کوئی کتا میں نے نہیں دیکھا۔"

میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس موقع پر روبی نے حاضر دماغی سے کام لیا اور مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ "شاید وہاں میں نے اس قسم کے کتے کی ایک جھلک دیکھی تھی لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ وہی کتا تھا جسے تم تلاش کر رہے ہو۔"

یہ سنتے ہی لمبا تڑنگا شخص جس کی عقل یقیناً اس کے سر سے کچھ فاصلے پر تھی، اس طرف دوڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی ہم نے بچے کھچے برگر جھاڑی کی طرف اچھالے۔ روبی نے کتے کا بیگ پشت پر لادا اور ہم مخالف سمت میں روانہ ہو

گئے۔ اتفاق سے ہماری گاڑی بھی اسی طرف پارک تھی۔ طے ہوا کہ ہم کتے کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا کر ہٹ کی طرف جائیں گے جو مزید آگے ایونچر کے علاقے میں تھا۔ اب پارک کی طرف واپس آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ روبی پہلے ہی لمبے تڑنگے شخص کو خطرناک قرار دے چکا تھا۔ مجھے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ ایڈپٹ بھی کچھ ٹھیک شخص نہیں ہے۔ بہر حال ہم نے کامیابی سے ڈائمنڈ کو زیرِ زمین ٹھکانے تک پہنچایا اور اس کے بعد ہٹ پہنچ گئے۔ شام تک فکرمند رہے پھر روبی ایک میچ میں شرکت کے لیے چلا گیا اور میں ٹی وی دیکھتا رہا۔ ڈنر کے بعد کچھ دیر سمندر میں تیراکی کی اور پھر سو گیا۔ اگلی صبح سورج نکلنے کے خاصی دیر بعد روبی نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔

"کیا ہوا... خیریت تو ہے؟"

"کتا گرے ایڈپٹ کا ہے۔" اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

یہ سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ مجھے ایڈپٹ کا نام کیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ گرے ایڈپٹ میامی بلکہ ریاست فلوریڈا کا نامی گرامی مافیا باس تھا۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ سے لے کر انسانوں کی اسمگلنگ تک درجنوں غیر قانونی کام کرتا تھا۔ امریکا میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کے لیے اس کا نام ایک مثال کے طور پر لیا جاتا تھا کہ وہ آج تک کسی جرم میں گرفتار نہیں ہوا اور نہ کسی عدالت میں پیش ہوا۔ کہا جاتا تھا کہ ریاست کے سینیٹرز اور کانگریس مین اس کی نظرِ کرم کے محتاج تھے۔ اسی طرح بعض سرکاری افسران اس سے وظیفہ لیتے تھے اور یہ سب اس کا تحفظ کرتے تھے۔ اس کے پاس خطرناک آدمیوں کی پوری فوج تھی جو اس کے ایک اشارے پر کسی کی ہڈیاں پسلیاں توڑنے سے لے کر اسے دنیا سے رخصت کرنے تک سب کر سکتے تھے۔ میں نے بے یقینی سے روبی کی طرف دیکھا۔ "تمہیں یقین ہے؟"

"یقین..." وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "آ کر دیکھ لو ٹی وی پر... ایڈپٹ ہمارے بارے میں کیا کہہ رہا ہے؟"

روبی نے چینل پوز کر دیا تھا۔ پھر اس نے اسے ذرا ریوائنڈ کر کے چلایا۔ گرے ایڈپٹ نے اپنے کتے کا لائف سائز پوسٹر اٹھا رکھا تھا اور اس کے پیچھے وہی لمبا تڑنگا شخص منہ لٹکائے کھڑا تھا جو ڈائمنڈ کو تلاش کرتا ہوا آیا تھا۔ یقیناً وہ اس کتے کا خدمت گار تھا۔ ایڈپٹ کہہ رہا تھا۔ "جن دو نوجوانوں نے میرے کتے کو اغوا کیا ہے، میں ان کو خبردار کر رہا ہوں... میں جلد یا بدیر انہیں تلاش کر لوں گا اور انہیں میرے کتے ڈائمنڈ کے اغوا کا حساب دینا ہوگا۔"

یہ سن کر ہم دونوں کو پسینا آگیا۔ ایڈپٹ کی دھمکی سننے کے بعد رپورٹرز نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا وہ یقین سے کہہ سکتا ہے کہ اس کے کتے کو دو نوجوانوں نے اغوا کیا ہے اور یہ کہ وہ انہیں ذاتی طور پر نمٹنے کی دھمکی دے رہا ہے؟ اس پر ایڈپٹ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا اور اس نے تردید کی کہ اس نے ایسی کوئی دھمکی دی ہے لیکن اس کے الفاظ اور انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ دھمکی دے رہا ہے۔ اس نے یقیناً اپنے گرگے سے ساری معلومات حاصل کی تھیں۔ اس کے بعد اس کے لیے یہ جاننا دشوار نہیں تھا کہ اس کا کتا کیسے غائب ہوا۔ پارک بڑا ہے لیکن ایسی جگہیں کم ہیں جہاں ایک چھوٹا کتا نظروں سے اوجھل رہ سکے۔ نیز وہ چھوٹا اور کمزور کتا تھا جو زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا اس لیے لازماً اسے کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ اغوا کے لیے دو مشکوک ترین امیدوار ہم دونوں ہی تھے۔ بعد میں لمبے تڑنگے آدمی نے جب تفصیل سے بتایا ہوگا تو اسے ہمارے پیروں تلے بیگ یاد آیا ہوگا اور اسپرے کی بو بھی جو اس نے وہاں آتے ہی محسوس کر لی تھی۔ خوف زدہ میں بھی تھا لیکن روبی زیادہ ہی دہشت زدہ تھا۔

"ڈربی! یہ ہمیں تلاش کر لے گا اور پھر ہماری لاشیں میامی کے کھلے سمندر میں پائی جانے والی شارک مچھلیوں کی خوراک بن جائیں گی۔"

ایڈپٹ کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کے ناپسندیدہ لوگ بالآخر شارک کی خوراک بن جاتے ہیں۔ روبی اسی کا حوالہ دے رہا تھا۔ حالانکہ یہ لاش ٹھکانے لگانے کا کوئی بہت اچھا طریقہ نہیں ہے کیونکہ شارک مچھلیاں خود شکار کر لی جاتی ہیں اور ان کے پیٹ سے انسانی اعضا بھی مل جاتے ہیں۔ کئی قاتل صرف اس لیے پکڑے گئے تھے کہ انہوں نے مقتول کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے شارک کے معدے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں کسی ویرانے میں زمین میں لاش دبا دینا زیادہ محفوظ تھا۔ عام طور سے جب تک لاش دریافت ہوتی ہے، قاتل بھی دنیا سے رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ یہ وقت لاشیں ٹھکانے لگانے کے بہترین طریقے سوچنے کا نہیں ہے۔ میں ٹی وی کی طرف متوجہ ہوا۔ آخر میں ایڈپٹ نے کہا۔

"ان نوجوانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ڈائمنڈ کو خاموشی سے واپس کر دیں ورنہ انہیں بڑے دردناک مراحل

سے گزرنا پڑے گا۔ یاد رہے فلوریڈا کی عدالتیں مقدمات کو بہت طول دیتی ہیں۔"

اس نے بڑی چالاکی سے اپنی دھمکی کا رخ عدالتوں کی طرف موڑ دیا تھا۔ جیسے ہی خبر مکمل ہوئی، روبی نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "ہمیں کتے کو واپس کر دینا چاہیے۔"

"اتنی جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ میں اتنی دیر میں اپنے اعصاب پر قابو پا چکا تھا۔ میں ایک سال چھوٹا ہونے کے باوجود اسی لیے باس تھا کہ میں روبی کی نسبت زیادہ مضبوط اعصاب رکھتا تھا۔ وہ جلد گھبرا جاتا اور دیر تک گھبراتا رہتا۔ اس کے مقابلے میں میں خود پر جلد قابو پا لیتا جیسا کہ اس وقت ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملہ اتنا سنگین نہیں ہے جتنا کہ لگ رہا ہے۔ میں نے روبی کی طرف دیکھا۔ "سوال یہ ہے کہ وہ اتنا ہی پُراعتماد ہے کہ ہم تک پہنچ جائے گا تو اسے یہ بات ٹی وی پر کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہو سکتا ہے وہ ہم سے چوہے بلی والا کھیل، کھیل رہا ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایڈپٹ دشمنوں کو پالنے کے بجائے ان کا خاتمہ کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ چوہے بلی والا آدمی نہیں ہے۔ وہ ایک جھٹکے میں جان لینے والا شخص ہے۔"

"تب وہ ٹی وی پر کیوں آیا ہے؟" روبی نے الٹا سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں اتنی آسانی سے تلاش نہیں کر سکتا اس لیے... ہمیں دھمکا رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے ڈائمنڈ اسے واپس مل جائے۔"

"اس کے لیے آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ انعام کا اعلان کر دیتا۔"

"وہ ایسا ہی کرتا اگر اسے ہمارے بارے میں نہ معلوم ہوتا لیکن وہ مافیا باس ہے۔ اس کی انا اسے اجازت نہیں دے رہی ہے کہ وہ ہمیں لالچ دے کر اپنا کتا واپس لے... اس لیے وہ دھمکی سے کام نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ اصل میں ہمیں تلاش نہیں کر رہا ہے؟"

"وہ تلاش کر رہا ہوگا لیکن اسے معلوم ہے کہ ہمیں تلاش کرنا آسان نہیں ہے... اس لیے ہمیں بدحواس ہو کر ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے ہم اس کے سامنے آجائیں۔"

"میرا تو خیال ہے ہمیں فوری طور پر روپوش ہو جانا چاہیے۔ اس غلط فہمی میں یہاں بیٹھے رہے تو اس کے ہاتھ آجائیں گے اور وہ معاف نہیں کرتا۔"

"میں بھی جانتا ہوں لیکن یہاں سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے؟ اگر ہم کسی ہوٹل یا کسی اور جگہ جا کر رہے، تب بھی امکان ہے کہ اس کے آدمیوں کے ہاتھ آجائیں۔ یہ تو یقینی ہے کہ وہ ہمارے ٹھکانے کے بارے میں نہیں جانتا۔ ورنہ اب تک ہم اس کے سامنے ہوتے اور اس کے جلاد ہم سے کتے کے بارے میں پوچھ رہے ہوتے۔"

"وہ جان تو سکتا ہے۔" روبی نے لرز کر کہا۔ "میں کہہ رہا ہوں اس کتے سے جان چھڑاؤ۔"

"اس کا امکان بہت کم ہے۔ سمجھ لو اس سے کم ہے کہ ہم باہر نکلیں اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں آجائیں۔"

روبی بڑی مشکل سے پُرسکون ہوا۔ اس کے لیے مجھے نہار منہ اسے دو گلاس برانڈی پلانا پڑی تھی۔ طے ہوا کہ ہم جو کریں گے، وہ سوچ سمجھ کر کریں گے... اور فی الحال تو "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ یعنی ایڈپٹ کی طرف سے دوسرا ردِعمل آنے کا۔ روبی کو یقین نہیں تھا کہ اس کا ردِعمل سامنے آئے گا۔ لیکن مجھے یقین تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ہمیں ایک دو دن انتظار کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم سوچیں گے کہ پھر کیا کریں۔"

ہم کتے کے لیے دو دن کے کھانے پانی کا انتظام کر آئے تھے اس لیے دوسرے دن جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تیسرے دن ہم وہاں گئے اور کتے کو خوراک اور پانی دے کر آئے۔ ابھی تک ایڈپٹ کی طرف سے مزید کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ روبی کا کہنا تھا کہ وہ ہمیں تلاش کر رہا ہے اور جلد یا دیر سے اس میں کامیاب بھی ہو جائے گا۔ اسے مزید کوئی ردِعمل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے برعکس مجھے یقین تھا کہ ایڈپٹ دوبارہ کچھ نہ کچھ کہے گا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کتا محفوظ ہے اور وہ اسے واپس حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ایک چال چلی تھی اور ہمیں دھمکی کے ساتھ کتا واپس کرنے پر معاملہ ختم ہونے کا لالچ بھی دیا تھا۔ اب وہ بھی سکون سے اپنی دھمکی اور چارے کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ اعصاب کا کھیل ہے۔ اس میں جس کے اعصاب جواب دے گئے، وہ بازی ہار جائے گا۔ ہم کمزور فریق تھے۔ بازی ہارتے تو جان بھی ہار سکتے تھے جبکہ ایڈپٹ مضبوط دشمن تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ اپنے کتے کا نقصان ہوتا۔ ہمارے پاس کمزور پتے تھے اور ان میں سب سے مضبوط پتا ڈائمنڈ تھا۔ اسی کے بل پر ہمیں ساری بازی

کھیلنی تھی۔ روبی دو دن سے باہر نہیں گیا تھا۔ اس نے پریکٹس میں حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ پریشانی میں وہ مجھے بتانا بھول گیا تھا کہ گزشتہ میچ میں اس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر ایک سیکنڈ لیگ کلب نے اسے اپنی طرف سے کھیلنے کی پیشکش کی تھی۔ پروفیشنل لیگ کھیلنے کے لیے یہ اچھی پیشکش تھی مگر اس دوران میں ایڈ پٹ والا معاملہ کھڑا ہو گیا۔ روبی زور دے رہا تھا کہ ہمیں کتا واپس کر کے معاملہ ختم کر دینا چاہیے۔

مگر میں اب اسے کسی اور نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ایڈ پٹ بہ ظاہر ملین ڈالرز کا مالک تھا لیکن اس کے پاس بے تحاشا بلیک منی تھی۔ اس لحاظ سے وہ بلین ڈالرز کا مالک تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے کتے کے عوض ایک دو لاکھ ڈالرز آسانی سے دے سکتا تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ دے سکتا تھا۔ اگر اسے اپنا کتا عزیز تھا اور اس نے اسے کتا برائے کتا نہیں سمجھا ہوا تھا۔ میں نے یہ خیال روبی کو نہیں بتایا تھا بلکہ اسے ڈرایا کہ اگر ہم نے کتا واپس کرتے ہوئے کوئی غلطی کی اور ایڈ پٹ نے ہمیں پکڑ لیا تو ہماری خیر نہیں ہو گی۔ اس لیے معاملے کو جوں کا توں رکھنا ہمارے مفاد میں ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ ایڈ پٹ کسی انعام کا اعلان کر ہی دے۔ روبی نے نکتہ اٹھایا۔

''جبکہ وہ ہمارے بارے میں اچھی طرح جان گیا ہے تو پھر اس سے انعام لینے کون جائے گا اور جائے گا تو واپس کیسے آئے گا؟''

''اس پر بھی غور کر لیں گے مگر یاد رکھو، عجلت میں اٹھایا ہوا کوئی بھی قدم ہمیں کسی ناقابلِ حل قسم کی مشکل میں پھنسا سکتا ہے۔''

''میرے کیریئر کا کیا ہو گا؟''

''اس کی فکر مت کرو۔ ویسے بھی سیزن ختم ہونے والا ہے۔ اب لیگ کئی مہینے بعد شروع ہو گی۔ اگر تم ہاں بھی کر دو، تب بھی اس سیزن میں تمہارے کھیلنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔ تم چاہو تو اپنی رضا مندی دے سکتے ہو۔ کلب تم بعد میں بھی جوائن کر سکتے ہو۔''

روبی یہ سن کر خوش ہو گیا۔ اس نے فوری طور پر کلب کے پروموٹر سے رابطہ کیا اور کلب کی پیشکش قبول کر لی۔ پروموٹر نے اسے بتایا کہ وہ دو دن بعد کلب کے دفتر آ جائے تاکہ اس سے معاہدہ کیا جا سکے۔ روبی نے مسرور لہجے میں کہا۔ ''مجھے کم سے کم بھی سالانہ ڈھائی لاکھ ڈالرز معاوضہ ملے گا اور پروفیشنل لیگ کھیلنے کا موقع الگ ملے گا۔''

میں نے اسے مبارک دی۔ ''دوست... کم سے کم تم ٹھکانے لگو گے۔''

''لیکن میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''ہم ہمیشہ کے دوست ہیں۔''

''نہیں دوست... تم جو کیریئر شروع کرنے جا رہے ہو، اس میں پرانی چیزوں کی گنجائش نہیں ہو گی۔ اب تم ایک پبلک فگر بن جاؤ گے۔ لوگ اور فین تمہارے ماضی کے بارے میں جاننا چاہیں گے اور تمہیں اپنے ماضی سے مجھے خارج کرنا ہو گا۔'' میں نے خلوص سے کہا تو روبی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''دوست... میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

''پہلے تم کلب سے معاہدہ تو کر دو، اس کے بعد ہم فیصلہ کرتے ہیں۔'' میں نے اسے ٹالا۔ روبی میرا دوست تھا اور میں سچ مچ خلوص کے ساتھ اسے یہ سب کہہ رہا تھا۔ ہماری دوستی کوئی قابلِ رشک بات نہیں تھی۔ آنے والے وقت میں اگر روبی اوپر جاتا تو ہماری دوستی اس کے لیے رکاوٹ بن سکتی تھی۔ اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف ایڈ پٹ کا معاملہ سامنے آنے سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ اب فلوریڈا ہمارے لیے خطرناک ہو گیا ہے۔ روبی مجھ سے الگ ہو جاتا اور اپنا حلیہ بدل لیتا تو اس کے لیے اتنا خطرہ نہ رہتا۔ میں بھی یہاں سے چلا جاتا لیکن ہم دونوں کا یہاں ایک ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ایڈ پٹ کے آدمی اگر دلجمعی سے تلاش کرتے تو ہم تک پہنچ سکتے تھے۔ صرف ایڈ پٹ کے آدمی نہیں تھے۔ میامی کے ہزاروں جرائم پیشہ افراد بھی اس کی مدد کر سکتے تھے۔ اگر وہ ہماری نشان دہی پر معقول انعام کا اعلان کر دیتا تو یقیناً ہزاروں افراد ہماری تلاش میں لگ جاتے۔ ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ہم الگ رہیں۔

اگلے روز روبی اہتمام سے تیار ہو کر کلب کے دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ گاڑی بھی وہی لے گیا تھا۔ ہمارے پاس دو سال پرانی اسپورٹس کار تھی جو بہت اچھی حالت میں تھی۔ اسے دیکھ کر بھی لوگ ہم سے متاثر ہو جاتے تھے۔ روبی کے جاتے ہی میں بھی گھر سے نکلا اور بس کے ذریعے میامی گارڈنز پہنچا۔ یہ شہر کا وسطی اور بہت پوش علاقہ ہے۔ میرا ارادہ ایڈ پٹ سے بات کرنے کا تھا۔ ایک فون بوتھ سے میں نے ایڈ پٹ کا نمبر ملایا اور اس سے پہلے منہ پر گرد اور دھوئیں سے بچانے والا نقاب پہن لیا۔ اب میامی میں بھی لوگ آلودگی سے بچنے کے لیے ایسے نقاب پہنے نظر آتے ہیں اس لیے کوئی دھیان نہیں دیتا۔ رابطہ ہونے پر میں نے ایڈ پٹ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں جان بوجھ کر آواز بنا کر بول رہا تھا۔

''معاملہ اس کے کتے کا ہے... اگر وہ ایک منٹ میں فون پر نہیں آیا تو میں کال منقطع کر دوں گا اور اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی اپنے پیارے کتے کی صورت نہیں دیکھ سکے گا۔''

اس دھمکی کے بعد ایڈ پٹ ایک منٹ سے پہلے فون پر آ گیا۔ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے میرا کتا اغوا کیا ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''میں چاہ رہا تھا کہ تم اپنی ٹی وی والی حماقت سے فارغ ہو جاؤ اور چاہو تو ان دو لڑکوں کو بھی تلاش کر کے دیکھ لو تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے، تب میں تم سے رابطہ کروں۔''

''کیا ثبوت ہے کہ ڈائمنڈ تمہارے پاس ہے؟''

''یہ نمبر جس پر میں کال کر رہا ہوں، یہ ڈائمنڈ کے پٹے پر تمہارے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ حیرت ہے، تم نے پٹے پر کتے کا نام نہیں لکھوایا۔''

''اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' وہ غرایا۔

''ٹھیک ہے، اس سے نہیں ہے لیکن تمہارے کتے سے تو ہے، وہ میرے پاس ہے۔''

''سنو، تم جو کوئی بھی ہو تم مجھے جانتے ہو نا...''

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم میرے ساتھ کیا کر سکتے ہو۔ تم مجھے قتل کر سکتے ہو، میری لاش کے ٹکڑے کر کے شارک مچھلیوں کو کھلا سکتے ہو، اس سے بھی زیادہ کر سکتے ہو لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہارے ہاتھ آؤں۔''

اسے چپ لگ گئی پھر اس نے کسی قدر بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''یہ میں تمہیں آدھے گھنٹے بعد بتاؤں گا، اسی فون پر موجود رہنا۔''

مجھے کال کرتے ہوئے پانچ منٹ ہونے کو آئے تھے اور میں نے طے کر لیا تھا کہ ایک کال پانچ منٹ سے زیادہ کی نہیں کرنی ہے۔ ایڈ پٹ کا اثر رسوخ بہت زیادہ تھا اور وہ اس فون بوتھ کا سراغ لگا سکتا تھا۔ میں نے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے۔ فون بوتھ سے نکل کر دوبارہ بس پکڑی اور ویسٹ ہل ریور تک آیا۔ یہاں ایک الگ تھلگ فون بوتھ سے میں نے دوبارہ ایڈ پٹ کا نمبر ملایا۔ اس بار وہ خود فون سے لگا بیٹھا تھا۔ ''ہاں بولو... کیا چاہتے ہو؟''

''صرف پانچ لاکھ ڈالرز۔'' میں نے کہا تو وہ چلا اٹھا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے... جانتے بھی ہو یہ کتنی رقم ہے؟''

''تم جیسے ارب پتی کو صرف نصف ملین ڈالرز کے لیے اس طرح نہیں چلانا چاہیے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ میری اوقات سے زیادہ ہے لیکن تمہارے لیے نصف ملین ڈالرز کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے کھسیا کر کہا۔ ''یہ بہت بڑی رقم ہے۔''

''لیکن کیونکہ تمہارا کتا میرے پاس ہے اس لیے اب یہ بڑی رقم نہیں ہے۔''

''اس کتے کی مالیت ڈیڑھ لاکھ ڈالرز ہے اور میں اس کے بدلے تمہیں پانچ لاکھ ڈالرز ادا کروں؟''

''ہاں کیونکہ تم کر سکتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اہمیت کتے کی مالیت کی نہیں ہے، اس کی ہے کہ وہ تمہارا کتا ہے۔''

''اس صورت میں تم ڈائمنڈ کو اپنے پاس رکھو... میں تمہیں تلاش کرتا ہوں اور کبھی نہ کبھی میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''افسوس تم ارب پتی ہو کر بھی اندر سے وہی ایڈ پٹ رہے جو کبھی کچرے سے کھانے کی چیزیں چن کر اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ تم نے بے چارے کتے کو بھی ڈالرز کے حساب سے تولا۔''

''تم جو چاہے سمجھو۔'' وہ گویا دانت پیس کر بولا۔ ''لیکن یاد رکھنا، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔''

''ایڈ پٹ! اگر تم نے مجھے پانچ لاکھ ڈالرز ادا نہ کیے تو تمہارے کتے کی ادھڑی ہوئی لاش میامی کے کسی مصروف ترین علاقے میں نظر آئے گی اور اس پر لکھا ہو گا کہ ایڈ پٹ کو اپنے کتے سے زیادہ رقم پیاری تھی۔ تم سوچ لو کہ تمہاری ساکھ پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟'' میں نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور یہاں سے بھی اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر کے روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے کال نہیں کی۔ میں ایڈ پٹ کو سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ میں کھانے پینے کا سامان لے کر واپس ہٹ پہنچا تو روبی آ گیا تھا اور بہت خوش لگ رہا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

''میں کامیاب رہا۔ اگلے سیزن میں میں کلب کی طرف سے کھیلوں گا۔''

میں بھی خوش ہو گیا۔ ''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ معاہدہ کتنے عرصے کا ہے اور تمہیں کیا دیں گے؟''

''دو سال کا معاہدہ ہے اور مجھے پہلے سال دو لاکھ پچیس ہزار ڈالرز ملیں گے۔ اس کے ساتھ نئی کار اور رہائش بھی ملے گی۔ اگلے سال میری کارکردگی کے لحاظ سے معاوضہ

دوبارہ طے کیا جائے گا۔" روبی جوش و خروش سے بتا رہا تھا پھر وہ چونکا۔ "تم کہاں گئے تھے؟"

"کھانے پینے کا سامان لینے گیا تھا، سب ختم ہو گیا ہے۔" میں نے شاپرز کی طرف اشارہ کیا تو وہ مطمئن ہو گیا۔ روبی کا اصرار تھا کہ میں اس کے ساتھ رہوں لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ روبی کے لیے نئی زندگی کا آغاز تھا، وہ اس دلدل سے نکل جاتا تو اچھا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیکار میں رہتا کیونکہ میں کچھ کر نہیں سکتا تھا اور اسے مجھے بھی وقت دینا پڑتا جبکہ ابھی اسے اپنی ساری توجہ اپنے کیریئر پر دینی چاہیے تھی۔ یہ چیز بعد میں اسے کھٹکتی اور ہماری دوستی بہت بُرے انداز میں ختم ہوتی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح جدا ہوں۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ابھی تو اس میں وقت ہے، سوچیں گے۔"

"وقت نہیں ہے۔ پہلی تاریخ کو مجھے کلب کی جانب سے دی گئی رہائش میں منتقل ہونا ہے۔ اس کے بعد مجھے کلب میں شامل کرنے کی تقریب ہوگی۔ اس میں باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔"

مجھے بیس بال سے صرف دیکھنے کی حد تک دلچسپی تھی اس لیے مجھے معلوم نہیں تھا کہ روبی اتنا اچھا کھلاڑی بن گیا ہے کہ اسے آغاز میں اتنی اچھی پیشکش ہوئی تھی۔ پہلی تاریخ آنے میں ابھی وقت تھا۔ مجھے امید تھی کہ ایڈپٹ والا معاملہ اس دوران میں کسی نہ کسی کروٹ بیٹھ جائے گا۔ اس سے رقم ملتی یا نہیں، اس کے بعد میں خاموشی سے غائب ہو جاتا اور روبی کو بھی پتا نہیں چلتا کہ میں کہاں گیا۔ سچی بات ہے کہ میں نے خود ابھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ فلوریڈا سے نکل کر میں کسی ایسے علاقے کا رخ کرتا جہاں اسپینش کمیونٹی نہ ہو۔ گرے ایڈپٹ اسپینش نژاد تھا اور اسپینش لوگ آپس میں ایک دوسرے کی بہت مدد کرتے ہیں۔ روبی مجھے ملاقات کی تفصیل بتا رہا تھا۔ اس کی ملاقات کلب کے کوچ اور کھلاڑیوں سے بھی ہوئی تھی اور اسے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔ میں خالی ذہن کے ساتھ اس کی بات سن رہا تھا۔ اس نے بھی محسوس کر لیا۔

"ڈربی! کیا بات ہے... تم پریشان ہو؟"

"ہاں، ڈائمنڈ کا معاملہ طول کھینچ رہا ہے۔"

"میں نے کہا تھا کہ اسے آزاد کر دو۔"

"اتنی آسانی سے نہیں۔ ہم جب بھی یہ کام کریں گے، پوری احتیاط سے کریں گے۔ کوئی غلطی ہماری نشان دہی کر دے یہ تمہارے لیے تباہ کن ہوگا کیونکہ اب تم ایک پبلک فگر بننے جا رہے ہو۔ میں روپوش ہو سکتا ہوں، یہ جگہ چھوڑ کر جا سکتا ہوں... مگر تم نہیں۔"

روبی فکر مند ہو گیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ کتا ہمارے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا ہے۔"

"اس میں قصور کتے کا نہیں، ہمارا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "پہلی بار ایسا ہوا کہ ہم نے کوئی کام ہوم ورک کے بغیر کیا اور ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔"

اگلے دن میں اکیلا ڈائمنڈ کو خوراک اور پانی دینے گیا۔ وہ پہلے بہت پریشان تھا اور مسلسل بھونک کر احتجاج کر رہا تھا مگر اب وہ عادی ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر دم ہلائی اور فریادی آوازیں نکالتا رہا کہ اسے کھانے کو دیا جائے۔ سائز سے قطع نظر اس کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ اس نے پورا برتن صاف کر دیا تھا۔ میں نے اسے اپنے سامنے خوراک دی۔ وہ خوش ہو کر کھانے لگا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو میں نے اس کا برتن دوبارہ بھر دیا۔ اب وہ دو دن آرام سے گزارہ کر سکتا تھا۔ میں کچھ دیر اس کے ساتھ رہا، اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ عادات کے لحاظ سے مہذب کتا تھا۔ اس نے کچی مٹی میں لوٹ کر خود کو گندا نہیں کیا تھا۔ اسی طرح اس نے رفع حاجت کے لیے گڑھا کھود کر اسے دوبارہ بند بھی کر دیا تھا۔ دوسرے کتے گڑھا ایسے ہی چھوڑ دیتے تھے اور کچھ سرے سے گڑھا ہی نہیں کھودتے تھے۔ ان کا کیا دھرا ہمیں صاف کرنا پڑتا تھا۔ بہرحال، یہ کاروبار کا ایک حصہ تھا۔ کتے سے باتیں کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر ایڈپٹ نے میرا مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کیا تو کیا میں اس معصوم کتے کے ساتھ وہ سلوک کر سکوں گا جس کی ایڈپٹ کو دھمکی دی تھی؟ میرے ضمیر نے ماننے سے انکار کر دیا۔ میں کتے کے ساتھ بد سلوکی نہیں کر سکتا تھا۔

میں ہالی اوور پارک سے روانہ ہوا اور میامی شہر پہنچا۔ اس بار میں نے ویسٹ پارک کا انتخاب کیا تھا۔ ایک فون بوتھ سے ایڈپٹ کو کال کی۔ وہ کسی قدر تاخیر سے آیا تھا۔ میں نے بلاتمہید پوچھا۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں تمہارا مطالبہ پورا کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ ڈائمنڈ زندہ اور ٹھیک ہے؟"

"ثبوت مل جائے گا۔"

"جب مجھے ثبوت مل جائے گا تو میں ادائیگی بھی کر دوں گا۔"

"میں جلد ثبوت مہیا کر دوں گا۔ تم پانچ لاکھ ڈالرز، ڈالرز کے پرانے نوٹوں کی صورت میں تیار رکھو۔ نوٹ کسی

بریف کیس میں نہیں بلکہ کھلے پلاسٹک شاپر میں ہوں۔ ... لینے کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ ایڈپٹ مجھ سے کتے کی زندگی کا ثبوت مانگے گا اس لیے میں نے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے اس کی تصاویر لے لی تھیں۔ یہ تصویریں اس طرح لی تھیں کہ پس منظر نہ آئے اور دیکھنے والا اندازہ نہ کر سکے کہ کتا کہاں ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک فوٹو شاپ سے ان تصاویر کے پرنٹ نکلوائے اور انہیں ایک لفافے میں ڈال کر پوسٹ کر دیا۔ میں نے اس بار بھی فنگر پرنٹس کا خاص خیال رکھا تھا۔ اگر میں اسے کوریئر کرتا تو مجھے خود جانا پڑتا اور اس صورت میں نہ صرف میرا نام آ جاتا بلکہ پوسٹ آفس میں لگے کیمرے بھی مجھے ریکارڈ کر لیتے۔ آسان طریقہ یہ تھا کہ پہلے سے ٹکٹ لگے لفافے میں ڈال کر کسی بھی لیٹر بکس میں ڈال دیا جائے۔ پتا بھی میں نے الٹے ہاتھ سے لکھا تھا اس لیے رائٹنگ پہچان لیے جانے کا بھی امکان نہیں تھا۔ فلوریڈا میں ڈاک کا نظام قابلِ رشک نہیں ہے لیکن مجھے امید تھی کہ کل تک ایڈپٹ تک تصاویر پہنچ جائیں گی۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ اس سے زیادہ اپنے اور روبی کے تحفظ کی فکر تھی۔ ابھی تک میں نے سوچا نہیں تھا کہ مجھے رقم وصولی کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا تھا۔ بہرحال، جلدی نہیں تھی۔ میں آرام سے ایسا طریقہ سوچ سکتا تھا جس میں پکڑے جانے یا سامنے آنے کا خطرہ نہ ہو۔

روبی آنے والے وقت کی تیاریوں میں لگ گیا تھا۔ اس نے نئے کپڑے اور نئی کٹ بھی لے لی تھی۔ ابھی تک میں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ میں کیا چکر چلا رہا ہوں لیکن اب مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ ایک آدمی کے لیے یہ کام دشوار تھا اس لیے میں نے اسے بتا دیا کہ میں کس چکر میں ہوں۔ وہ سن کر اچھل پڑا۔ "ڈربی! تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ ایڈپٹ سے رقم وصول کرنا کسی مگرمچھ سے اس کا شکار چھیننے سے زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں کوئی ایسی ترکیب سوچ لوں گا جس میں خطرہ کم سے کم ہو۔"

روبی پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "اگر تمہیں مسئلہ ہے تو مت شامل ہو... میں اکیلے کر لوں گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم اکیلے کرتے ہو یا میں تمہارے ساتھ شامل ہوتا

گواہ

وکیل صفائی نے معزز عدالت اور جیوری کے اراکین کو متاثر کرنے کے لیے اپنے مؤکل کی طرف سے قصبے کی ایک معمر اور راست گو عورت کو بطور گواہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔

کارروائی کا آغاز ہونے پر خاتون گواہی کے کٹہرے میں پہنچی تو وکیل صفائی نے رسمی طور پر اس سے پوچھا۔ "تم مجھے جانتی ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" خاتون نے بلاتامل جواب دیا۔ "تم اسکول کے زمانے سے اول درجے کے لفنگے تھے، لوگوں کے ہاتھوں سے چیزیں چھین کر بھاگ جاتے تھے، اپنے ساتھیوں سے مار دھاڑ کرنا تمہارا محبوب مشغلہ تھا۔ جوانی میں تم قصبے کی ہر لڑکی پر مر مٹنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے تمہاری شادی ہوئی تب بھی تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ بے چاری روزی سے مسلسل بے وفائی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ تمہارا نیا رومان..."

خاتون کی تقریر پر وکیل صفائی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ بات خطرناک رخ اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں خاتون کی بات کاٹ کر کہا۔ "یہ کافی ہے... تت... تم انہیں بھی جانتی ہو؟" اس بار اس نے وکیل استغاثہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ بچپن سے تم سے زیادہ بدمعاش تھا۔" خاتون نے فخریہ لہجے میں اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ "اس نے لڑائی میں ایک بار تمہارے دو دانت توڑ دیے تھے لیکن اب تم نے اس سے ساری زیادتیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آج کل تم اس کی بیوی سے نیا رومان چلا رہے ہو..."

عورت کی بات ادھوری رہ گئی۔ جج نے زور سے میز پر ہتھوڑا مار کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کیا اور وکیل صفائی کو اپنے چیمبر میں آنے کی ہدایت کر کے کرسی چھوڑ دی۔

ندامت اور شرمندگی کے ساتھ وکیل صفائی جج کے چیمبر میں پہنچا تو جج نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "اگر تم نے اس منحوس بڑھیا سے میرے بارے میں ایک لفظ بھی پوچھا تو میں اپنے عملے سے اٹھوا کر تمہیں باہر پھنکوا دوں گا۔"

(کراچی سے تسلیم اختر کا انتخاب)

ہوں۔ تم پکڑے گئے تو میں بھی پکڑا جاؤں گا۔"

"ایسی صورت میں میں سارا الزام اپنے اوپر لے لوں گا۔"

"ایڈ پٹ جیسے لوگ کسی کی بات نہیں مانتے۔ وہ اپنی تسلی خود کرتے ہیں۔" روبی نے تلخی سے کہا۔ "اب یا تو میں تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں یا پھر تم یہ ارادہ ترک کر دو۔"

"ارادہ ترک کرنا بہت مشکل ہے۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "مجھے نئی زندگی کے آغاز کے لیے رقم چاہیے اسی لیے میں نے ایڈ پٹ سے پانچ لاکھ ڈالرز کی رقم مانگی ہے۔"

روبی تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہے۔ اس کے بعد ہمارے راستے الگ ہوں گے۔ وہ کامیاب ہو جائے گا اور میں دولت کے بغیر ناکام ہو کر ایسی ہی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں گا۔ اس کی دوستی کا جذبہ اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ میرا ساتھ دے۔ بالآخر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے ڈربی... میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن جو کرنا بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔"

میں خوش ہو گیا کیونکہ میں روبی کی مدد کے بغیر خود کو اتنا مضبوط محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ہم دونوں مل کر غور کرتے رہے، سوچتے رہے لیکن کوئی ایسی ترکیب ذہن میں نہیں آ رہی تھی جس سے ہم بغیر سامنے آئے ایڈ پٹ سے رقم وصول کر سکیں۔ اسی غور و فکر میں ہم ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ٹی وی پر... ائرپورٹ کے بارے میں رپورٹ آ رہی تھی۔ اچانک روبی اچھلا۔ "آئیڈیا... ایک آئیڈیا ہے۔"

"کیسا آئیڈیا۔"

"رقم محفوظ طریقے سے حاصل کرنے کا... ہم ائرپورٹ کا لاکر استعمال کریں گے۔"

ائرپورٹ پر مسافروں کو اپنا سامان محفوظ رکھنے کے لیے لاکر سروس مہیا کی جاتی تھی لیکن یہ سروس صرف سفر کرنے والوں کے لیے مخصوص تھی۔ مجھے روبی کا خیال اچھا لگا۔ میں نے کال کر کے لاکر کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں۔ یہ نمبرز سے کھلنے والے لاکر تھے۔ پھر میں نے روبی کے ساتھ مل کر پلان کو حتمی صورت دی۔ رات گئے ہم اسی میں لگے رہے۔ جب سونے کے لیے اٹھے تو ہم دونوں مطمئن تھے۔ اگلی صبح میں میامی سٹی کی طرف روانہ ہوا اور فون بوتھ سے ایڈ پٹ کو کال کی۔ یہی سب سے محفوظ طریقہ تھا۔ ایڈ پٹ کو تصاویر مل گئی تھیں۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں ڈائمنڈ کی طرف سے مطمئن ہوں۔ اب بتاؤ کہ رقم کیسے چاہیے؟"

"تمہارا ایک آدمی پرسوں دن بارہ بجے کی فلائٹ سے واشنگٹن جانے کے لیے سوار ہو گا۔ رقم اس کے پاس ہو گی۔ جب وہ واشنگٹن پہنچے گا تو تب بتاؤں گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں خبردار کر دوں کہ کسی قسم کا دھوکا تمہارے کتے کے لیے دردناک بن جائے گا۔ وہ ایسی جگہ قید ہے جہاں سے برسوں بعد بھی کسی کا گزر نہیں ہو گا۔ وہ وہیں بھوکا پیاسا مر جائے گا۔"

"کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ جھوٹ کہہ رہا تھا۔ یقیناً اس نے ہمیں پکڑنے کے لیے اپنے آدمیوں کو تیار کر لیا ہو گا۔ لیکن مجھے امید تھی کہ وہ ہمارے اصل پلان سے دھوکا کھا جائے گا۔

دوسرے دن میں اور روبی کتے کو خوراک اور پانی دینے گئے۔ اب اس نے ہمیں اپنا مالک تسلیم کر لیا تھا اور دوستانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔ روبی نے کہا۔ "یہ بہت اچھا کتا ہے۔ کاش کہ یہ ایڈ پٹ جیسے خطرناک آدمی کا نہ ہوتا تو میں اسے اپنے پاس رکھ لیتا۔"

"میرا بھی یہی دل ہے مگر اسے واپس کر دینا بہتر ہے۔ ایڈ پٹ اسے جتنے ناز و نعم سے رکھتا ہو گا ہم اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کر سکتے اس کے لیے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جب میں دولت مند بن جاؤں گا تو ایسا ہی کتا لوں گا۔"

"اور پھر اسے کوئی اغوا کر کے لے جائے گا تاکہ تم انعام کا اعلان کرو۔" میں ہنسا تو روبی بھی ہنس دیا اور ڈائمنڈ تیزی سے اپنی دم ہلانے لگا۔ اس شام ہم نے ائرپورٹ کا معائنہ کیا کیونکہ اس سے پہلے ہمیں کبھی میامی کا ائرپورٹ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہم نے خاص طور سے اس ٹرمنل کا معائنہ کیا جس سے مذکورہ فلائٹ نے جانا تھا۔ اس ٹرمنل میں لاکر تھا۔ لاکر بورڈنگ لاؤنج کے پاس تھا اور وہاں صرف انہی افراد کو جانے کی اجازت تھی جو ٹکٹ لے کر جا رہے ہوتے تھے یا کہیں سے آ رہے ہوتے تھے۔ بعد میں وہ بھی ٹکٹ دکھا کر لاکر تک رسائی حاصل کر سکتے تھے۔ ہمیں ٹکٹ لینا پڑا ورنہ ہم لاکر تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ٹکٹ میرا تھا اور مجھے ہی لاکر سے رقم نکالنی تھی۔ روبی کو سامنے نہیں آنا تھا کیونکہ آنے والے دنوں میں اسے مشہور ہو جانا تھا اور اس وقت ایڈ پٹ کا کوئی آدمی اسے دیکھ لیتا تو بعد میں پہچان سکتا تھا۔

میں نے اگلی صبح ایڈ پٹ کو کال کی اور کہا۔ "تمہارا آدمی سرخ جیکٹ میں ہو اور سر پر نیلے رنگ کی سادہ پی کیپ ہو۔ رقم کہاں پہنچانی ہے، یہ تمہیں واشنگٹن میں بتاؤں گا۔"

ایڈ پٹ متجسس تھا کہ میں واشنگٹن میں رقم کیسے وصول کروں گا مگر میں نے اسے سوال جواب کا موقع نہیں دیا۔ اس کے فوری بعد میں ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ یہ ڈومیسٹک فلائٹ تھی اس لیے روانگی سے ایک گھنٹا قبل بھی پہنچ جانا کافی تھا۔ بورڈنگ پاس آدھا گھنٹا پہلے دیے جاتے۔ میں اندر لاؤنج میں تھا، یہاں لوگ مسلسل آ جا رہے تھے اور خاصا رش تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر ایڈ پٹ نے یہاں آدمی لگائے بھی ہوئے تو وہ اتنی آسانی سے مجھ پر نظر نہیں رکھ سکیں گے۔ ٹھیک گیارہ بجے ایک آدمی سرخ جیکٹ اور نیلی سادہ پی کیپ میں اندر آیا۔ اس نے شانے سے ایک بیگ لٹکا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں اٹھ کر برابر والے ٹرمنل کے لاؤنج میں آیا اور یہاں ایک فون بوتھ سے ایڈ پٹ کا نمبر ملایا۔

"اپنے آدمی سے کہو رقم ٹرمنل کے لاکر روم میں ایک لاکر لے کر اس میں رکھ دے۔"

"لیکن تم نے..."

"ایڈ پٹ! جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو... اور ہاں، اپنے آدمی سے کہنا یہ کام بیس منٹ میں کر لے اور اس کے بعد اسی فلائٹ سے واشنگٹن روانہ ہو جائے۔ میں بیس منٹ بعد تم سے لاکر کا پاس ورڈ لوں گا۔"

"میری بات..." اس نے کہنا چاہا لیکن میں نے فون رکھ دیا اور باہر نکل آیا۔ وہاں پہلے ہی چار افراد لائن میں کھڑے تھے اس لیے مجھے انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں تیسرے ٹرمنل کی طرف چل پڑا۔ گھڑی دیکھ کر میں نے بیس منٹ بعد ایڈ پٹ کو کال کی۔ میری آواز سنتے ہی اس نے گالی دی۔

"میں تمہیں دیکھ لوں گا۔"

"ضرور دیکھ لینا... اگر میں ہاتھ آیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے آدمی نے ہدایات پر عمل کیا؟"

اس نے دوسری گالی کے ساتھ مجھے پاس ورڈ بتا دیا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ "تم بہت چالاک بن رہے ہو۔"

"کیونکہ میری زندگی داؤ پر لگی ہے اور تمہارے صرف نصف ملین ڈالرز داؤ پر لگے ہیں۔ اتنا تو تم ایک دن میں کما لیتے ہو گے۔ مجھے زیادہ چالاکی سے کام لینا ہی ہے۔"

ایڈ پٹ سے بات کر کے میں واپس فلائٹ والے ٹرمنل آیا۔ سرخ جیکٹ والا اپنی جگہ موجود تھا لیکن اس کے پاس موجود بیگ غائب تھا۔ پہلے میں فوری طور پر لاکر کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ مجھے رک کر کچھ دیر دیکھنا چاہیے۔ ایڈ پٹ جیسے شخص کی طرف سے دھوکا دہی کا امکان بہت زیادہ تھا۔ وہ کسی کو بخشنے والا آدمی نہیں تھا۔ میرا رکنا ہی میری بچت کی وجہ بن گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ سرخ جیکٹ والا بار بار دو افراد کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ان میں سے ایک سیاہ فام تھا، اس نے نفیس سوٹ پہن رکھا تھا لیکن یہ اس کی شخصیت سے بالکل میچ نہیں کر رہا تھا۔ دوسرا اسپینش تھا۔ صورت سے وہ بھی بدمعاش ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی سرخ جیکٹ والے کی طرف متوجہ تھے اور ان کی نظریں آپس میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ لاکر کی طرف جانے والے راستے پر موجود تھے۔ میرا خدشہ درست نکلا تھا۔ ایڈ پٹ نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ ایک آدمی تو وہ تھا جو رقم لے کر جا رہا تھا اور باقی یا اس سے زیادہ نگرانی کے لیے تھے۔ یقیناً ان کے پاس بھی فلائٹ کے ٹکٹ تھے۔ اتفاق سے لاکر کی طرف جانے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک شخص گیا تو اسپینش آدمی فوراً اس کے پیچھے گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اس کے ساتھ ہی واپس آیا۔ گویا لاکر کی طرف جانے والے ہر شخص کی مکمل نگرانی کی جا رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ اس صورت میں لاکر کی طرف جانا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ فلائٹ کے وقت میں بیس منٹ رہ گئے تھے جب مسافروں کو بورڈنگ کارڈ لینے کی ہدایت کی گئی۔ سب عجلت میں بورڈنگ لاؤنج کی طرف چل پڑے۔ میں بھی مسافروں میں شامل تھا۔ وہ تینوں بھی آ رہے تھے لیکن انہوں نے بورڈنگ کارڈ لینے میں عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ پیچھے رہے۔ یعنی وہ اس بات کو یقینی بنا رہے تھے کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے۔ جو پیچھے رہ جاتا، لازماً وہی مشکوک ہوتا۔ مجبوراً میں آگے آیا اور بورڈنگ کارڈ لے کر لاؤنج میں آ گیا جہاں مسافر طیارے میں جانے والی سرنگ میں داخل ہو رہے تھے۔ میں سرنگ کے پاس ایک جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے انٹری پوائنٹ نظر آ رہا تھا۔ عین موقع پر وہ تینوں پیچھے ہٹ گئے اور وقت مکمل ہونے پر بورڈنگ بند کر دی گئی۔ گویا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس فلائٹ پر جانے کا۔ میں طیارے کی طرف بڑھا اور دس منٹ بعد طیارہ رن وے پر ٹیکسی کر رہا تھا۔ میں نے طیارے سے باہر دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرا پلان فیل ہو گیا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ ایڈ پٹ کو اپنے کتے کی پروا بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بہر صورت مجھ تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ مجھے نمونہ عبرت بنا کر اپنے انتقامی جذبے

کی تسکین کر سکے۔

دو گھنٹے بعد طیارے نے واشنگٹن ائرپورٹ پر لینڈ کیا اور میں نے باہر آتے ہی میامی کی طرف جانے والی اولین پرواز میں ٹکٹ بک کرایا۔ یہ پرواز چار گھنٹے بعد تھی۔ یوں ٹھیک آٹھ گھنٹے بعد میں واپس میامی پہنچ گیا۔ واشنگٹن میں روبی کو کال کر کے میں نے اپنی ناکامی کا بتا دیا تھا۔ وہ مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ ایک بار مجھے لاکر کا خیال آیا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ ایڈ پٹ کے گرگوں نے اس میں سے رقم نکال لی ہو گی... اگر بیگ میں کوئی رقم موجود تھی تو۔ مگر اس کا امکان تھا کہ اس کے آدمی مکڑی کا جالا بچھا کر میرا انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں آؤں اور پھنس جاؤں۔ اس لیے دل پر جبر کر کے یہ خیال ترک کر دیا۔ باہر آ کر روبی نے پوچھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں... ہم ناکام رہے۔"

"میرا اشارہ کتے کی طرف ہے۔ کیا ہم اسے واپس کر دیں؟"

"نہیں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ایڈ پٹ نے جو کیا ہے، اس کی واحد سزا یہی ہو سکتی ہے کہ اسے اس کا کتا کبھی واپس نہیں ملے گا۔"

"آج اسے کھانا دیے تیسرا دن ہو گیا ہے۔"

"وہ بھوکا ہو گا لیکن مرے گا نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں کل اسے دیکھوں گا۔"

روبی ہچکچایا۔ "کیا تم اس کے ساتھ وہی سلوک کرو گے جس کی دھمکی ایڈ پٹ کو دی تھی؟"

"شاید۔" میں نے کہا۔

"اس صورت میں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم جانتے ہو میں جانور پر ظلم کے خلاف ہوں۔"

"میں اکیلے ہی سب کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ درحقیقت میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اگلی صبح جب روبی سو رہا تھا، میں نے اپنا سامان لیا اور ہٹ سے روانہ ہو گیا۔ میں نے کار لی تھی اور باقی سامان روبی کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ایک رقعہ بھی لکھ آیا تھا کہ میں فلوریڈا چھوڑ کر جا رہا ہوں اور شاید واپس نہ آؤں۔ روبی کی بہتری اسی میں ہے کہ میں اس سے کوئی رابطہ نہ رکھوں۔ ہاں، کبھی حالات سازگار ہوئے تو میں اس سے ملنے آؤں گا۔ میں نے کار کا رخ ہال اوور پارک کی طرف کر دیا۔ ایڈ پٹ کا کتا وہاں موجود تھا۔ وہ بھوک سے بے تاب تھا۔ میری بو سونگھتے ہی اس نے دور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ سارا کھانا اور پانی ختم کر چکا تھا۔ میں اس کے پاس آیا تو وہ میرے پیروں میں لوٹنے لگا۔ میں نے اسے خوراک کا ایک ڈبا کھول کر دیا تو وہ بے تابی سے کھانے لگا۔ پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس نے بہ طور شکریہ دم ہلائی پھر اچانک میرے ہاتھ چاٹنے لگا۔

میں نے گہری سانس لی اور اس کے پٹے سے زنجیر کا ہک نکال دیا۔ "برخوردار... اب تم آزاد ہو۔"

ڈائمنڈ گیا نہیں، منہ اٹھا کر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں اسے اٹھا کر باہر لایا اور جنگل میں چھوڑ کر کہا۔ "اب تم آزاد ہو۔"

مگر وہ جانے کے بجائے اسی طرح میرا منہ دیکھتا رہا۔ میں اسے چھوڑ کر اپنی کار تک آیا۔ جب میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ کار کے سامنے موجود تھا۔ وہ میرا پیچھا کرتا کار تک چلا آیا تھا۔ مجھے کار اسٹارٹ کرتے دیکھ کر وہ بھونکا۔ وہ التجا کر رہا تھا کہ میں اسے چھوڑ کر نہ جاؤں۔ شاید وہ یہاں اکیلے رہتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ پالتو کتا تھا، جنگل کی زندگی سے ناواقف تھا۔ میں نے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ اندر گھس آیا اور خوشی سے بھونکنے لگا۔ میں نے واپس ہال اوور پارک کا رخ کیا اور وہاں سڑک کے کنارے کار روک کر دروازہ کھول دیا۔ "چلو اترو برخوردار... امید ہے تم یہاں سے اپنے گھر خود پہنچ جاؤ گے۔"

یہ پارک اس کی تفریح گاہ تھی اور یہاں سے ایڈ پٹ کا محل نما ولا زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ یقیناً اسے راستوں کا اچھی طرح علم تھا لیکن اس بار بھی ڈائمنڈ نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ بدستور فرنٹ سیٹ پر براجمان رہا اور میری طرف دیکھتا رہا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اس نے مجھے اپنا آقا اور مالک تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ وہ ایڈ پٹ کے پاس واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ "تو یہ بات ہے برخوردار... تم اب اس غریب کے ساتھ رہنا چاہتے ہو اپنے دولت مند مالک کو چھوڑ کر... جیسے تمہاری مرضی لیکن میرے ساتھ کچھ سختیاں بھی برداشت کرنا ہوں گی۔"

میں نے کار واپس موڑی اور شمال کی طرف چل پڑا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری منزل کہاں تھی؟ مجھے تو بس فلوریڈا اور ایڈ پٹ کی پہنچ سے دور نکل جانا تھا۔ میں پانچ لاکھ ڈالرز حاصل نہیں کر سکا تھا۔ بچپن کے دوست روبی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا تھا۔ لیکن میرے پاس اب ڈائمنڈ تھا۔ وہ مجھے دولت نہیں دے سکتا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ وہ میرا ساتھ ضرور دے گا اور میں اکیلا نہیں رہوں گا۔

ختم

زندگی کی ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لیے شکار اور شکاری کے مابین کشمکش اور مزاحمت یقینی امر ہے... شکار کی مزاحمت اپنے آپ کو شکنجے میں آنے سے بچاؤ کے لیے اور شکاری کی تمام تر کوشش اسے جکڑ لینے میں ہوتی ہے... ایک ایسے ایذا پرست کا ماجرا جو اپنے ہدف کو اذیت میں مبتلا دیکھنا پسند کرتا تھا...

انسانی جبلت اور فطرت میں پوشیدہ حیوانیت کا دل خراش اسرار...

رسیلی گیند

امجد رئیس

رات کے دس بجنے والے تھے جب میں ہوٹل سے نکلا۔ رات معمولی سی حدت لیے ہوئے تھی۔ میں نے ڈرنک کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی کاک ٹیل لاؤنج میں جانا بے وقوفی سمجھا۔ باؤلنگ کنونشن کی وجہ سے لاؤنج، پاگل خانہ معلوم ہو رہا تھا۔

میں آگے بڑھتا رہا، میں نے محسوس کیا کہ کلیولینڈ باؤلرز سے بھرا پڑا ہے اور تقریباً سب ہی ڈرنک بھی لینا چاہ رہے ہیں۔

ہر موڑ پر باؤلرز کا ہجوم تھا۔ ان کی شرٹس پر بیج لگے تھے۔ تقریباً سب نے اپنے اپنے اسٹینڈرڈ گول طرز کے باؤلنگ بیگ سنبھالے ہوئے تھے۔ کوئی بیگ بھی خالی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

دور پہاڑوں پر ہونے والی گرج چمک، ان کے قہقہوں اور چیخ پکار میں دب رہی تھی۔ میں اس ہجوم کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ میں اپنا وزنی باؤلنگ بیگ لیے کسی نسبتاً پُرسکون جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دراصل میں اپنا بیگ لاکر میں رکھنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے پہلے ڈرنک کی طلب پوری کرنی تھی۔

بالآخر مجھے اپنی مطلوبہ جگہ مل گئی... یہاں روشنی کم تھی، جگہ بھی چھوٹی اور کافی حد تک سنسان تھی۔ بارٹینڈر اکیلا کونے میں ریڈیو پر کمنٹری سن رہا تھا۔ میں نے بار کاؤنٹر پر دروازے کے قریب جگہ پکڑی اور گول بیگ قریبی اسٹول پر رکھ دیا۔ پھر میں نے بارٹینڈر کو بیئر کے لیے اشارہ کیا۔ ''بوتل لے آؤ۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس کے بعد میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔'' میں صرف شائستگی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس سے پہلے کہ بارٹینڈر ایک بار پھر کھیل کی طرف دھیان دیتا، ایک اور گاہک نمودار ہوا۔

''ڈبل اسکاچ۔'' اس کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے نگاہ اٹھائی۔ وہ آدمی پچاس کے پیٹے میں تھا۔ جسم بھاری بھرکم تھا۔ گنجے سر پر چند سلوٹیں دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس نے کوٹ پہنا ہوا تھا اور باؤلنگ بیگ... وہ تو جیسے آج لازمی تھا۔ اس کا بیگ سیاہ رنگ کا تھا اور بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بیگ کافی حد تک میرے بیگ سے ملتا جلتا تھا۔ میں اس کا جائزہ لیتا رہا... اس نے بار کاؤنٹر کے ساتھ بیٹھتے ہوئے احتیاط سے بیگ برابر والے اسٹول پر رکھ دیا اور جام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے سر عقب میں جھکایا اور گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کردیا۔ خالی گلاس آگے بڑھا کر بولا۔ ''ایک اور۔'' اس نے بارٹینڈر کو مخاطب کیا۔ ''بیٹا، ریڈیو بند کردو۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں دوسری فرمائش کی۔ ساتھ ہی اس نے نوٹوں کی نمائش کی۔

اس کی دوسری فرمائش پر ایک لمحے کے لیے بارٹینڈر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے مگر نوٹوں کی جھلک دیکھتے ہی تحلیل ہوگئے۔ اس نے کندھے اچکائے اور ریڈیو بند کردیا۔

میں جانتا تھا کہ بارٹینڈر کیا سوچ رہا ہے۔ اگر یہ بیئر کا سوال ہوتا تو وہ اس گاہک کو باہر کا راستہ دکھاتا۔ لیکن گاہک اسکاچ کا شوقین تھا۔ لہٰذا اس نے ریڈیو بند کردیا اور اس کے گلاس میں اسکاچ انڈیلی۔

''بھر دو۔'' بھاری بھرکم آدمی نے نیا حکم جاری کیا۔ بارٹینڈر نے مزید اسکاچ گلاس میں بھر دی۔ اس جام کا حشر بھی پہلے جیسے ہوا۔ میں نے دیکھا کہ تیسرا جام بھی موٹے شخص کے شکم کی گہرائیوں میں غائب ہوگیا۔

دو منٹ میں اتنی اسکاچ... اس کی موٹی گردن پر سرخی ابھر آئی۔ عام مے نوش کی اتنی اسکاچ ڈکارنے کے بعد زبان بھی لڑکھڑانے لگتی ہے۔

اب اس نے بیس بال ٹیم کے خلاف بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ''میری سمجھ سے بالاتر ہے یہ بات کہ ایک کھیل کے پیچھے اتنا پاگل پن۔'' اس نے پیشانی پر نمودار ہونے والا پسینا صاف کیا۔ ''لگتا ہے، بیس بال کے دیوانوں کے علاوہ دنیا میں کچھ اور ہے ہی نہیں... تمام موسم گرما میں یہی ہنگامہ بپا رہتا ہے۔ اس سے جان چھوٹتی ہے تو فٹ بال کا نمبر آجاتا ہے اور حالات پہلے سے زیادہ ابتر ہوجاتے ہیں...'' اس نے منہ بنا کر ہاتھ نچایا۔ ''اور پھر باسکٹ بال... اوہ خدایا، ان کو آخر اس افراتفری سے کیا ملتا ہے؟''

''ہر کسی کی کوئی نہ کوئی ہابی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں لیکن یہ ہابی کی کون سی قسم ہے؟ ایک بندروں کی ٹولی ہے جو گیند نما چیز کے لیے لڑ رہی ہے۔'' اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ''ایک بدنما مذاق ہے۔ ان کو پروا نہیں ہے کہ کون جیتتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ بیشتر افراد کا بال گیم کے پیچھے جانے کا مقصد مختلف ہوتا ہے۔'' اس نے فلسفہ جھاڑا۔ ''ہے... میک۔'' اس نے بارٹینڈر کو آواز دی جس نے دراصل ریڈیو بند نہیں کیا تھا بلکہ آواز بہت دھیمی کردی تھی اور اب ریڈیو کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ ''کبھی کھیل دیکھنے گئے ہو یا ریڈیو سے ہی لگے رہتے ہو؟''

''ایک مرتبہ اتفاق ہوا تھا۔'' بارٹینڈر نے جواب دیا۔

''تو پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ وہاں کیا چیخ پکار ہوتی ہے؟ کبھی غور کیا کہ تماشائی زیادہ تر کس بات پر چیخ رہے ہوتے ہیں؟ میں بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ بارٹینڈر خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ پھر گویا ہوا۔ ''وہ چلّا رہے ہوتے ہیں کہ... امپائر کو مار دو... ہاں، یہی شور ہوتا ہے... امپائر کو ختم کردو!'' اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

میں نے بیئر ختم کی اور اسٹول کھسکایا، ادھر اس نے نعرہ بلند کیا۔ ''ایک بیئر اور... میری طرف سے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سوری، مجھے درمیانی شب کی ٹرین پکڑنی ہے۔'' میں نے بتایا۔

اس نے دیوار گیر گھڑی کی جانب نظر ڈالی۔ ''ابھی تو کافی وقت ہے۔''

میں نے احتجاج کے لیے منہ کھولا ہی تھا، تب دیکھا کہ بارٹینڈر بوتل کھول چکا۔ اس نے بیئر میری طرف بڑھائی اور اسکاچ کا چوتھا جام اپنے باتونی گاہک کی جانب کھسکایا... اجنبی نے پھر بولنا شروع کردیا۔

''فٹ بال تو انتہائی خراب کھیل ہے۔ اس میں کھلاڑی زخمی بھی ہوجاتے ہیں۔ بعض کو شدید چوٹیں لگتی ہیں اور مجمع یہی دیکھنا چاہتا ہے... خون دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر وہ خون کے لیے چلّانا شروع کردیتے ہیں۔''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے معتدل لہجہ اختیار کیا۔ ''بہرحال اندر کا غصہ کھیل میں نکل جاتا ہے اور غصہ خارج کرنے کا یہ ایک صحت مند طریقہ کار ہے۔''

مجھے نہیں پتا کہ اس نے میری بات سے اتفاق کیا یا نہیں، بہرحال اس کا سر دھیرے سے مثبت انداز میں ہلا تھا۔

''ہاں، جذبات کو نکاسی کا راستہ ملتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ تماشائی، کھلاڑیوں کو مرتا بھرتا دیکھنا چاہتے ہیں لیکن اسے تسلیم نہیں کرتے۔''

اسکاچ کی زیادتی سے اس کا چہرہ اب بالکل سرخ ہو چکا تھا۔ پسینے کا اخراج بڑھ گیا تھا۔

''جیسے باکسنگ ہے یا ریسلنگ۔ اسے اسپورٹس کہتے ہیں۔ ہابی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہوتا کیا ہے؟ تشدد... خون ریزی... اور پبلک کو اسی میں مزہ آتا ہے۔ شکار کو لے لو... اس میں بھی کسی معصوم جانور یا پرندے کو گولی ماری جاتی ہے... حتیٰ کہ فشنگ جیسے بظاہر پُرامن کھیل یا ہابی میں بھی حشرات کو مار کر ہک میں پھنسا کر مچھلی کو پکڑا جاتا ہے۔ ہک مچھلی کے حلق میں پھنسا ہوتا ہے... وہ تڑپتی ہے۔ اس کا منہ سانس لینے کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ وہ سانس نہیں لے پاتی اور تڑپتے ہوئے مرجاتی ہے... اس میں ہیجانی مزہ ہے...''

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیونکر اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام لوگ اس قسم کے اذیت پسند ہوتے ہیں؟''

اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ سچ ہے۔ یہ چیز... جبلت کا حصہ ہے... کسی میں کم، کسی میں زیادہ اور کسی میں بہت زیادہ... بلکہ میں کہوں گا کہ ان کو یا ہمیں باکسنگ یا ریسلنگ سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔ پھر جنگ شروع ہو جاتی ہے... وار، ریئل وار... خون بہتا ہے۔ قتل و غارت

ٹیڑھا حساب

سردار روپ سنگھ ایک مدت سے اس بارے میں فکر اور تشویش میں مبتلا ہیں کہ ان کی بہن کے دو بھائی ہیں جبکہ ان کا صرف ایک بھائی ہے۔ حساب کی یہ گڑبڑ آخر کہاں ہے؟

لباس

دعوت نامے میں جلی حروف میں لباس کے آگے کالی ٹائی لکھا ہوا تھا۔ سردار جوگیندر سنگھ بہت اہتمام سے تیار ہوکر تقریب میں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تمام مدعوئین نے دعوت نامے کی ہدایت کو نظرانداز کردیا تھا۔ سب لوگ کالے رنگ کی ٹائیوں کے ساتھ سوٹ بھی پہنے ہوئے تھے!

سزا کا سبب

رائل آرمی کے ایک سارجنٹ میجر فوجی مشق کے دوران میں کچھ جوانوں کے ساتھ ایک خندق میں مورچا زن تھے۔ موصوف اپنی بدمزاجی اور بدکلامی کی وجہ سے اپنے ماتحتوں میں چنداں مقبول نہ تھے۔ اندھیرے میں گردوپیش کا جائزہ لینے کے لیے انہوں نے اپنا سر خندق سے باہر ابھارا تو ایک دھماکے سے فائر ہوا۔ وہ بال بال بچے اور ہانپتے ہوئے دوبارہ خندق میں دبک گئے۔

''اسمتھ!'' سارجنٹ میجر پھنکارے۔ ''باہر نکلو اور گولی چلانے والے کو پکڑ لاؤ۔''

اسمتھ اپنے گروپ کا بہترین اسکاؤٹ تصور کیا جاتا تھا۔ وہ بہت احتیاط سے رینگ کر باہر نکلا اور چند ہی منٹ میں ''دشمن'' کے ساتھ واپس آپہنچا۔ اس نے ''دشمن'' پر ہتھیار تانا ہوا تھا اور دشمن، اس کے آگے ہاتھ اٹھائے آرہا تھا۔

جونہی دوسرے سپاہی خندق سے باہر نکلے، اسمتھ نے ''دشمن'' پر بے رحمی سے مکوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کر کے آناً فاناً اسے لہولہان کردیا۔

''اسمتھ! یہ کیا کررہے ہو؟ اتنی سی لغزش کی اتنی بڑی سزا؟'' ساتھیوں نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں اسے فنا کردوں گا۔'' اسمتھ غصے میں آپے سے باہر ہوا جارہا تھا۔ ''اس نے سارجنٹ میجر پر فائر کیا... اچھا کیا لیکن اس مردود کا نشانہ کیوں خطا ہوا؟ ہم کب تک اس کی گالیاں سہتے رہیں گے؟''

(کوئٹہ سے انجینئر شہزاد بخش کا جلال)

گری ہزاروں لاکھوں کے ہندسے کو چھو لیتی ہے... نطشے بھی بس ایک قنوطی فلاسفر تھا۔ اسے پتا ہونا چاہیے تھا کہ ڈبل اسکاچ کیا ہوتی ہے۔"

اس کا آخری جملہ عجیب تھا، شاید اب اسکاچ نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

"تمہارے ذہن میں کیا حل ہے؟" میں نے اپنے سوال کی معصومیت کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر حکومت قتلِ عمد کے قوانین تبدیل کر دے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ خون نسبتاً کم بہے گا؟"

"شاید۔" گنجے اجنبی نے خالی گلاس کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ اس بات پر منحصر ہے کہ کس کو قتل کیا جا رہا ہے؟ کسی جرائم پیشہ کو، کسی غنڈے کو یا کسی عام شخص کو...؟ کوئی تنہا شخص، جس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ جو بھی ہو، اسے پھر بچنا نہیں چاہیے۔ مزید یہ کہ تم وہاں سے بآسانی اور صفائی سے نکل بھی جاؤ۔"

میں آگے جھک کر اسے گھورنے لگا۔

"کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میری جانب نہیں دیکھا بلکہ جواب دینے سے پہلے اپنے باؤلنگ بیگ کو نگاہ بھر کے دیکھا۔

"مجھے غلط مت سمجھو، مسٹر۔" وہ مسکرایا۔ شاید وہ جبراً مسکرایا تھا۔ "میں کوئی قاتل نہیں ہوں لیکن میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو یہ کام بیس سال پہلے اسی علاقے میں کرتا رہا تھا... بار بار کرتا رہا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے، سیریل کلر؟"

"ہاں۔"

"کیا تم اسے جانتے تھے؟"

"نہیں ظاہر ہے بالکل بھی نہیں... کوئی نہیں جانتا اور یہی اصل نکتہ ہے کہ وہ ہر بار صفائی سے نکل جاتا تھا۔ تاہم اخبارات کے حوالے سے سب اسے جانتے تھے... "کلیو لینڈ تورسو سلیئر" اس کا نام پڑ گیا تھا۔ اس نے چار سال میں تیرہ قتل کیے۔ پولیس پریشان ہو گئی۔ وہ اسے تلاش کرنے میں بُری طرح ناکام رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ علاقے میں عموماً ویک اینڈ پر وارد ہوتا تھا اور کسی عورت کو ورغلا کر کسی گلی، کھنڈ یا ویران جگہ پر لے جاتا۔ اپنی حیوانی خواہش پوری کرتا۔ وہ احمق نہیں تھا کہ اسپورٹس کے چکر میں پڑتا۔ اسے حقیقی اور بھرپور تھرل درکار تھا... وہ خواہش پوری کرنے کے بعد چاقو کے ذریعے، حقیقی ٹرافی حاصل کر لیتا..."

"یعنی وہ سر الگ کر لیتا؟" میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

"یہ سوال تمہیں کرنا چاہیے؟" اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔

میں نے کھڑے ہو کر اپنے بیگ کی جانب ہاتھ بڑھایا تو اجنبی ہنسنے لگا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، مسٹر۔" وہ بولا۔ "یہ پرانی بات ہے۔ جب جنگ یورپ تک پہنچی تو ممکن ہے کہ وہ ادھر نکل گیا ہو۔ کام تو اس کو وہاں بھی وہی کرنا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اب وہ قاتل نہیں ہیرو تھا۔ بہرحال وہ حقیقی ٹرافی کے لیے دیانت داری سے کام کرتا تھا۔ کوئی بہانے بازی یا جواز نہیں تراشتا تھا۔ اپنے کام میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا..."

"بہت ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "خود کو ہیجان میں مبتلا مت کرو۔ یہ تمہاری تھیوری ہے، میری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مفروضہ ہی ہو۔"

اس نے اپنی آواز دھیمی کی۔ "تھیوری؟ شاید ایسا ہو، مسٹر! لیکن آج رات میں وہ کام کرنے جا رہا ہوں کہ تم ششدر رہ جاؤ گے۔ تم کیا سمجھ رہے ہو... میں نے اتنی اسکاچ معدے میں کیوں انڈیلی ہے؟ آخر کس لیے؟"

"ہر باؤلر پیتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن تم یہ بتاؤ کہ اگر اسپورٹس کے بارے میں تمہارے یہ خیالات ہیں تو تم خود کیوں ایک باؤلر ہو؟"

گنجا شخص نے مجھ سے قریب ہو کر بڑبڑایا۔ "کس نے کہا، میں باؤلر ہوں؟"

میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ میرے حلق سے آواز برآمد ہوتی، باہر سے ایک اور ہی آواز نے بلند ہونا شروع کیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ چونکے۔ یہ سائرن جیسی آواز تھی۔

بارٹینڈر کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ "لگتا ہے کہ اسی جانب آ رہی ہے..." وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہا تھا، اس کا رخ گنجے کی جانب تھا لیکن وہ تو اچھل کر کھڑا ہو چکا تھا اور دروازے کی جانب لپک رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے جھپٹا۔ "اسے کہاں بھولے جا رہے ہو..." میں نے اس کا باؤلنگ بیگ اسے پکڑا دیا۔

"شکریہ مسٹر۔" اس نے کہا اور بارٹینڈر کی جانب ہاتھ ہلا کر باہر نکل گیا۔ وہ سڑک پر جانے کے بجائے عمارتوں کے درمیان ایک پتلی گلی میں گھس گیا۔ لمحہ بھر میں وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ سائرن کی آواز قریب آ گئی تھی۔

یہ ایک اسکواڈ کار تھی... سڑک کنارے موجود فٹ پاتھ پر عمارتوں کے ساتھ ساتھ ایک وردی پوش سارجنٹ دوڑتا چلا آ رہا تھا... گاہے بگاہے وہ رکتا اور جھک کر زمین کو دیکھتا پھر آگے کو لپکتا... قریب آ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بار میں جھانکا پھر مجھے دیکھا اور سوال کیا۔

"کسی بھاری بھرکم گنجے آدمی کو دیکھا جس کے پاس ایک باؤلنگ بیگ ہے؟" سارجنٹ کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

میں نے اسے حقیقت بتا دی۔

"کس طرف گیا ہے وہ؟"

میں نے ایک گلی کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے کار سواروں کو چلا کر ہدایات دیں اور خود وہیں رہا۔ کار میری بتائی ہوئی گلی کی جانب بڑھ گئی۔

"کیوں؟ کیا بات ہے جناب؟"

وہ مجھے اندر لے آیا۔ "مجھے بتاؤ، اس کے بارے میں؟" اس نے کہا۔

میں نے تمام باتیں سارجنٹ کے گوش گزار کر دیں۔ وہ گاہے بگاہے بارٹینڈر کو بھی دیکھتا رہا جس کا سر متواتر اثبات میں جنبش کر رہا تھا۔ گویا میرے بیان کی تصدیق ہو رہی تھی۔ میں نے بات ختم کر کے پھر سوال دہرایا۔

"آخر بات کیا ہے؟"

"مرڈر۔" جواب آیا۔ "ایک گھنٹے قبل باؤلنگ کنونشن پر ہوٹل کے کمرے میں ایک عورت کو قتل کیا گیا ہے... عورت کا سر غائب ہے۔"

میں اور بارٹینڈر دونوں سٹپٹا گئے۔

"بیل بوائے نے اسے بیگ کے ساتھ، اسی کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ اس نے لفٹ کے بجائے، باہر جانے کے لیے سیڑھیاں استعمال کی تھیں۔"

"وہ گریب آرٹسٹ تھا۔" سارجنٹ نے مزید بتایا۔

"گریب آرٹسٹ... مطلب اُچکا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ایسے اجتماعات پر عموماً اچکوں کی ٹولی لوگوں کی شیا اڑانے کے لیے آ جاتی ہے، جیب تراشی کے واقعات بھی ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن جناب! ایک اُچکا قتل جیسا جرم کیونکر..." میری بات درمیان میں رہ گئی۔

"یہی تو پتا لگانا ہے۔ ہماری ٹیم کی اطلاعات کے مطابق اس ہوٹل میں یا آس پاس، اسی حلیے کا کوئی آدمی نہیں ٹھہرا ہوا تھا لیکن اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ مقتولہ اسی کمرے میں رہائش پذیر تھی اور اسے بھی وہاں سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔" سارجنٹ نے کہا۔ "پھر تمہارے بیان کے مطابق وہ پولیس کار کے ہوٹر کی آواز سن کر بھاگ نکلا۔"

"ایک منٹ سارجنٹ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "مجھے یاد آ گیا۔"

"کیا؟" سارجنٹ نے دلچسپی سے میری آنکھوں میں دیکھا۔

"وہ کسی سیریل کلر کی بات کر رہا تھا جو بیس سال پہلے "کلیو لینڈ تورسو سلیئر" کے نام سے مشہور تھا۔ اس وقت میں یہی سمجھا کہ وہ زیادہ چڑھا گیا ہے اور نشے میں اول فول بک رہا ہے۔"

سارجنٹ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "کلیو لینڈ تورسو سلیئر... کیا تمہیں یقین ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

میں نے بارٹینڈر کی جانب دیکھا۔ اس کا سر فوراً اثبات میں ہلا۔ سارجنٹ کا منہ بن گیا۔

اچانک اس کی نگاہ اسٹول پر رکھے میرے باؤلنگ بیگ پر پڑی۔

اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ تمہارا ہے؟"

میں نے اقرار کیا۔

"اسے کھولو۔" اس نے حکم جاری کیا۔ بیگ کو کھولنے میں دیر لگی کیونکہ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ سارجنٹ نے بیگ میں جھانکا...

"ٹھیک ہے، اس کا مطلب وہ اپنے ساتھ لے گیا... وہی ہمارا مطلوبہ آدمی ہے۔"

"لیکن جناب! آپ اتنی جلدی یہاں تک کیسے پہنچے؟" میں نے حیرانگی ظاہر کی۔

"ہمیں پتا چلا تھا کہ اس حلیے کا آدمی، اسی سڑک پر گیا ہے۔"

"لیکن وہ اسی سڑک پر کسی اور طرف بھی نکل سکتا تھا؟" میں نے اعتراض کیا۔

"تم نے دیکھا نہیں، میں پیدل آ رہا تھا؟"

"دیکھا تھا لیکن میں سمجھ نہیں سکا۔"

"میں اسے ٹریس کرتا ہوا آ رہا تھا۔"

"نہیں سمجھا۔" میں نے مایوسی ظاہر کی۔

اس نے اشارہ کیا۔ "اسٹول کی سطح دیکھو۔"

میں نے سر گھمایا اور اسٹول پر سرخ دھبے دیکھ کر

بوکھلا گیا۔ سارجنٹ مسکرا رہا تھا۔

مزید کوئی سوال کرنا حماقت تھی۔ اس کے باؤلنگ بیگ میں گیندیں نہیں تھیں۔

میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ اسی وقت دوسرا پولیس اہلکار بار میں داخل ہوا۔

”پکڑلیا؟“ سارجنٹ بولا۔

پولیس مین نے نظریں چرائیں۔ ”پکڑنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ احمق نشے میں تھا یا اتنا بدحواس تھا کہ گلی سے نکلتے ہی لوڈنگ ٹرک کی زد میں آگیا۔ اس کی تو شناخت تک ممکن نہیں ہے... لاش کی بہت بری حالت ہے۔“

سارجنٹ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہی قاتل تھا؟“

”جناب! ایک ثبوت ہے۔“ پولیس مین نے کہا۔ ”ہینسن اس کا بیگ لے کر آرہا ہے۔“

اسی وقت ہینسن نامی پولیس مین بیگ کے ساتھ نمودار ہوا... سارجنٹ نے بیگ لے کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

”یہ اس کے پاس تھا؟“ اس نے ہینسن سے پوچھا۔

”یس سر! یہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔“

اسی وقت میں نے اپنا رخ پھیر لیا۔ میں سارجنٹ کو بیگ کھولتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ان لوگوں کے تاثرات دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ میں اپنے کان بند نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ ان میں سے کسی نے ابکائی لی ہے۔ یقیناً ابکائی لینے والا پولیس فورس میں زیادہ پرانا نہیں لگتا تھا، ورنہ یہ لوگ اس قسم کے مناظر کے عادی ہو جاتے ہیں...

☆☆☆

میں نے دوبارہ اٹھنا چاہا لیکن سارجنٹ کے خیالات کچھ اور تھے۔ اسے میرا نام، پتا اور باضابطہ بیان درکار تھا۔ جو ظاہر ہے کہ اسے مل گیا۔ بیان کے نیچے میں نے دستخط کر دیے۔

میں نے اس کی تھیوری، خیالات، اسپورٹس اور ہابی پر کمنٹس... خصوصاً وہ گفتگو جو اس نے ”کلیولینڈ ٹورسو سلیئر“ سے متعلق کی تھی، سب کچھ بتا دیا۔ مرڈر کے متعلق اس کا خیال تھا کہ قاتل کا شکار بچنا نہیں چاہیے اور قاتل کو صفائی سے نکل جانا چاہیے... چنانچہ بہتر ہے کہ عورتوں کو نشانہ بنایا جائے تاکہ مزاحمت اور ناکامی کا امکان ختم ہو جائے... وغیرہ وغیرہ۔

”مجھے تو یہ سب کچھ مذاق لگ رہا تھا۔“ آخر میں، میں نے تبصرہ کیا۔

سارجنٹ نے بیگ کی جانب نگاہ کی پھر مجھے دیکھا۔ ”یہ مذاق نہیں، نہ وہ کوئی کامیڈین تھا۔ قاتل کا دماغ، خصوصاً سیریل کلر کا دماغ کیسے کام کرتا ہے؟ اس کے متعلق اس نے تمہیں کچھ معلومات فراہم کر دی تھیں۔ جہاں تک ”ٹورسو سلیئر“ کا تعلق ہے تو پوری فورس اس کے بارے میں جانتی ہے۔ اس کے اوپر تقریباً سب ہی ماضی میں خوب تفتیش کر چکے ہیں... بعد میں نئے آنے والوں نے بھی اسے اسٹڈی کیا تھا۔“

وہ ٹھیک ہی کہانی سنا رہا تھا... ہو سکتا ہے کہ بیس سال قبل معاملہ بہت گرم ہونے پر وہ جنگ زدہ علاقوں میں چلا گیا ہو۔ جنگ ختم ہونے پر اس کی ہابی اسے دوبارہ پرانے علاقے میں کھینچ لائی... تاکہ وہ نئے سرے سے پھر اپنا پرانا کام شروع کر دے۔

”کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”کون جانتا ہے؟ شاید یہ اس کے لیے کھیل ہو۔ اسے ”ٹرافیاں“ جیتنا پسند ہو۔ لیکن تم اس کے اعصاب اور انداز دیکھو کہ اس بھیڑ میں باؤلنگ بیگ لے کر گھس گیا... تاکہ اپنا ”سووینیئر“ بیگ میں لے جا سکے...“

میں نے اندازہ لگایا کہ سارجنٹ شاید میرے چہرے کے تاثرات سمجھ گیا تھا۔ جب ہی اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”سوری، میں سمجھ سکتا ہوں تمہارے احساسات کو... یہ ایک بہت قریبی مڈبھیڑ تھی... وہ ایک عیار قاتل تھا۔ ایک گمنام ذہنی بیماری کا شکار... تم سوچو کہ تم کتنے خوش قسمت رہے۔“

میں نے اعتراف میں سر ہلایا اور اپنا بیگ اٹھا کر دروازے کا رخ کیا۔

نصف شب کی ٹرین میں اب بھی پکڑ سکتا تھا۔ سارجنٹ نے ٹھیک کہا، یہ واقعی ایک نہایت قریبی مڈبھیڑ تھی۔ دل ہی دل میں ”عیار قاتل“ کی اصطلاح کا بھی میں نے اعتراف کیا۔ میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ میں خوش قسمت رہا۔ میرا مطلب ہے کہ جب وہ احمق اٹھائی گیرا سائرن کی آواز سن کر بھاگا تو میں نے رساؤ والا بیگ اسے پکڑا دیا۔ میں اپنے لیے خوش قسمت رہا کہ اس نے بدحواسی میں فرار ہوتے ہوئے باؤلنگ بیگ کی تبدیلی یا رساؤ کا نوٹس نہیں لیا۔

نیل رچرڈ اپنے مشینی آرے سے اس بڑے درخت کے تنے کو کاٹ رہا تھا۔ نیل اور اس کی طرح کے کوئی نوّے افراد شین میٹ ٹمبر کمپنی میں ملازم تھے اور وہ... درختوں کی کٹائی کرتے تھے۔ ریاست منی سوٹا میں کینیڈا کی سرحد سے کوئی تیس میل دور بوگوٹی نامی اس چھوٹے سے قصبے کی معیشت کا انحصار لکڑی کاٹنے پر تھا۔ جنگل کاٹنے کا ٹھیکا میٹ ٹمبر کمپنی کے پاس تھا اور اس کے مالک بھائیوں جون میٹ اور جائل میٹ نے ایک طرح سے اجارہ داری قائم کر رکھی

آزادی کی اکیسویں صدی میں قرونِ اولیٰ جیسی غلامی کی ایک داستانِ دل فگار

صحت منداور کڑیل جوانوں پر جو کام یا بوجھ لاد دیا جائے وہ پیشانی پر شکن لائے بغیر اسے قبول کر لیتے ہیں... پھر یہ لادنے والے کی رضا ہے کہ وہ اسے جہاں اور جتنی دور لے جائے... ان کو کوئی اختیار نہیں ہوتا، کھانے کا... پینے کا یا آرام کرنے کا... ان کا ہر فعل ان سنگ دل مہربانوں کی مرضی پر موقوف ہوتا ہے جو گویا دام چکا کر انہیں اصطبل کے ایک گھوڑے کی طرح خرید چکے ہوتے ہیں۔

غلامی

سکندر علیم

تھی۔ گزشتہ تین سال سے مزدوروں کی تنخواہ میں اضافہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر مزدور کئی بار احتجاج کر چکے تھے اور آج بھی ان کا احتجاج کا ارادہ تھا۔

نیل مزدور لیڈر تھا اور اس نے کمپنی کے خلاف سخت گیر موقف اختیار کیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ مقامی کونسل کے سامنے احتجاج کر کے میٹ کمپنی کا ٹھیکا منسوخ کرایا جائے۔ اپنے اثر رسوخ کی بنا پر انہوں نے بوگوٹی پر ایک طرح سے قبضہ کر لیا تھا۔ یہاں ہر قابل ذکر چیز جیسے گیس اسٹیشن، ہوٹل، سپر اسٹور اور اناج گھر ان کی ملکیت تھے۔ بیس سال کے عرصے میں انہوں نے قصبے میں فروخت ہونے والی ہر زمین اور جائداد خرید لی تھی اور اب قصبے کی چالیس فی صد زمین بھی ان کی ملکیت تھی۔ بوگوٹی کے باشندوں کو احساس تھا کہ ان پر رفتہ رفتہ ایک جبر مسلط ہوتا جا رہا ہے لیکن وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ میٹ برادران سارا کام قانون کی حد میں رہ کر کرتے تھے۔ ان کی دولت کی وجہ سے یونین کونسل کے لوگ اور علاقے کے کانگریس مین اور سینیٹر بھی ان کے طرف دار تھے۔ ان کا باپ ایک معمولی کسان تھا لیکن انہوں نے چالاکی سے علاقے میں جنگل کی کٹائی کا ٹھیکا حاصل کر لیا۔ اس کے بعد وہ قصبے کی معیشت پر حاوی ہوتے چلے گئے۔

نیل کا باپ ڈین رچرڈ بڑھئی تھا اور اس نے ساری عمر محنت مشقت کی تھی۔ شہر سے دور اس علاقے میں نہ تو کوئی صنعت ہے اور نہ یہاں کی زمین قابلِ کاشت ہے۔ اونچا نیچا پہاڑی علاقہ ہے جس میں بلند و بالا درختوں پر مشتمل جنگل ہیں۔ اس لیے واحد پیشہ جس سے لوگ روزگار حاصل کر سکتے تھے، وہ درخت کاٹنے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بوگوٹی کے تیس فی صد لوگوں کا روزگار درخت کاٹنا تھا اور اس پیشے سے وابستہ افراد کی کل تعداد پچاس فی صد سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ ایک زمانے میں نیل کے باپ اور اس کے چند دوستوں نے مل کر لکڑی کا ایک کارخانہ قائم کرنے کا سوچا تھا جہاں لکڑی کو مختلف شکل میں کاٹ کر بیچا جاتا تو اس کی بہت اچھی قیمت مل سکتی تھی۔ لیکن میٹ برادران نے جنگل کی کٹائی کا ٹھیکا حاصل کر کے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا کیونکہ اب یہاں سے لکڑی سینٹ پال کے ایک صنعتی کمپلیکس کو فراہم کی جاتی تھی۔ اس کمپلیکس میں مقامی یونین کونسل اور کانگریس مین کے شیئرز تھے۔ نیل کا باپ اس ناکامی سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ اس نے شراب پینا شروع کر دی اور آخر کار وہ جگر کے کینسر کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد گھر کی ذمے داری نیل کے سر آ گئی۔ وہ سترہ سال کی عمر سے لکڑی کاٹنے کا کام کر رہا تھا۔

روزگار پر لگ جانے کی وجہ سے نیل ہائی اسکول کے بعد مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکا لیکن اس نے اس کی کمی مطالعے سے پوری کرنے کی کوشش کی۔ کام سے آنے کے بعد وہ زیادہ وقت پڑھنے میں صرف کرتا۔ اس مطالعے نے اس کے اندر شعور بیدار کیا اور اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ میٹ برادران کس طرح دولت کے بل بوتے پر ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ وہ ان کی محنت کو استعمال کر کے خود دولت مند ہوتے جا رہے تھے اور ان کی محنت کا صلہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ نیل کا دل چاہتا تھا کہ ان لوگوں کے خلاف کھڑا ہو جائے لیکن وہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک اس کے ساتھ اور افراد نہ ہوتے، وہ ان بھائیوں کا زور نہیں توڑ سکتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس بارے میں قائل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسے یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ سب ہی میٹ برادران کے رویے سے تنگ تھے۔

انہی دنوں نیل کی شادی ہو گئی۔ اس کی بیوی کارلا بہت خوب صورت اور نازک سی لڑکی تھی۔ نیل کے ساتھی اس پر رشک کرنے لگے کہ اسے اتنی حسین بیوی ملی تھی۔ شادی کے چند مہینوں بعد اس نے نیل کو خوش خبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ گھر کی حد تک نیل کی زندگی مکمل تھی لیکن گھر سے باہر اس کے لیے مشکلات کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ بات چھپی نہیں رہی تھی کہ وہ درخت کاٹنے والے ورکرز میں باغیانہ خیالات پھیلا رہا ہے۔ میٹ برادران نے ایک بار اسے دفتر میں بلا کر خبردار بھی کیا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے۔ اس موقع پر نیل اور ان کے درمیان تلخ کلامی ہوئی اور نیل کا خیال تھا کہ اسے ملازمت سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر انہوں نے اسے ملازمت سے نہیں نکالا۔ شاید اس خوف نے انہیں روک لیا ہو کہ ملازمت سے نکالے جانے کے بعد نیل کھل کر ان کے خلاف کام نہ کرنے لگے۔

نیل اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے مزدوروں کو آمادہ کر لیا کہ ان کو اپنی تنخواہوں میں اضافے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے ہفتے میں ایک دن ہڑتال کا پروگرام بنایا۔ جب مقررہ دن مزدوروں کی اکثریت کام پر نہیں آئی تو میٹ برادران فکر مند ہو گئے۔ مگر انہوں نے مزدوروں سے مذاکرات کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس سے

اگلے دن مزدور ازخود کام پر آ گئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر اگلے ہفتے مزدوروں نے ہڑتال کی تو دونوں بھائی سمجھ گئے۔ اس کے باوجود انہوں نے تنخواہ بڑھانے سے انکار کر دیا۔

نیل اور اس کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ آنے والے ہفتے سے وہ پرانی تنخواہ نہیں لیں گے۔ مزدوروں کو ہفتے میں تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس کی بھنک جون اور جائل کو بھی پڑ گئی اور جب نیل اور اس کے ساتھی کام کرنے کے لیے جنگل میں مقررہ مقام پر پہنچے تو انہوں نے وہاں پولیس کو موجود پایا۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن مزدور سمجھ گئے کہ وہ کس مقصد کے لیے وہاں آئے ہیں۔ ان میں اشتعال پھیلنے لگا لیکن نیل اور دوسرے لیڈرز ان کو سمجھا بجھا کر کام پر لے گئے۔ انہوں نے جھگڑا نہیں کرنا تھا بس شام کو تنخواہ لینے سے انکار کرنا تھا۔ وہ سارا دن اپنے کام میں مصروف رہے اور درخت گراتے رہے۔ شام کو مقررہ وقت پر انہوں نے کام بند کیا اور اپنے اوزار چھوڑ کر باہر آئے جہاں کمپنی کا کیشیر مزدوروں کی تنخواہ لیے بیٹھا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایڈم کا نام پکارا۔ ایڈم آ گیا، کیشیر نے رقم دینے سے پہلے رجسٹر بک اس کی طرف کی کہ وہ سائن کر دے۔ ایڈم نے جھک کر رقم دیکھی اور اچانک بک پر تھوک دیا۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ کیشیر نے برہمی سے کہا۔

”ہمیں یہ تنخواہ قبول نہیں ہے۔“ ایڈم نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔

”ٹھیک ہے تم مت لو۔ دوسروں کو آگے آنے دو۔“ کیشیر نے حقارت سے کہا۔

”کوئی تنخواہ لینے نہیں آئے گا۔“ نیل آگے آ کر بولا۔

کیشیر نے جواب دینے کے بجائے بلند آواز سے دوسرے کا نام پکارا۔ پھر وہ ایک ایک کر کے نام پکارتا رہا لیکن کوئی تنخواہ لینے آگے نہیں آیا۔ البتہ بعض نے نام پکارے جانے پر کیشیر کے سامنے آ کر تھوکا ضرور تھا۔ کوئی ایک مزدور بھی تنخواہ لینے نہیں آیا۔ میٹ برادران وہاں نہیں تھے لیکن شیرف آ گیا تھا۔ جب اس نے صورتِ حال دیکھی تو اپنے آدمیوں کو تیار ہونے کا اشارہ کیا اور سامنے آیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”اب تم لوگ گھر جانا پسند کرو گے یا نہیں؟“

نیل آگے آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”آج ہم گھر جا رہے ہیں لیکن اگلے ہفتے ہمیں تنخواہ بڑھا کر نہیں دی گئی تو ہم اتنی شرافت سے گھر نہیں جائیں گے۔“ نیل نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا تو وہ سب قصبے کی طرف روانہ ہو گئے۔ نیل گھر آیا۔ کارلا رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ نیل نے عقب سے اسے بانہوں میں لے لیا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کھانا بنا رہی ہوں۔“ کارلا مسکرائی۔ وہ ماں بننے کے خیال سے خوش تھی۔ نیل نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھا۔

”اور بے بی کیسا ہے؟“

”فائن۔“ کارلا نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ ”اب تم جا کر نہا لو، بہت بو آ رہی ہے۔“

”دل تو نہیں چاہ رہا لیکن...“ نیل نے سرد آہ بھری اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ نہا کر وہ باہر آیا۔ الماری سے دوسرے کپڑے نکال کر پہنے اور سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے اس نے کارلا کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ جیسے ہی وہ کچن میں آیا اسے کارلا فرش پر پڑی نظر آئی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف جھپٹا اور بے تابی سے کہا۔ ”کارلا۔“

کارلا بے ہوش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کچن میں کام کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی ہو۔ نیل اسے دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی اور جیسے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا، عقب میں موجود نقاب پوش نے ایک کپڑا اس کے منہ پر رکھ دیا اور اس سے اٹھتی تیز مہک نے اس کے حواس گم کر دیے...... وہ چکرا کر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ کارلا کے برابر میں زمین پر دراز تھا۔ کارلا کے پیٹ سے خون ابل رہا تھا اور اس کے دوسری طرف نقاب پوش کچن سے باہر والے دروازے سے نکل کر جا رہا تھا۔ اس نے نیل کی طرف دیکھا اور انگلیوں سے بائے کا اشارہ کیا۔ اس کی بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا ناخن سیاہ تھا۔ نیل بس اتنا ہی دیکھ پایا اس کے بعد وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔ اگلی بار اسے ہوش آیا تو پولیس والوں نے اسے یوں گھیر رکھا تھا کہ اس پر پستول تان رکھے تھے اور چلا چلا کر اسے چاقو پھینکنے کو کہہ رہے تھے۔ پھر اس کی نظر کارلا پر پڑی۔ وہ یقیناً مر چکی تھی کیونکہ اس کا سینہ بالکل ساکت تھا اور اس کے آس پاس خون ہی خون تھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ میں موجود خون آلود چاقو دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو۔

☆☆☆

وہ بس سے اترا تو اسے لگا کہ وہ بھیانک خواب اب بھی جاری ہے حالانکہ اس بات کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ پولیس نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اس نے بے وفائی کے شبے

میں اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ جب اس نے قتل کیا تو وہ نشے میں تھا اور اس کے طبی معائنے سے بھی یہ ثابت ہوئی تھی کہ اس کے خون میں بعض نشہ آور کیمیکلز معمول سے کہیں زیادہ مقدار میں پائے گئے تھے۔ جیوری نے اسے قتل کا مرتکب قرار دیا تھا اور عدالت نے اسے دس سال کی سزا سنا دی تھی۔ نیل نے اپنے وکیل کو اپیل کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے خلاف شواہد بہت مضبوط ہیں۔ جس چاقو سے کارلا کو قتل کیا گیا تھا، وہ اس کے کچن کا تھا اور وہ نیل کے ہاتھ میں تھا۔ یہی نہیں بلکہ نیل کے ہاتھ پر کارلا کا خون بھی لگا تھا۔ پولیس کو کسی نامعلوم فرد نے اطلاع دی تھی اور اس نے رنگے ہاتھوں نیل کو گرفتار کر لیا تھا۔ پولیس نے نیل کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی کہ یہ کام ایک نقاب پوش نے کیا ہے۔ پولیس کے مطابق گھر میں کسی شخص کے گھسنے کے آثار نہیں تھے۔

اس نے دس سال جیل میں یہ سوچ کر گزارے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یہ کوئی حادثہ تھا یا اس کو پھنسایا گیا تھا؟ ایک خیال یہ تھا کہ گھر میں کوئی اُچکا گھسا اور اس نے غیر متوقع طور پر کارلا کو قتل کر دیا اور پھر خود کو بچانے کے لیے اسے پھنسا دیا۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ کسی نے باقاعدہ سازش کر کے اسے پھنسایا... اور ایسا صرف......... میٹ برادران کر سکتے تھے۔ وہ ان کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔

بس آگے روانہ ہوئی تو وہ بھی قصبے کی طرف چل پڑا۔ اسے یہاں کے حالات کا علم نہیں تھا کیونکہ گزشتہ دس سالوں میں اس کا یہاں کسی سے رابطہ نہیں رہا تھا۔ ماں باپ پہلے ہی دنیا سے جا چکے تھے اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ جو دوست تھے، وہ بھی اس واقعے کے بعد اس سے لاتعلق ہو گئے تھے۔ اسے تعجب تھا کہ ان میں سے بعض تو اس کے بہت قریبی تھے۔ نہ ان میں سے کوئی عدالت میں آیا اور نہ ہی کسی نے اس کے خلاف مقدمے میں دلچسپی لی تھی۔ وہ اسے بھول گئے تھے۔ اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ انہوں نے اسے مجرم مان لیا تھا۔ نیل کو نہیں معلوم تھا کہ قصبے میں اس کے بارے میں کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن یقیناً اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے باقاعدہ مہم چلائی گئی تھی جس کا یہ نتیجہ نکلا تھا۔ وہ قصبے میں داخل ہوا، اسے کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی۔ چند عمارتوں کا اضافہ ہوا تھا اور شاید کچھ عمارتوں کی مرمت کی گئی تھی۔ اس کا مکان قصبے کے آخری حصے میں تھا لیکن وہاں جانے سے پہلے اسے لنچ کرنا تھا اور کچھ خریداری کرنا تھی۔ قصبے میں بہترین کھانا این فیلڈ کے ریستوران میں ملتا تھا۔

اس نے ریستوران کا رخ کیا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت وہاں اچھے خاصے لوگ ہوتے تھے اور اس روز بھی وہاں خاصے لوگ تھے۔ وہ اندر آیا تو کئی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں این فیلڈ خود موجود تھا۔ ان دس سالوں میں وہ مکمل طور پر بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے پہلے تو دھیان نہیں دیا لیکن پھر نیل کو دیکھ کر چونکا۔

''تم... کب آئے؟''

''آج... ابھی۔'' نیل نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا مجھے ایک برگر اور چکن لیگ پیس مل سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' این فیلڈ نے کہا اور مطلوبہ چیزیں تیار کرنے کا حکم دیا پھر نیل کی طرف دیکھا۔ ''خوش آمدید۔''

''شکریہ... ایک بیئر بھی دینا۔''

این فیلڈ نے بیئر کی بوتل اس کے سامنے رکھ دی۔ ''باہر کب آئے؟''

''پرسوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ اب تم واپس نہیں آؤ گے۔''

''تم سب غلط سمجھ رہے تھے۔'' نیل کا لہجہ ہلکا سا تلخ ہو گیا۔ ''شاید تم سب شروع سے غلط سمجھتے رہے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' این فیلڈ کا لہجہ مدافعانہ ہو گیا۔

وہاں کئی افراد نیل کے جاننے والے تھے لیکن کسی نے اس کے پاس آنے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نیل نے لنچ کیا اور بل ادا کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ اگرچہ اسے قصبے والوں سے کوئی اچھی امید نہیں تھی لیکن پھر بھی ان کا سرد رویّہ دیکھ کر اسے دھچکا لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اسے یقینی طور پر کارلا کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔ اس نے میٹ برادران کے سپر اسٹور سے کچھ خریداری کی اور جب ادائیگی کرنے کاؤنٹر پر آیا تو وہاں موجود کیشیئر چونکا۔ وہ نیل کو جانتا تھا۔ اس نے سامان کی قیمت بناتے ہوئے کہا۔

''آج تو تم آ گئے ہو لیکن مہربانی کر کے آئندہ یہاں مت آنا۔''

''کیوں؟''

''یہاں کوئی تمہیں خوش آمدید نہیں کہے گا۔ تم نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔''

''مجھے یہیں آنا تھا۔'' اس نے زور دے کر کہا اور سامان لے کر اسٹور سے نکل آیا۔ وہ غصے سے کھولتا ہوا اپنے مکان تک آیا جو گزشتہ دس سال سے بند پڑا تھا اور اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ باہر جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ سارا

رنگ اتر گیا تھا اور دروازے پر کسی نے چاند ماری کی تھی۔ اس میں گولیوں کے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ اندر ہر چیز مٹی مٹی ہو رہی تھی۔ اس نے سامان باہر ہی رکھا اور مکان کی صفائی میں لگ گیا۔ کچن میں داخل ہوتے ہی اسے کارلا یاد آئی اور درد کی ایک لہر اس کے دل میں اتر گئی۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ وہ کارلا کے قاتل کو ضرور تلاش کرے گا اور وہ اسے مل گیا تو اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے گا۔ چاہے اس کے بدلے اسے سزائے موت کیوں نہ دے دی جائے۔ شام تک وہ گھر کی صفائی میں مصروف رہا۔ جب وہ پورا گھر صاف کر کے فارغ ہوا تو... خود سر سے پاؤں تک مٹی میں اٹ گیا تھا۔ اس نے غسل کیا اور رات کے کھانے کے لیے ایک بار پھر این فیلڈ کے ریستوران کا رخ کیا۔

اسے سپر اسٹور والا واقعہ یاد تھا۔ سپر اسٹور میٹ برادران کی ملکیت تھا اس لیے وہ اس پر پابندی لگا سکتے تھے۔ لیکن پورا قصبہ ان کی ملکیت نہیں تھا اور وہ اس پر وہاں رہنے یا کوئی کام کرنے کی پابندی نہیں لگا سکتے تھے۔ ڈنر کے وقت ریستوران میں چند ایک لوگ تھے اور ان میں اس کے دو دوست ایڈم اور ہنری بھی تھے۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے اور پھر اس کے گلے لگے۔ علیک سلیک کے بعد نیل نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہاں میری آمد کو کسی نے پسند نہیں کیا ہے۔''

''حالات بہت بدل گئے ہیں۔'' ایڈم نے آہستہ سے کہا۔ ''لوگ دباؤ کا شکار ہیں۔''

''میٹ برادران؟''

ایڈم نے سر ہلایا۔ ''وہ پہلے سے بہت طاقت ور ہو گئے ہیں۔ کارلا کے قتل کے واقعے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے مزدوروں کی بغاوت کو دبا دیا اور لوگ ڈر گئے۔''

''کس بات سے؟''

ہنری نے جواب دیا۔ ''تمہارے دوست ڈر گئے تھے کہ ان کو بھی اس معاملے میں ملوث نہ کر دیا جائے۔ تمہیں معلوم ہے کہ پولیس نے کیا کیس بنایا تھا۔''

نیل نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔ ''وہ بکواس تھی، کارلا معصوم تھی۔ میرا اس پر شک کا سوال ہی پیدا... نہیں ہوتا تھا۔''

''لیکن پولیس تمہارے دوستوں سے پوچھ گچھ کر رہی تھی اور اس وقت شیرف نے دبے انداز میں سب کو خبردار کیا تھا کہ اگر کسی نے دورانِ مقدمہ تم سے ملنے یا تمہاری مدد کی کوشش کی تو اسے بھی ملوث کیا جا سکتا ہے۔''

مشہور مصور

''ایک اچھے مصور کی حیثیت سے شہرت پانے کے لیے کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟''

''بھائی جی! دیکھیں تصویریں تو ہر کوئی بنا لیتا ہے۔ ان میں اچھی بھی ہوتی ہیں اور میری بھی لیکن زندگی میں شہرت بس کسی کسی کو ہی ملتی ہے۔ اب آپ مونالیزا کو لے لیں۔ وہ بے چاری کتنی اچھی فن کارہ تھی۔ آج دنیا بھر میں اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن زندگی میں کسی نے اس کی قدر نہیں کی...''

''معاف کیجیے، مونالیزا فن کارہ نہیں تھی۔ وہ پکاسو کی بنائی ہوئی ایک بے جان تصویر کا نام تھا۔ اس تصویر کی جان دار مسکراہٹ نے اسے شہرت دے دی۔''

''جی جی! مجھے سب معلوم ہے، میں سب جانتا ہوں۔ مونالیزا اور پکاسو ایک ہی بات ہے!''

''آپ زندگی میں شہرت حاصل کرنے کا نسخہ بتا رہے تھے۔''

''جی ہاں! اس کے لیے آرٹسٹ کے کان پر برش اور جیب میں ہتھوڑی اور کیلوں کا ہر وقت موجود رہنا ضروری ہے۔''

''ہتھوڑی اور کیلیں...! آرٹ سے ان کا کیا واسطہ!''

''سب کچھ ان ہی کا کھیل ہے۔ اسے جہاں کوئی اچھی اور صاف ستھری جگہ خالی نظر آئے، کیل ٹھونک کر اپنی تصویر لٹکا دے۔ تھوڑے دنوں میں شہرت اس کے قدم چومے گی۔''

''ویری گڈ! پھر کان پر برش کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔''

''آپ بات نہیں سمجھتے۔ وہ بھی بہت ضروری ہے تاکہ لوگوں کو یہ یقین آ سکے کہ شہر بھر میں لٹکی ہوئی تصویریں اسی کی بنائی ہوئی ہیں... بھائی جی! یہ چھوٹی موٹی باتیں نہیں ہیں۔ میں نے اتنی زندگی گزار کر کامیابی کے یہ گر سیکھے ہیں۔ اب آپ مجھے جگہ دیں اور اپنی دیوار میں کیل ٹھونکنے دیں۔ یہاں مجھے ایک تصویر لٹکانی ہے۔''

(ایک مشہور مصور کے انٹرویو سے اقتباس)

(کورنگی سے حمیرا اقبال کا تعاون)

نیل گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تو یہ وجہ تھی کہ کوئی اس سے سماعت کے دوران اور بعد میں جیل میں ملنے نہیں آیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اب کیا صورتِ حال ہے؟''

''بہت بُری ہے۔ میٹ ٹمبر کے پاس مزید دس سال کے لیے ٹھیکا ہے اور اس دوران میں وہ یہاں کسی اور کے قدم جمنے نہیں دیں گے۔ قصبے کے تمام کاروبار... پر وہ پہلے ہی قابض ہیں۔''

''تنخواہ کتنی ہے؟''

''آس پاس کے علاقوں سے کوئی تیس فی صد کم ہے۔ بہت سارے لوگ یہاں سے جا چکے ہیں۔''

ہنری نے کہا۔ ''اور جو ہیں، وہ بھی یہاں سے جانے کی سوچ رہے ہیں۔''

''یہ ہمارا قصبہ ہے، ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔'' نیل نے تیز لہجے میں کہا۔

''ہنری ٹھیک کہہ رہا ہے دوست... یہاں حالات بہت مشکل ہو گئے ہیں۔'' ایڈم نے نرمی سے کہا۔ ''ہم سب فیملی والے لوگ ہیں اور ہمارے لیے اس طرح کام کرنا دشوار ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن اس طرح میدان چھوڑ کر جانا...''

''دوست، ہم کوئی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں کہ میدان چھوڑ کر جانے کا مطلب شکست بن جائے۔'' ہنری نے اس کی بات کاٹی۔ ''یہاں سے چالیس میل دور ایک اور کمپنی درختوں کی کٹائی کا کام شروع کرنے والی ہے اور اسے کارکنوں کی ضرورت ہے۔ وہ مارکیٹ سے دس فی صد زیادہ معاوضہ دے رہی ہے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم وہاں چلے جائیں گے۔''

نیل کو مایوسی ہونے لگی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے جانے سے میٹ برادران کو کوئی نقصان ہوگا؟ نہیں... بلکہ اس جگہ ان کا قبضہ اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔''

ایڈم نے شانے اچکائے۔ ''ہماری بلا سے... جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو وہ کچھ بھی کرتا رہے۔''

''دوستو! تم صرف اپنے لحاظ سے سوچ رہے ہو۔ کیا یہاں صرف لکڑی کاٹنے والے بستے ہیں؟ اور بھی بہت سارے لوگ ہیں جو یہاں سے نہیں جا سکتے.... وہ میٹ برادران کے رحم و کرم پر نہیں رہ جائیں گے؟''

''ہم سب کے بارے میں نہیں، صرف اپنی فیملیوں کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔'' ہنری بولا، ایڈم نے اس کی تائید کی۔

''یہ خود غرضی نہیں ہے؟ ہمارے خاندانوں کو بھی اچھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔''

''یہاں سے بس اتنا ملتا ہے کہ مشکل سے گزارہ چلتا ہے۔ بچت یا اچھی زندگی گزارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

نیل ڈنر کر کے واپس آیا تو اس کے ذہن میں کئی معاملات واضح ہو گئے تھے اور ساتھ ہی اسے درست صورتِ حال کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ بوگوٹی کا قصبہ خطرے میں تھا اور اگر یہ لوگ یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیتے تو ہجرت کا ایک ایسا سلسلہ چل نکلتا جس کے بعد بوگوٹی ایک گھوسٹ ٹاؤن بن کر رہ جاتا۔ امریکا میں گھوسٹ ٹاؤنز کی کمی نہیں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس ترقی یافتہ ترین ملک میں تیرہ ہزار سے زیادہ گھوسٹ ٹاؤنز ہیں۔ یعنی ایسے گاؤں اور شہر جو کسی وجہ سے لوگوں سے خالی ہو گئے اور اب وہاں سوائے عمارتوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ نیل کو اس خیال نے مضطرب کر دیا کہ اس کا قصبہ بھی خالی ہو جائے گا۔ اسے اس جگہ سے محبت تھی اور وہ اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اگلے چند دن تک نیل مکان کے آس پاس کی صفائی میں مصروف رہا۔ اس نے جھاڑیاں صاف کیں اور باغ میں نئے پودے لگائے۔ پھر اس نے مکان پر کلر کا کام کیا۔ یہ اس کا آبائی مکان تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے باپ کی ورکشاپ بھی تھی لیکن اس نے کبھی اسے استعمال نہیں کیا تھا۔ گزشتہ پندرہ سال سے یہ ایسے ہی پڑی تھی۔ اس نے باپ کا پیشہ اختیار نہیں کیا تھا لیکن اس نے جیل میں قید کے وقت کو ضائع بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کیا اور پہلے گریجویشن اور پھر ماسٹر کیا۔ ماسٹر کے لیے اس نے سماجی سائنس کا انتخاب کیا۔ اس کے ساتھ نیل نے جیل میں کارپینٹر شاپ میں کام کیا۔ اس نے پہلے کارپینٹر کا بنیادی کورس کیا اور اس کے بعد اس نے اپنی الگ راہ منتخب کی۔ اب بھی اس کا ارادہ یہی کام کرنے کا تھا۔ جیل میں ان مثبت سرگرمیوں کی وجہ سے اسے سزا میں چھوٹ بھی ملی اور وہ دو سال پہلے رہا کر دیا گیا۔

جب تک اس نے مکان اور ورکشاپ کی حالت درست کی، اسے قصبے کے حالات کی آگاہی بھی ملتی رہی۔ اسے یہ جان کر دھچکا لگا کہ بوگوٹی کی دس فی صد آبادی یہاں سے دوسرے قصبوں یا شہروں کی طرف جا چکی ہے۔ یہ سارے لوگ ہی درخت کاٹنے کے پیشے سے وابستہ تھے۔

نیل جانتا تھا کہ صرف درخت کاٹنے والے ہی یہاں سے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کے علاوہ کسی اور کو صرف بوگوٹی سے ہی نہیں بلکہ اس علاقے سے دور کسی اور شہر میں جانا پڑتا کیونکہ یہاں روزگار محدود تھا۔ مزید لوگ یہاں سے جانے کا سوچ رہے تھے اور یہ سب درخت کاٹنے والے تھے۔ درحقیقت ان لوگوں کی وجہ سے بوگوٹی کی معیشت چلتی تھی۔ درخت کاٹنے والے کما کر خرچ کرتے تھے جس سے دوسرے لوگوں کا کام چلتا تھا۔ اگر وہی یہاں سے چلے جاتے تو بوگوٹی کی معیشت تباہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

نیل نے جیل میں کام کر کے کچھ رقم کمائی تھی اور اس وقت وہی اس کے کام آ رہی تھی۔ اس نے ورکشاپ کے لیے کچھ اوزار لیے۔ اب اسے لکڑی کی ضرورت تھی۔ بوگوٹی میں لکڑی صرف میٹ ٹمبر سے مل سکتی تھی اور اسے معلوم تھا کہ وہاں سے اسے لکڑی نہیں ملے گی۔ اس لیے اس نے ایک دوسری کمپنی سے لکڑی حاصل کی۔ اسے بوگوٹی سے کوئی چالیس میل دور سے لکڑی لانی پڑی۔ اس میں خرچہ زیادہ تھا لیکن اس کی مجبوری تھی۔ کام شروع کرنے کے لیے اسے لکڑی کی اشد ضرورت تھی۔

ہنری، ایڈم اور دوسرے پانچ افراد یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے نیل کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ چلے لیکن نیل نے انکار کر دیا۔ اس نے لکڑی کاٹنے کا پیشہ ترک کر دیا تھا۔ ان کے جانے سے پہلے اس نے ان سے کہا۔ ''اگر تم لوگ میرا ساتھ دو تو ممکن ہے تمہیں یہاں سے جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اور یہاں کے لوگوں کو میٹ برادران سے بھی نجات مل جائے۔''

''دوست... یہ ممکن نہیں ہے۔'' ہنری نے فوراً انکار کر دیا۔

''تمہارا منصوبہ کیا ہے؟'' ایڈم نے پوچھا۔

''میں یہاں لکڑی کی اشیا تیار کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''اس کے لیے لکڑی کی ضرورت ہے اور لکڑی ساری میٹ ٹمبر کے قبضے میں ہوتی ہے۔'' ایڈم نے اسے یاد دلایا۔

''جب میں کام شروع کروں گا تو میں یونین کونسل کے پاس جاؤں گا اور ان سے اپنی ورکشاپ کے لیے لکڑی کے حصول کی بات کروں گا۔ خام لکڑی کے مقابلے میں اس کی مصنوعات کی تیاری سے یونین کونسل کو یقیناً زیادہ ٹیکس ملے گا۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ وہ میٹ برادران کے مقابلے میں تمہاری بات نہیں سنیں گے۔'' ہنری نے یقین سے کہا۔

''لیکن کوشش تو کی جا سکتی ہے۔'' نیل نے اصرار کیا۔

''تم نے پہلے بھی کوشش کی تھی... تمہیں کیا ملا؟'' ہنری کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''اپنی بیوی سے محروم ہوئے اور آٹھ سال جیل میں رہنا پڑا۔''

''اس کے باوجود میں اپنی جدوجہد ترک کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے دوست... جب تم کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بتا دینا۔'' ایڈم بولا۔ اس کا لہجہ تمسخرانہ ہو گیا۔ ''ہم واپس آ جائیں گے۔''

نیل ان کے رویے سے مایوس ہوا۔ ''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی لیکن میں کوشش ضرور کروں گا، چاہے مجھے اس میں کامیابی ہو یا ناکامی۔''

''تم ایسا کر سکتے ہو۔'' ایڈم بے رخی سے بولا۔ ''تمہارے پاس اب کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ساتھ بیوی بچے ہیں، ہم انہیں نہیں کھو سکتے۔''

جیل میں نیل نے لکڑی سے تعمیراتی اشیا بنانے کا فن سیکھا تھا اور اس کا کام بہت اعلیٰ معیار کا تھا اس لیے اسے امید تھی کہ وہ اپنا کاروبار چلا لے گا۔ وہ خاص طور سے دروازے اور کھڑکیاں تیار کرنے کا ماہر تھا۔ لکڑی لاتے ہی اس نے کام شروع کر دیا۔ اگرچہ اکیلے کام کرتے ہوئے اسے ذرا دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس نے انٹرنیٹ کی مدد سے دروازوں اور کھڑکیوں کے جدید ترین ڈیزائن نکالے اور پھر ان میں اپنے طور پر تبدیلی کر کے تیاری کا کام شروع کر دیا۔ اس پورے علاقے میں یہ کام کرنے والا کوئی نہیں تھا اور جو مکانات بنواتے یا بناتے تھے، ان کو یہ سارا سامان شہروں سے لانا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے بھی امید تھی کہ اس کا کام چل نکلے گا۔

وہ صبح اٹھ کر ناشتا کرتے ہی ورکشاپ میں کام پر لگ جاتا۔ اس کی کوشش تھی کہ نمونوں کی تیاری جلد از جلد مکمل کر لے، اس کے بعد ہی وہ یونین کونسل والوں سے بات کر سکتا تھا۔ اس دن بھی وہ صبح صبح کام میں مصروف تھا کہ ایک عورت نے ورکشاپ میں جھانکا۔ یہ تقریباً ستائیس برس کی دل کش اور گداز بدن کی عورت تھی۔ ''ہیلو۔'' اس نے کہا۔

''ہیلو۔'' نیل نے جواب دیا۔ عورت جانی پہچانی لگ رہی تھی لیکن نیل اسے شناخت نہیں کر سکا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

"نیل! کیا تم نے میرے کتے بوب کو دیکھا ہے؟ سفید رنگ کا چھوٹا سا کتا ہے۔"

"نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔" نیل نے نفی میں سر ہلایا اور پھر ہچکچا کر بولا۔ "کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

"تم مجھے بھول گئے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "میں سوان نیل ہوں، پانچ سال پہلے یہاں سے چلی گئی تھی۔"

اب نیل کو یاد آ گیا۔ "اوہ... اتنا عرصہ ہو گیا اس وجہ سے میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔" اس نے ندامت سے کہا۔

"کوئی بات نہیں... تمہاری سزا پر مجھے افسوس ہوا تھا اور میں نے کبھی اس پر یقین نہیں کیا کہ یہ کام تم نے کیا ہے۔"

"تمہارا شکریہ۔" نیل نے آہستہ سے کہا۔ "کیا میں بوب کو تلاش کرنے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں؟"

"ضرور لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" سوان نے بے تکلفی سے پوچھا۔ "یہ شاید دروازہ ہے؟"

"ہاں، یہ سنگل ڈور ہے۔" نیل نے اسے دروازے کی ڈرائنگ دکھائی۔ "تیار ہونے کے بعد یہ ایسا لگے گا۔"

"یہ تو بہت خوب صورت ہے۔" سوان متاثر ہوئی۔ "میں حال ہی میں واپس آئی ہوں اور اپنے مکان میں کچھ تبدیلیاں کروا رہی ہوں۔ ان میں دروازوں اور کھڑکیوں کی تبدیلی کا کام بھی ہے۔ کیا تم وقت نکال کر آ سکتے ہو؟"

اگرچہ نیل اپنی ساری توجہ کام پر رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ سوان کو انکار نہیں کر سکا۔ "میں آجاؤں گا لیکن پہلے تمہارے کتے کو تلاش کرتے ہیں۔"

کتا نیل کے مکان کے ساتھ جنگل میں مل گیا۔ نیل نے اسے سوان کے حوالے کیا۔ "اس کا خیال رکھا کرو، جنگل میں یہ کسی حادثے کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں خیال رکھتی ہوں لیکن آج یہ چپکے سے نکل گیا۔ بہرحال تمہارا شکریہ۔"

"میں جلد چکر لگاؤں گا۔"

اس روز نیل نے جتنا کام سوچا تھا، وہ اس کی توقع کے خلاف جلد نمٹ گیا اور اس نے سوچا کہ وہ سوان کے گھر کا چکر لگا لے۔ تازہ دم ہو کر وہ سوان کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ اسی سڑک پر ذرا پیچھے تھا۔ کال بیل کے جواب میں سوان نے دروازہ کھولا۔ وہ نیل کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اتنی جلدی آجاؤ گے۔"

"آج کام ذرا جلدی نمٹ گیا تھا، میں نے سوچا تمہارا گھر دیکھ لوں۔"

"اندر آؤ۔" سوان اسے اندر لائی اور گھر دکھانے لگی۔ یہ اچھا بڑا گھر تھا اور اس میں اوپر نیچے خاصا کام تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے علاوہ فرش کا کام بھی تھا اور جو کام ٹھیک تھا، اسے بھی پالش کی اشد ضرورت تھی۔ گھر دکھانے کے بعد سوان اسے کچن میں لے آئی۔ وہ رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ سوان ایک انٹرنیٹ ٹریڈنگ کمپنی میں سیلز ایگزیکٹو تھی اور اسے گھر میں کام کرنے کی سہولت میسر تھی اس لیے اس نے سینٹ پال سے واپس یوگوئی آنے کا فیصلہ کیا۔

"سچی بات ہے کہ میرا وہاں دل نہیں لگا اس لیے موقع ملتے ہی میں واپس آ گئی۔"

"حیرت ہے حالانکہ لوگ تو یہ قصبہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" نیل نے تلخی سے کہا۔ "یہ میٹ برادران سے خوف زدہ ہیں۔"

"میں جانتی ہوں لیکن جب مجھے یہاں کے حالات کا پتا چلا تو مجھے ان لوگوں پر ترس بھی آیا۔ یہ خوشی سے نہیں جا رہے۔"

"پھر بھی ان کو اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔"

"نیل! سب تمہاری طرح سخت جان اور مثبت ذہن رکھنے والے نہیں ہوتے۔" سوان نے نرمی سے کہا۔ "میرا نہیں خیال تھا کہ تم جیل سے اس طرح واپس آؤ گے۔"

"شاید تمہاری اور دوسرے لوگوں کی سوچ تھی کہ میں کوئی بدمعاش بن کر سامنے آؤں گا۔"

"ہاں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ تم اسی طرح واپس آجاؤ گے۔"

سوان نے اسے رات کے کھانے پر روک لیا۔ نیل رک گیا۔ اس نے برسوں سے گھر کا بنا کھانا نہیں کھایا تھا اور وہ اس کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا۔ ڈنر کے بعد سوان نے اسے بہت اچھی کافی پلائی۔ وہ اس کے گھر سے نکلا تو بہت اچھے موڈ میں تھا لیکن جب وہ اپنی ورکشاپ تک پہنچا تو رک گیا۔ اندر لائٹ جل رہی تھی جبکہ وہ لائٹ بجھا کر گیا تھا۔ اس نے سوچا اور پھر دبے قدموں ورکشاپ تک آیا۔ اس نے کھلے دروازے سے اندر دیکھا تو اسے ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ یہ میٹ برادران کا منیجر زیگر کیپ تھا۔ ابھی نیل اسے دیکھ رہا تھا کہ کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ زیگر اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"مسٹر رچرڈ... آٹھ سال بعد تمہیں دیکھ کر خوشی ہو

رہی ہے۔ تم میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔"

"تم میری ورکشاپ میں بغیر اجازت کے داخل ہوئے ہو۔ اس سے پہلے کہ میں پولیس کو کال کروں، یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

"اوہ... تمہارے دم خم بھی پہلے جیسے ہیں۔" زیگر نے کہا۔ اس دوران میں نیل کو اندر دھکا دینے والا بھی آ گیا تھا۔ یہ میٹ برادران کا ایک تنومند کرگا جیف تھا۔ اس نے زیگر کی طرف دیکھا۔

"کہو تو اسے ذرا سبق سکھا دیں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مسٹر رچرڈ خود بھی سمجھدار آدمی ہیں۔"

نیل نے محسوس کیا کہ وہ برہمی دکھا کر نقصان میں رہے گا اس لیے اس نے تحمل سے کہا۔ "مسٹر کیپ! تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں۔" اس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "میں تو کچھ نہیں چاہتا لیکن میٹ برادران تم سے کچھ چاہتے ہیں۔"

"وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ چاہتے ہیں کہ تم یہ ورکشاپ بند کر کے دوبارہ ان کے پاس کام پر آ جاؤ۔"

"اور اگر میں یہ بات نہ مانوں تو...؟"

"تب تم یہاں سے چلے جاؤ۔" زیگر نے لہجے میں غرور سمو کر کہا۔ "یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

"میٹ برادران مجھے کوئی کام کرنے سے کیسے روک سکتے ہیں؟"

"روک سکتے ہیں۔" زیگر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "ہمارے جانے کے بعد تم اپنی ورکشاپ کا معائنہ کر لینا، تمہیں خود سمجھ آ جائے گا۔"

زیگر نے کہا اور جیف کو اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ جیف بھی چلا گیا۔ ان کے جاتے ہی نیل اس طرف لپکا جہاں وہ اپنا سامان رکھتا تھا اور یہ دیکھ کر اس کا غصے سے بُرا حال ہو گیا کہ اس نے نمونے کی جتنی چیزیں تیار کی تھیں، ان سب کو بھاری ہتھوڑے سے توڑ پھوڑ دیا گیا تھا۔ نیل نے بڑی مشکل سے خود کو ان کے پیچھے جانے سے روکا۔ وہ باہر اپنی گاڑی میں موجود تھے اور بلند آواز سے بات کر کے اسے جتا رہے تھے کہ وہ ابھی یہاں سے گئے نہیں۔ نیل نے سوچا اور اپنے موبائل فون سے پولیس کا نمبر ملایا اور رابطہ ہوتے ہی بلند آواز سے بولا۔

"مجھے فوری مدد کی ضرورت ہے۔ کچھ لوگوں نے میری ورکشاپ میں گھس کر توڑ پھوڑ کی ہے۔"

"اپنا نام اور پتا بتاؤ مسٹر۔" نائن ون ون کے آپریٹر نے نرمی سے کہا۔

نیل نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور اپنا نام اور پتا بتا کر فون بند کر دیا۔ پندرہ منٹ بعد ایک پولیس کار اس کی ورکشاپ کے سامنے تھی۔ اس سے اتر کر آنے والا شیرف جوان تھا۔ نیل اسے جانتا تھا۔ مچل نیلسن نامی یہ شخص اچھا پولیس افسر تھا اور اب وہ اس علاقے کا شیرف تھا۔ شاید وہ اسی علاقے میں گشت کر رہا تھا اس لیے وہ خود آ گیا۔

"مسٹر نیل رچرڈ۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہارے آتے ہی مسئلے سامنے آنے لگے ہیں۔"

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ تلخ انداز میں بولا۔ "میں خود اپنی ورکشاپ میں توڑ پھوڑ نہیں کر سکتا۔"

شیرف مچل نے اس کی ورکشاپ کا معائنہ کیا۔ "کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟"

"ہاں، میں نے زیگر اور جیف نامی شخص کو اپنی ورکشاپ سے نکلتے دیکھا ہے۔ یہ دونوں میٹ ٹمبر کمپنی میں کام کرتے ہیں۔"

شیرف مچل نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو، تم کن لوگوں پر الزام لگا رہے ہو؟"

"ہاں، میں نے سچ بیان کیا ہے۔ اگر تم میری ورکشاپ کا معائنہ کرو تو تمہیں ان لوگوں کی یہاں موجودگی کے ثبوت بھی مل جائیں گے۔"

"اس کے لیے تمہیں باقاعدہ رپورٹ کرانا ہوگی۔"

"میں تیار ہوں۔" نیل نے کہا۔ وہ شیرف مچل کے ساتھ پولیس اسٹیشن آیا اور اس نے زیگر اور جیف کے خلاف رپورٹ درج کرا دی۔ اگر وہ اس کی ورکشاپ میں توڑ پھوڑ نہ کرتے تو شاید وہ اس حد تک جانے سے گریز کرتا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس کی اور میٹ برادران کی کھلی لڑائی شروع ہو جائے گی۔ امکان یہی تھا کہ اسے نقصان اٹھانا پڑے گا، اس کے باوجود وہ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے نقصان کی رپورٹ کے ساتھ ایک رپورٹ اور بھی کی کہ اگر اسے کوئی جانی نقصان ہوا تو اس کی ذمے داری میٹ برادران پر ہوگی۔ اس کی ورکشاپ پر حملے اور اس کی پولیس رپورٹ کی خبر نہ جانے کیسے اتنی جلدی قصبے میں پھیل گئی۔ جب وہ واپس آیا تو سوان، ایڈم اور ہنری اس کے گھر کے سامنے موجود تھے۔ ہنری نے اسے دیکھ کر کہا۔

”نیل! تم نے اچھا نہیں کیا۔“

ایڈم نے اس کی تائید کی۔ ”یہ لوگ بہت طاقت ور ہیں۔“

”اگر تم مجھے یہی بتانے آئے ہو تو تمہارا شکریہ۔“ نیل کہتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے آ گئے۔

”نیل! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ایڈم نے کہا۔

نیل نے اسے بازو سے پکڑا۔ اسے کھینچ کر اپنی ورکشاپ میں لایا اور توڑی جانے والی چیزیں دکھائیں۔ ”یہ میری ایک ہفتے کی محنت تھی جو انہوں نے برباد کر دی اور اب میٹ برادران چاہتے ہیں کہ میں پھر سے ان کی غلامی میں آ جاؤں یا قصبہ چھوڑ کر چلا جاؤں۔“

ان کے پیچھے سوان اور ہنری بھی آ گئے۔ ایڈم نے آہستہ سے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، ہم خوشی سے جا رہے ہیں؟ نہیں... بلکہ ہمارے سامنے بھی یہ دو آپشن رکھے گئے تھے۔“

”اور تم لوگ یہاں سے جا رہے ہو؟“

”ہم نے کہا نا کہ ہم نہ تو تمہاری طرح مضبوط ہیں اور نہ ہی اکیلے ہیں۔“ ہنری بولا۔ ”ہم اپنے بیوی بچوں کی جانیں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔“

”تو تم لوگ جاؤ تمہیں کس نے روکا ہے؟“

”ہمیں تمہاری فکر ہے۔“ ایڈم بولا۔

”نیل! یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں... یہ تمہارے مخلص ہیں۔“ سوان بولی۔

نیل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن دوست... میں اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بہتر ہوگا تم لوگ مجھ سے دور رہو ورنہ یہ لوگ تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

اس بات کا خطرہ ان لوگوں کو بھی تھا۔ وہ نیل کی ہمدردی میں یہاں تک آ گئے تھے لیکن وہ اس جھگڑے میں اس کے ساتھ کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ایڈم اور ہنری کے جانے کے بعد نیل نے سوان کی طرف دیکھا۔ ”میرا یہی مشورہ تمہارے لیے بھی ہے۔“

”نہیں، میں تم سے دور نہیں ہو سکتی۔“ سوان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میرا اندازہ تھا کہ جیل سے تم زیادہ اچھے انسان بن کر آئے ہو لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے اور میں ہر صورت میں تمہارا ساتھ دوں گی۔“

”سوان! میں تمہیں نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“

نیل نے نرمی سے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے دل میں کیا ہے لیکن میرے دل میں تم بہت اہم مقام حاصل کر چکی ہو۔“

سوان اس کے پاس تھی، اس نے نیل کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اتنا ہی اہم مقام تم میرے دل میں حاصل کر چکے ہو۔ نیل! میری درخواست ہے کہ تم اس چکر سے نکل جاؤ۔“

”کاش کہ یہ ممکن ہوتا۔“ اس نے سرد آہ بھری۔ ”ابھی مجھے ان سے کارلا کے خون کا حساب بھی لینا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے خلاف یہ سازش انہوں نے کی تھی۔“

سوان ذرا مایوس ہوئی۔ ”تمہارے نزدیک زندوں ..... سے زیادہ مر جانے والوں کی اہمیت ہے؟“

”ایسا نہیں ہے لیکن مر جانے والوں کا بھی ہم پر حق ہوتا ہے اور اب یہ بات اصول کی ہے۔ میں اگر پیچھے ہٹا تو اپنی نظروں سے گر جاؤں گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

سوان کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں۔“ پھر اس نے اپنی بانہیں نیل کے گلے میں ڈال دیں۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔ تمہارا میرے ساتھ نظر آنا ضروری نہیں ہے۔ اس طرح تم میرے زیادہ کام آ سکتی ہو۔“

سوان اس سے الگ ہوئی۔ ”ویسے تم نے ایک طرح سے اچھا بھی کیا ہے۔ اب یہ تمہارے خلاف کچھ کرنے سے پہلے سوچیں گے ضرور۔“

”انہوں نے میرے خلاف جو کرنا تھا، وہ کر دیا ہے۔“ نیل نے مایوسی سے برباد ہونے والی چیزوں کو دیکھا۔ ”اب مجھے دوبارہ لکڑی لانی ہوگی اور کام بھی نئے سرے سے کرنا پڑے گا۔“

سوان ہچکچائی۔ ”سنو... تم نے ابھی کام شروع کیا ہے اور تمہارے پاس زیادہ رقم نہیں ہوگی۔ اگر تمہیں ضرورت ہو تو میں...“

”نہیں، مجھے فوری ضرورت نہیں ہے۔“ نیل نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”ابھی میرے پاس کچھ رقم ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اگر تمہیں ضرورت ہو تو تم مجھ سے ضرور کہنا۔“

”او کے۔“ نیل نے اس کی بات مان لی۔

اگلے دن اس نے ورکشاپ کے دروازے پر ایک مضبوط تالا لگا دیا۔ اگرچہ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا لیکن کچھ تو کرنا تھا۔ اس نے جا کر لکڑی خریدی اور واپس آ کر دوبارہ کام میں لگ گیا۔ اس بار اس نے زیادہ تیزی سے کام کیا۔ وہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ورکشاپ میں آ جاتا تھا اور رات گئے تک کام میں مصروف رہتا۔ سوان دن میں دو تین بار اس کے پاس آتی تھی لیکن نیل کو اس سے بات کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ سوان اسے زیادہ پریشان بھی نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اس کے لیے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز لے آتی تھی۔

نیل سمجھ رہا تھا کہ سوان کے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں۔ حالانکہ وہ ایک سزا یافتہ شخص تھا اور سوان کے لیے اچھے افراد کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ سوان نے اسے پسند کیا تھا۔ اب اس کی زندگی کے مقاصد میں سوان بھی شامل ہو گئی تھی۔ اسے اپنا کام شروع کرنا تھا، کارلا کے قاتل کو تلاش کرنا تھا اور پھر سوان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اولین شرط تھی اس لیے وہ سب فراموش کر کے جان توڑ محنت کر رہا تھا۔ اس بار وہ دس دن کے اندر اپنے ڈیزائن کے نمونے تیار کرنے میں کامیاب رہا۔ پھر اس نے اپنے تیار کردہ دروازوں اور کھڑکیوں پر خوب صورت پالش کی تو وہ اور بھی نکھر گئے۔ اس شام وہ ورکشاپ میں کھڑا اپنی محنت کا نظارہ کر رہا تھا کہ سوان وہاں آ گئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

”میرے خدا... اتنے خوب صورت دروازے اور کھڑکیاں۔“

نیل نے مڑ کر دیکھا۔ ”تمہیں پسند آئے ہیں؟“

”پسند...؟“ وہ تعجب سے بولی۔ ”میں نے آج تک ہاتھ سے بنے اتنے خوب صورت دروازے اور کھڑکیاں نہیں دیکھے۔“

”یہ کام میں نے جیل میں سیکھا تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب رہو گے۔“ سوان پُرجوش لہجے میں بولی۔ ”ایک منٹ رکنا... میں ابھی آئی۔“

سوان کچھ دیر میں آئی تو اس کے پاس ایک جدید ڈیجیٹل کیمرا تھا۔ اس نے نیل سے کہا کہ وہ اپنے تیار کیے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے ساتھ کھڑا ہو جائے۔ پھر اس نے ایک ایک چیز کی کئی کئی زاویوں سے تصاویر لیں۔ نیل اس کی شوخی اور بچکانا انداز پر مسکرا رہا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک سوان تصویریں لیتی رہی حتیٰ کہ اس کے کیمرے کی میموری ختم ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”شان دار... میں ان تصویروں کو ویب پر لوڈ کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہت سارا بزنس تو ایسے ہی مل جائے گا بلکہ اگر تم کہو تو میں

تمہیں اپنے آن لائن اسٹور میں شامل کر دوں۔ تمہیں کچھ کمیشن دینا ہوگا لیکن اس کا تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔“

نیل کو آن لائن بزنس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا کیونکہ جس عرصے میں وہ جیل میں رہا تھا، اس دوران میں یہ بزنس پروان چڑھا تھا۔ ”تمہاری مرضی لیکن مجھے اس بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔“

”میرے ساتھ چلو، میں تمہیں سب بتاتی ہوں بلکہ تمہارا اکاؤنٹ بنا دیتی ہوں۔ تمہیں صرف اس وقت ادائیگی کرنا پڑے گی جب تمہاری بنائی ہوئی کوئی چیز ہمارے اسٹور کے توسط سے فروخت ہوگی۔“

نیل کا کام ختم ہو گیا تھا اور اس کے پاس فرصت تھی اس لیے وہ مان گیا۔ اس نے کہا۔ ”رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھائیں گے۔“

سوان کھل اٹھی۔ ”میں جا کر تیار ہوتی ہوں۔“

”میں چھ بجے تک آؤں گا۔“ نیل نے اسے بتایا۔

اس کے پاس ایک پرانی سیڈان کار تھی۔ آٹھ سال تک کھڑے رہنے سے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی لیکن اس کے انجن اور دوسرے پرزے بہترین حالت میں تھے۔ فی الحال تو نیل نے اسے صاف کر کے اور سروس کر کے قابلِ استعمال بنا لیا تھا لیکن اس کا ارادہ اسے تبدیل کرنے کا تھا۔ جب اس کے پاس کچھ رقم آ جاتی تو وہ یہ کام کرتا۔ اس دن کے بعد سے میٹ برادران کے گرگوں کی صورت نہیں دکھائی دی۔ نیل کو لگ رہا تھا کہ اب وہ اس کے منہ لگنے سے گریز کریں گے۔ پولیس میں اس کی رپورٹ کا اثر ہوا تھا۔

وہ چھ بجے تیار ہو کر سوان کے گھر پہنچا تو وہ بھی تیار تھی۔ اس نے خوب صورت فراک پہن رکھی تھی جس میں اس کا دل کش وجود نمایاں تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے یہ تیاری خاص نیل کے لیے کی تھی۔ اس نے گھوم کر خود کو دکھایا۔ ”کیسی لگ رہی ہوں؟“

نیل نے پہلی بار جرأت کی اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے عملاً بتانے لگا کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ سوان شرما گئی۔ ”بدتمیز۔“

نیل مسکرانے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس کے لیے محبت کا لقب ہے جو ہر چاہنے والی عورت اپنے محبوب کو دیتی ہے۔ سوان اسے اپنے کام والے کمرے میں لائی۔ یہاں کمپیوٹر اور اس سے متعلق سامان تھا جس کی اسے کام کے دوران ضرورت پڑتی تھی۔ اس نے نیل کو عملی طور پر دکھایا کہ آن لائن ٹریڈنگ کس طرح کرتے ہیں۔ وہ متاثر ہوا۔

"یہ تو بہت آسان ہے۔"

"اور محفوظ بھی ہے۔ اب میں صرف اس وجہ سے بوگوٹی میں بیٹھ کر بھی جاب کر سکتی ہوں۔"

نیل کو یہ خیال اچھا لگا ورنہ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اپنی ورکشاپ چلانے کے لیے تشہیر پر خاصی رقم خرچ کرنا پڑے گی، تب کہیں جا کر کام ملے گا۔ اس نے کہا۔ "اب چلیں؟"

"ہاں۔" سوان نے کہا پھر اسے خیال آیا۔ "تم نے ورکشاپ اچھی طرح بند کر دی تھی؟"

"ہاں، تم فکر مت کرو۔" اس نے کہا اور وہ باہر نکل آئے۔ نیل نے بوگوٹی سے کوئی پندرہ میل شمال میں کینیڈا کی سرحد کے ساتھ ایک تفریح گاہ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ بھی کارلا کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ یہاں کھانے، پینے اور رقص کی سہولت موجود تھی۔ تفریح گاہ میں ایک جھیل بھی تھی۔ لوگ کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتے تھے۔ سردیوں میں جب یہ جھیل جم جاتی تو اس کی سطح پر اسکیٹنگ کرنے والوں کا ہجوم جمع ہو جاتا تھا۔ جولائی اور اگست میں گرمی پڑتی ہے اس لیے لوگ کشتی رانی کر رہے تھے۔ نیل اور سوان نے بھی جھیل میں کشتی چلائی۔ پھر انہوں نے کچھ وقت بال روم میں گزارا۔ آٹھ بجے وہ ڈنر کے لیے جھیل کے ساتھ کھلے حصے میں آ گئے۔ نیل نے اپنے اندر سے امڈتی خوشی کو محسوس کیا۔

"پورے آٹھ برس بعد میں خود کو پھر سے انسان محسوس کر رہا ہوں۔"

"میں بھی کئی برس بعد خوش ہوں۔" سوان نے اعتراف کیا۔

نیل اس کی پہلی شادی کے بارے میں جانتا تھا۔ اس نے آہستہ سے پوچھ لیا۔ "کیا تم نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی؟"

اس نے سر ہلایا۔ "شادی کے آخری دن میرے لیے ڈراؤنا خواب بن گئے تھے۔ گریم سخت اذیت پسند شخص تھا۔ اس نے میری زندگی حرام کر دی تھی۔ اس سے طلاق لینے کے بعد مجھے کچھ سکون ملا لیکن پھر میں شادی کے نام سے بھی خوف کھانے لگی۔"

نیل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ضروری تو نہیں کہ ہر انسان ایک جیسا ہو۔"

"میں جانتی ہوں لیکن یہ بات میرے ذہن سے نہیں نکل رہی تھی۔" سوان نے گہری سانس لی۔ "تم سے ملنے کے بعد میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگی ہوں۔"

نیل نے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔ وہ آج تفریح کرنے نکلے تھے، ماضی کی عذاب ناک یادوں کو دہرانے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے کھانے کا آرڈر دیا اور اس دوران میں ڈرنک سے دل بہلاتے رہے۔ کھانے کے بعد وہ بار میں آ گئے۔ پینے پلانے کے لیے نہیں بلکہ آج ان دونوں کا گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر رات تاریک ہونے لگی تو انہوں نے محسوس کیا کہ اب ان کو روانہ ہو جانا چاہیے۔ نیل زیادہ پی گیا تھا اور اسے ہلکا سا نشہ محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ وہ ڈرائیونگ نہ کر پاتا۔ واپسی کے سفر میں سوان اس کے شانے سے سر ٹکائے بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد نیل نے اسے مخاطب کیا تو وہ سو رہی تھی۔ نیل نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے رکا۔ اس نے پہلے سوان کو جگانے کا سوچا لیکن پھر ہچکچاتے ہوئے اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ کسمسائی اور اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ نیل نے اسی طرح دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر اس نے لائٹ کے لیے بٹن دبایا لیکن لائٹ نہیں جلی۔ شاید فیوز اڑ گیا تھا۔ اس نے سوان کو صوفے پر لٹا دیا اور سیدھا ہوا تھا کہ عقب سے کسی نے اس کے سر پر وار کیا اور وہ نیچے گر گیا۔ وار سخت اور غیر متوقع تھا۔ اسے خود پر قابو پانے کا موقع بھی نہیں ملا اور وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔

نیل کو ہوش آیا تو وہ اپنی ورکشاپ کے فرش پر بندھا پڑا تھا اور اس کے سامنے کام والی میز سے میٹ برادران ٹکے ہوئے تھے۔ جون سگار پی رہا تھا جبکہ جائل نیل کا ہتھوڑا لیے اسے آہستہ آہستہ میز پر ٹھونک رہا تھا۔ ایک طرف دیو قامت جیف اور اس کے ساتھ ایک اجنبی شخص کھڑا تھا لیکن وہ بھی ان کا ساتھی تھا۔ نیل کسمسایا۔

"سوان کہاں ہے؟"

"وہ وہیں ہے جہاں تم نے اسے ڈالا تھا۔" جیف نے کہا۔

نیل کو یقین نہیں آیا۔ اس کے ساتھ یہ واقعہ ہو گیا تھا اور سوان بے خبر سوتی رہی تھی۔ "تم بکواس کرتے ہو۔"

"اگر یقین نہیں تو اسے بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔" اس بار جون بولا۔ پھر اس نے جیف کو حکم دیا۔ "جا کر اسے لے آؤ۔"

جیف چلا گیا۔ نیل نے ان لوگوں کو دیکھا۔ "تم کس لیے آئے ہو؟"

"تمہاری غلط فہمی دور کرنے۔" جائل نے جواب دیا اور اچانک اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ نیل بچنے کی کوشش میں لڑھک گیا۔ پھر بھی اسے شانے پر چوٹ آئی۔ "تم سمجھ رہے تھے کہ پولیس کو رپورٹ کر کے بچ جاؤ گے یا ہمیں ڈرا دو گے۔"

جون مسکرایا۔ "ہمیں معلوم تھا کہ تم کس چکر میں ہو اس لیے ہم انتظار کر رہے تھے کہ تم ایک بار محنت کر لو، اس کے بعد تمہیں دیکھتے ہیں۔"

"میں نے دیکھا ہے، تم نے واقعی بہت اچھے دروازے اور کھڑکیاں بنائے ہیں۔" جائل بولا۔ "مجھے ان کو برباد کرتے ہوئے افسوس ہوگا۔"

نیل کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ "کیا مطلب؟"

جیف سوان کو لے آیا تھا اور اس نے اسے میز پر لٹا دیا۔ وہ بالکل بے سدھ تھی اور یقیناً بے ہوش تھی۔ ان حالات میں کوئی کیسے سوتا رہتا۔ نیل نے تڑپ کر کہا۔ "اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

اس پر اجنبی شخص نے اپنی جیب سے رومال نکال کر لہرایا۔ "یہ کیا ہے... کچھ یاد آیا؟"

نیل نے اسے دیکھا اور اس کی نظر اس شخص کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر گئی۔ اس کا ناخن سیاہ ہو رہا تھا۔ نیل کو لگا جیسے اس کے اندر دھماکا ہوا ہے۔ اس نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن بندھے ہونے کی وجہ سے وہ بے بسی سے بل کر رہ گیا۔ "ذلیل... کمینے۔" اس نے کہا۔

اس شخص نے ہنس کر میٹ برادران کی طرف دیکھا۔ "یہ مجھے پہچان گیا ہے۔"

"لیکن جلد یہ سب بھول جائے گا۔" جون کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ "کیونکہ یہ باقی نہیں رہے گا۔"

"باس! کیوں چاہتے ہو کہ اسے مرنے سے پہلے ہارٹ اٹیک ہو جائے۔" سیاہ ناخن والا ہنسا۔ وہ صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ "بے چارہ ابھی پہلی بیوی کا صدمہ بھی نہیں بھولا ہوگا۔"

نیل چلا چلا کر اسے گالیاں دینے لگا۔ اس کا مقصد اسے سنانے سے زیادہ کسی کو اس طرف متوجہ کرنا تھا۔ بدقسمتی سے سب سے نزدیکی گھر سوان کا تھا اور باقی گھر اس سے بھی دور تھے۔ سوان خود بے بس پڑی ہوئی تھی۔ جائل نے جیف کو حکم دیا۔ "اس کا منہ بند کر دو۔"

جیف نے اسی ٹیپ سے نیل کے منہ پر پٹی چپکا دی جس سے اس نے اس کی کلائیاں اور پاؤں باندھے تھے۔ اب وہ بولنے سے قاصر تھا۔ جون میز سے اتر آیا اور اس نے سوان کی طرف دیکھا۔ "یہ عورت بھی خوب صورت ہے۔ عورتوں کے معاملے میں تم خوش نصیب ہو نیل۔"

"لیکن افسوس... تمہیں نہ صرف اس عورت سے بلکہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔" جائل بولا۔

"کہانی یہ ہوگی کہ تم نے کسی وجہ سے جنون کا شکار ہو کر سوان کو چاقو سے قتل کر دیا اور پھر اسی جنونی کیفیت میں اپنی ورکشاپ کو آگ لگا کر خود بھی اسی آگ میں جل مرے۔" جون نے بتایا۔ نیل اندر سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کا منہ بند تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ان کے لیے گالیاں موجود تھیں۔ "ممکن ہے پولیس اس پر یقین نہ کرے لیکن وہ ہم پر شک بھی نہیں کرے گی کیونکہ سارا کام صفائی سے ہوگا۔ جیراڈ اپنے کام کا ماہر ہے۔ تمہیں ایک بار تجربہ ہو چکا ہے۔" جون نے کہا اور اچانک ہی جھک کر سگار اس کی گردن پر لگا دیا۔ نیل تڑپ اٹھا لیکن سگار ہٹا نہیں سکتا تھا۔ "امید ہے جب پولیس کو تمہاری جلی ہوئی لاش ملے گی تو اس پر یہ نشان نہیں ہوگا۔"

جون سیدھا ہوا۔ اس نے جیف اور جیراڈ سے کہا۔ "تم لوگ سمجھ گئے ہو نا کہ کیا کرنا ہے؟"

جیف نے پُرہوس نظروں سے سوان کی طرف دیکھا۔ "باس! اگر اجازت ہو تو اس عورت..."

"ہرگز نہیں۔" جون سخت لہجے میں بولا۔ "پوسٹ مارٹم میں اس کا پتا چل جائے گا۔"

"کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔" جائل نے ان کو خبردار کیا۔ "اگر بات پولیس تک گئی تو مزید دو لاشیں ٹھکانے لگانے کے لیے کچھ اور لوگ ہائر کرنا پڑیں گے۔"

جیف اور جیراڈ کے چہرے سفید ہو گئے۔ وہ ان دونوں بھائیوں کے لیے کام کرتے تھے اور بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ کتنے سفاک ہیں۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہوتی تو وہ واقعی انہیں بھی ٹھکانے لگا دیتے۔ وہ اپنی ذات کے لیے خطرے پالنے کے قائل نہیں تھے۔ جیراڈ نے جلدی سے کہا۔ "بے فکر رہو باس... کام ایسا ہوگا کہ کسی کو شک نہیں ہوگا۔"

جون ایک بار پھر نیل کی طرف آیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اس نے جھک کر کہا۔ "کاش! میں تمہیں اپنے ہاتھ سے مار سکتا لیکن میں نے آج تک یہ کام نہیں کیا۔" اس نے کہتے ہوئے اچانک نیل کے منہ پر گھونسا مارا۔ "مجھے دنیا میں کسی شخص سے اتنی نفرت نہیں ہے جتنی تم سے ہے۔"

نیل کا منہ گھوم گیا لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جون

اور جائل باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی جیف اور جیراڈ اپنے اصل روپ میں آگئے اور ان کے چہروں سے حیوانیت جھلکنے لگی۔ جیف، سوان کی طرف آیا۔ اس نے سوان کے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ ”کیا عورت ہے... لیکن باس کی طرف سے اجازت نہیں ہے۔“ اس کے لہجے میں حسرت آگئی۔

جیراڈ اس دوران میں تیاری کر رہا تھا۔ اس نے دستانے پہنتے ہوئے کہا۔ ”اس چکر میں مت پڑو... ہمیں جلد از جلد کام کر کے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔“

”تم فکر مت کرو، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ جیف کا ہاتھ سوان کے رخسار سے ہوتا ہوا اس کی گردن پر آگیا تھا۔

”اور کوئی آگیا تو اس صورت میں ایک یا زیادہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کام بھی کرنا پڑے گا اور اس کے بعد کام خراب ہونے کی صورت میں سزا بھی ملے گی۔“

جیف نے حسرت سے سوان کی طرف دیکھا۔ اس کا ہاتھ مزید نیچے جا رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے، اب یہ بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟“

”اسے گھر میں لے جانا ہے، لاؤنج ٹھیک رہے گا۔ وہاں شراب کی بوتل اور گلاس سجا دینا۔ اس کے بعد ہم اسے پلائیں گے۔“ اس نے نیل کی طرف اشارہ کیا۔

”کیسے پلاؤ گے؟“

”جب اس کی ناک بند کر کے منہ سے بوتل لگائیں گے تو یہ خود پیے گا۔“ جیراڈ بولا۔ وہ اس قسم کے کاموں کا ماہر لگ رہا تھا۔ ”بعد میں پوسٹ مارٹم رپورٹ بتائے گی کہ یہ نشے میں دھت تھا اور اس نے کسی بات پر مشتعل ہو کر لڑکی کو قتل کر دیا۔ سابقہ ریکارڈ کی موجودگی میں پولیس اور عدالت کو اس بات پر یقین آجائے گا۔“

”اور یہ کیوں جل مرے گا؟“

جیف کے اس احمقانہ سوال پر جیراڈ نے اسے گھورا۔ ”ظاہر ہے، قتل کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور یہ احساسِ جرم کے تحت خودکشی کر لے گا۔“

”کیا پولیس اس بات پر یقین کر لے گی؟“

”نہ کرے لیکن ہماری طرف سے کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے جو ہمیں پکڑوا دے۔ میں دیکھ رہا ہوں تم نے اس ورکشاپ میں کئی چیزوں کو چھیڑا ہے اور ان پر تمہاری انگلیوں کے نشان آئے ہوں گے۔“

”اسے تو جل جانا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”ہاں لیکن گھر کو تو نہیں جلنا ہے۔ مہربانی کر کے دستانے پہن لو اور اگر گھر میں کہیں ہاتھ لگایا ہے تو اس جگہ کو صاف کر دینا۔“

جیف نے بھی دستانے پہن لیے۔ پھر اس نے سوان کو اٹھایا اور مکان کی طرف چلا گیا۔ جیراڈ نے ورکشاپ کی تلاشی لی۔ اسے شاید تارپین کے تیل کی تلاش تھی لیکن اتفاق سے تارپین کا تیل ختم ہو گیا تھا اس لیے اسے نہیں ملا۔ وہ نیل کی طرف آیا۔ ”تارپین کا تیل کہاں ہے؟“

نیل نے نفی میں سر ہلایا۔ جیراڈ نے اس کے چہرے پر ایک ضرب لگائی اور پھنکار کر بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو اس طرح تم بچ جاؤ گے؟ نہیں، میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔“

جیراڈ باہر چلا گیا۔ نیل کے خیال میں اسے ایک موقع ملا تھا۔ ورکشاپ میں کئی ایسے آلات تھے جن سے وہ اپنی بندشیں کاٹ سکتا تھا لیکن تمام ہی آلات اس کی پہنچ سے دور تھے۔ وہ فرش پر پڑا تھا اور یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اچانک اس کی نظر میز کے نیچے پڑے ایک چھوٹے سے اوزار پر گئی۔ اس سے لکڑی کے ایسے کونے چھیلے جاتے تھے جہاں بڑے اوزار نہیں جا سکتے تھے۔ نیل نے کروٹ لی اور گھوم کر پاؤں سے اس اوزار کو اپنے پاس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے اسے دروازے کی طرف سے آہٹ ہوئی اور وہ جلدی سے گھوم کر واپس اپنی جگہ پر آگیا۔ جیراڈ اندر آ رہا تھا۔ اس نے ایک جیری کین اٹھا رکھا تھا۔ اس نے یقیناً نیل کی کار سے پیٹرول نکالا تھا۔ اس نے جیری کین نیچے رکھا اور نیل کا معائنہ کیا۔

”یہ کام تو ہو گیا، اب میں گھر والا سیٹ تیار کرتا ہوں۔“ وہ جیری کین رکھ کر مکان کی طرف چلا گیا۔ نیل کا جسم لرز اٹھا۔ وہ یقیناً سوان کو قتل کرنے گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی نیل پھر پلٹا اور اس نے اوزار کو اٹھانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ پشت پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ یہ بہت مشکل کام تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح پاؤں مار کر اوزار کو میز کے نیچے سے نکال لیا۔ یہ کوئی چار انچ لمبا اور اوپر سے چوڑے پھل والا تھا۔ ان بدمعاشوں کے مقابلے میں یہ معمولی سا ہتھیار تھا لیکن یہ کم سے کم اسے آزاد کرا سکتا تھا۔ جب وہ باہر آیا تو نیل گھوما اور اس نے اسے انگلیوں سے اٹھانے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ پہلے کام سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا کیونکہ اس کا مختصر سا دستہ اس کی انگلیوں میں نہیں آ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اسے ایک ہاتھ میں لیا اور پھر اس کی دھار سے ٹیپ کاٹنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان لوگوں نے ٹیپ کا استعمال اس لیے کیا تھا کہ اس کے نشانات نہ پڑیں اور پولیس کو شک نہ ہو۔ ٹیپ کاٹنے کی دیوانہ وار کوشش میں اس نے کئی جگہ سے اپنی کلائی کاٹ لی تھی۔ اس کے پھل کی دھار بہت تیز تھی مگر جان بچانے کے لیے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کسی وقت بھی جیراڈ یا جیف میں سے کوئی آجائے گا اور ملنے والا یہ واحد موقع بھی ضائع ہو جائے گا اس لیے وہ کسی بات کی پروا کیے بغیر ٹیپ کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر اس نے ٹیپ کاٹ دیا۔ اس نے تیزی سے ہاتھ سامنے کیے اور پھر پاؤں کا ٹیپ بھی کاٹنا چاہتا تھا کہ جیراڈ اندر آگیا۔ نیل نے بڑی پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر لیا ورنہ جیراڈ دیکھ لیتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چاقو اور دوسرے ہاتھ میں برانڈی کی بوتل تھی۔ نیل نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ چاقو صاف تھا۔ یعنی ابھی سوان محفوظ تھی۔ جیراڈ نے چاقو لہرایا۔

”یہ لڑکی کے لیے ہے اور یہ تمہارے لیے۔“ اس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ ”پہلے میں تمہیں پلاؤں گا، اس کے بعد چاقو پر تمہاری انگلیوں کے نشان لوں گا اور پھر اس جگہ کو آگ لگا دوں گا۔“ اس نے پورا پروگرام بتایا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے منہ سے ٹیپ اتار دیا۔

”تمہارا یہ منصوبہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔“ نیل نے نفرت سے کہا اور اچانک ہاتھ سامنے لاتے ہوئے اوزار جیراڈ کے سینے میں اتار دیا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ سامنے لانے کی کوشش کی لیکن نیل نے پورا زور لگا کر اوزار دستے تک اس کے سینے میں اتار دیا... وہ زمین پر لڑھک گیا۔ اسی لمحے جیف اندر آیا۔ غیر متوقع صورتِ حال نے چند لمحے کے لیے اسے بھی ساکت کر دیا۔ لیکن جیسے ہی نیل نے اپنے پاؤں کا ٹیپ کاٹنا شروع کیا، وہ تیزی سے اس کی طرف جھپٹا۔ نیل لڑھک کر میز کی آڑ میں ہو گیا اور جیسے ہی جیف پاس آیا، اس نے اوزار اس کی ٹانگ میں اتار دیا۔ جیف کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ نیل کے اوپر گر پڑا۔ اس نے غراتے ہوئے نیل کی گردن پکڑ لی۔ اس کے گرنے سے نیل کا اوزار والا ہاتھ اس کی پشت پر چلا گیا تھا اور اس کی دھار اب اس کی کمر چھیل رہی تھی۔ وہ ہاتھ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں اس کی کمر مزید زخمی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر جیف نے اس کی گردن پکڑ رکھی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اگر وہ کچھ دیر اور سانس نہ لے سکا تو پھر کبھی سانس نہیں لے سکے گا اور سوان بھی ان لوگوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔ سوان کا خیال آتے ہی اس کا دم توڑتا حوصلہ پھر سے بحال ہونے لگا اور اس نے پوری قوت سے اوزار والا ہاتھ نیچے سے نکال لیا۔ ایک تیز دہاڑ کے ساتھ اس نے اوزار دستے تک جیف کی موٹی گردن میں گھونپ دیا۔۔ دوسری دہاڑ جیف کے منہ سے نکلی اور اس نے نیل کی گردن چھوڑ کر اپنی گردن سے اوزار نکالنے کی کوشش کی۔ نیل نے اسے پاؤں کے زور سے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ زمین پر گرا۔ اس نے اوزار نکال لیا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی گردن سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا۔ اب وہ خون روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیل اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے مکان کی طرف لپکا۔ اسے سوان کی فکر تھی۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر بے ہوش پڑی تھی اور جیف مردود نے اس کی فراک سامنے سے کھول دی تھی۔ نیل نے خون آلود ہاتھوں سے اس کی فراک ٹھیک کی اور پھر موبائل اٹھا کر پولیس کو کال کرنے لگا۔ اس کی کمر میں گہرے کٹ آئے تھے جن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس سے پہلے وہ مدد طلب کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے بہ مشکل پولیس کو مطلع کیا اور پھر وہیں قالین پر لڑھک گیا، اسے ہوش نہیں رہا تھا۔

نیل کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا اور سوان اس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بھی تھکن کا شکار تھی لیکن اس نے نیل کے پاس سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ جیسے ہی نیل نے آنکھیں کھولیں، وہ بے تابی سے اس پر جھک گئی۔ ”کیسے ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں... اور تم؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”جیف اور جیراڈ کا کیا ہوا؟“

”جیف جہنم رسید ہو گیا اور جیراڈ یہیں اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ اس نے پولیس کے سامنے کارلا کے قتل کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ اس کے بیان پر پولیس نے جون کو گرفتار کر لیا ہے اور جائل ابھی مفرور ہے لیکن وہ بھی جلد پکڑا جائے گا۔“

”شکر ہے۔“ نیل نے طویل سانس لیا۔ ”ایک وقت ایسا آیا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہم دونوں مارے جائیں گے لیکن پھر مجھے موقع مل گیا۔“

”تم نے بہت ہمت دکھائی۔“ سوان نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس وجہ سے یہ دونوں بھائی پولیس کی گرفت میں آئے۔ اب مجھے یقین ہے کہ اس قصبے کی رونقیں لوٹ آئیں گی۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ نیل نے یقین سے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

قتلِ عام

سرور اکرام

عقل اور علم میں جسم و جاں کا سا رشتہ ہے... جسم کے بغیر روح ہوا کا محض ایک جھونکا اور روح کے بغیر بدن محض بے جان ڈھانچا... خود کو عقلِ کل سمجھنے والے دانش مندوں کی دانش وری کی کہانی... وہ عقل و شعور سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اپنے باطن کی گہرائیوں سے ہم کلام ہوئے تو محض مادّی اور نفسانی خواہشات کے گرداب میں الجھ کر رہ گئے... عقل و علم کا علَم لہرا کر جذبوں سے بھرے اور شعور سے بے بہرہ ہجوم کو اپنے مفادات کی خاطر خطروں کا کھلاڑی بنا دینے والوں کی حقیقی تصویر کشی... ہر منظر دل خراش اور ہر پیراہن جانا پہچانا... ہمارے ہی ماحول میں سانس لیتی اور سوچنے پر مجبور کرتی تحریر...

سرورق کی پہلی کہانی

بہت ہی خوب صورت لڑکی تھی۔

اس کے چہرے کی ملاحت اور تیکھے پن نے اظفر کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

سینڈی نام تھا اس کا۔ ایک کرسچین اسکالر کی لبرل مائنڈڈ لڑکی... جس کے نزدیک دنیا پھولوں، تتلیوں، خوب صورت رنگوں، گیتوں اور پیار بھری باتوں کے سوا کچھ نہیں تھی۔

وہ اکثر اپنے باپ شمائل سے اسی بات پر الجھ جایا کرتی۔

''ڈیڈ! یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ ہم پیدا تو ایک ہی انسان سے ہوئے ہیں پھر اتنے خانوں میں بانٹ دیے گئے ہیں... آخر کیوں؟ کیا ضرورت تھی ہمیں عیسائی، مسلمان، یہودی یا کچھ اور ہونے کی؟ کیا ہم صرف انسان نہیں رہ سکتے تھے؟''

''نہیں مائی سن... یہ بھی ضروری تھا کیونکہ انسان جب تعداد میں زیادہ ہو گئے تو اس میں گناہوں کے جراثیم پرورش پانے لگے۔ اس کو سیدھے راستوں پر لانے کے لیے مذہب کی ضرورت تھی۔''

''چلیں مان لیا کہ اس کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے مذہب کی ضرورت تھی۔'' سینڈی نے کہا۔ ''لیکن کیا ضروری تھا کہ اتنے مذاہب سامنے آتے، کسی ایک سے کام نہیں چل سکتا تھا کیا؟''

وہ شمائل سے اسی قسم کی بحث کیا کرتی۔

شمائل خود بھی ایک آزاد خیال انسان تھا۔ وہ کہا کرتا کہ اچھائیاں انسانوں میں ہوتی ہیں۔ عیسائیوں، مسلمانوں یا ہندوؤں میں نہیں۔ یعنی یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اچھا انسان عیسائی یا مسلمان ہی ہو۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اچھائیوں یا برائیوں کا تعلق انسان کی فطرت سے ہوتا ہے اور فطرت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

شمائل کے دوستوں کا حلقہ بہت زیادہ تھا۔ اس میں ہر مذہب کے لوگ تھے۔ ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی۔ اس کا تعلق نیویارک کے ایک ایسے ادارے سے تھا جو فلسفے اور مذہب کے موضوعات پر کتابیں شائع کیا کرتا تھا۔ سینڈی ایسے ہی ماحول میں پرورش پا رہی تھی۔ اسے فخر تھا اپنے باپ پر۔ اس کی سوچ پر جس نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ سینڈی نے اظفر نام کے ایک مسلمان نوجوان کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔

☆☆☆

اظفر کا پس منظر سینڈی کے پس منظر سے بہت مختلف تھا۔

اس کے والد ایک طاقت ور سیاست داں تھے۔ پاکستان میں ان کے افکار اور خیالات کی دھوم مچی رہتی تھی۔ ان کی شعلہ بیانی محفل کو گرما کر رکھ دیتی۔ ان کے لیکچرز سننے کے لیے انہیں بھاری معاوضوں پر بلایا جاتا۔

کسی لیکچر میں جانے سے پہلے ان کی تیاریاں دیکھنے کے قابل ہوا کرتیں۔ کھڑکھڑاتا ہوا لباس، سلیم شاہی، سر پر ایک بڑا سا جناح کیپ، قیمتی پرفیوم کا بے دریغ استعمال اور آنکھوں کی لالی بڑھانے کے لیے ایک خاص قسم کا لوشن۔ اور جب ظہور الاسلام اپنے دو عدد مسلح محافظوں کے ساتھ لیکچر ہال میں پہنچتا تو دیکھنے والوں پر اس کی ہیبت طاری ہو جاتی۔

اس کی گردن میں ایک خاص قسم کے تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک انکسارانہ مسکراہٹ ہوتی۔ وہ حاضرین کے سلام کا جواب دیتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھ جاتا۔

اظفر کو یہ سب ایک ڈرامے سے زیادہ اور کچھ نہیں لگتا تھا۔

وہ کئی بار اپنے باپ سے اس بارے میں بات بھی کر چکا تھا۔ ظہور صاحب کو اس کی یہ بغاوت بہت گراں گزرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کا بیٹا اظفر اس کے منصب پر فائز ہو جائے گا۔ سیاست داں بن کر وہ بھی کسی نہ کسی عہدے پر پہنچ جائے گا۔

اظفر جب تعلیم کے لیے نیویارک روانہ ہو گیا تو اس وقت ظہور نے اس کی غیر موجودگی میں ایک اور شادی کر لی۔

شمائلہ اس کی تیسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے اظفر تھا۔ اس کی زندگی میں اس نے ایک اور نوجوان بیوہ سے شادی کر لی تھی۔

اس معاملے میں بھی اس کا یہی کہنا تھا کہ اگر شادی کرنی ہے تو نوجوان تلاش کرو۔ اس بیوی سے اس کی ایک بیٹی ہوئی تھی... زرین جو اب سترہ اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔

اس بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا اور اب ظہور نے تیسری شادی شمائلہ سے کر لی تھی جو اس کے بیٹے اظفر کی ہم عمر تھی۔ اظفر کو اس شادی کی خبر امریکا آنے کے بعد ہوئی تھی۔

نیویارک ہی کے ایک ریستوران میں اس کی ملاقات سینڈی سے ہوئی اور دونوں نے محسوس کیا کہ ان کی کیمسٹری تقریباً ایک ہی ہے۔

دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ دونوں کے خیالات ایک جیسے اور ذہنی سطح تقریباً ایک تھی۔ دونوں کے درمیان دنیا کے ہر موضوع پر بات ہوا کرتی۔

ایک دن سینڈی نے اس سے پوچھا۔ ''اظفر! تمہارے والدین کیا کرتے ہیں؟''

''صرف باپ ہیں۔ ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اور باپ کیا کرتے ہیں؟''

''وہ سوداگر ہیں۔'' اظفر نے بتایا۔ ''سیاست کے سوداگر۔ سیاست کو کیش کر رہے ہیں۔''

''میرا باپ مذہب کا سوداگر ہے۔'' سینڈی نے کہا۔ ''لیکن وہ مذہب کو کیش نہیں کر رہا بلکہ مذہب کی طاقت کو انسانی بھلائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ کیا واقعی انسان کو مذہب کی ضرورت ہے؟'' اظفر نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔ ''خاص طور پر آج کے انسان کو؟''

''پتا نہیں۔'' سینڈی نے جواب دیا۔ ''کیا تم نے کبھی گرور جنیش کا کوئی لیکچر پڑھا ہے یا اٹینڈ کیا ہے؟''

''نہیں لیکن میں نے نام بہت سنا ہے۔''

''گرور جنیش تو اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کا ایک شاگرد اچاریہ انہی کے خیالات اور افکار کا پرچار کرتا رہتا ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے آپ کو تلاش کرنے کے لیے اس کا لیکچر سننے چلی جاتی ہوں۔''

''اور تمہاری تلاش کہاں تک پہنچی ہے؟'' اظفر نے پوچھا۔

''کہیں بھی نہیں۔'' سینڈی نے جواب دیا۔ ''اپنے آپ کو تلاش کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

''کسی دن میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔'' اظفر نے کہا۔ ''دیکھتا ہوں تمہارے یہ اچاریہ جی کیا کہتے ہیں۔''

☆☆☆

اس کے دونوں ہاتھ کھُردرے تھے۔

وہ ایک مستری تھا۔ دیواروں اور فرش کو بنانے والا۔ سیمنٹ، ریت سے روزگار حاصل کرنے والا۔ اس لیے اس کے دونوں ہاتھ کھردرے ہوگئے تھے۔

ان ہاتھوں پر سخت اور سیاہ گٹے پڑ گئے تھے لیکن اسلم کو ان باتوں کی پروا نہیں تھی۔ اسے کون سا مقابلۂ حسن میں حصہ لینا تھا کہ وہ ایسی باتوں پر دھیان دیتا۔

اس کی زندگی تو بس یہی تھی کہ صبح مزدوری پر جاؤ، دن بھر محنت کرو اور شام کو تھکے ہارے گھر واپس آجاؤ۔ اس کی بیوی کا نام پروین تھا۔ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت جس نے زندگی میں صرف ایک ہی بات سیکھی تھی کہ شوہر خوش ہے تو جنت مل جاتی ہے۔

اسی لیے وہ اسلم کی خدمت گزار اور فرماں بردار تھی۔ دو بچے تھے۔ ایک دس برس کا، دوسرا آٹھ برس کا۔ دونوں کو اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔

اسلم کی واحد تفریح یہ تھی کہ وہ مزدوری سے واپس آنے کے بعد محلے کے ایک جھونپڑی ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتا۔ یہاں ہر طرح کے لوگ آیا کرتے لیکن سب اسی کے طبقے سے تعلق رکھنے والے غریب اور اَن پڑھ قسم کے لوگ تھے۔

ان لوگوں کے درمیان چاچا شبراتی بہت اہمیت رکھتا تھا۔ وہ روزانہ اخبار پڑھتا اور خبروں پر تبصرے کیا کرتا۔ یہ سب اس کی باتیں بہت دھیان سے سنا کرتے۔

شبراتی کہا کرتا۔ ''دیکھ لینا تم لوگ۔ یہ جو امریکا ہے نا، یہ اپنی موت آپ مرجائے گا۔ فرشتوں نے اس کو ختم کرنے کے لیے فوج بنالی ہے۔''

کوئی کہتا۔ ''شبراتی چاچا! امریکا کو ختم کرنے کے لیے پوری فوج کی کیا ضرورت ہے... کیا ایک اکیلا فرشتہ یہ کام نہیں کرسکتا؟''

''جاہل ہو تم لوگ۔'' شبراتی کہتا۔ ''تمہیں کیا معلوم کہ امریکا کی کتنی ریاستیں ہیں۔ اب ایک فرشتہ ایک ہی ریاست کو برباد کرے گا نا۔ اتنی ریاستوں کو برباد کرنے کے لیے تو بہت سے فرشتے درکار ہوں گے۔''

اس کے اردگرد بیٹھے لوگ اس کی باتیں سن کر اپنی اپنی گردن ہلانے لگتے۔

اسلم کے لیے یہ محفل بہت غنیمت تھی۔ وہ چاچا شبراتی سے یہ سب معلوم کرکے گھر جاتا اور رات کو سونے سے پہلے اپنی بیوی پروین کو ضرور بتایا کرتا۔ وہ بھی سُن سُن کر حیران ہوا کرتی۔

ایک رات اس ہوٹل میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سب اسی طرح بیٹھے چاچا شبراتی کی باتیں سن رہے تھے کہ ایک ملنگ ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

وہ کوئی عام خیرات مانگنے والا ملنگ نہیں معلوم ہوتا تھا اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی کاسہ تھا۔ البتہ اس کے گلے میں مالائیں ضرور پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے جسم پر ایک ایسا چوغہ تھا جس میں بے شمار پیوند لگے ہوئے تھے۔

وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔ آنکھوں میں بلا کی کشش۔ اس کے چہرے پر اتنا جلال تھا کہ اس کی طرف دیکھنا محال ہوگیا۔ اس کو دیکھ کر چاچا شبراتی کو سکتہ سا ہوگیا تھا۔

وہ آنکھیں پھاڑے ہوئے اس ملنگ کو دیکھے جارہا تھا۔ وہ ملنگ ہوٹل میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لیتا ہوا اسلم کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اسلم اسے دیکھ کر ادب سے کھڑا ہوگیا۔

اس ملنگ نے اچانک اسلم کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس کی ہتھیلیوں کو دیکھا اور بہت احترام سے ان پر بوسے دینے کے بعد جس طرح آیا تھا، اسی طرح باہر نکل گیا۔

اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہوٹل میں کچھ دیر تک سناٹا رہا۔ پھر سب زور زور سے بولنے لگے۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوگیا۔ ملنگ کی آمد سے زیادہ حیرت اس بات کی تھی کہ اس ملنگ نے اسلم کے ہاتھ کیوں چومے تھے۔

''ابے یار! تو تو بہت خوش نصیب آدمی ہے۔'' شبراتی نے اسلم سے کہا۔

''چاچا! ایسا لگتا ہے تم اس ملنگ کو جانتے ہو۔'' کسی نے پوچھا۔

''ہاں، یہ قادری بابا ہیں۔'' شبراتی نے بتایا۔ ''بہت بڑے آدمی ہیں۔ اللہ کے خاص بندے۔ ان کے یہاں تو بڑوں کی لائن لگی رہتی ہے۔ نہ جانے کتنوں کو حسرت ہی رہتی ہے کہ ان سے ہاتھ ملا سکیں۔ اور وہ اسلم کا ہاتھ چوم کر چلے گئے۔ اسلم آخر یہ سب کیا تھا؟''

''مجھے تو خود نہیں معلوم شبراتی چاچا۔'' اسلم نے کہا۔ ''میں تو اس بندے کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔''

''کہانی سمجھ میں نہیں آئی۔'' شبراتی نے کہا۔ ''کوئی نہ کوئی چکر ہے ضرور۔ قادری بابا ایسے آدمی نہیں ہیں جو فضول حرکتیں کرتے پھریں۔''

☆☆☆

ہلکی سردی کی نرماہٹ محسوس ہونی شروع ہوگئی تھی۔ اس نرم موسم میں ظہور کو ہلکی آنچ دیتے ہوئے آتش دان کے سامنے بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

اس کی تیسری خوب صورت اور جوان بیوی شمائلہ اس کے سامنے بیٹھی اس کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ کچھ دیر بعد شمائلہ نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا بات ہے، خیریت تو ہے... کیا سوچ رہے ہیں؟''

''میں اپنی پارٹی بنانے کی پلاننگ کر رہا ہوں۔'' ظہور نے جواب دیا۔

''خدا خیر کرے۔ کس قسم کی پارٹی؟'' شمائلہ نے اٹھلاتے ہوئے دریافت کیا۔ ''آپ ایک سیاسی پارٹی سے منسلک تو ہیں۔''

''ہاں لیکن اس میں کوئی مقام نہیں ملنے والا۔'' ظہور نے جواب دیا۔ ''ظہور اسلام کے نام سے دوسری پارٹی بنا رہا ہوں۔''

''اسلام کا ظہور تو صدیوں پہلے ہو چکا ہے، ظہور اسلام صاحب۔''

''ہاں لیکن اس دور میں اس کا چہرہ گرد آلود ہوگیا ہے۔'' ظہور نے کہا۔ ''لوگ اسلام سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ ہر طرف بے سکونی ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کے قوانین کو پوری قوت اور دیانت داری کے ساتھ نافذ کر دیا جائے۔''

''اور یہ نافذ کون کرے گا؟''

''میری پارٹی۔ ظہور اسلام۔'' ظہور نے کہا۔

''آپ کیوں ان جھمیلوں میں پڑتے ہیں۔ آپ کے پاس کیا نہیں ہے۔ دو دو گھر ہیں، گاڑیاں ہیں، بینک بیلنس ہے، شہرت ہے، عزت ہے اور کیا چاہیے؟''

''لیکن اقتدار تو نہیں ہے میری جان۔'' ظہور مسکرا کر بولا۔ ''تمہیں کیا معلوم... اقتدار کا نشہ ہی اور ہوتا ہے۔ ہر طرف عزت۔ حکم چلانے کا مزہ حکمرانوں سے پوچھو۔ اس وقت بہت سے لوگ میرے ساتھ کھڑے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں صرف پارٹی بنانے کا اعلان کر دوں، باقی معاملات وہ خود سنبھال لیں گے۔''

''کیا آپ اظفر کو بھی پارٹی میں کوئی عہدہ دیں گے؟'' شمائلہ نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔ وہ تعلیم حاصل کرنے گیا ہے۔ اسے وہیں رہنے دو۔ ویسے بھی وہ میرے کام کا کہاں رہا ہے۔ الٹی سیدھی کتابیں پڑھ کر مجھ سے بحث کرنے لگا ہے۔ کہتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ مناسب نہیں ہے۔''

''اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ وہ ایک ذہین لڑکا ہے۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''وہ جانتا ہے کہ آپ کہاں کہاں غلطی کر رہے ہیں۔''

''تو کیا تمہارے خیال میں مجھے پارٹی نہیں بنانی چاہیے؟'' ظہور نے کچھ غصے سے پوچھا۔

''ضرور بنائیں سرکار۔'' شمائلہ لہراتے ہوئے بولی۔ ''جہاں آپ وہاں میں۔''

''بس، تمہاری انہی باتوں اور اداؤں نے تو دیوانہ بنا رکھا

ہے۔" ظہور نے شمائلہ کو اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی۔

شمائلہ بہت ہوشیاری سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی۔

وہ ابھی تک سیاست کے اس تاجر کو دل سے قبول نہیں کر پائی تھی۔ اس کا رشتہ اچانک ہی ہوا تھا۔ شمائلہ کا باپ ظہور کا عقیدت مند تھا۔ ظہور، شمائلہ کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ شمائلہ اپنے باپ کے ساتھ ظہور کے یہاں دو تین بار آئی تھی۔

اس نے اظفر کو بھی دیکھا ہوا تھا۔ اظفر اسے پسند آیا تھا۔ ایک صاف دل اور روشن ذہن رکھنے والا نوجوان... جو اپنے باپ کے بالکل برعکس تھا۔

جب شمائلہ کے باپ نے شمائلہ سے ظہور کے یہاں رشتے کی بات کی تو وہ خوش ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ ظہور نے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ دیا ہوگا۔ لیکن جب پتا چلا کہ یہ رشتہ خود ظہور کا تھا تو شمائلہ بھڑک اٹھی۔ وہ اس شخص سے شادی کیسے کر سکتی تھی جس کا بیٹا خود اس کی عمر کے برابر تھا۔ جس کی پہلے سے دو دو شادیاں ہو چکی تھیں۔ جو جاہلوں کے معاشرے میں حب الوطنی کی پہچان بنا ہوا تھا لیکن جس کا علم سوائے جذباتی اور احمقانہ تقاریر کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

لیکن اس کا انکار کسی کام نہیں آیا کیونکہ اس کے باپ کو یقین تھا کہ کوئی عہدہ ملتے ہی ظہور صاحب اسے بھی کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرا ہی دیں گے۔

اسی لالچ میں اس نے شمائلہ کی شادی زبردستی ظہور سے کروا دی تھی اور اب وہ پرمٹ اور پلاٹ کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

شمائلہ کو ظہور پہلے ہی دن سے پسند نہیں آیا تھا۔ پہلے وہ اس کی ظاہری علمیت سے مرعوب ہوا کرتی لیکن اب اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ ایک کھوکھلا انسان ہے۔

لوگ اسے اسکالر سمجھتے تھے لیکن علم اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزرا تھا۔

وہ جب شمائلہ کو اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کرتا تو شمائلہ کو اس کے جسم سے کسی دنبے یا بکرے کی بو اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

وہ بہت کم نہایا کرتا۔ عام طور پر کھڑکھڑاتے لباس کے اوپر قیمتی عطریات کا چھڑکاؤ کر لیا کرتا جس سے اس کے جسم کی بو دب جاتی۔

شمائلہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ اسے صرف ایک موقع کا انتظار تھا جب وہ اس آدمی سے نجات حاصل کر لیتی۔

☆☆☆

"یہ دنیا بدلنے کو ہے۔"

اچاریہ لیکچر دے رہا تھا۔ وہ گرو رجنیش کا خاص شاگرد تھا۔ گرو کی موت کے بعد اب اس نے گرو کی جگہ لے لی تھی۔ اس وقت وہ لیکچر دے رہا تھا۔ اس لیکچر میں اظفر اور سینڈی بھی شامل تھے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "دنیا بدلنے کو ہے۔ اس دنیا نے ہزاروں لاکھوں برسوں کی جہالت برداشت کر لی ہے۔ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کو ہے۔

"اب بہار آنے کو ہے۔ جب ہر طرف پھول ہی پھول ہوں گے۔ کچھ لوگوں نے اس دنیا میں جنم لے کر آنے والی بہار کا بگل بجا دیا ہے۔

"یہ بدھا، یہ مسیح، یہ محمدؐ یہ زرتشت یہ سب کیا ہیں۔ یہ سب وہ پھول ہیں جن کی آمد یہ اعلان کر رہی ہے کہ اب دنیا میں ہر طرف پھول ہی پھول ہوں گے۔"

لیکچر ختم ہوا۔ دونوں باہر آگئے۔ سامنے ایک خوب صورت پارک تھا۔ دونوں نے اسی پارک کی راہ لی۔ اس پارک میں کچھ اور لوگ بھی تھے جو لیکچر ہال سے اٹھ کر آئے تھے اور اپنے اپنے انداز میں تبصرے کر رہے تھے۔

"تمہارا کیا خیال ہے اظفر؟" سینڈی نے پوچھا۔ "اس کی باتیں کیسی ہوتی ہیں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ لوگ سسٹم کے خلاف ہیں۔" اظفر نے کہا۔ "گھر کا سسٹم، محلے کا سسٹم، معاشرے کا سسٹم اور مذہب کا سسٹم۔ اس نے کچھ لوگوں کی مثالیں دی ہیں لیکن ان کی انفرادی شخصیت کی تعریف کی ہے۔ ان کے لائے ہوئے مذاہب پر بات نہیں کی۔ یعنی اس کے نزدیک اچھے افراد کی اہمیت ہے۔ اچھے مذہب کی نہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ جب مذہب ہی نہیں ہوگا تو ضابطۂ اخلاق کون بنائے گا، کہاں سے بنائے گا؟"

"ہاں، تمہارا یہ سوال اپنی اہمیت رکھتا ہے۔" اظفر نے کہا۔ "بہرحال، ہمیں فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا۔"

"لیکن مجھے تو فکرِ جہاں ہے۔" سینڈی مسکرا کر بولی۔ "کیونکہ ڈیڈ کو بھی ہے۔ ڈیڈ بھی آنے والے دنوں کے لیے ایسے ہی انسان کے خواب دیکھ رہے ہیں جس کے نزدیک سسٹم کی کوئی اہمیت نہ ہو۔"

"چلو چھوڑو۔" اظفر نے کہا۔ "اب ہمیں کچھ اپنی باتیں بھی کرنی چاہئیں۔ بہت ہو چکی۔"

"مشرقی نوجوان ہونا اسی لیے اپنی باتوں سے مراد

رومینٹک باتیں ہوں گی۔"

"نہیں یار! اب ہم اس مرحلے سے آگے نکل آئے ہیں۔" اظفر نے کہا۔ "ہمیں ٹھوس بنیادوں پر آئندہ کی پلاننگ کر لینی چاہیے۔"

"تم اس سلسلے میں ڈیڈ سے ملو۔ ان کے پاس زندگی گزارنے کے بے شمار راستے ہیں۔" سینڈی نے کہا۔

"اور ایک اہم ترین راستہ یہ ہے کہ میں تمہیں حاصل کر لوں۔"

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو اپنی اسٹڈی پر دھیان دو۔"

ایک نوجوان ان دونوں کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ پچیس اور تیس کے درمیان ہوگا۔ وہ دیکھنے ہی سے ایشیائی معلوم ہوتا تھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی۔ اس نے جو شرٹ پہن رکھی تھی، وہ اس کے گھٹنوں سے بھی نیچے تھی۔ اس نے اظفر کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اظفر کے لیے اجنبی تھا۔

"کیا بات ہے... کون ہے یہ؟" سینڈی نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ شاید اسے مجھ سے کوئی کام ہے۔" اظفر نے کہا۔ "میں اس سے بات کر کے آتا ہوں۔" اظفر اس نوجوان کے پاس چلا گیا۔

"میرا نام کمال الدین ہے۔" نوجوان نے بتایا۔ اس نے اردو ہی میں کہا تھا۔

"کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟" اظفر نے پوچھا۔

"ہاں، ہم یہاں نیویارک ہی میں رہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ہم بہت سے لوگ ہیں اور ہمارا کام یہ ہے کہ ہم تم جیسے بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اظفر اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ "تمہیں کیسے معلوم کہ میں بھٹکا ہوا ہوں؟"

"تم نے اس غیر مسلم لڑکی سے دوستی کر رکھی ہے۔" اس نے کہا۔ "ہم بہت دنوں سے تمہاری نگرانی کر رہے تھے۔ تمہیں یہ اندازہ نہیں کہ یہ لڑکیاں تم جیسوں کو بہکا کر اپنے راستے پر لے آتی ہیں۔ نہ جانے کتنے، یہودی لڑکیوں کا شکار ہو کر وطن دشمن ہو چکے ہیں۔"

"بھائی تم میری فکر مت کرو۔" اظفر نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھے کس سے دوستی کرنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ میں کسی کو اپنے معاملے میں مداخلت کی اجازت نہیں

دے سکتا۔"

"تمہاری مرضی۔" اس شخص نے کہا۔ "تمہارا یہ جواب میرے دوستوں کو پسند نہیں آئے گا۔"

وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اظفر کا دل چاہا کہ وہ اس نوجوان سے بھڑ جائے۔ وہ کون ہوتا ہے اس قسم کی باتیں کرنے والا۔

اس دوران سینڈی میں اس کے پاس آگئی تھی۔ "کیا بات ہے اظفر؟ کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

"کچھ نہیں۔" اظفر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں آگے بڑھ گئے۔ وہ شخص کھڑا غصے بھری نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

ظہور کو اپنی ساکھ بنانے اور اپنی سیاسی پارٹی تشکیل دینے کا ایک سنہری موقع مل گیا تھا۔

اس کے ایک کارندے نے کچرے کے ایک ڈھیر پر ایسا مواد بکھرا ہوا دیکھ لیا جو وطن اور قوم دشمنی کا تھا۔

نہ جانے کون لوگ تھے جنہوں نے ایسا لٹریچر چھاپنے کی حرکت کی تھی اور پھر کسی وجہ سے اسے کچرے کے ڈھیر پر پھینک بھی دیا تھا۔

اس کارندے نے جب یہ خبر ظہور الاسلام کو سنائی اور وہ لٹریچر دکھایا تو ظہور کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے اس سے کہا۔ "شاید تمہیں یہ اندازہ نہ ہو کہ تم نے اس وقت ملک اور قوم کی کتنی خدمت کی ہے۔ یہ قوم ہمیشہ تمہاری احسان مند رہے گی۔"

"سرکار... مجھے تو بس پیٹرول پمپ کے پرمٹ کی ضرورت ہے۔"

"مجھے اقتدار میں آنے دو پھر دیکھو، میں تمہارے لیے کیا کرتا ہوں۔" ظہور نے کہا۔ "بس تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ ابھی یہ خبر کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ میں کوئی جھوٹ یا سیاست وغیرہ نہیں کر رہا۔ اس اہم ایشو میں اثر پیدا کرنے کے لیے کر رہا ہوں۔ ورنہ یہ قوم تو بالکل بے حس ہو چکی ہے۔"

"اجی سرکار! اس کی آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ جو کہیں گے، میں وہی کروں گا۔"

"شاباش! اب جو میں کہوں، وہ غور سے سُن لو۔"

دوسرے دن شہر میں ایک کہانی گردش کرنے لگی۔

کہانی کچھ یوں تھی کہ ظہور الاسلام صاحب کے ایک جاننے والے نے یورپ سے بتایا تھا کہ ملک میں ملک دشمنی کا

لٹریچر پھیلانے کی سازش ہو رہی ہے۔

فون کرنے والے نے ظہور کو ایک دو مقامات کے نام بھی بتائے تھے۔ ایک رات ظہور صاحب اپنے ایک آدمی کے ساتھ ان ہی مقامات کی نگرانی کر رہے تھے کہ انہوں نے دو مشکوک قسم کے آدمیوں کو ایک شاپر میں کچھ لے جاتے ہوئے دیکھا۔

ظہور صاحب نے انہیں رکنے کے لیے کہا لیکن انہوں نے دوڑ لگا دی۔ وطن کی محبت میں سرشار ظہور صاحب بھی اپنی گاڑی سے اتر کر ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ پھر وہ دونوں اس شاپر کو کچرے کے ایک ڈھیر پر پھینک کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے بعد ظہور صاحب نے جب وہ شاپر اٹھایا تو اس میں وطن دشمنی کا لٹریچر بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد ظہور صاحب نے اپنے طور پر جب ان مشتبہ مقامات پر چھاپے مارے تو وہاں سے انہیں کچھ نہیں مل سکا۔ شاید وہ لوگ ہوشیار ہو چکے تھے۔

اس خبر کو ہر اخبار میں نمایاں جگہ ملی تھی۔ اسی دن ظہور صاحب کے کہنے پر ان کے بندوں نے ایک پریس کانفرنس کا بھی اعلان کر دیا۔

پریس کانفرنس ظہور صاحب کے شاندار گھر پر ہی ہوئی تھی اور پریس والوں کے لیے بہت زبردست ڈنر کا بھی بندوبست کیا گیا تھا کیونکہ مہمانوں کی تواضع عین خدمت ہے... اور وہ بھی صحافیوں کی۔

اس شام ظہور صاحب کا خطبہ اور ان کے انداز دیکھنے والے تھے۔ یہ کہانی سناتے ہوئے کئی بار ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔

ان سے طرح طرح کے سوالات کیے جا رہے تھے جن کے وہ اسی انکسار کے ساتھ جواب دیتے رہے۔ بالآخر جب ایک صحافی نے پوچھا۔ ”جنابِ عالی! اب یہ فرمائیں کہ ایسے واقعات کا سدِباب کیسے ہو؟“

تو اس وقت ظہور صاحب پھٹ پڑے۔ ”صرف اور صرف ایک علاج ہے اور وہ ہے حقیقی معنوں میں ایک مضبوط سیاسی پارٹی اور مضبوط حکومت۔ جس میں کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکے کہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت کرے۔“

”اور جناب، یہ قیام کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟“

”ایک ایسی پارٹی کے ذریعے جو حکمرانی اور سیاست بھی کرے اور دین کی خدمات بھی بجا لائے۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ بدقسمتی سے یہاں جتنی پارٹیز ہیں، وہ کہنے کو تو دینی اور مذہبی جماعتیں ہیں لیکن ان کے رشتے سیکولرازم سے جا کر مل جاتے ہیں۔ اسی لیے یہاں اتنی بے حرمتی ہو رہی ہے۔“

”کیا اس سلسلے میں آپ کوئی کردار ادا کرنے والے ہیں؟“ کسی نے سوال کیا۔

”ہاں، ویسے تو میں ان سب معاملات سے بہت دور رہا ہوں۔“ ظہور نے کہا۔ ”میرا ان ایوانوں سے کیا واسطہ لیکن اس عظیم الشان نیک مقصد کے لیے میں ایک پارٹی بنانے کا اعلان کر رہا ہوں... جس کا نام ہو گا ظہور الاسلام پارٹی۔“

”واہ ظہور الاسلام صاحب، واہ۔ آپ نے اپنے نام کی مناسبت سے بہت اچھا نام تجویز کیا ہے۔“

”چلیں جی، اس پارٹی کی کامیابی کے لیے دعا مانگتے ہیں۔“ ایک معتقد نے بلند آواز میں اعلان کیا۔

سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ان میں سے کوئی بھی حصولِ ثواب میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا اور شاندار ڈنر کو دیکھ کر تو سب نے پیش گوئی کر دی تھی کہ ملک اور قوم کے لیے اس سے بہتر پارٹی اور کوئی نہیں ہو سکتی اور ظہور الاسلام کی پارٹی ملک کی سلامتی اور کامیابی کی ذمے دار ہے۔

یہ خبر شمائلہ تک بھی پہنچ چکی تھی۔

ظہور صاحب جب سرشاری کی کیفیت میں اس کے پاس پہنچے تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو۔ آپ نے بہت کامیابی کے ساتھ اپنا جال پھینک ہی دیا۔“

”لاحول ولا۔ تم اسے جال کہہ رہی ہو۔“ ظہور جز بز ہو گیا تھا۔ ”یہ تو قوم کی اور ملک کی خدمت کا مشن ہے۔ دعا کرو کہ میں اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”چلیں، اگر میری دعائیں آپ کے کسی کام آ سکتی ہوں تو دعا بھی کر دوں گی۔“

”شمائلہ! جانتی ہو آج میری پریس کانفرنس کتنی زوردار رہی ہے؟“

”ہاں، آپ کو دیکھ کر اندازہ تو ہو رہا ہے۔“ شمائلہ نے کہا۔ ”ویسے میں نے تو کبھی آپ کو راتوں کو اٹھ کر کچرا چھانتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”یہ ایسی باتیں ہیں جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ بہرحال، تمہیں اِدھر اُدھر جا کر ایسی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں ظہور صاحب! اطمینان رکھیں۔ اتفاق سے میں ایک فرماں بردار قسم کی بیوی ہوں۔ اس لیے ایسی حرکت کبھی نہیں کروں گی۔“

☆☆☆

اسلم اب خود قادری بابا کو تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

جس دن سے اس کے ساتھ وہ واقعہ ہوا تھا... جب قادری بابا نے بھرے ہوٹل میں اس کا ہاتھ چوما تھا، اس دن سے اسے سکون نہیں تھا۔

آخر کیوں؟ قادری بابا نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ وہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ پورا شہر ان کو جانتا ہے۔ ان کا احترام کرتا ہے پھر قادری بابا نے اس کا ہاتھ کیوں چوما؟ اس کو اتنا بڑا مرتبہ کیوں دیا؟

جب اس کی الجھن بڑھتی ہی چلی گئی تو اس نے شبراتی چاچا سے بات کی۔ ”چاچا! قادری بابا نے میرا ہاتھ چوم کر میرا سکون... غارت کر دیا ہے۔ تم بتاؤ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

”اسلم! ایسا کر تو خود قادری بابا سے جا کر ملاقات کر لے۔“ شبراتی چاچا نے مشورہ دیا۔ ”ان سے کھل کر بات کر۔ پھر دیکھ وہ کیا کہتے ہیں۔“

”نہیں چاچا! میں اکیلا تو نہیں جاؤں گا۔ وہ اللہ والے ہیں۔ ان سے ڈر ہی لگتا ہے۔“

”پاگل ہوا ہے۔ وہ تو بہت مہربان اور نرم دل انسان ہیں۔“ شبراتی چاچا نے کہا۔ ”وہ تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ بس ہمت کر کے چلا جا ان کے پاس۔“

”لیکن وہ ملیں گے کہاں؟“

”پتا میں بتائے دیتا ہوں۔“ شبراتی چاچا نے اسلم کو پتا سمجھا دیا۔

اسلم اسی دن سے قادری بابا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن وہ مل کر نہیں دے رہے تھے۔ ان کے بارے میں کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔ بس وہ ایک مخصوص علاقے میں گشت کرتے دکھائی دیتے۔ لیکن اب اس علاقے کے لوگوں کو بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

ایک رات وہ اپنے گھر میں ہی تھا کہ قادری بابا خود اس کے گھر آ گئے۔ وہ قادری بابا کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”بابا... آ... آپ...“ اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

”میں نے یہ سنا تھا کہ تم میری تلاش میں ہو۔“ بابا نے کہا۔ ”تو میں نے سوچا کہ تمہیں پریشان کیوں کیا جائے۔ میں خود چلا ہوں تمہارے پاس۔“

”بابا! آپ... آپ... میں تو ایک عام سا مزدور اور انسان ہوں۔“ اسلم سے اپنی حیرت کا اظہار بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ”پھر میرے ساتھ آپ کی یہ مہربانی کیسی؟“

”تم ایک عام انسان نہیں ہو۔“ قادری بابا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تمہارے لیے اشارے دیے گئے ہیں۔ بس میں تمہیں اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر قادری بابا نے پھر اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ”اب میری تلاش میں خود کو ہلکان مت کرنا۔ مجھے ملنا ہو گا تو میں خود آ جاؤں گا تمہارے پاس۔“

قادری بابا اسے حیران اور پریشان چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں اس کے دروازے پر محلے والوں کی بھیڑ لگ گئی تھی۔ ان میں سے اکثر قادری بابا کو جانتے تھے اور انہیں اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ قادری بابا نے اسلم کا اتنا احترام کیوں کیا تھا۔ کیا خاص بات تھی اسلم میں۔

لیکن سوائے قادری بابا کے اور کوئی بھی نہیں جانتا ہو گا کہ اسلم اچانک اتنی اہمیت کیوں اختیار کر گیا تھا۔ محلے والے اب اسے عزت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”بھائی اسلم! تم تو بہت چھپے ہوئے نکلے۔“ کسی نے کہا۔

”ارے نہیں بھائی، میں کیا اور میری اوقات کیا۔“ اسلم گڑبڑا کر بولا۔ ”میں تو جو ہوں تمہارے سامنے ہی ہوں۔“

اسلم کی بیوی بھی اپنے شوہر کی اس عزت افزائی پر حیران ہو رہی تھی۔

اس رات اس نے اسلم سے کہا۔ ”قادری بابا نے یہ کہا تھا کہ ان کو کسی کی طرف سے اشارے ملے ہیں... تو کس کی طرف سے اشارے ملے ہیں؟ تم ان سے معلوم تو کرو۔“

”نہیں، انہوں نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ میں ان سے ملنے کی کوشش نہ کروں۔“ اسلم نے بتایا۔ ”وہ خود ہی مجھ سے مل لیا کریں گے۔“

دوسری صبح وہ معمول کے مطابق فیکٹری پہنچ گیا۔ یہاں کی صورتِ حال بہت مختلف ہو رہی تھی۔ قادری بابا اور اس کے حوالے سے یہاں بھی کہانیاں پہنچ چکی تھیں۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے ورکرز اس کا احترام کر رہے تھے۔ سپروائزر نے اس کو کام میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔

گیارہ بجے فیکٹری کے مالک نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ”میں نے تمہارے بارے میں یہ کیسی باتیں سنی ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”کیا ہے یہ سب؟ کون ہیں یہ قادری بابا؟“

”ایک اللہ والے بندے ہیں صاحب!“ اسلم نے بتایا۔ ”میں نہیں جانتا کہ انہیں مجھ میں ایسی کون سی خاص بات

نظر آ گئی ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ یہاں بھی لوگ تمہارا بہت احترام کررہے ہیں۔ تمہیں ولی اللہ سمجھ رہے ہیں۔"

"اب میں کیا بتا سکتا ہوں صاحب۔" اسلم نے انکساری سے اپنی گردن جھکالی۔

"ایسا لگتا ہے کچھ دنوں کے بعد یہاں قوالیاں شروع ہو جائیں گی۔" مالک نے کہا۔ "مسٹر اسلم! ایسے ماحول میں کام نہیں ہوسکتا۔ تم اپنا حساب کرلو اور چلے جاؤ یہاں سے۔"

اسلم سکتے میں رہ گیا۔ "جناب! جو کچھ ہورہا ہے، اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اس نے پوچھا۔ "میں تو مزدور آدمی ہوں۔ مزدوری کرنے آتا ہوں۔ مجھے ایسی باتوں سے کیا لینا دینا۔"

"نہیں بھائی، ہم اپنی فیکٹری میں کسی اللہ والے کو نہیں رکھ سکتے۔" مالک نے کہا۔ "کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے تمہاری شان میں کوئی گستاخی ہو جائے۔ اس لیے چلے جاؤ یہاں سے۔"

☆☆☆

سینڈی نے مین ہٹن کے ایک ریستوران میں ملنے کے لیے کہا تھا۔

ان دونوں کا قیام بھی نیویارک کے اسی خوب صورت علاقے میں تھا۔ یہاں کی چہل پہل اظفر کو ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی۔ خاص طور پر یہاں کے فٹ پاتھوں سے گزرتے ہوئے لوگ۔

اس کا دعویٰ تھا کہ دس منٹ کے اندر اندر اتنے بھانت بھانت کے لوگ کہیں سے بھی گزرتے دکھائی نہیں دیں گے۔ چینی، جاپانی، ہندوستانی، پاکستانی، افریقی اور نہ جانے کیا کیا۔

ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگ۔ وہاں کی فٹ پاتھیں بین الاقوامی فیشن پریڈ کی طرح تھیں۔

اظفر ریستوران کے اندر بیٹھ کر شیشے سے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ کتنا حیرت انگیز تھا۔ وہ شیشے کی دوسری طرف دیکھنے میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کوئی اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو کچھ دنوں پہلے اسے پارک میں ملا تھا اور جس نے الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔

"کسی کا انتظار کررہے ہو کیا؟" اس شخص نے اظفر سے پوچھا۔

"تم سے مطلب؟" اظفر کا لہجہ سخت تھا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں کس کا انتظار ہے۔" اس نے کہا۔ "ہم تمہیں آخری وارننگ دے رہے ہیں۔ دیارِ غیر میں ایسی حرکتوں سے باز آجاؤ۔ ورنہ نقصان میں رہو گے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ آخر تمہیں کیا پریشانی ہے؟" اظفر نے پوچھا۔

"ہم کسی پاکستانی کو کسی غیر مسلم لڑکی کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے۔" اس نے کہا۔ "یہ سازشیں کرتی ہیں۔ ہم کئی لوگوں کو سیدھی راہ پر لے آئے ہیں۔ تمہیں بھی لانا ہے۔"

"تم کیا زبردستی اپنی بات منوانا چاہتے ہو؟"

"ہاں زبردستی۔ ہمارا یہی مشن ہے۔ پوری دنیا میں جہاں بھی کوئی ہم وطن بھٹک رہا ہوگا، ہم اس کو سیدھا کر دیں گے۔"

"دیکھو، مجھے احساس ہے کہ تم ایک مخلص انسان ہو۔" اظفر نے کہا۔ "تم اپنے طور پر وطن کی خدمت کی کوشش کررہے ہو لیکن یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ تم اپنی باتوں سے مجھے قائل کردو تو پھر میں شاید وہی کروں جو تم کہہ رہے ہو۔"

"نہیں، ہمارے یہاں باتیں نہیں ہوتیں۔" اس نے کہا۔ "ہم صرف سختی کرتے ہیں۔ باتیں تو بہت ہوچکیں۔"

اظفر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت سینڈی ریستوران میں داخل ہو گئی۔ سینڈی کو دیکھ کر وہ شخص جلدی سے باہر نکل گیا۔ سینڈی اظفر کے پاس آ گئی۔ "یہ وہی آدمی تھا نا جو اس دن پارک میں تم سے ملا تھا؟" سینڈی نے پوچھا۔

"ہاں، یہ وہی تھا۔"

"اظفر! ایسا لگتا ہے کہ شاید یہ آدمی تمہیں کچھ پریشان کررہا ہے۔" سینڈی نے کہا۔

"شاید۔" اظفر نے ایک گہری سانس لی۔ "پتا نہیں، یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔"

"اگر یہ تمہیں ہراساں کررہا ہے تو ہم پولیس میں بھی اس کی شکایت کرسکتے ہیں۔"

"نہیں، رہنے دو۔ اگلی بار ملا تو میں خود نمٹ لوں گا۔"

"خیر، چلو ڈیڈی نے تمہیں ملنے کا وقت دے دیا ہے۔" سینڈی نے کہا۔ "خوش قسمت ہو تم۔ ورنہ وہ کسی سے نہیں ملتے۔"

"نہیں، میں اس لیے خوش قسمت نہیں ہوں کہ تمہارے ڈیڈی مجھ سے ملیں گے بلکہ اس لیے خوش قسمت ہوں کہ تم میرے ساتھ ہو۔"

"پھر شروع ہو گیا مشرق کا رومانس۔"

"یہ تو ہم مشرقی لوگوں کی رگوں میں شامل ہے۔ ہم

بغیر عشق کے نہیں رہ سکتے۔ ہمارے یہاں جاکر دیکھو۔ ہر نوجوان لڑکا اور لڑکی موبائل پر گھنٹوں ایک دوسرے سے نان اسٹاپ باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"کتنا فالتو وقت ہے تم لوگوں کے پاس۔"

"بات یہ ہے کہ ہم نے نروان حاصل کرلیا ہے۔" اظفر نے کہا۔ "اور ہمارا نروان یہ ہے کہ کچھ نہ کرو۔ نروان حاصل ہو جائے گا اور ہم سیدھے جنت میں چلے جائیں گے۔"

"اظفر! یاد رکھو جو قوم یہاں جنت نہیں بنا سکی، وہ وہاں بھی نہیں بنا سکے گی۔"

سینڈی کا شاندار گھر شہر کے مضافات میں ایک بہت خوب صورت مقام پر تھا۔ سینڈی اسے اپنے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ "تم بیٹھو، میں ڈیڈ کو بلا کر لاتی ہوں۔"

سینڈی کا باپ واقعی باذوق قسم کا اسکالر معلوم ہوتا تھا۔ دیواروں پر مشاہیر کی بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

جب وہ سینڈی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو اظفر اسے دیکھ کر احترام سے کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی اسکالر ہے۔ اس کی آنکھوں میں علم اور ذہانت کی چمک تھی۔

اس نے بہت گرم جوشی سے اظفر سے ہاتھ ملایا۔ "بیٹھو نوجوان۔ سینڈی نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔"

اظفر بیٹھ گیا۔

شمائل گہری نگاہوں سے اظفر کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے بات آگے بڑھائی۔ "سینڈی بتا رہی تھی کہ تمہارے ڈیڈ بھی اسکالر ہیں۔"

اظفر کا دل چاہا کہہ دے کہ وہ اسکالر نہیں سوداگر ہیں لیکن وہ شمائل کو یہ نہیں بتا سکا۔ اس کے بجائے اس نے جواب دیا۔ "جی ہاں، لیکن ان کے بہت سے خیالات سے میں اتفاق نہیں کرتا۔"

"مسٹر اظفر! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" شمائل نے کہا۔ "یہ اختلاف ہی تو زندگی کی علامت ہے۔ زندگی کیا ہے، ایک دریا ہے۔ ہر لمحہ ہمیں نئی لہر، نئی سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب یہ جو قدیم رسوم و رواج ہوتے ہیں یہ کیا ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے پانی کو کسی جگہ بند کردیا گیا ہو۔ اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ پانی استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ اس میں سے بدبو آنے لگتی ہے۔ کیوں... ٹھیک ہے نا؟"

"جی ہاں، بالکل۔" اظفر نے گردن ہلا دی۔ اسے شمائل کی باتیں بہت منطقی محسوس ہورہی تھیں۔

"اسی لیے ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں تازہ خیالات اور رسومات کی ضرورت ہے۔" شمائل نے کہا۔ "چاہے وہ شعبہ فلسفے کا ہو، معاشیات کا ہو یا مذہب کا۔ ہمیں بہت کچھ بدلنا ہوگا۔"

"چھوڑیں ڈیڈ... کیسی خشک باتیں لے کر بیٹھ گئے۔" سینڈی نے مداخلت کی۔ "کوئی اور باتیں کریں۔"

شمائل ہنس پڑا۔ "اوکے، چلو کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔ ہلکی پھلکی۔ اپنے آپ کو مطمئن کرنے والی۔"

اظفر دو گھنٹوں تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس شخص کا مطالعہ نہ صرف وسیع ہے بلکہ وہ بہت سچائی کے ساتھ تجزیہ بھی کرسکتا ہے۔

دو گھنٹوں کے بعد اظفر جب سینڈی کے باپ سے مل کر رخصت ہوا تو مذہب کے حوالے سے اس کے ذہن میں بے شمار خیالات جنم لے چکے تھے۔

شمائل نے سوچنے کے لیے بالکل نئی راہیں اس کے سامنے رکھ دی تھیں۔

اس شام جب اس نے اپنے اپارٹمنٹ واپس آکر اپنا ٹی وی آن کیا تو اسے ایک نئی خبر سننے کو مل گئی۔ اس نے دوسرے پاکستانیوں کی طرح ایک ایسا کنکشن لے رکھا تھا جس میں دو چار چینلز پاکستانی آجایا کرتے۔

وطن سے دور رہنے والوں کے لیے اس قسم کے چینلز غنیمت تھے۔ ان سے وطن کی خبریں مل جایا کرتیں۔ شام کی تازہ خبر یہ تھی کہ اس کے باپ ظہور الاسلام نے ظہور اسلام ہی کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنالی تھی۔

☆☆☆

ظہور لا اسلام نے پارٹی تو بنالی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے سامنے کوئی ایسا ایشو نہیں آیا تھا کہ اس کی پارٹی راتوں رات مشہور ہو سکتی۔ یا لوگ اس پر بھروسا کرنے لگتے۔

شمائلہ اس کی ایسی بیوی تھی جس سے وہ اس قسم کے مشورے بھی لیا کرتا تھا اور وہ اسے راستے بتایا کرتی۔ شمائلہ کی ذہانت پر ظہور ... کو بہت فخر بھی تھا۔

اس نے کچھ دیر تک شمائلہ کے ناز اٹھانے اور اس کی خوشامدیں کرنے کے بعد جب اس بارے میں مشورہ کیا تو شمائلہ نے کہا۔ "ظہور اسلام صاحب! آپ سیاست میں تو آگئے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہی نہیں کہ سیاست ہوتی کیا ہے۔"

"اسی لیے تو پارٹی کا جنرل سیکریٹری تمہیں بنایا ہے۔"

"تو یہ جنرل سیکریٹری یہ کہتی ہے کہ جہاں خبریں نہ ہوں، وہاں خبریں CREATE کی جاتی ہیں۔" شمائلہ نے کہا۔

"کیا مطلب؟ خبریں کیسے بنائی جائیں؟" ظہور

نے پوچھا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ڈرائیور جلیل نے اپنی پسند کی شادی کی ہے؟" شمائلہ نے کہا۔

"ہاں، جانتا ہوں میں۔"

"تو پھر میری بات ذرا دھیان سے سنیں۔ آج آپ کو ایک پریس کانفرنس کرنی ہے۔" شمائلہ نے کہا۔ "جس میں آپ کا ڈرائیور اور اس کی بیوی دونوں پیش ہوں گے۔"

"حد ہوگئی۔ تو اس سے کیا ہوگا؟"

"جو میں آپ کو سمجھا رہی ہوں، وہی جلیل اور اس کی بیوی کو بھی سمجھانا ہے۔" شمائلہ نے کہا۔ "ان دونوں نے پسند کی شادی کی ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوا۔ دونوں کے گھر والوں نے تو انہیں معاف بھی کردیا ہے۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"یہی تو بتانا ہے کہ انہیں معاف نہیں کیا گیا ہے۔" شمائلہ نے کہا۔ "بلکہ ان دونوں کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں اور کسی بھی وقت ان دونوں کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

پریس کانفرنس بہت زوردار تھی۔

ظہور الاسلام کی ہر پریس کانفرنس اس لحاظ سے کامیاب ہوا کرتی کہ بے شمار اخبار والے ڈنر کے لالچ میں آجایا کرتے تھے۔ شہر بھر میں اس کی پریس کانفرنس کی دھوم مچی رہتی تھی۔

"ہاں میں۔" ظہور الاسلام اپنے سینے پر ہاتھ مار مار کر بول رہا تھا۔ "میں نے دونوں کو پناہ دی ہے کیونکہ یہ ہماری روایات کے عین مطابق ہے۔ مذہب نے بھی زبردستی کی شادی کی کبھی حمایت نہیں کی۔ اگر مرد اور عورت شرعی طور پر ایک ہوجاتے ہیں تو اس میں برائی کیا ہے؟"

"برائی صرف پرانے اور جہالت بھرے رسوم و رواج میں ہے۔ ہماری برادری میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارے خاندان کی لڑکی باہر نہیں جاتی۔ یہ سب بکواس ہے۔ اصل چیز ہے برداشت۔ زمانہ بہت آگے جاچکا ہے۔ ہمیں ترقی کرنی ہے۔ ہماری پارٹی ان کی محافظ ہوگئی ہے۔"

"کیا ان دونوں نے آپ سے پناہ کے لیے کہا تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"ہاں۔" ظہور الاسلام نے بتایا۔ "جلیل میرا ڈرائیور بھی ہے۔ اس نے جب یہ بات کی تو میں نے اس سے کہا کہ سب سے بہتر یہی ہوتا ہے کہ شادی میں بزرگوں کی رضامندی شامل ہو۔ اگر یہ نہ بھی ہو اور شرعی اور جائز طریقے سے نکاح پڑھوالیا ہے تو بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ اب دونوں خاندانوں کو چاہیے کہ معاف کردیں۔ لیکن افسوس کہ معاف کرنے کا تو رواج ہی ختم ہوگیا ہے۔ بس ماردو... جان سے ماردو۔ یہی سیکھا ہے ہم نے... اور خود کو انسان بھی کہتے ہیں اور مسلمان بھی۔"

اخبار والوں نے تالیاں بجانی شروع کردیں۔ تالیاں بجانے والوں میں ڈرائیور جلیل اور اس کی بیوی بھی شامل تھے کیونکہ ان بے چاروں کو یہی بتایا گیا تھا۔

ظہور الاسلام فخریہ انداز سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج کی پریس کانفرنس گویا جیت لی تھی۔

اچانک پچھلی کرسیوں سے ایک نوجوان لڑکی اٹھ کر سامنے آگئی۔ ظہور الاسلام اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ نورین تھی۔ اس کی اپنی بیٹی۔

وہ چونکہ پچھلی کرسی پر بیٹھی تھی، اس لیے ظہور اسے ابھی تک دیکھ نہیں سکا تھا۔

"بابا۔" نورین نے ظہور کو مخاطب کیا۔ "کیا میں بھی کچھ کہہ سکتی ہوں؟"

ظہور نے اس کو جواب دینے سے پہلے اخبار والوں کی طرف دیکھ کر بتایا۔ "یہ میری بیٹی ہے اور یہ بھی اپنے حق کے بارے میں مجھ سے سوال کرنا چاہتی ہے۔ ہاں بیٹا! کیا کہنا ہے؟" اس نے نورین سے پوچھا۔

"بابا! کیا یہ درست ہے کہ اسلام میں صرف تقویٰ کو اہمیت دی گئی ہے اور خاندانی وجاہت اور مال و دولت ثانوی چیزیں ہیں؟"

"بالکل بالکل۔" ظہور نے گردن ہلائی۔ "جو ایسی باتوں پر غرور کرتا ہے وہ لعنتی ہے۔"

"اس کے علاوہ کیا یہ بھی درست ہے کہ لڑکی اگر کسی نیک نوجوان سے اپنی مرضی سے شادی کرلے تو یہ ہے تو بڑی بات۔ لیکن نکاح منسوخ نہیں ہوتا۔"

"بالکل لیکن تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"بابا! میں نے آپ کی مرضی کے بغیر ایک شریف اور نیک نوجوان سے شادی کرلی ہے۔" نورین نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

☆☆☆

روزی نے ایک تھپڑ رسید کردیا۔

تھپڑ کھانے کے باوجود وہ بے غیرتی سے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر ہنستا رہا۔

تھپڑ کھانے والے کا نام سکندر تھا۔ ایک لوفر قسم کا

نوجوان جس نے زندگی میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا ہوگا۔

روزی ایک عیسائی لڑکی تھی جس کے باپ پیڈرو نے محلے میں ہارڈویئر کی دکان کھول رکھی تھی۔ اس نے روزی کو اچھی تعلیم دلوادی تھی۔ اب روزی ایک بینک میں ملازمت کررہی تھی۔

وہ ایک خوب صورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ جب وہ چلتی تو نہ جانے کتنے دلوں پر بجلیاں سی گرجاتیں۔ اس محلے کے جانے کتنے نوجوان اس کی خاطر اپنا مذہب تک بدلنے کو تیار ہوچکے تھے۔ لیکن وہ مضبوط کردار کی مضبوط لڑکی تھی۔

اس کا پورا گھرا اچھا تھا۔ پیڈرو خود ایک صلح جو اور نرم خو قسم کا آدمی تھا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی اسی کے مزاج کے تھے۔ خاص طور پر روزی جس نے اپنی عزت اور اپنا احترام برقرار رکھا تھا۔

سکندر تو پہلے ہی سے روزی کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا لیکن گزشتہ چند دنوں سے اس نے روزی کے ساتھ باقاعدہ چھیڑ چھاڑ شروع کردی تھی۔

آج وہ روزی کے سامنے اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ جم کر کھڑا ہوگیا تھا۔ "روزی! آخر تم مجھ سے اتنا کتراتی کیوں ہو؟"

"کیا مطلب؟" روزی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم سے کیوں کتراؤں گی... میرا تم سے کیا واسطہ ہے؟"

"واسطہ ہی تو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔" سکندر مسکراتے ہوئے بولا۔

اس نے روزی کا ہاتھ تھامنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا کہ روزی نے اس کے گال پر تھپڑ رسید کردیا۔

سکندر بھنا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

لیکن وہ اس وقت کچھ نہیں کرسکا۔ روزی بھی اسی محلے کی تھی اور سب روزی کو بھی جانتے تھے اور سکندر کو بھی۔ سکندر اچھی طرح جانتا تھا کہ محلے والے روزی کی طرف داری کریں گے۔ اس لیے وہ صرف دھمکی دیتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔ "کوئی بات نہیں جانِ من... یہ تھپڑ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

اس نے اسلم کو بھی اسی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا سکندر یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اسلم نے بھی روزی کی حمایت کردی تو سکندر کے لیے اور پریشانی ہوجائے گی۔

آج کل پورا محلہ اسلم کا احترام کررہا تھا کیونکہ قادری بابا اس کا ہاتھ چوم کر چلے گئے تھے۔

اسلم روزی کے پاس آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ "کیا بات ہے بیٹی؟" اس نے روزی سے پوچھا۔ ایک ہی محلے میں رہنے کی وجہ سے سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ "یہ بدمعاش تمہیں تنگ کررہا تھا کیا؟"

"ہاں، اسلم بھائی! الٹی سیدھی باتیں کررہا تھا۔" روزی نے بتایا۔

"پریشان نہ ہو۔ میں سمجھا دوں گا اس کو۔ اس وقت کہاں جارہی ہو؟"

"بس اسٹاپ۔" روزی نے بتایا۔ "وہاں سے اپنے آفس۔"

"آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اسٹاپ تک پہنچا دیتا ہوں۔" اسلم نے کہا۔

اسٹاپ وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ روزی بے جھجک اس کے ساتھ چل پڑی۔ راستے میں دونوں باتیں کرتے رہے۔

"برا مت مانیے گا اسلم بھائی۔" روزی نے کہا۔ "آپ کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے تحفظ کا احساس ہورہا ہے۔ جیسے میرا کوئی رکھوالا، کوئی نگہبان ساتھ چل رہا ہو۔ ورنہ اب تک تو مسلمانوں کے لیے میرا تجربہ بہت خراب ہی رہا ہے۔"

"یہی تو بدقسمتی ہے۔" اسلم نے ایک گہری سانس لی۔ "ہم مسلمانوں نے اپنے آپ کو بہت نیچے گرادیا ہے۔ لیکن سب ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ یاد رکھو روزی، ہمارے پیغمبر ہمارے سرکار کو سچے دل سے ماننے والا کبھی چھچھوری حرکتیں نہیں کرے گا۔ یہی ہمارے نبیؐ نے ہمیں بتایا ہے۔ میں تو ایک جاہل سا مزدور ہوں۔ زیادہ باتیں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے محفوظ رہیں۔ لو تمہارا اسٹاپ آگیا۔ اب تم جاؤ۔ اور ہاں، وہ آئندہ تمہیں تنگ کرے تو مجھے بتادینا۔"

روزی اس کا شکریہ ادا کرکے اپنی مطلوبہ بس میں سوار ہوگئی۔ اسلم اسٹاپ سے گھر واپس آگیا۔ آج کل وہ بے روزگار تھا۔ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔

اس کی فیکٹری کے مالکان نے صرف اس لیے اسے نکال دیا تھا کہ لوگ اس کا احترام کرنے لگے تھے۔ لیکن لوگوں کا احترام اس کا اور اس کے گھر والوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

لیکن کیا؟

اس نے اپنی بیوی سے ذکر کیا تو اس نے اپنے

تھوڑے سے زیورات نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ ”یہ لو اور ان سے کام چلاؤ۔“

”ارے نہیں... یہ زیورات کب تک ساتھ دیں گے؟“ اس نے کہا۔

”ان کو بیچ کر محلے میں کوئی چھوٹی سی دکان کر لو۔“ بیوی نے مشورہ دیا۔

اسلم کا دل نہیں مانا۔ ایک تو ویسے ہی اس بے چاری کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اب یہ زیورات بھی چلے جاتے تو کیا ہوتا۔

ایک دن محلے کے شبراتی چاچا نے اسے ایک انوکھا مشورہ دیا۔ ”دیکھو بھائی اسلم! اب یہ پورا محلہ تمہاری عزت کرنے لگا ہے۔ سب تم پر بھروسا بھی کرتے ہیں تو اگر تم چاہو تو اس موقع سے فائدہ بھی اٹھا سکتے ہو۔“

”کیسا فائدہ؟“

”تعویذ گنڈوں کا کام شروع کر دو۔“ شبراتی چاچا نے کہا۔ ”بہت فائدے میں رہو گے۔“

”کیا بات کر رہے ہو چاچا! میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں؟“

”ارے، اس ملک میں ایک سے ایک بدمعاش یہی کام کر رہے ہیں اور تم تو پھر نیک آدمی ہو۔“ شبراتی چاچا نے کہا۔ ”تعویذ گنڈوں کی کتابیں آتی ہیں۔ بس ان کو دیکھ دیکھ کر شروع ہو جاؤ۔“

”اور لوگوں کو دھوکا دینا شروع کر دوں؟“

”ارے بھائی، دھوکا کیسا... تم ان کے لیے دعائیں کر دینا، سچے دل سے۔ اور میرا خیال ہے کہ اوپر والا تمہاری دعائیں ضرور سن لے گا۔“

”یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”سامنے کی بات ہے۔ قادری بابا یونہی تو تمہاری طرف نہیں آئے ہوں گے۔ کچھ نہ کچھ تو دیکھا ہی ہوگا۔“

اسلم سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔ وہ اس قسم کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

”شبراتی چاچا! میرا دل نہیں مان رہا۔“

”بے وقوف ہو تم۔“ شبراتی چاچا نے کہا۔ ”موقع سے فائدہ اٹھا لو۔ میں تمہارے لیے حجرے کا بندوبست بھی کر دوں گا اور تمہاری مشہوری بھی کروا دوں گا۔ سمجھا کرو۔ اس طرح اپنی روٹی روزی کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ بغیر کسی کام کے گھومتا پھر رہا ہوں۔“

اسلم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد گردن ہلا دی۔

”ٹھیک ہے شبراتی چاچا... لیکن مجھے یہ کام نہیں آتا۔“

”اس کی فکر مت کرو۔ میں سمجھا دوں گا۔“ شبراتی چاچا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

☆☆☆

اظفر نے یہ خبر بہت دکھ سے سنی تھی۔

اس کے باپ ظہور الاسلام نے اپنی بیٹی نورین کو اپنی جائداد وغیرہ سے عاق کر دیا تھا کیونکہ اس نے اپنی پسند سے ایک شریف نوجوان سے شادی کر لی تھی۔

نورین اگرچہ ظہور الاسلام کی دوسری بیوی سے تھی۔ وہ اظفر کی سوتیلی بہن تھی۔ اس کے باوجود اظفر کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ اظفر ہی کی طرح کھلے دل و دماغ کی لڑکی تھی۔

اظفر نے یہ خبر سنتے ہی نورین کو فون کیا۔ وہ اظفر کا فون موصول کر کے خوش ہو گئی۔ ”ہاں بھائی! بابا کا یہ رنگ بھی ہمارے سامنے آ گیا ہے۔“ پھر اس نے بتایا کہ کس طرح بابا نے پریس کانفرنس میں پسند کی شادی کی حمایت کی تھی۔ زوردار تقریر کی تھی۔ اور یہ ظاہر کیا تھا کہ جلیل اور اس کی بیوی نے پسند کی شادی کی ہے۔ اسی لیے انہوں نے دونوں کو پناہ دی ہے۔“

”میرے خدا! اتنی بڑی منافقت۔“ اظفر نے تبصرہ کیا۔

”ہاں بھائی... اور جب میں نے اس پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ میں ایک غریب لیکن شریف نوجوان سے شادی کر چکی ہوں تو ان کو سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں جو کچھ ہوا، وہ میں بتا نہیں سکتی۔ انہوں نے مجھے اور میرے شوہر کو قتل کروانے کی تین چار کوششیں کیں۔“

اظفر بہت حیرت اور دکھ سے یہ سب سنتا رہا۔ نورین رو رہی تھی۔ ”بھائی! میرے دانشور اور محب وطن باپ نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ ہم ان کے خوف سے بھاگے پھر رہے ہیں۔ کہیں بھی چین نہیں ہے۔ خدا جانے یہ کیسی منافقت ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتے کچھ اور ہیں اور دوسری طرف ان کا یہ رویہ۔“

”ایسا ہی ہوتا ہے... ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اظفر نے کہا۔ ”تم بالکل پریشان نہ ہو۔ تم نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میں ایک نمبر اور نام بھیج رہا ہوں۔ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ تم فوراً اس سے رابطہ کر کے اس کے پاس چلی جاؤ۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر تمہاری حفاظت کرے گا۔“

”شکریہ بھائی۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ اظفر اس

وقت ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ سینڈی اس وقت اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ اس نے اظفر کی کیفیت محسوس کر لی تھی۔ ”کیا ہوا اظفر! خیریت تو ہے نا؟“

”نہیں، خیریت نہیں ہے۔ ایک لڑکی ایک نام نہاد اسکالر کی انا اور اس کی ضد کی بھینٹ چڑھ رہی ہے اور اتفاق سے وہ اسکالر میرا باپ ہے اور وہ لڑکی میری بہن ہے۔“ اس نے سینڈی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

”خدا جانے کچھ لوگ ایسے کیوں ہوتے ہیں۔“ سینڈی اداس ہو کر بولی۔ ”لگتا ہے جو بھی اپنے نام کے آگے کوئی خاص ٹھپا لگا لے، اس میں منافقت آ ہی جاتی ہے۔ چاہے وہ میرا باپ ہو یا تمہارا باپ۔“

”نہیں سینڈی! تمہارے ڈیڈ تو ایک روشن خیال اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔“ اظفر نے کہا۔

”اسی بات کا تو دکھ ہے کہ وہ ایسے نہیں نکلے جبکہ خود میرا بھی خیال تھا۔“ سینڈی اداسی سے بولی۔ ”تم نے شاید ان کی کتاب نہیں پڑھی۔“

”کون سی کتاب؟“ اظفر نے پوچھا۔

”کل ہی چھپ کر آئی ہے۔“ سینڈی نے بتایا۔ ”میں تمہارے لیے لے کر آئی ہوں۔“ سینڈی نے اپنے بیگ سے ایک کتاب نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ ”ڈیڈ نے یہ کتاب CLASHES OF CIVILIZATION کی طرز پر لکھی ہے۔ لیکن اس میں انہوں نے صرف تم مسلمانوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔“

”اوہ۔“ اظفر نے ایک گہری سانس کے ساتھ کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی جس کا نام ہی چونکا دینے والا تھا۔ THE MUSLIM AND CULTURAL WORLD۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ڈیڈ نے مسلمانوں کو مہذب دنیا سے الگ کر دیا ہے۔“

”ہاں، ان کا خیال ہے کہ مسلمان کلچرڈ نہیں ہوتے۔“ سینڈی نے کہا۔ ”میں تو اس کتاب کو پڑھ کر بہت دیر تک روتی رہی ہوں۔“

”ارے، اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اس قسم کے لوگ تو ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔“ اظفر نے کہا۔ ”میں تمہیں اپنے باپ کے بارے میں بتا چکا ہوں سینڈی۔ یہ سب اپنی اپنی دکان چمکانے کی بات ہے۔ میرے باپ نے پریس کانفرنس میں جو کہا، اس سے اس کی دکان چمک گئی۔ بے شمار گاہک پیدا ہو گئے ہوں گے جو سب اس کی رواداری کی تعریف کر رہے ہوں گے اور ان کو یہ نہیں معلوم ہوگا کہ خود ان کی بیٹی ان کی منافقت اور مذہبی کاروبار کی بھینٹ چڑھ رہی ہے۔ اسی طرح تمہارے ڈیڈ نے اپنی دکان چمکا لی ہے۔ پورے مغرب میں اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور یہ بیسٹ سیلر ہو جائے گی۔“

”خدا کی پناہ! کیسے لوگ ہوتے ہیں۔“ سینڈی نے اداسی سے کہا۔

”پھر اداس ہو رہی ہو۔ اس دنیا میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔“

”اظفر! میرے ڈیڈ نے یہ کتاب لکھ کر مجھے شاک دیا ہے۔“ سینڈی نے کہا۔ ”ان کا اصل چہرہ میرے سامنے آ گیا ہے اور اب میں بھی انہیں ایک شاک دوں گی۔ ایسا شاک جسے وہ زندگی بھر یاد کریں گے۔“

”تم کیا شاک دو گی؟“

”تم سے شادی کر کے۔“ سینڈی نے کہا۔

”کیا؟“ اظفر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھ سے شادی کر کے۔“

”ہاں، تم یہ بتاؤ کیا میں تمہارے قابل نہیں ہوں؟“ سینڈی نے پوچھا۔

”سینڈی! تم تو ایسی لڑکی ہو جس کو حاصل کر کے اس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔“ اظفر نے کہا۔

”تو بس، بات طے ہو گئی۔ ہم کل ہی کورٹ میرج کر رہے ہیں۔“ سینڈی نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

☆☆☆

سکندر کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنے بڑے لیڈر اور اسکالر کے بلانے پر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ جب سے اس نے ظہور اسلام پارٹی جوائن کی تھی، اس وقت سے پہلی بار اسے اتنی پذیرائی ملی ہوگی۔

”ماشاء اللہ... ماشاء اللہ۔“ ظہور نے گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جوان! میری یہ عادت ہے کہ میں اپنے ہر کارکن کا خیال رکھتا ہوں۔ ہر ایک کے بارے میں مجھے روزانہ کی بنیاد پر رپورٹس ملتی رہتی ہیں۔ تمہارے بارے میں جب معلوم ہوا کہ تم ایک انتہائی پُرجوش کارکن ہو تو میرا دل خوش ہو گیا۔ اس قوم کو تم ہی جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔“

”اب میں کیا کہوں صاحب۔“ سکندر کی آواز کانپنے لگی۔ ”آپ کا حکم ملتے ہی دوڑا چلا آیا ہوں۔“

”یاد رکھو، تم ہی لوگ اس ملک کی امید ہو۔“ ظہور نے کہا۔ ”تمہارے ہی دم سے دنیا میں پاکستان کا بول بالا

ہونے والا ہے۔''

''آپ کی مہربانی ہے صاحب!'' سکندر ابھی تک بے پناہ نروس تھا۔

''یہ لو، یہ میری طرف سے تمہارے جوش اور جذبۂ ایمانی کا انعام۔'' ظہور نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

''صاحب! اس کی کیا ضرورت ہے؟'' سکندر نے کہا۔ ''میں تو ویسے ہی آپ کا خادم ہوں۔ میں یہ سب لے کر کیا کروں گا؟''

''اس دور میں اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے... رکھ لو۔''

سکندر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹوں کی وہ گڈی اپنی جیب میں رکھ لی۔

''اب یہ بتاؤ اگر تمہیں کوئی کام دیا جائے تو کتنی رازداری سے کر سکو گے؟'' ظہور نے پوچھا۔

''ٹکڑے بھی ہو جائیں گے سرکار تب بھی کسی کو ہوا نہیں لگے گی۔'' سکندر نے کہا۔

''نوجوان! کیا تمہیں میری بدقسمتی معلوم ہے؟'' ظہور نے پوچھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

سکندر یہ دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ ''بتائیں سرکار! بتائیں مجھے... میں آپ کے کسی کام آسکا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔''

''بیٹے! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر جسم پر بد گوشت آجائے تو صرف علاج کی خاطر اسے کاٹ کر پھینک دینا پڑتا ہے۔'' ظہور نے کہا۔ ''اپنے دین، اپنی عزت اور آبرو کو بچانے کے لیے کڑوا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔''

''جی صاحب! ایسا ہی ہوتا ہے۔'' سکندر نے گردن ہلا دی۔

''کیا تم جانتے ہو کہ میری بیٹی نے میری اجازت کے بغیر شادی کر لی ہے؟'' ظہور نے پوچھا۔

''جی صاحب! یہ قصہ تو مشہور ہو چکا ہے۔''

''بخدا میں ایسی شادی کے خلاف نہیں ہوں۔'' ظہور نے کہا۔ ''میرے نزدیک پسند کی شادی کوئی گناہ، کوئی جرم نہیں ہے۔ خاندان، دولت یہ سب خدا کے نزدیک بیکار کی باتیں ہیں۔ چاہے وہ کوئی ہو۔ اگر وہ اچھا انسان ہے تو پھر اس کو حق ہے کہ وہ کسی بھی خاندان میں شادی کر لے۔''

سکندر بہت دھیان سے ظہور کی باتیں سن رہا تھا۔ اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ظہور کے چہرے پر نور ہی نور پھیلا ہوا ہو۔ کتنے پاکیزہ خیالات تھے اس شخص کے۔

''تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میری بیٹی نے بھی ایک شخص سے اپنی پسند کی شادی کر لی۔'' ظہور نے بات آگے بڑھائی۔ ''بخدا میں اس شادی کے خلاف نہیں ہوں۔ یہ اس کا حق ہے لیکن افسوس کہ اس شادی کے بعد میری حب الوطنی پر داغ آنے والا ہے۔''

''وہ کیوں صاحب؟''

''وہ اس لیے کہ اس نے جس شخص سے شادی کی ہے، وہ یہودی ایجنٹ ہے۔ سمجھتے ہو نا یہودی ایجنٹ ہونا کتنی خطرناک بات ہے؟'' ظہور کی آواز میں بے پناہ دکھ سمٹ آیا تھا۔

''صاحب جی! یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔''

''ہاں۔'' ظہور نے ایک گہری سانس لی۔ ''اب تم بتاؤ۔ کیا مجھے چین مل سکتا ہے؟ میں اس دن سے تڑپ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری عبادتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ میں جہنم کی آگ میں خود کو جلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے کئی بار اس شخص کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ اس کو سمجھایا کہ وہ راہ پر آجائے، یہ سب نہ کرے۔ اس قوم اور ملک کا مذاق نہ اڑائے لیکن خدا جب کسی کے دل پر مہر لگا دے تو پھر اسے کون سمجھا سکتا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں صاحب! آپ کے لیے تو یہ بہت بڑی بات ہے۔''

''ہاں سکندر! میری زندگی میں یہی ایک دکھ ہے۔ مجھے ایک پل بھی چین نہیں ہے۔ میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی ہے کہ میں اس شادی کے کیوں خلاف ہوا ہوں۔ یہ بتانے والی بات ہی نہیں ہے۔''

''جی صاحب! آپ تو کسی کو بتا بھی نہیں سکتے۔''

''نہ جانے کیوں تم پر بھروسا کرنے کو دل چاہا۔ اسی لیے تمہیں سب کچھ بتا دیا۔''

''صاحب! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔'' سکندر نے کہا۔

''نہیں، تم کیا کر سکو گے۔'' ظہور کے لہجے میں دکھ تھا۔ ''تم جاؤ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے، اس کو اپنے آپ تک رکھنا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔''

''صاحب! آپ نے اتنے بڑے آدمی ہو کر جب اتنا مجھ پر بھروسا کیا ہے تو میں آپ کے حکم کے خلاف کیسے جا سکتا ہوں۔''

''ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے لیے پارٹی میں کوئی عہدہ بھی نکال دوں۔'' ظہور نے کہا۔

''آپ مجھے اپنا تابعدار پائیں گے صاحب۔''

سکندر کے جانے کے بعد ظہور دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔ اس نے اس نوجوان پر اپنا جال پھینک دیا تھا۔

اس کی پارٹی کے کچھ لوگوں نے سکندر کے بارے میں بتایا تھا۔ ''جنابِ عالی! اپنے محلے کا بہت بڑا غنڈا ہے۔ لوگ اس سے خوف زدہ بھی رہتے ہیں۔ سنا ہے ایک آدھ قتل بھی کر چکا ہے لیکن گرفت میں نہیں آسکا کیونکہ اس کے خلاف کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔''

''ایسا شخص تو ہماری پارٹی میں آکر نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

''نہیں جنابِ عالی! آج کل ہر پارٹی کے پاس ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ آج کی سیاست میں مار دھاڑ اور غنڈا گردی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اب کوئی شریف بندہ تو یہ سب کرنے سے رہا۔ اسی لیے عقل مند قسم کے سیاسی حضرات اسی قسم کے لوگوں کو اپنی پارٹی میں رکھتے ہیں۔''

''ایسے شخص کو کسی ظہور اسلام ٹائپ کی پارٹی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟'' ظہور نے پوچھا۔

''صرف کھانے کمانے کے لیے جنابِ عالی۔'' اسے بتایا گیا۔ ''ورنہ اس کو کسی سے کیا دلچسپی۔ اسے قابو میں کر لیں جنابِ عالی! بہت کام آئے گا۔''

نورین کی بغاوت کے بعد ظہور نے اسے اور اس کے شوہر کو ٹھکانے لگانے کے لیے دو چار آدمیوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن وہ ناکارہ نکلے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ نہیں آسکے تھے۔

اور اب ظہور کی امیدیں سکندر سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ وہ اسی قسم کا انسان تھا۔ اس کے نزدیک رشتوں سے زیادہ اہمیت اپنے اصولوں کی تھی۔ اور اس کا اصول یہ تھا کہ کبھی بھی کسی عام سے انسان کے ساتھ کوئی رابطہ، کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔ یہ عام سے لوگ تو بس عام ہی سے ہوتے ہیں۔

اس کی بیٹی نے اس سے بغاوت کر کے ایک عام سے نوجوان سے شادی کر لی تھی۔ وہ اس عام سے نوجوان کو اپنا داماد کہہ کر متعارف نہیں کروا سکتا تھا۔

زبان سے تقریر کر دینا اور بات ہے اور اس قسم کے صدمے برداشت کر لینا اور بات ہے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا اسی لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اس عام سے نوجوان کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اور اس کے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی۔ اس کی نافرمانی کا بس ایک ہی علاج ہو سکتا تھا۔

سکندر اسے کام کا بندہ دکھائی دے رہا تھا۔ آج اس نے سکندر سے پہلی ملاقات کی تھی۔ دوسری ملاقات میں اسے سکندر کو یہ ذمّے داری دینی تھی۔

اسے اُمید تھی کہ اول تو سکندر اس کے خلاف زبان کھولنے کی حماقت نہیں کرے گا اور اگر اس نے کبھی ایسا سوچا بھی تو خود اس کا بھی علاج ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

محلے میں اب خود اسلم کے خلاف باتیں بننی شروع ہو گئی تھیں۔

اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک کرسچین لڑکی روزی کو اپنے ساتھ اسٹاپ تک لے جایا کرتا... سکندر سے بچا کر۔

محلے والوں کا اب یہ خیال تھا کہ اسلم اور روزی کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے لیکن اب اس احترام کے باوجود اس پر انگلیاں اٹھنے لگی تھیں۔

ایک دن محلے کے ایک مولوی صاحب نے بھی اس سے بات کر لی۔ ''میاں اسلم! آخر تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔ آپ کس چکر کی بات کر رہے ہیں؟''

''میاں! تم روزانہ اس عیسائی لڑکی کو اس کے گھر سے اسٹاپ تک لے جاتے ہو؟''

''جی ہاں اور میں یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ محلے کے غنڈا عناصر سے اس کو بچا سکوں۔'' اسلم نے کہا۔

''میاں! یہ تو سوچو کہ وہ ایک عیسائی لڑکی ہے۔ اس سے ہمارا کیا واسطہ؟''

''ایک بات بتائیں، کیا کسی عیسائی لڑکی کی عزت، عزت نہیں ہوتی؟'' اسلم نے پوچھا۔

''میاں! وہ غیر مسلم ہے۔''

''کیا ہمارے نبیؐ کے دور میں غیر مسلموں کی عزتیں خراب کر دی جاتی تھیں؟'' اسلم نے پوچھا۔ ''معاف کیجیے گا۔ میں ایک جاہل اور ناسمجھ انسان ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جو آپ کہہ رہے ہوں درست ہو لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپؐ کے زمانے میں ان کو بھی اسی طرح سمجھا جاتا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں کو۔''

''میاں! تم کو تو بحث کرنے کی عادت پڑ گئی ہے۔'' مولوی صاحب جھلا کر بولے۔ ''تمہیں کیا معلوم کہ امریکا اور یورپ نے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ خاص طور پر

پاکستانیوں کا۔"

"ہاں، میں نے بھی یہ خبر سنی تھی۔" اسلم نے کہا۔ "لیکن مجھے اس میں کہیں بھی اس عیسائی لڑکی کا ہاتھ نظر نہیں آیا جو ہمارے محلے میں رہتی ہے... اور نہ ہی اس کے باپ نے ایسی کوئی حرکت کی ہوگی۔"

"میاں! اس کی قوم تو ہماری دشمن ہے نا۔"

"بالکل درست ہے جناب! جو ایسا کرتے ہیں، سزا تو انہیں ملنی چاہیے... نہ کہ پوری قومیت کو۔ اور یہ محاورہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ کرے مونچھوں والا اور پکڑا جائے داڑھی والا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

مولوی صاحب بک بک کرتے ہوئے چلے گئے۔

اسلم کی سمجھ میں ایک بات نہیں آرہی تھی کہ اسے ایسی باتیں کرنے کا سلیقہ کہاں سے آگیا تھا وہ تو ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔ مزدوری کرتا تھا۔ صرف آٹھویں تک تعلیم حاصل کی تھی اس نے۔ اب اتنی باتیں اسے کہاں سے آگئی تھیں؟

وہ مولوی صاحب سے جان چھڑا کر گھر کی طرف جارہا تھا کہ سکندر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ اس دن کے بعد سے وہ پہلی بار اسلم کے سامنے آیا تھا۔

"واہ، خوب بے وقوف بنا رہے ہو محلے والوں کو۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب تو صاف ہے پیر صاحب۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے تو اس لونڈیا کے راستے سے ہٹا دیا اور خود لے اڑے۔"

"کیا بکواس کررہے ہو؟" اسلم غصے سے کانپنے لگا۔

"بکواس میں ہی نہیں کررہا، پورا محلہ کررہا ہے۔" سکندر نے کہا۔ "بہت پارسا بنتے ہو۔ تمہاری ساری پارسائی سامنے آگئی ہے۔"

اسلم کو محسوس ہوا کہ اب اس محلے میں اس کی پوزیشن بہت کمزور ہوچکی ہے۔ قادری بابا کے آنے کے بعد محلے والے اس کی عزت کرنے لگے تھے لیکن اب ہر شخص کی آنکھوں میں اس کے لیے طنز تھا۔ شاید وہ اس عیسائی لڑکی کی مدد کرکے غلطی کررہا تھا۔ سب یہی کہہ رہے تھے۔ اس کی بیوی تک اس سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی۔

سکندر اسے اور دو چار باتیں سنا کر چلا گیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ پھر اسے روزی دکھائی دے گئی۔ وہی لڑکی جس کی وجہ سے اسے یہ سب برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

وہ اس کو دیکھ کر اس کے قریب آگئی۔ "اسلم بھائی! مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" اس نے کہا۔

"روزی!" اسلم نے اس کی طرف دیکھا۔ "بہتر یہی ہے کہ تم محلے میں اس طرح مجھ سے باتیں نہ کیا کرو۔"

"کیوں اسلم بھائی! ہمارے دل تو صاف ہیں۔"

"ہمارے دل تو صاف ہیں لیکن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے۔" اسلم نے کہا۔ "میرے اور تمہارے بارے میں باتیں بنائی جارہی ہیں۔"

"ہاں، میں نے بھی کچھ باتیں سنی ہیں لیکن مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔"

"تمہیں تو نہیں ہے لیکن مجھے کرنی پڑے گی۔" اسلم نے کہا۔ "خیر، یہ بتاؤ اس وقت تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"اب تو بات ہی ختم ہوگئی ہے اسلم بھائی۔" روزی دھیرے سے بولی۔ "اب تو مجھ ہی کو سامنا کرنا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس محلے میں اب میرا ایک مسلمان بھائی بھی ہے جو میری حفاظت کرے گا لیکن وہ تو خود مجبور ہوگیا ہے۔ معاف کرنا اسلم بھائی! میری وجہ سے تم بدنام ہونے لگے ہو۔"

اسلم تڑپ کر رہ گیا۔ اس لڑکی نے اس سے امیدیں وابستہ کرلی تھیں۔ وہ ایک مسلمان بھائی کو پکار رہی تھی۔ لوگ چاہے کچھ بھی کہتے رہیں، وہ اسے مایوس نہیں کرسکتا تھا۔

"بتاؤ روزی... بتاؤ۔" اس نے مضطرب ہوکر پوچھا۔ "لوگوں کو جانے دو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ بتاؤ، کیا بات ہے؟"

روزی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اسلم بھائی! اس غنڈے کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس نے کل مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا؟" اسلم لرز کر رہ گیا۔ "اغوا کررہا تھا۔"

"ہاں اسلم بھائی! وہ ایک گاڑی لے کر آیا تھا۔ مجھے زبردستی بٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس میں دو آدمی پہلے سے بیٹھے تھے۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ اس طرح میری عزت بچ گئی۔"

"لعنت ہو اس پر۔" اسلم غصے سے دانت پیسنے لگا۔ "تم بے فکر رہو۔ اب وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

"اسلم بھائی! آپ اس کے منہ نہیں لگیے گا۔" روزی نے کہا۔

"تم جاؤ، اس کی فکر مت کرو۔ میں سلیقے سے اس کو سمجھا دوں گا۔"

اس شام پورے محلے نے یہ خبر انتہائی حیرت اور افسوس کے ساتھ سنی تھی کہ اسلم نے محلے کے غنڈے سکندر کا خون کردیا تھا۔

تفصیل کے مطابق سکندر ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اسلم اچانک ہوٹل میں داخل ہوا اور سکندر پر جھپٹ پڑا۔

اسلم کے ہاتھ میں ایک بڑی سی چھری تھی۔ اس نے چھریوں کے کئی وار کرکے سکندر کو مار دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان جھگڑے کی وجہ ایک عیسائی لڑکی تھی۔ پولیس نے اسلم کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی.... حراست میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

نورین کا شوہر انور اپنی گلی میں ایک شخص کو دیکھ کر جلدی سے پان کے ایک کیبن کی آڑ میں ہوگیا۔ اس آدمی کا چہرہ اسے شناسا دکھائی دیا تھا۔

پھر اسے یاد آگیا کہ اس نے اس آدمی کو نورین کے باپ ظہور کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ ظہور کا خاص آدمی تھا اور یقیناً انہی کی تلاش میں آیا ہوگا۔

انور اور نورین پر دو حملے ہوچکے تھے۔ ان کی قسمت نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ وہ بچ گئے لیکن اب ایسا محسوس ہورہا تھا کہ ظہور نے تہیہ ہی کرلیا تھا کہ وہ ہر حال میں ان دونوں کو اتنی بڑی جسارت کی سزا دے گا۔ وہ آدمی اس گلی کے کسی شخص سے باتیں بھی کررہا تھا۔ شاید انہی دونوں کے بارے میں دریافت کررہا ہو۔ اس کا اندیشہ اس وقت درست ثابت ہوا جب گلی کے آدمی نے اس مکان کی طرف اشارہ کردیا جہاں انور اور نورین رہ رہے تھے۔

وہ آدمی اس مکان کو گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

انور اس کے چلے جانے کے بعد کیبن کی آڑ سے نکل کر اپنے گھر میں آگیا۔ نورین اس کا حال دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت ہی نہیں ہے۔" انور نے بتایا۔ "تمہارے بابا کے آدمی یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔"

"میرے خدا! اب کیا ہوگا؟"

"ہمیں فوری طور پر یہ مکان خالی کرنا ہوگا۔" انور نے کہا۔

"آخر کب تک؟" نورین بھڑک اٹھی۔ "ہم آخر کب تک ان کے خوف سے بھاگتے رہیں گے؟ کہاں جائیں گے ہم؟ انور! میں بھی اس شخص کی بیٹی ہوں اور اب جو میں نے سوچا ہے وہ کرنا ہے۔ اس کے بعد شاید ہم محفوظ ہوجائیں۔"

"کیا سوچ لیا ہے تم نے؟"

"پریس کانفرنس۔" نورین نے بتایا۔ "یہ کہانی بابا کی پریس کانفرنس سے شروع ہوئی تھی اور اس کا انجام بھی پریس کانفرنس ہی میں ہوگا۔"

"کہوگی کیا؟"

"پریس والوں کے سامنے ساری باتیں رکھ کر یہ کہوں گی کہ اگر ہم دونوں کو کوئی جانی اور مالی نقصان پہنچا تو اس کی ذمے داری بابا پر ہوگی۔"

"اور پریس کانفرنس ارینج کیسے ہوگی؟"

"ہوجائے گی، میرے بھی جاننے والے ہیں۔" نورین نے بتایا۔ "وہ میرا ساتھ دیں گے۔"

اسی وقت دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی۔ دونوں بری طرح چونک گئے۔ "یہ... یہ کون ہوسکتا ہے؟" انور کی آواز لرز رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں، جب اتنا بڑا قدم اٹھالیا ہے تو حوصلہ بھی پیدا کرو۔" نورین نے کہا۔ "میں دروازہ کھولتی ہوں۔ ویسے بابا کے آدمی تو نہیں ہوسکتے۔ وہ اتنی جلدی کیسے آسکتے ہیں۔"

اس نے دروازہ کھولا اور کئی قدم پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ دروازے پر خود اس کا باپ ظہور کھڑا تھا۔

نورین سکتے کی حالت میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ ظہور مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "بے وقوف لڑکی! اپنے باپ سے چھپتی پھر رہی ہے۔"

"بابا! میں آپ ہی کے خوف سے چھپ رہی ہوں۔" نورین نے کہا۔ "آپ ہم دونوں پر قاتلانہ حملے کروا چکے ہیں۔"

"کیا پاگل ہوگئی ہو۔" ظہور غصے سے بولا۔ "میں اپنی اولاد پر قاتلانہ حملے کرواؤں گا؟"

"تو پھر کیا ہوا تھا ہمارے ساتھ؟"

اس دوران میں انور بھی ان کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ "یہی تو سمجھانا ہے تم دونوں کو۔" ظہور نے کہا۔ "اس حملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ میں خود پاگلوں کی طرح پورے شہر میں تم دونوں کو تلاش کروا رہا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ تم دونوں نے حماقت تو کرلی ہے لیکن یہ شرعی اور قانونی طور پر بالکل درست ہے۔ میں صرف ناراض تھا۔ بعد میں میری ناراضگی بھی ختم ہوگئی اور یہ پریشانی ہوگئی کہ تم دونوں ہو کہاں؟"

”بابا! پھر وہ حملے کیا تھے؟“

”یہی تو سمجھنے والی بات ہے۔ اس وقت میں نے ایک پارٹی بنا رکھی ہے جو روز بروز مقبول ہوتی جارہی ہے۔ فرض کرو خدانہ کرے تم دونوں کو کچھ ہو جاتا ہے اور اس کیس میں میرا نام آجاتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟ میری پارٹی کی بنیاد ہل کر رہ جائے گی۔ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ سمجھ گئیں؟“

”جی انکل! میں نے سمجھ لیا ہے۔“ انور نے کہا۔ ”یعنی یہ حرکت آپ کے کسی سیاسی مخالف کی ہو سکتی ہے۔“

”سو فیصد۔“ ظہور نے اپنی گردن ہلائی۔ ”تم پر حملے میرے خلاف بہت بڑی سازش تھے اور ابھی بھی تم دونوں خطرے میں ہو۔ کچھ دیر پہلے میرے ایک آدمی نے تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بتادیا کہ تم دونوں یہاں ہو۔ بس میں بے قرار ہو کر چلا آیا۔“

نورین کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

ظہور کچھ بھی ہو، اس کا باپ تھا اور ان دونوں کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔ ظہور نے بیٹی کے جرم کو معاف کر دیا تھا اور خود تلاش کرتا ہوا یہاں تک چلا آیا تھا۔ اب اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ پریشانی کے بادل ایک دم سے چھٹ گئے تھے۔

ظہور نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ نورین اپنے باپ کے بازوؤں میں سمٹ آئی۔

☆☆☆

دوسری طرف اظفر بھی سینڈی کے ساتھ اس کے باپ شائل کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

لیکن شائل کا رویہ بالکل مختلف تھا۔

اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ ”تو تم دونوں نے کورٹ میرج کرلی؟“ اس نے پوچھا۔

”یس ڈیڈ!“ سینڈی نے جواب دیا۔

”اچھا کیا تم نے۔“ شائل نے کہا۔ ”اسی سے اندازہ لگا لو ہمارے یہاں کتنی رواداری ہے۔ انسان اچھا ہونا چاہیے۔ چاہے اس کا مذہب اور اس کی قومیت کچھ بھی ہو۔ افسوس کہ آج کی دنیا میں اچھے عیسائی اور اچھے مسلمان تو پیدا ہو رہے ہیں لیکن اچھے انسان کی پروڈکشن ختم ہوگئی ہے۔ وہ انسان جو کسی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے۔“

”لیکن ڈیڈ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، آپ کا رویہ ویسا تو نہیں ہے۔“ سینڈی نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”آپ ذرا خود اپنی کتاب اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ نے یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کو پوری دنیا کی مصیبتوں کی بنیاد بتایا ہے۔ آخر ایسا کیوں کیا آپ نے؟“

”یہ ایک دوسرا پوائنٹ آف ویو ہے۔“ شائل نے کہا۔ ”یاد رکھو کہ ہماری کسی سے دوستی یا دشمنی انفرادی طور پر تو ہو سکتی ہے، اجتماعی طور پر نہیں۔ ہم کسی ایک یا دو مسلمانوں کو تو اچھا سمجھ سکتے ہیں اور ان سے اپنے رشتے بھی استوار کر سکتے ہیں لیکن مجموعی طور پر پوری قوم کے ساتھ سمجھوتا نہیں ہو سکتا۔“

”جس طرح آپ نے مجھے اپنی بیٹی کے شوہر کے طور پر برداشت کرلیا ہے؟“ اظفر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں کیونکہ یہ انفرادی معاملہ ہے۔“

”تو آپ کا خیال ہے کہ ہم بحیثیت مسلمان اس قابل نہیں ہیں؟“ اظفر نے پوچھا۔

”بالکل۔“ شائل مسکرا دیا۔ ”اب میں تمہیں بتاؤں کہ پچھلے دنوں ویسٹ میں کچھ لوگوں نے تمہارے نبیؐ کے خاکے بنائے۔ مذاق اڑایا اور اس کا ردِعمل کیا ہوا؟ ردعمل یہ ہوا کہ تمہارے ملک میں دکانیں جلا دی گئیں۔ گاڑیوں کو آگ لگا دی گئی۔ تو تم اس رویے کو کیا کہو گے؟ یہ ہو سکتا ہے کہ تم ایسا نہ کرو لیکن تمہاری پوری قوم کیا کر رہی ہے؟“

”کاش میرے پاس آپ کی باتوں کا جواب ہوتا۔“ اظفر نے گردن جھکا لی۔

”کوئی بات نہیں۔“ شائل نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ”جاؤ، لائف انجوائے کرو اور میری باتوں پر دھیان دینا۔“

اظفر اور سینڈی نے ایک خوب صورت اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ دونوں اس میں رہ رہے تھے۔ سینڈی سے اظفر کی شادی دو چار دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اس کے بعد خاموشی ہوگئی۔

دونوں اپنے اپارٹمنٹ واپس آئے۔ گیٹ کے سامنے ہی ایک بڑا اسٹور تھا۔ اظفر کو وہاں سے گھر کے لیے کچھ چیزیں لینی تھیں۔ اس نے سینڈی کو اپارٹمنٹ کی طرف روانہ کیا اور خود روڈ کراس کر کے دوسری طرف آیا ہی تھا کہ اچانک دو آدمی اس کے سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک تو وہی نوجوان تھا جو اس سے ملتا رہا تھا اور جس نے سینڈی کے حوالے سے اسے دھمکیاں دی تھیں اور دوسرا کوئی اور تھا... کوئی افریقی۔

وہ دونوں اظفر کے پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ کسی انجانے خوف سے اظفر کا دل دھڑک اٹھا۔ ”خیریت تو ہے دوستو؟“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ سامنے جو کالے رنگ کی گاڑی دیکھ رہے ہو نا۔“ پہلے والے شخص نے کہا۔ ”بس خاموشی سے اس میں جا کر بیٹھ جاؤ۔“

”لیکن کیوں؟“ اظفر نے پوچھا۔

”تمہارے پاس سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔“ افریقی شخص نے کہا۔ وہ انگریزی ہی بول رہا تھا۔ ”اگر تم نے دیر لگائی تو اسی فٹ پاتھ پر تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اس کے تیور بہت خوفناک تھے۔ وہ پہلے والے نوجوان سے کہیں زیادہ تند اور جوشیلا معلوم ہوتا تھا۔ اظفر نے یہی مناسب سمجھا کہ اس کی بات مان لی۔

وہ کالے رنگ کی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کی سیٹ پر پہلے سے ایک آدمی موجود تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اسلم اور اس کے گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسلم جیسا نیک اور شریف انسان کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔ وہ بھی کسی لڑکی کے لیے۔ وہ خود حیران تھا کہ اس کے ہاتھوں اتنا بڑا جرم کیسے سرزد ہو گیا۔

اس دن جب روزی سے اس کی ملاقات ہوئی اور روزی نے اسے بتایا کہ سکندر نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی تو نہ جانے کیوں اسے ایسا لگا جیسے سکندر کو سزا دینا اس کا فرض بن گیا ہو۔

ایک اسلامی فرض، اخلاقی فرض، سماجی فرض۔ اتفاق سے اس شام سکندر سے پھر اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے پھر اسلم کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔

”ارے بھائی، تم نے کیا ان لوگوں کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ کوئی چکر و کر چلا رہے ہو تو بات دوسری ہے۔ ورنہ تم جیسے آدمی کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کیوں خوامخواہ بدنام ہو رہے ہو؟“

”دیکھو سکندر!“ اسلم نے بہت ٹھنڈے لہجے میں اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”شاید تم یہ نہیں جانتے کہ عورت کا تحفظ ہمارا مذہبی اور دینی فریضہ ہے۔“

”یہ سبق کس نے سکھا دیا تمہیں؟“

”اس ہستی نے سکھایا ہے جنہوں نے اپنے اخلاق سے پوری دنیا کو بدل کر رکھ دیا تھا۔“ اسلم نے کہا۔

”رہنے دے بھائی رہنے دے۔ زیادہ دودھ کا دھلا مت بن۔ اور آئندہ سے ہمارے راستے میں مت آنا۔ میں جانوں اور وہ لڑکی جانے۔“

”سکندر! شاید تم یہ بھی نہیں جانتے کہ روزی نے مجھے بھائی کہہ کر پکارا ہے۔“ اسلم نے کہا۔ ”اس نے ایک مسلمان سے اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کی شکایت کی ہے۔“

”اچھا اچھا، زیادہ محمد بن قاسم مت بن۔“ سکندر نے حقارت سے کہا۔

بس اس بات نے اسلم کے بدن میں آگ لگا دی۔ اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے۔ وہ سیدھا گھر آگیا۔

نہا کر دو رکعت نماز ادا کی اور بیوی کی نگاہوں سے چھپ کر بڑی سی چھری اٹھائی اور اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں وہ روزانہ سکندر کو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

سکندر نے اسے دیکھ کر پھر کوئی پھبتی کسی اور اسلم نے اس کے سینے میں چھری اتار دی۔ بالکل اضطراری طور پر۔ اس کا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا لیکن شاید اس کی موت آچکی تھی۔

سکندر کو قتل کرنے کے بعد اسلم نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس جگہ خاموش کھڑا رہا۔ لوگوں نے بھی اسے کچھ نہیں کہا۔ صرف پولیس کو فون کر دیا گیا۔ اس طرح اس کی گرفتاری عمل میں آگئی۔

اب وہ حوالات میں تھا۔ اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ اس نے تو ویسے ہی اقرار کرلیا تھا کہ اس نے خون کیا ہے۔ پولیس کو کچھ لوگوں نے یہ بتایا کہ یہ قتل ایک لڑکی کی وجہ سے ہوا ہے۔

روزی بھی گرفتار ہوئی تھی۔ اس پر اسلم نے سخت احتجاج کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ روزی اس سلسلے میں بالکل بے قصور ہے۔ اس نے یہ قتل اپنی مرضی سے کیا ہے۔ وہ سکندر کی باتوں سے اشتعال میں آگیا تھا۔

پولیس کو بھی اسلم سے ہمدردی تھی۔ سکندر کا ریکارڈ ان کے سامنے تھا۔ وہ ایک غنڈا تھا۔ کئی بار اسے سزا بھی ہوئی تھی۔ وہ ایک قتل کے الزام میں بھی ملوث تھا جبکہ اسلم کے خلاف ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اسی لیے پولیس کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔

تھانے کا ایس ایچ او ملک نواز ایک ایسا انسان تھا جو پیروں، فقیروں پر بہت زیادہ بھروسا کیا کرتا تھا۔ وہ بھی قادری بابا کے معتقدین میں سے تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ قادری بابا بھی اسلم کا احترام کرتے ہیں۔ پھر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا آدمی کسی کا خون کیونکر کر سکتا ہے۔

اس نے اسلم سے کہا تھا۔ ”دیکھو، تھانے میں تم پر کوئی سختی نہیں ہوگی۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی کیونکہ تم ایک اچھے انسان ہو۔ تمہارا ریکارڈ ہمارے سامنے ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ تم ایک لڑکی کے چکر میں کیسے آگئے؟“

”ایس ایچ او صاحب! اس لڑکی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اسلم نے بتایا۔ ”صرف اتنی سی بات ہے کہ اس لڑکی نے مجھ سے سکندر کی شکایت کی تھی کہ وہ اسے تنگ کرتا ہے۔“

”اور تم نے اس کو مار دیا؟“

”اس بات پر نہیں مارا۔“ اسلم نے کہا۔ ”بات یہ تھی کہ اس لڑکی نے مجھے بھائی کہا تھا اور ایک بہن، بھائی سے مدد مانگ رہی تھی۔ کیا یہ میرا فرض نہیں تھا کہ میں ایک بہن کی مدد کرتا؟ اور دوسری بات یہ بھی ایس ایچ او صاحب کہ وہ ایک عیسائی لڑکی ہے۔ اس کا پورا خاندان، اس کی پوری برادری ہم مسلمانوں کی پناہ میں ہے۔ یہ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم صرف اس لیے اسے پریشان کریں کہ وہ عیسائی ہے۔ یہ رویہ تو خود ہمارے نبیؐ کو بھی پسند نہیں آتا۔ انہوں نے بہت سختی سے تاکید کی ہے کہ خبردار جو غیر مسلم تمہاری حفاظت میں ہیں، ان کو کوئی تکلیف نہ دو۔ میں نے تو اپنے نبیؐ کے حکم کی تعمیل کی ہے ایس ایچ او صاحب۔“

”آپ واقعی بہت بڑے آدمی ہیں اسلم صاحب۔“ ایس ایچ او کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ نے جو کچھ کیا بالکل درست کیا۔ قادری بابا جیسے انسان یونہی آپ کا احترام نہیں کرتے۔ انہوں نے کچھ نہ کچھ تو دیکھا ہی ہوگا لیکن میں مجبور ہوں۔ آپ کا چالان بنا کر آپ کو عدالت میں تو پیش کرنا ہی پڑے گا۔“

”ہاں ہاں... کیوں نہیں۔ یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔“ اسلم نے کہا۔

اور اس وقت تھانے میں ہلچل سی مچ گئی۔

یہ ہلچل قادری بابا کے تھانے آنے کی وجہ سے مچی تھی۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ خاص طور پر ایس ایچ او گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

قادری بابا کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ پورا شہر ان کا احترام کیا کرتا تھا۔ قادری بابا سیدھے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

انہوں نے آتے ہی اسلم کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔“

اس سے پہلے کہ اسلم کچھ کہہ سکتا، انہوں نے اسلم کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دیا اور جس طرح آئے تھے اسی طرح باہر نکل گئے۔ البتہ جاتے جاتے انہوں نے ایس ایچ او کے شانے پر بھی تھپکی دی تھی۔

ایس ایچ او کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ اسلم کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ اس نے اسلم کے لیے اسی وقت ہوٹل سے بہترین کھانے منگوا لیے تھے۔

”ارے ایس ایچ او صاحب! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ اسلم نے کہا۔ ”میں تو ایک قاتل ہوں۔“

”نہیں جناب! آپ قاتل نہیں ہیں۔“ ملک نواز عقیدت سے بولا۔ ”آپ نے جو کچھ کیا وہ اوپر والے کے اشارے پر کیا ہے۔ آپ کو شاید اسی کام کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ قادری بابا تک آپ کا احترام کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ آپ کیا ہیں، یہ بھید اللہ ہی جانتا ہے۔“

ایس ایچ او نہ جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن اسلم کا دھیان قادری بابا کی بات پر تھا۔ ”ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔“ اور کون سا امتحان باقی رہ گیا تھا؟ اس کے ہاتھوں ایک آدمی کا خون ہو چکا تھا۔ وہ اپنی سزا کا منتظر تھا۔ اب اور کیسے امتحان اس کے سامنے آنے والے تھے؟

اسلم کو بہت احترام اور عزت کے ساتھ اس کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ دوسری صبح اسے عدالت میں حاضری دینی تھی۔

☆☆☆

چار آدمیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔

ان میں سے ایک تو وہی تھا جس سے اظفر کی دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنا نام اکبر بتایا تھا۔ اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔

اکبر کے علاوہ ایک اور پاکستانی بھی تھا، شرافت۔ ایک افریقی عبداللہ اور ایک سعودی باشندہ۔ یہ سب اظفر کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔

اس پر باقاعدہ جرح کی جا رہی تھی۔ ”تم ایک منافق مسلمان ہو۔ تم نے یہاں آکر ایک یہودی لڑکی سے شادی کر لی ہے۔“

”بالکل درست ہے لیکن میں منافق نہیں ہوں۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”اور وہ لڑکی یہودی نہیں بلکہ عیسائی ہے اور نہ جانے کتنوں نے عیسائی لڑکیوں سے شادیاں کر رکھی ہیں۔ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔“

”لیکن اس لڑکی کا باپ ایک متعصب یہودی ہے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”تم نے اس کی کتاب نہیں دیکھی جس میں اس نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے۔“

”ہاں، دیکھی ہے اور میں نے اس پر احتجاج بھی کیا تھا۔“

”کس قسم کا احتجاج؟“

”وہی جو ان حالات میں کرنا چاہیے۔“ اظفر نے کہا۔ ”اگر یہ کہا جائے کہ مجھے توڑ پھوڑ مچا دینی چاہیے تھی، اس کو گولی مار دینی چاہیے تھی تو اس سے کچھ نہیں ہونے والا۔ اس نے ایک علمی بحث کا آغاز کیا ہے اور علم کا جواب علم ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ ہنگامے سے نہیں۔“

”یہ تمہارے کمزور ایمان کی دلیل ہے۔“

”نہیں بلکہ یہ اس ایمان کی دلیل ہے جس کی ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ دشمن سے الجھنے کے بجائے اسے دلیل سے قائل کرو۔“

”لیکن تم ہمیں قائل نہیں کر سکتے۔“ شرافت نے کہا۔

”یہ میری بدقسمتی ہے۔“ اظفر نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم لوگ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ مغرب میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ نبیؐ کی شان میں خاکے بنائے جا رہے ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں؟ خود اپنے ہی ملک میں توڑ پھوڑ، اپنا ہی نقصان۔“

”تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”تم لوگ کیا سمجھتے ہو کہ اس قسم کی حرکتیں اچانک شروع ہوئی ہیں؟“ اظفر نے پوچھا۔ ”جی نہیں، ان کی پلاننگ سو ڈیڑھ سو سال سے جاری ہے۔ ہمیں بھی اسی قسم کی پلاننگ کرنی ہوگی۔ پوری امت مسلمہ کو۔ تب جا کر یہ سلسلہ ختم ہوگا۔“

”کس پلاننگ کی بات کر رہے ہو؟“

”ٹیکنالوجی اور طاقت حاصل کرنے کی۔“ اظفر نے کہا۔ ”فرض کرو۔ دنیا کا کوئی اسلامی ملک اگر سپر پاور ہو جاتا ہے تو کیا کسی کی مجال ہوگی جو اس قسم کی حرکتیں کر سکے؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کمزور کو ہر کوئی دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے طاقتور بنیں، علم حاصل کریں۔ اس کے بعد منہ توڑ جواب دیں۔ ابھی تم لوگ مجھے اٹھا کر لے آئے ہو۔ مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہو تو اس سے کیا ہوگا؟ کیا پورا عالمِ اسلام سدھر جائے گا... جواب دو؟“

وہ سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”اس کے باوجود ہم یہ چاہیں گے کہ تم اس لڑکی کو چھوڑ دو۔“ عبداللہ نے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ اظفر نے پوچھا۔ ”کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ میں تبلیغ کر کے اسے اسلام کی طرف مائل کروں۔ وہ ایک ذہین لڑکی ہے اور ہماری قوم کو ذہانت کی ضرورت ہے۔“

وہ سب اظفر سے کچھ دور جا کر آپس میں مشورہ کرتے رہے۔ پھر شرافت ہی اس کے پاس آیا۔ ”دوست! تم جا سکتے ہو۔ لیکن ہم امید رکھتے ہیں کہ تم اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے۔“

”جس طرح تم لوگوں نے مجھ سے یہ امید رکھی ہے اسی طرح میں بھی تم لوگوں سے امید رکھتا ہوں کہ تم لوگ عالمِ اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں کو سنجیدگی سے سمجھو اور سنجیدگی سے جواب دو۔ مار دھاڑ یا دہشت گردی سے ہم پوری دنیا میں اپنا کیس کمزور کرتے چلے جا رہے ہیں۔“

”میرے دوست! شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔“ شرافت نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب ہم اپنی پالیسی پر غور کریں گے۔“

☆☆☆

ظہور الاسلام کو یہ سن کر شاک لگا تھا کہ سکندر کا قتل ہو گیا تھا جو آگے چل کر اس کے بہت کام آنے والا تھا۔

اسے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ سکندر کو اسلم نام کے ایک آدمی نے مارا ہے اور اس کا قتل ایک عیسائی لڑکی روزی کے لیے ہوا ہے۔

ظہور نے یہ سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی بیٹی نورین اور اس کے شوہر انور کو ہٹانے کے لیے سکندر ہی سے کام لے گا لیکن

کھڑکی

”میں دسویں منزل کے کمرا نمبر دس سے بول رہا ہوں...... جلدی آؤ...... میری بیوی خودکشی کرنا چاہتی ہے!“

ہوٹل کا منیجر یہ سن کر بوکھلا گیا۔ ”یس...... سر...... میں ابھی پولیس اور فائر بریگیڈ کو فون کرتا ہوں...... وہ یہ خودکشی نہیں ہونے دیں گے۔“

”پولیس کے بچے!“ دوسری طرف سے شاید دانت پیس کر کہا گیا۔ ”جلدی میرے کمرے میں آؤ، کھڑکی نہیں کھل رہی...... دیر ہوئی تو وہ ارادہ بدل لے گی۔“

(حمیرا اقبال، کورنگی)

سکندر اب خود اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اسی لیے اس نے ایک دوسری چال چلی تھی۔

وہ نورین اور انور کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ اس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ان دونوں کو معاف کر چکا ہے جبکہ سچائی کچھ اور تھی۔

اس کی پلاننگ کے لیے یہ ضروری تھا کہ نورین اور انور لوگوں کے سامنے آئیں۔ دونوں اس بات کا اعلان کریں کہ اب وہ ظہور کے ساتھ ہی ہیں اور سب ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

اور جب سب ٹھیک ہو جائے تو اس کے بعد ان دونوں کی کہانی ختم کر دی جائے۔

اس کی پلاننگ اپنی جگہ مکمل ہو چکی تھی کہ درمیان میں وہ لڑکی روزی آ گئی۔ جس کی وجہ سے سکندر کا خون ہوا تھا۔ اس کا باپ پیڈرو ظہور کے پاس اپنی اور گھر والوں کی حفاظت کی درخواست لے کر آیا تھا۔

ظہور کے ملازم نے پیڈرو کو ظہور کے شاندار ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اس کمرے کی شان و شوکت ہی دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔

جب ظہور اپنے کھڑکھڑاتے لباس اور معطر بدن کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا تو پیڈرو اسے دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' ظہور نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

پیڈرو ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گیا تھا۔

''ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟'' ظہور نے پوچھا۔ ''کیوں آئے ہو میرے پاس... کیا کام ہے مجھ سے؟''

''سرکار ہم غریب لوگ ہیں۔'' پیڈرو نے کہا۔ ''آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے ہزاروں، لاکھوں پرستار ہیں۔ آپ ایک اشارہ بھی کر دیں تو ہماری جان چھوٹ سکتی ہے۔''

''بات کیا ہے؟''

''سرکار! پچھلے دنوں سکندر نام کے ایک آدمی کا قتل ہوا ہے۔'' پیڈرو نے بتانا شروع کیا۔ ''اس کے بارے میں سنا گیا ہے کہ وہ آپ کی پارٹی کا کارکن تھا۔''

''لاحول ولا۔ ایسے بدمعاشوں اور غنڈوں سے ہمارا یا ہماری پارٹی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے سرکار کہ وہ آپ کی پارٹی کا نام استعمال کر رہا ہو۔''

''ممکن ہے لیکن بات کیا ہے؟''

''سرکار! اس قتل کے سلسلے میں ایک لڑکی کا نام بھی آ رہا ہے۔''

ظہور اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ''ہاں سنا تو ہے۔ شاید وہ کوئی کرسچین لڑکی ہے۔''

''جی سرکار! وہ میری بیٹی ہے روزی۔'' پیڈرو نے بتایا۔

''سمجھ گیا۔'' ظہور نے گردن ہلائی۔ ''تو کیا اس کا قاتل یا سکندر سے کوئی تعلق نہیں تھا؟''

''نہیں سرکار، کوئی تعلق نہیں تھا۔'' پیڈرو نے بتایا۔ ''صرف اتنا کہ ہم ایک محلے میں رہنے والے ہیں۔ میری بیٹی روزی نے اسلم کو اپنا بھائی بنا رکھا تھا اور اسلم بھی بھائی کی طرح اس کی حفاظت کیا کرتا۔''

''اب کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟'' ظہور نے پوچھا۔

''سرکار! سکندر کے کچھ اور ساتھی بھی ہیں جو سکندر ہی کی طرح آپ کی پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم عیسائی یہ محلہ چھوڑ کر چلے جائیں۔ سرکار! ہم نے اپنے علاقے میں ایک بڑا پلاٹ خرید رکھا ہے جہاں ہم نے اپنے گھر بنائے ہیں۔ کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہم وہ پلاٹ بھی خالی کر دیں تا کہ وہ اس پر اپنی مرضی سے قبضہ کر سکیں۔''

''یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔''

''سرکار! اسی لیے تو ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔'' پیڈرو نے بتایا۔ ''میرے کچھ ساتھی باہر بھی کھڑے ہیں۔ آپ بہت اثر والے ہیں سرکار۔ لوگ آپ کی بات بھی مانتے ہیں۔ آپ ذرا ان لوگوں کو سمجھا دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔''

''ہوں۔'' ظہور نے ہنکارا بھرا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عیسائیوں کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان کا ووٹ بینک بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وہ کئی دنوں سے یہی سوچ رہا تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کو کیسے متاثر کیا جائے۔ قدرت نے اسے ایک زبردست موقع فراہم کر دیا تھا۔

''دیکھو، میرا اصول ہے کہ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' ظہور نے کہا۔ ''میں ابھی تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔''

''ابھی چل رہے ہیں سرکار؟'' پیڈرو نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں ابھی۔''

ظہور کا قافلہ کئی گاڑیوں پر پیڈرو کے محلے میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ مسلح محافظوں کے علاوہ اس کے کچھ خاص لوگ بھی تھے۔

اس وقت ظہور کے چہرے پر بلا کا رعب برس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اصفہانی سرمے کے ڈورے کھنچے ہوئے تھے جن کی وجہ سے آنکھیں پُرکشش دکھائی دے رہی تھیں۔

پیڈرو اس قافلے کو اپنے گھر تک لے آیا تھا۔

اور یہیں پر آ کر ظہور گڑبڑا کر رہ گیا۔ پیڈرو کے دروازے پر ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ لڑکی کیا تھی۔ ظہور کی آنکھوں میں ایک بجلی سی لہراتی چلی گئی۔

''سرکار! یہ میری بیٹی ہے روزی۔'' پیڈرو نے روزی کی طرف اشارہ کیا۔

ظہور یہ سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کے لیے تو نہ جانے کتنے سکندر قتل ہو سکتے ہیں۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ اس کی نگاہیں روزی پر جم کر رہ گئیں۔

محلے کے کچھ لوگوں نے ظہور کے نام کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ظہور نے اپنے آپ کو سنبھال کر ایک تقریر کر ڈالی جس میں پڑوسیوں اور اقلیتوں کے حقوق وغیرہ کی بات کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ اگر شر پھیلنے کا اندیشہ ہو اور فساد بڑھنے کا خوف ہو تو عقل مندی اسی میں ہے کہ کسی طاقتور مسلمان کی پناہ حاصل کر لی جائے تا کہ تحفظ حاصل ہو، وغیرہ وغیرہ۔

جاتے جاتے اس نے پیڈرو سے کہہ دیا تھا کہ مزید کارروائی کے لیے وہ اور اس کی بیٹی اس کے پاس آ جائیں۔

☆☆☆

اسلم کو عدالت میں پیش کر دیا گیا تھا۔

حیرت انگیز طور پر عدالت نے بھی اس کے خلاف نرمی ہی برتی تھی۔

شہر کے کچھ دولت مندوں نے اس کے لیے ایک مہنگے وکیل کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں۔ اس کے حق میں بہت مضبوط کیس بنایا گیا تھا۔

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ اسلم ایک سیدھا سادہ سچا اور بے ضرر انسان ہے جبکہ مرنے والا ایک مستند غنڈا تھا کئی دفعہ کا سزا یافتہ... اور یہ قتل فوری اشتعال کا نتیجہ تھا۔ اس میں اسلم کے شعوری عمل کا کوئی دخل نہیں تھا۔

اسلم کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے لیے اتنا مہنگا وکیل کس نے ہائر کیا ہے۔ اس کی بیوی بے چاری تو یہ سب نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو بس اس کو دیکھ کر صرف روتی ہی رہتی تھی۔

تیسری پیشی میں ہی اسلم کی ضمانت منظور ہو گئی تھی۔

لیکن اس پر کیس چلتے رہنا تھا۔

چونکہ یہ ایک مشہور کیس تھا اسی لیے اس کی ضمانت کے موقع پر عدالت میں اور عدالت کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں شبراتی چاچا اور دیگر محلے والوں کے علاوہ روزی اور پیڈرو بھی ہار لیے ہوئے کھڑے تھے۔

اسلم کی بیوی اور بچے بھی تھے۔

روزی نے آگے بڑھ کر اسلم کے گلے میں ہار ڈال دیا۔ اسی وقت نہ جانے کدھر سے قادری بابا نمودار ہو گئے۔

اسلم کے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ قادری بابا کو دیکھ کر ایک طرف سمٹ گئے۔ قادری بابا نے اسلم کے پاس آتے ہی معمول کی طرح اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی

کرکٹ نامہ

مشہور بھارتی کرکٹر سری کانت ایک دفعہ بال کٹوا رہے تھے۔ حجام کی گفتگو میں جیسے ہی وسیم اکرم کا نام آتا، سری کانت تیکھی نگاہوں سے حجام کو منع کر دیتے۔

کئی بار منع کرنے کے باوجود جب حجام نہ مانا تو سری کانت اس کا قینچی والا ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولے۔ ''تم بار بار وسیم اکرم کا نام کیوں لیتے ہو؟''

''جناب آپ ناراض نہ ہوں۔ دراصل میں جب بھی وسیم اکرم کا نام لیتا ہوں۔ آپ کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھے کاٹنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ ہے اصل وجہ۔'' حجام نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

اسے بھی پڑھیئے

دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کب ہوتا ہے؟

☆ جب گوالے کی بھینس زیادہ پانی پی جائے۔

چوروں کو مور کیسے پڑتے ہیں؟

☆ جب چوری کی کار کوئی اور لے جاتا ہے۔

تارے گننے کا آسان سا طریقہ؟

☆ آنکھیں بند کر لیں۔

(حسن ابدال سے ر۔ب کا انتخاب)

ہیں۔“
اس سے پہلے کہ وہ پہلے کی طرح چلے جاتے، اسلم لپک کران کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ”حضرت! یہ سب کیا ہے؟ مجھ غریب سے کون سا امتحان لیا جارہا ہے؟ میں تو ایک عام سا آدمی ہوں۔ خدا کے لیے یہ بھید تو ظاہر کرتے جائیں۔ آپ کیوں میرا احترام کرتے ہیں؟ میں نے ایسا کون سا کارنامہ کیا ہے؟ میں تو ایک قاتل ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے؟ آپ مجھے کیوں دشواریوں میں ڈال کر چلے جاتے ہیں؟“

”امتحان دے... کامیاب ہو جا۔“ قادری بابا نے کہا۔ ”اچھے نمبر لے۔ بس اور کچھ مت پوچھ۔ جا امتحان دے۔“ قادری بابا امتحان دے کی رٹ لگاتے ہوئے تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلے گئے۔ اسلم حیران ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس دوران میں دوسرے لوگ بھی اس کے پاس آ کر کھڑے ہوئے تھے۔

روزی نے اس کے پاس آ کر کہا۔ ”اسلم بھائی! جو کچھ بھی ہوا، وہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”نہیں، تم نے تو کچھ نہیں کیا ہے۔“ اسلم دھیرے سے بولا۔ ”اگر مجھے امتحان ہی دینا ہے تو شاید اس قسم کے مرحلے آتے رہیں گے۔ اب وہ کیا ہوں گے، یہ میں نہیں جانتا۔“

اسلم کی بیوی نے آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ قافلہ پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اظفر نے سینڈی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

اس نے بہانہ کر دیا کہ اپارٹمنٹس کے گیٹ پر ہی اسے کوئی کام یاد آ گیا تھا۔ اسی لیے وہ کچھ دیر کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔ سینڈی نے بھی اس کی بات پر یقین کر لیا۔

اظفر نہیں چاہتا تھا کہ وہ سینڈی کو یہ بتا کر خوف زدہ کر دے کہ کچھ لوگ اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس طرح سینڈی کی نگاہوں میں مسلمانوں کا امیج خراب ہو کر رہ جاتا۔

سینڈی پر اس نے مذہب کے سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ کوئی ضد نہیں کی تھی کہ اسے مسلمان ہی ہونا ہے۔ اس نے سینڈی سے کہا۔ ”سینڈی! تم ایک پڑھی لکھی اور شعور رکھنے والی لڑکی ہو۔ تمہارے سامنے سارے مذاہب موجود ہیں۔ سب کو دیکھو، سب کا مطالعہ کرو۔ قرآن کا ترجمہ بھی تمہارے پاس ہے۔ تم خود اپنی عقل سے کام لو۔ اپنے شعور کو بیدار کرو۔ اس کے بعد فیصلہ کرو کہ کس مذہب پر قائم رہنا چاہتی ہو۔“

”اظفر! یہ بتاؤ کیا دنیا میں ایسی مثالیں ہیں؟“ سینڈی نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے کہ بہت کم ہوں لیکن ہمیں مثال قائم کرنی ہے۔“ اظفر نے کہا۔

سینڈی نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔

انہوں نے اپنی ایک دنیا بنالی تھی۔ ایک خوب صورت اپارٹمنٹس۔ دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہوئے۔ اظفر کو اپنے باپ ظہور کے بارے میں خبریں ملتی رہتی تھیں۔

اس کی پارٹی بہت تیزی سے کامیابی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ کچھ لوگ ابھی تک قوم اور وطن کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنائے جا رہے تھے اور لوگ بے وقوف بننے کے لیے تیار تھے۔

اسی طرح سینڈی کا باپ تھا۔ اس کی کتاب بیسٹ سیلر ہو چکی تھی۔ وہ کتاب مذاہب کے درمیان خلیج پیدا کرنے میں بہت کامیاب رہی تھی۔

اظفر نے علمی اور تحقیقی طور پر اس کتاب کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نیویارک اورینٹل لائبریری اس کے لیے کھلی ہوئی تھی۔

سینڈی اس سلسلے میں اس کی بہت مدد کر رہی تھی کہ اچانک ایک بم پھٹ پڑا۔

یہ بم ایک فلم کی صورت میں تھا۔ یہ فلم ایک ایسے شخص نے بنائی تھی جس کا کردار مشکوک رہا تھا۔ جسے مختلف جرائم میں سزائیں بھی ہو چکی تھیں۔

اس کے باوجود اس کی فلم کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ کیونکہ اس فلم میں ایک مسلمان ملک پاکستان کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہر قسم کے جرائم کا مرکز پاکستان کو قرار دیا تھا۔

اس فلم نے پورے پاکستان میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔

جگہ جگہ جلسے، جلوس، مظاہرے، امریکا کے خلاف ہنگامے، سفارت خانوں پر حملے، یہ سب پھوٹ پڑے تھے۔ سینڈی اپنی جگہ بہت شرمندہ شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

”ارے بھئی! تم کیوں شرمندہ ہو؟“ اظفر نے کہا۔ ”اس میں تمہارا تو کوئی قصور نہیں ہے نا۔“

”یہ درست ہے کہ میرا قصور نہیں ہے لیکن یہ حرکت تو میری ہی قوم کے ایک فرد نے کی ہے اور کسی ایک فرد کے گناہ کا عذاب کبھی کبھی پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔“

”سینڈی! یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ اظفر نے کہا۔ ”لیکن ہمارے ملک پاکستان میں بہت برا حال ہو رہا ہے۔ اس چکر میں بہت لوگ مارے جا رہے ہیں۔ بہت توڑ پھوڑ ہو رہی ہے اور میں نے فوری طور پر پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”لیکن تم کیوں جاؤ گے؟“ سینڈی نے پوچھا۔ ”تم وہاں کیا کر سکتے ہو؟“

”کم از کم اپنے باپ کے سامنے تو کھڑا ہو سکتا ہوں نا۔“ اظفر نے کہا۔ ”کیونکہ ان ہنگاموں میں میرے باپ کی پارٹی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔“

☆☆☆

ظہور، روزی کا جواب سن کر تلملا کر رہ گیا تھا۔

اس نے روزی اور اس کے باپ کو بلا کر ان سے کہا تھا۔ ”دیکھو، تم لوگوں کو ایک مستقل اور مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تم میرے سائے میں آ جاؤ۔“

”سرکار! ہم تو آپ ہی کے سائے میں آ گئے ہیں۔“ پیڈرو نے کہا۔

”اس طرح نہیں، ہمیشہ کے لیے۔“ ظہور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔ اس کے بعد کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“

پیڈرو تو سناٹے میں رہ گیا تھا لیکن روزی بھڑک اٹھی تھی۔ ”واہ، کیا کہنے ہیں آپ کے۔ میرے برابر آپ کی اولادیں ہیں۔ دو دو بیویاں آپ کے گھر میں ہیں۔ اس کے باوجود آپ طاقت کی آڑ لے کر عیاشی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا بات ہے آپ کے انصاف کی۔ ہمیں آپ کی مہربانیاں نہیں چاہئیں۔“

ظہور اس وقت کچھ نہیں بول سکا تھا۔

روزی کی باتوں نے اس کے بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس گستاخ اور منہ پھٹ لڑکی کو اس جسارت کی سزا ضرور دینی تھی۔

وہ کئی دنوں تک سوچتا رہا۔

پھر اس فلم کی کہانی شروع ہو گئی۔

ایک بار پھر اس کی قسمت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹی کو اس آڑ میں مزہ چکھا سکتا تھا۔ اس نے اسی شام اپنے خاص کارکنان کے سامنے وطن کی محبت پر ایک زوردار تقریر کی اور پورے شہر میں آگ لگ گئی۔

☆☆☆

اسلم کے دروازے پر بہت زوردار دستک ہو رہی تھی۔

اس نے بوکھلا کر دروازہ کھولا تو شبراتی چاچا پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ دروازے پر موجود تھا۔ ”اسلم میاں! غضب ہو گیا... طوفان آ گیا۔“

”کیا ہوا؟“

”بہت سے لوگ عیسائیوں کے گھروں کو جلانے کے لیے جا رہے ہیں۔“

”کیوں؟“ اسلم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ جو کوئی فلم بنی ہے نا اس کے لیے۔“

”ارے تو اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور؟“ اسلم نے کہا۔ ”شبراتی چاچا! میں جا رہا ہوں بچانے کے لیے۔“

”ارے مت جانا، لوگ غصے میں پاگل ہو رہے ہیں۔“

”نہیں چاچا! اس وقت مت روکو۔ یہ میرا فرض ہے۔“

اسلم نے دوڑ لگا دی۔ اس کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ اس نے اس مجمع میں ایک شخص کو پہچان لیا تھا۔

وہ ظہور الاسلام تھا۔ ایک نام نہاد رہنما۔ جس نے اپنی ایک سیاسی جماعت بنالی تھی۔ روزی نے اس کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ روزی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن روزی کے سختی سے انکار کے بعد وہ ان لوگوں سے انتقام لینے اپنے آدمیوں کو لے کر اس بستی پر چڑھ دوڑا تھا۔

خواہش

ایک آدمی کی اپنے ایک پرانے دوست سے ملاقات ہوئی۔ اس کا دوست اب معمولی آدمی نہیں رہا تھا بلکہ وہ ایک دیوتا کا روپ دھار چکا تھا۔ آدمی نے اس سے اپنی مفلسی کا رونا رویا۔ دیوتا نے تحمل سے اس کی بپتا سنی۔ پھر سڑک کے کنارے پڑی ہوئی ایک اینٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اینٹ فی الفور سونا بن گئی۔ دیوتا نے وہ سونا اپنے دوست کو دے دیا مگر دوست مطمئن نہیں ہوا۔ دیوتا نے اسے مطمئن کرنے کے لیے سونے کا ایک بڑا سا مکان بنا کر دے دیا لیکن اس کی اب بھی تسلی نہیں ہوئی۔ دیوتا نے سوال کیا۔

”دوست تم اور کیا چاہتے ہو؟“

”تمہاری انگلی۔“ آدمی نے جواب دیا۔

(راجا اسلم حیات، بڈھے والا ضلع سرگودھا)

اسلم کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص نے ایک دکان کو آگ لگا دی۔ یہ دکان روزی کے باپ پیڈرو کی تھی جو اپنے گھر والوں کو ایک طرف سمیٹے ہوئے کھڑا تھا۔

دکان کے برابر میں وہ زمین تھی جس پر گھر بنے ہوئے تھے۔

اسلم بستی کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ”رک جاؤ تم لوگ.... رک جاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ ہمارے نبیؐ نے یہ سب نہیں بتایا ہے۔ خدا کے لیے یہ سب مت کرو۔“

”مارو اس کو۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔ ”اس نے لڑکی کے چکر میں اپنا مذہب بدل لیا ہے۔“

”نہیں، میں نے اپنا مذہب نہیں بدلا۔“ اسلم چلایا۔ ”بلکہ تم لوگوں نے مذہب بدلا ہے۔ اسلام تو امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ یہ تم لوگ کون سا مذہب لے کر آ گئے ہو؟ خدا کے لیے اس نبیؐ کو ناراض مت کرو جس نبیؐ کے نام پر تم سب یہ کرنے جا رہے ہو۔“

مجمع کے درمیان سے ظہور نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ ”ہٹ جا ملعون۔ مسلمانوں کو اپنے جذبات کے اظہار سے مت روک۔“

”یہ جذبات کا اظہار نہیں ہے۔ یہ درندگی کا اظہار ہے۔“

ایک طرف سے ایک بڑا سا پتھر اسلم کے سر کو لہولہان کر گیا۔ وہ تیورا کر ایک طرف گر پڑا۔

☆☆☆

اظفر اور سینڈی ائرپورٹ سے جب گھر پہنچے تو اظفر کو معلوم ہوا کہ اس کا باپ ایک جلوس لے کر فلاں محلے کی طرف جا چکا ہے۔

اس نے خود تنہا ہی جانا چاہا لیکن سینڈی ضد کر کے اس کے ساتھ ہو لی۔ ”دیکھوں تو سہی کہ یہ قوم اپنے احمقانہ جذبے میں کس حد تک جا سکتی ہے۔ ویسے راستے میں تو بہت کچھ دیکھتی آ رہی ہوں۔“

وہ دونوں اسی وقت اس طرف روانہ ہو گئے۔

ظہور کا ایک خاص آدمی ان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے راستے میں مختصراً اظفر کو اسلم، روزی، قادری بابا وغیرہ کی ساری کہانی سنا دی تھی۔

اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ظہور صاحب نے روزی کے سامنے کیا شرط رکھی تھی۔

سینڈی کے سامنے یہ باتیں سنتے ہوئے اظفر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

جب ان کی گاڑی وہاں پہنچی تو کئی گھروں اور دکانوں میں آگ لگ چکی تھی۔ اس نے اپنے باپ ظہور کو دیکھا جو بڑے جارحانہ انداز میں گرجا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اور اچانک ہی کچھ ہوا۔

کسی طرف سے ایک گولی چلی اور ظہور چیخ کر ایک طرف جا گرا۔

اس کے ساتھ ہی بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا منہ جدھر ہوا، اس نے اسی طرف دوڑ لگا دی۔ اظفر، سینڈی اور ظہور کے آدمی ایک طرف سمٹ کر کھڑے ہو گئے۔

کچھ دیر میں وہاں سناٹا تھا۔ سوائے دو لاشوں کے۔ ایک ظہور کی لاش اور دوسری لاش اسلم کی تھی۔ اظفر اپنے باپ کی لاش کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ ان کے بجائے ایک بے حسی سی تھی۔

ایک لڑکی ان دونوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت بری طرح رو رہی تھی۔

”یہ لاش کس کی ہے؟“ اظفر نے اسلم کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

”اسلم کی۔ اس نے ہمارے گھروں کو بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی۔“

”گھروں کو بچاتے ہوئے؟“ سینڈی نے پوچھا۔

”ہاں، یہ بہت بڑا آدمی تھا۔ ایک سچا مسلمان۔“ روزی نے کہا۔

”اظفر! کیا مسلمان ایسے بھی ہو سکتے ہیں؟“

”ہاں۔“ اظفر نے گہری سانس لی۔ ”ہم پہلے ایسے ہی تھے۔ پھر جہالت نے ہمیں اندھا اور بہرہ بنا دیا۔“

”اظفر! اگر مسلمان ایسے ہوتے ہیں تو پھر مجھے یہ کہنے دو کہ میں اسلام قبول کر رہی ہوں۔“

اظفر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اسی وقت ایک طرف سے ایک پرجلال قسم کا ملنگ نمودار ہوا۔ اس نے اسلم کی لاش کے پاس آ کر عقیدت سے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”بس یہی تیرا آخری امتحان تھا۔ تو کامیاب ہو گیا ہے۔ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا ہے۔“

اس نے پھر سینڈی کی طرف دیکھا۔ اس کے شانے پر تھپکی دی اور ہوحق کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اب پولیس موبائل کے سائرن سنائی دے رہے تھے اور آس پاس آگ جل رہی تھی۔

اجلے لباس کو داغ سے بچانے کی خاطر کیچڑ سے کترا کر نکلنے والے جب دولت کی دلدل میں دوسروں کو اترتا دیکھتے ہیں تو خود بھی اس میں گلے گلے تک دھنس جانا چاہتے ہیں مگر اس میں اترنا آسان اور نہ نکلنا سہل مگر حضرتِ انسان کی اس میں دھنسنے کی خواہش کا کوئی انت نہیں... اکثر زر کی دلدل میں اترنے کو بے تاب رہتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں کہ جنہیں زر کی یخ بستگی کے بجائے اپنوں کی محبت سے جنم لینے والی حرارت ہی زندگی کا احساس بخشتی ہے... زر کی پرستش سے زندگی کا دائرہ محدود اور محبت کی تپش سے مختصر زندگی بھی پُرمسرت اور صدیوں سے طویل محسوس ہوتی ہے۔ دولت کے پجاری اور محبت کو عبادت سمجھنے والے ہمارے معاشرے کے دو پہلو... وہ محبت اور چاہت کا متلاشی تھا اور یہ دولت اسے میسر بھی تھی لیکن دوسرا اُس کی صورت اپنی ہوسِ زر کی تشنگی مزید مٹانے کا خواہشمند تھا... اور پھر زندگی نے رخ بدلا... محبت اور دولت کی کشمکش میں دونوں جانب جذبے تھے، دونوں ہی اپنے اپنے جذبوں کے امین اور اس کی صداقت پر یقین تھے لیکن جیت تو کسی ایک کے مقدر میں ہوتی ہے۔

ہوسِ زر، جرم و گناہ اور آزمائشوں کا لامتناہی سلسلہ... عیاری اور سچائی کی ازلی رسا کشی...

کاشف زبیر

زاہد احمد عباسی بہت مصروف تھا۔ اسے کچھ ضروری فائلیں آج ہی دیکھنی تھیں... پھر اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ شام سات بجے اسے گھر پہنچنا تھا کیونکہ آج نہ صرف اس کی شادی کی پچیسویں سالگرہ تھی بلکہ اس کی بیٹی کی بیسویں سالگرہ بھی تھی۔ رومانہ سے زاہد کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑا اصمد اس کے ساتھ ہی دفتر میں ہوتا تھا۔ اس نے حال ہی میں ایم بی اے کیا تھا۔ اس سے چھوٹی ہما کی شادی کر دی تھی، وہ اپنے شوہر کے ساتھ دبئی میں ہوتی تھی۔ دوسرا بیٹا اسد ابھی زیرِ تعلیم تھا اور شیما بھی پڑھ رہی تھی۔ زاہد احمد عباسی بزنس مین تھا۔ تیس سال پہلے وہ کراچی آیا.... تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ صرف بیس سال کا تھا اور ابھی پڑھ رہا تھا۔ اسی دوران میں اسے ایک اسٹاک بروکر فرم میں ملازمت مل گئی۔ یہاں اسے تنخواہ تو بس اتنی ملتی تھی کہ وہ بہ مشکل اپنا گزارہ کر پاتا تھا لیکن یہاں سے اس نے جو بیش بہا تجربہ حاصل کیا، اس تجربے نے اصل میں بزنس مین زاہد احمد عباسی کو جنم دیا۔

دفتر میں وہ اپنے کان کھلے..... اور زبان بند رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے دفتر میں ایسا امیج بنا لیا کہ جیسے وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہو لیکن

درحقیقت وہ سب پر نظر اور کان کھلے رکھتا تھا۔ وہ جو دیکھتا یا سنتا، اسے لکھ لیتا۔ اس نے کئی رجسٹر اسی طرح بھر لیے تھے۔ ملازمت سے آنے کے بعد وہ انہیں بار بار پڑھتا اور معلومات کا آپس میں موازنہ کرتا۔ اسٹاک کا کام آسان نہیں ہوتا لیکن جو سمجھ جاتا ہے اور اس کھیل کے بڑوں کا مزاج آشنا ہو جاتا ہے، اس کے لیے یہ کھیل آسان ہو جاتا ہے۔ زاہد نے گریجویشن کیا اور ملازمت کے دوسرے سال میں اس نے اپنا پہلا چانس لیا۔ اس نے ایک کیمیکل کمپنی کے شیئرز خرید لیے۔ شیئرز کی قیمت ان دنوں بہت زیادہ گری ہوئی تھی۔ یہ اصل قیمت کے دسویں حصے پر دستیاب تھے۔ ایک مہینے کے اندر یہ کمپنی ایک بڑی پارٹی نے خرید لی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شیئرز اصل سے دوگنا ہو گئے۔ زاہد نے صرف پانچ ہزار لگائے تھے اور اسے لاکھ روپے ملے تھے۔ آج سے تیس سال پہلے اس رقم میں ایک متوسط گھرانا بہت اچھی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے بعد زاہد نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

دو سال بعد اس نے اپنی فرم قائم کی۔ پھر اس نے متعدد کاموں میں ہاتھ ڈالا مگر اس کا اصل کام اسٹاک کا رہا۔ آنے والے سالوں میں وہ اس میدان کا بڑا کھلاڑی تو نہیں بن سکا مگر وہ ان مچھلیوں کی طرح ہو گیا تھا جو بڑی مچھلیوں کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور وہ جو شکار کرتی ہیں، ان میں اپنا حصہ بناتی ہیں۔ زاہد احمد ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا تھا کیونکہ اسٹاک جس طرح اوپر جاتے ہیں اسی طرح منہ کے بل نیچے بھی گر جاتے ہیں اور ترقی پذیر ممالک کی اسٹاک مارکیٹس ویسے ہی ناقابلِ بھروسا ہوتی ہیں۔ زاہد دوسروں کی رقم اسٹاک میں لگاتا تھا اور نفع میں اس کا حصہ ہوتا تھا جبکہ نقصان ہمیشہ شیئرز کے مالکوں کے حصے میں آتا تھا۔ اس نے دوسرے کاروبار بھی کیے مگر ان میں وہ نفع نہیں تھا جو اس کام میں تھا۔ دو تین سال بعد ایسا جیک پاٹ ہاتھ لگتا تھا کہ آنے والے سالوں کے بھی وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ دوسرے بزنس دھیمے انداز میں چلتے تھے اور مستقل منافع دیتے تھے۔

زاہد احمد کا تعلق راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے نواحی قصبے سے تھا۔ یہ قصبہ کسی زمانے میں واہ آرڈی نینس فیکٹری کے قریب گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا مگر آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ اب کینٹ کی حدود میں آ گیا تھا اور یہاں تمام سہولیات بھی آ گئی تھیں۔ زاہد احمد کا خاندان آج بھی یہیں آباد تھا مگر اس کے اپنے بھائیوں اور دوسرے رشتے داروں سے واجبی سے تعلقات تھے۔ کئی سالوں بعد جا کر اس کا وہاں چکر لگتا تھا اور اس کی بیوی بچے سرے سے نہیں جاتے تھے۔ اس کی بیوی کا تعلق کراچی سے تھا اور اسے سسرال والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر زاہد نے کبھی اس کا شکوہ بھی نہیں کیا کیونکہ اسے خود اپنے گھر والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ماں باپ اس کے کراچی آنے کے چند سال بعد ایک ایک کر کے گزر گئے تھے۔ اس کے بعد اس کی خاندان سے رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی..... اس کے بھائی حسن ابدال میں آٹو پارٹس اور الیکٹرانکس کی دکانیں چلاتے تھے۔

زاہد احمد دفتری کام نمٹا کر میٹنگ روم میں آیا جہاں ڈائریکٹرز اس کے منتظر تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ معاملات سنگینی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سارے ڈائریکٹرز اس کی اسٹاک بروکر کمپنی سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر خود سرمایہ کار تھے اور شیئرز میں ان کا کروڑوں روپیا لگا ہوا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی ڈائریکٹرز نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی.... ان سوالات کا مرکز گزشتہ دنوں ہونے والا مارکیٹ کریش تھا جس میں فرم کی بہت بڑی سرمایہ کاری ڈوب گئی تھی۔ اس سرمائے کی مالیت اربوں میں تھی۔

ایک ڈائریکٹر نے زاہد احمد سے پوچھا۔ ”ہم نے ان اسٹاکس میں سرمایہ کیوں لگایا جنہیں ڈوبنا تھا؟“

دوسرے نے سوال کیا۔ ”اس رقم کی ری کوری کیسے ہو گی؟“

ایک ڈائریکٹر کو فکر تھی کہ اپنے لوگوں کو کیا منہ دکھائے گا۔ زاہد سکون سے سب کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہو گئے پھر اس نے کہا۔ ”شیئر مارکیٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آج نفع ہے تو کل نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح آج نقصان ہے تو کل نفع بھی ہو سکتا ہے۔“

”جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔“ ایک ڈائریکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”جو ہوا ہے، وہ دھوکا اور فراڈ ہے۔“

”جنٹل مین... جنٹل مین۔“ زاہد نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔ ”آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔“

”کمپنی اس طرح نہیں چل سکتی۔“ ایک ڈائریکٹر نے تقریباً چلا کر کہا۔ ”ہم دوسرا چیئرمین لائیں گے۔“

”اوہ... تو یہ بات ہے۔“ زاہد کا لہجہ سرد ہو گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”اگر آپ لوگ چیئرمین تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں، میں ابھی استعفا دیتا ہوں۔“

مگر زاہد کا استعفا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ان ڈائریکٹرز نے بہت بڑے پیمانے پر بلیک منی شیئرز میں لگا کر وائٹ کی تھی اور اب انہیں ان لوگوں کو جواب دینا تھا جن کی یہ بلیک منی تھی۔ وہ شریف لوگ نہیں تھے۔ کالی کمائی والے شریف کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ اپنی رقم نکلوانا جانتے تھے۔ ان کا اصول تھا جو رقم نہ دے، اس کی جان لے لو۔ سرمایہ کاری کمپنی پالیسی کے تحت کی گئی تھی اور پالیسی زاہد بناتا تھا۔ فرم کے ڈائریکٹرز بس نام نہاد حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں اسٹاک بزنس کا اتنا علم نہیں تھا۔ سرمایہ کاری کئی ارب روپے کی تھی اور نقصان بھی تقریباً اتنا ہی تھا۔ زاہد نے براہِ راست خود کچھ نہیں کیا تھا، بس گائیڈ لائن دی تھی مگر کاغذات کی حد تک اس کے ہاتھ صاف تھے۔ جب وہ میٹنگ روم سے جا رہا تھا تو ڈائریکٹرز بے بسی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اگر زاہد فرم کی چیئرمین شپ سے دست بردار ہو جاتا، تب بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کی ذاتی سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کے شیئرز بھی بہت اچھی کمپنیوں کے تھے۔ یہ اس کے ذاتی قبضے میں تھے اور وہ جب چاہتا، ان کو کیش کرا سکتا تھا۔

جب تک زاہد میٹنگ روم سے باہر نہیں آیا، تب تک اس کے چہرے پر خشونت تھی لیکن باہر آتے ہی وہ مسکرانے لگا۔ ایسا لگا جیسے وہ اندر سے مسکرا رہا تھا مگر باہر اس نے خود پر خول چڑھا رکھا تھا۔ وہ لفٹ تک آیا۔ لفٹ بوائے نے اسے سلام کیا۔ نیچے آتے ہوئے زاہد نے اسے سو روپے ٹپ دی تو وہ خوش ہو گیا۔ زاہد نے پالیسی بنائی ہوئی تھی، وہ نچلے درجے کے ملازموں کو خوش رکھتا تھا۔ یہ ملازم اس کے کان اور آنکھ بن جاتے تھے اور بہت سی باتیں اس کے علم میں آ جاتیں جو بعد میں اس کے لیے مفید ثابت ہوتی تھیں۔ شہر کے مصروف ترین کاروباری مرکز میں اس بڑی عمارت کے دو مکمل فلور زاہد... کے پاس تھے۔ یہاں اس کی تمام کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ ان میں اسٹاک فرم بھی شامل تھی۔ اس نے لابی میں داخل ہوتے ہوئے اپنے چیف اکاؤنٹنٹ کو کال کی۔

”اعجاز صاحب... اسٹاک فرم کا رینٹ اور بلز اب ہماری ذمے داری نہیں ہیں۔ آپ میری بات سمجھ گئے ہیں؟“

”بالکل سر! میں سمجھ گیا ہوں۔“ اعجاز شاہ نے مستعدی سے کہا۔ وہ زاہد کے ساتھ بیس برس سے تھا اور اس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

☆☆☆

رضوان کمال فکرمند تھا۔ آج اس نے انٹرنیٹ سے اپنا اکاؤنٹ چیک کیا تو اسے پتا چلا کہ اس میں اب ایک لاکھ روپے کی رقم ہے۔ گزشتہ دن تک اس کے اکاؤنٹ میں

موجود رقم ساڑھے تین کروڑ روپے تھی۔ اس کی فکرمندی کا تعلق رقم کی گمشدگی سے نہیں تھا۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کبھی اس کے بینک اکاؤنٹ میں کروڑوں روپے ہوتے تھے اور کبھی چند لاکھ رہ جاتے۔ یہ ایک غیر ملکی بینک کا خصوصی اکاؤنٹ تھا۔ اس سے فارن کرنسی بھی ڈیل کی جاتی تھی اور اس اکاؤنٹ کے تحت کچھ ایسی سہولیات بھی میسر تھیں جو عام طور سے بینک کے اصول و قواعد میں نہیں آتی تھیں۔ یہ سہولیات بینک اپنے خاص گاہکوں کو فراہم کرتے ہیں اور زاہد بہت خاص آدمی تھا۔ رضوان کا یہ اکاؤنٹ چھ مہینے پہلے اس وقت کھولا گیا جب رضوان، زاہد انٹرپرائز میں آیا تھا۔

رضوان کا تعلق اسی قصبے سے تھا جہاں زاہد رہتا تھا بلکہ محلہ بھی ایک ہی تھا۔ رضوان کا دادا زاہد احمد کے باپ مجید احمد کا دوست تھا۔ چوبیس سالہ رضوان نے دو سال پہلے ایم کام کیا تھا اور ان دنوں ایک فرم میں جاب کر رہا تھا، جب اتفاق سے اس کی ملاقات زاہد سے ہوئی۔ وہ رضوان کے باپ کی موت کا افسوس کرنے آیا تھا۔ یہ زاہد... کی عادت تھی کہ برسوں بعد بھی آتا تو جن واقف کار گھروں میں فوتگی ہوتی تھی، وہاں تعزیت کے لیے ضرور جاتا تھا۔ رضوان نے زاہد کو بس چند ایک بار دیکھا تھا اور اس کے بارے میں اتنا معلوم تھا کہ وہ کراچی جا کر ایک بڑا بزنس مین بن گیا ہے۔ اس کے بھائی اس سے ناخوش تھے کیونکہ اس نے دولت مند ہو جانے کے بعد ان کو پوچھا بھی نہیں تھا۔ وہ متوسط درجے کے کاروباری تھے۔

مختصر ملاقات میں زاہد مشکل سے دس پندرہ منٹ رکا اور اس دوران میں اس نے رضوان سے اس کے کیریئر کے بارے میں پوچھا۔ رضوان پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹے دو بھائی تھے اور آخر میں دو بہنیں تھیں۔ کمال شفقت واہ فیکٹری میں کام کرتا تھا اور اسے گردے کا مرض تھا۔ کئی سال سے گردے ناکارہ تھے اور ڈائیلاسس پر گزارہ تھا مگر خرابی اتنی بڑھی کہ اس کا وقت آ گیا۔ گردے کی تبدیلی اس کا واحد علاج تھا اور اسے گردہ میسر نہیں تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ بیوی بچوں میں سے کسی کا گردہ اسے میچ نہیں ہوا۔ اب گھر کی ذمے داری رضوان پر تھی۔ وہ پنڈی کی ایک کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ روز ایک گھنٹے کا سفر کر کے جاتا اور آنے میں اس سے زیادہ وقت لگتا تھا۔ تنخواہ مناسب تھی، بہت زیادہ یا کم نہیں تھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی اور جگہ اسے بہتر تنخواہ پر جاب مل جائے تاکہ وہ اپنے

گھر والوں کو بہتر سپورٹ کر سکے۔ اس سے چھوٹا عدنان گریجویشن کے بعد جاب کر رہا تھا اور ساتھ ہی ایوننگ میں ایم بی اے بھی کر رہا تھا۔ اس کی تنخواہ کا زیادہ حصہ فیسوں میں چلا جاتا تھا۔ وہ گھر میں کچھ نہیں دے پاتا تھا۔ اس سے چھوٹا کامران ابھی کالج میں تھا۔ سینا کالج کے پہلے سال میں تھی اور آئینہ نویں میں تھی۔ کمال کو سرکاری گھر ملا ہوا تھا مگر اسے کرائے پر دے کر وہ خود آبائی قصبے میں رہ رہے تھے۔ ایک تو یہاں شہری سہولیات آگئی تھیں اور پھر سرکاری گھر کا کرایہ بہت اچھا آتا تھا کیونکہ وہ کینٹ کے پوش علاقے میں تھا۔

وہ لوگ قناعت پسند تھے اس لیے گزارہ ہو رہا تھا اس کے باوجود رضوان میں آگے بڑھنے اور اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کرنے کی لگن تھی۔ اس جدوجہد کے پیچھے اس کی خالہ کی بیٹی نادیہ بھی تھی۔ نادیہ ان دنوں میٹرک میں تھی اور رضوان سے پورے آٹھ سال چھوٹی تھی مگر دونوں بہنوں نے بچپن میں ان کی نسبت طے کر دی تھی۔ نادیہ اکلوتی تھی اور ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ رضوان چاہتا تھا کہ جب وہ اسے بیاہ کر لائے تو نادیہ کو کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہ ہو۔ اس لیے وہ ابھی سے کوشش کر رہا تھا۔ پنڈی اور اسلام آباد چھوٹے شہر ہیں اور یہاں ملازمتوں کے مواقع سرکاری سطح پر تو ہیں لیکن نجی ملازمتیں کم ہیں اس لیے یہاں کے پڑھے لکھے لوگ کراچی، لاہور اور فیصل آباد کا رخ کرتے ہیں جہاں ملازمتوں کے مواقع زیادہ ہیں۔ رضوان بھی سوچ رہا تھا کہ وہ لاہور اور فیصل آباد میں کوشش کرے۔ کراچی کا خیال اسے یوں نہیں آیا کہ کراچی دور تھا اور دوسرے وہاں کے حالات بھی آئے دن خراب رہتے تھے۔

رضوان جانتا تھا کہ مواقع کراچی میں زیادہ ہیں مگر اس نے وہاں نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ البتہ تقدیر نے اس کے لیے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا۔ زاہد کو واپس گئے ہوئے ایک مہینا ہونے کو آیا تھا کہ رضوان کو اس کی کال آئی۔ رضوان حیران ہوا کیونکہ زاہد نے اس کا نمبر نہیں لیا تھا۔ دوسری حیرت یہ تھی کہ زاہد نے اسے کیوں کال کی تھی۔ رسمی سلام دعا کے بعد زاہد مطلب کی بات پر آگیا۔ اس نے وضاحت کی کہ اس نے یہ نمبر کسی اور سے حاصل کیا تھا۔ پھر اس نے اپنا ارادہ بیان کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ رضوان اس کے پاس جاب کرے۔ اس بار رضوان زیادہ حیران ہوا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے یوں کسی کمپنی کا مالک خود کال کر کے جاب آفر کرے گا۔ زاہد نے کہا۔ ”تم سوچ لو، میرے پاس اکاؤنٹس میں ایک جگہ خالی ہے اور مجھے کسی قابلِ بھروسا آدمی کی ضرورت ہے۔ تمہاری فیملی سے میں واقف ہوں۔“

رضوان نے انکار نہیں کیا لیکن اپنی مجبوریاں بتائیں۔

”میں اتنی جلدی جاب نہیں چھوڑ سکتا اور پھر اپنی امی سے بھی پوچھنا ہوگا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس دو مہینے کا وقت ہے۔ تم نوٹس دے کر جاب چھوڑو اور اپنے گھر والوں سے مشورہ کرلو۔ مگر ہاں یا نہ مجھے ایک ہفتے کے اندر کر دو تا کہ میں کوئی دوسرا آدمی دیکھ سکوں۔“

”میں آپ کو ایک ہفتے میں جواب دیتا ہوں۔“ رضوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے یہ پیشکش اچھی لگ رہی تھی کیونکہ مالک اسے براہِ راست آفر کر رہا تھا۔

”گڈ... تم یہاں جتنی تنخواہ لے رہے ہو اس سے چالیس فیصد اضافے پر تمہاری شروعات ہوگی اور تین مہینے کے ٹرائل پیریڈ کے بعد مزید اضافہ کیا جائے گا۔“

اب رضوان مزید دلچسپی لینے پر مجبور ہوا لیکن وہ پہلے ماں سے پوچھنا چاہتا تھا۔ وہی اس کی بڑی اور گھر کی سربراہ تھیں۔ فاطمہ شوہر کے بعد بچوں کو سنبھال رہی تھیں۔ انہوں نے گھر میں ایک ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ لڑکے اور لڑکیاں باپ سر پر نہ ہونے کے باوجود غلط راہوں کی طرف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ آج کے دور میں بھی ان کے گھر پی ٹی وی دیکھا جاتا تھا۔ وہ کیبل سے ناواقف تھے۔ گھر میں صرف دو افراد کے پاس موبائل تھا اور یہ دونوں کمانے والے فرد تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں فکسڈ فون لگا ہوا تھا۔ لڑکیوں کو مغرب کے بعد اور لڑکوں کو عشا کے بعد گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں، رضوان اور عدنان کی جاب اور انسٹی ٹیوٹ کی وجہ سے دیر ہو جاتی تو الگ بات تھی۔ فاطمہ اس کے علاوہ بھی اولاد پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ ماں کے محتاط رویے کی وجہ سے رضوان کا خیال تھا کہ اسے مشکل سے اجازت ملے گی مگر جب اس نے ماں سے بات کی تو انہوں نے پوچھا۔

”تمہیں کیسی لگ رہی ہے یہ آفر؟“

”اچھی لگ رہی ہے امی... اسٹارٹنگ میں اٹھائیس ہزار ملیں گے اور تین مہینے بعد تنخواہ مزید بڑھ جائے گی۔“

”لیکن بڑے شہر میں رہو گے تو اخراجات بھی زیادہ ہوں گے۔“

”میں یہاں جو آنے جانے کا خرچ کرتا ہوں، اس کی بچت ہو جائے گی۔“ رضوان نے کہا۔ اس کے آنے جانے میں تقریباً دو ہزار روپے کرائے میں لگ جاتے تھے۔ ”پھر امی... کراچی بڑا شہر ہے، وہاں مواقع زیادہ ہوں گے۔“

فاطمہ نے رضوان کو اجازت دے دی۔ ایک ہفتے بعد اس نے کال کر کے زاہد احمد کو ہاں کر دی۔ زاہد خوش ہوا اس نے اسی وقت رضوان کو خوش خبری سنائی کہ اسے رہائش کا مسئلہ نہیں ہوگا۔ زاہد کا ایک واقف کار ملازمت پیشہ افراد کے لیے ہاسٹل چلاتا تھا۔ اس کے اخراجات بھی زاہد... ادا کرتا۔ رضوان کے لیے یہ بڑی خوش خبری تھی کیونکہ اس کا اندازہ تھا کہ مہینے میں کم سے کم چھ سات ہزار اس کے ایسے ہی خرچ ہو جائیں گے اور اسے تنخواہ میں اضافے کا حقیقی فائدہ نہیں ہو گا۔ مگر اب وہ بچت کر سکتا تھا اور گھر میں بھی پہلے سے زیادہ رقم دے سکتا تھا۔ اس نے اپنی کمپنی کو جاب چھوڑنے کا نوٹس دیا اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جانے سے پہلے اس نے کچھ ضروری کام نمٹائے اور دو مہینے بعد وہ کراچی میں تھا۔

☆☆☆

”ہیلو... کیا ہو رہا ہے؟“ ایمن نے اس کے کیبن میں جھانکا۔

”کام۔“ رضوان نے جواب دیا۔

”مجھے ڈراپ کر دو گے؟“ وہ اندر آگئی اور اس کے پاس... کیبنٹ سے ٹک گئی۔ اس چھوٹے سے کیبن میں صرف ایک میز تھی جس پر جدید ترین ایل سی ڈی مانیٹر، کی بورڈ اور ماؤس کے ساتھ کچھ سامان رکھا تھا۔ دائیں اور عقب میں تین فٹ اونچے کیبنٹس تھے جن میں فائلیں اور دوسرا سامان موجود تھا۔ یہ سب رضوان کی تحویل میں رہتا تھا اور وہی اس کا ذمے دار تھا۔ ایمن عقب والے کیبنٹ پر ٹکی ہوئی تھی۔ وہ رضوان کے بہت قریب تھی۔ اتنی قریب کہ اس کی بدن سے اٹھتی مسحور مہک رضوان کو ڈسٹرب کرنے لگی۔

”کیوں نہیں لیکن کچھ کام نمٹا لوں۔“ رضوان نے اشارہ کیا۔ ”کیا آج گاڑی نہیں آئی؟“

”نہیں آئی تبھی تو تمہاری منتیں کر رہی ہوں۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”منتیں کیوں جبکہ میں پہلے مان چکا ہوں۔“

ایمن کسی قدر چھوٹے قد اور متناسب جسامت کی شوخ سی لڑکی تھی۔ جسم گداز تھا۔ سرمئی بلوری آنکھیں اور اسی رنگ کے ریشمی بال اسے زیادہ جاذبِ نظر بناتے تھے۔ نقوش مجموعی طور پر بہت دلکش تھے۔ اس نے ڈھلکتے ریشم جیسے کپڑے کا لباس پہن رکھا تھا جو اس پر جچ رہا تھا۔ ایمن صدیقی ایڈمن کے شعبے میں تھی۔ اس کا تعلق ایک اوپری متوسط گھرانے سے تھا اور صرف وقت گزاری کے لیے جاب کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ ایم بی اے کر چکی تھی اور وہ بھی فنانس جیسے مشکل شعبے میں۔ رضوان کو کراچی آئے یہ تیسرا مہینا تھا۔ وہ اکاؤنٹ اسسٹنٹ کے طور پر آیا تھا مگر اب وہ براہِ راست زاہد احمد کے ماتحت تھا۔

ہاسٹل طارق روڈ کے علاقے میں تھا اور دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر تھا۔ اسے دفتر آنے جانے میں آدھا گھنٹا لگتا تھا۔ شروع میں ٹریفک جام کی وجہ سے بہت مشکل پیش آتی تھی۔ جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ بائیک کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اس نے دوسرے مہینے بائیک لے لی۔ ایمن کے سی ایچ ایس میں رہتی تھی اور یہ جگہ رضوان کے ہاسٹل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بس تھوڑا سا آؤٹ آف وے جانا پڑتا تھا۔ ایمن بھی براہِ راست زاہد احمد کے ماتحت تھی اور اس کے برابر والے کیبن میں بیٹھتی تھی... کیونکہ اس نے فنانس میں ایم بی اے کیا تھا، اس لیے بعض حسابات اس کے ذمے تھے اور اسٹاک اور فارن ایکسچینج سے متعلق کچھ آن لائن کام تھا۔ یہ سب کانفیڈنشل تھا۔ دوسرے مہینے سے زاہد.... نے اسے اپنے پاس بلا لیا تھا اور اب وہ کسی اور کو جواب دہ نہیں تھا۔ زاہد نے اسے بتایا تھا کہ اب وہ جو اکاؤنٹس دیکھے گا، وہ صرف اسی تک محدود رہنے چاہئیں۔ کسی تیسرے تک ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ پہنچے۔

جاب ہونے کے چند مہینے بعد رضوان، زاہد احمد کی ہدایت پر اس غیر ملکی بینک پہنچا جہاں اس کا اکاؤنٹ کھولا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جب اس کا کمپنی اکاؤنٹ ایک بینک میں پہلے ہی موجود تھا تو یہ اکاؤنٹ کیوں کھلوایا گیا اور خاص بات یہ تھی کہ یہ مکمل طور پر ڈیبٹ کارڈ، کریڈٹ کارڈ اور ایس ایم ایس اور انٹرنیٹ بینکنگ سے استعمال ہونے والا اکاؤنٹ تھا۔ اس کی چیک بک ایشو نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف اکاؤنٹ اس کے نام پر تھا۔ اس کا ای میل، فون نمبر اور ڈیبٹ کارڈ سب زاہد احمد کے قبضے میں تھا۔ زیادہ سے زیادہ رضوان انٹرنیٹ سے بیلنس چیک کر سکتا تھا۔ کسی قسم کی ادائیگی یا رقم کی منتقلی کے لیے دو کوڈز ای میل اور موبائل پر آتے تھے اور وہ دونوں زاہد کے پاس تھے۔ رضوان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے نام سے ایسا اکاؤنٹ کیوں کھولا گیا ہے اور اگلے دن یہ دیکھ کر اس کی عقل خبط ہو گئی کہ اس اکاؤنٹ میں کھولنے کے چند گھنٹے بعد ہی ساڑھے چار کروڑ روپے کی رقم کے مساوی ڈالرز جمع کرائے گئے تھے۔ اگلے دن وہ دفتر آتے ہی سب سے پہلے زاہد احمد کے پاس آیا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"سر! میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟"

"اپنے اکاؤنٹ کے بارے میں؟" زاہد احمد نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"جی سر! اس میں ساڑھے چار کروڑ کے مساوی رقم ہے۔"

زاہد.... نے اپنی عینک اتارتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ "اگر ہے تو تمہیں اس میں پریشانی کیوں ہے؟"

رضوان نے ہمت کر کے کہا۔ "کیونکہ اکاؤنٹ آپ نے میرے نام سے کھولا ہے سر جی۔"

"ڈونٹ وری... یہ کچھ ٹیکس کے معاملات ہیں اور کچھ زرِمبادلہ کی پابندیوں کا مسئلہ ہے۔ میں بزنس مین ہوں، مجھ پر ان پابندیوں کا اطلاق ہوتا ہے لیکن تم پر نہیں ہوتا۔"

"لیکن سر! اتنی بڑی رقم کا اکاؤنٹ چیک تو ہوتا... ہوگا؟"

زاہد... طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "یہ پاکستان ہے امریکا نہیں جہاں ہر اکاؤنٹ چیک ہوتا ہے۔ تم فکر مت کرو، کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور ویسے بھی تمہیں صرف چیک کرنا ہے۔ باقی کوئی مسئلہ ہوا تو میں اسے دیکھوں گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔"

"جی سر!" اس نے بے دلی سے کہا۔ وہ ابھی تک زاہد... کی بات سے متفق نہیں ہوا تھا۔ زاہد نے بھانپ لیا، اس نے کہا۔

"رضوان! یہ تمہاری جاب سے ہٹ کر کام ہے اور تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملے گا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے سر!" اس نے جلدی سے کہا۔

زاہد... نے بغیر کسی تاثر کے کہا۔ "میں تمہیں اپنے فائدے کے لیے یوز کر رہا ہوں تو تمہارا حق بھی بنتا ہے۔"

اگلے مہینے اسے تنخواہ کے علاوہ دس ہزار الگ سے ملنے لگے اور یہ رقم کسی اور طریقے سے اس کے اکاؤنٹ میں آتی تھی۔ کمپنی اکاؤنٹ سے نہیں بلکہ کوئی کیش جمع کراجاتا تھا اس کے اکاؤنٹ میں۔ اکاؤنٹ کھلنے کے تیسرے دن ایمن نے اسے گھر چھوڑنے کو کہا۔ دو بار وہ پہلے بھی اسے چھوڑنے گیا تھا۔ پہلی بار حالات خراب تھے اور گاڑیاں غائب تھیں۔ اس وقت رضوان کے پاس بائیک بھی نہیں تھی، وہ اسے رکشا کر کے چھوڑنے گیا تھا۔ ایمن نے اصرار کر کے اسے گھر میں بلایا اور اپنے پاپا اور ممی سے ملوایا۔ وہ خوش خلقی ... اور بہت مہذب انداز میں ملے تھے انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ وہ خراب حالات میں ایمن کو چھوڑنے آیا تھا۔ پھر ایک دن وین والا نہیں آیا تھا جو ایمن کو پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔ اس دن رضوان اسے بائیک پر چھوڑنے گیا۔

"اب جاؤ بھی، میں کام کر کے پیک کر لوں گا۔" رضوان نے کسی قدر نروس ہو کر کہا۔ ایمن یوں ہنسی جیسے اس کی کیفیت سے واقف ہو۔ وہ جان بوجھ کر ذرا پاس ہو کر بولی۔

"او کے میں ٹائم پاس کرتی ہوں۔"

رضوان اس کے جانے کے بعد کام کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بچہ نہیں تھا جو ایمن کا انداز نہ سمجھتا۔ ایمن دفتر میں سب سے ریزرو رہتی تھی، اس کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ باس کے ساتھ کام کرتی تھی اس لیے سب ہی حد میں رہ کر پیش آتے تھے۔ صرف رضوان سے الگ انداز میں پیش آتی تھی مگر وہ بھی تنہائی میں۔ دوسروں کے سامنے وہ رضوان سے بھی لیے دیے رہتی تھی۔ رضوان نے زاہد احمد سے بات کی تو اسے تنخواہ کے علاوہ آمدنی کی نوید بھی مل گئی۔ اس کے باوجود وہ کچھ بے چین تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس طرح کسی کے نام کا اکاؤنٹ کھول کر رقم جمع کرانے میں زاہد... کے لیے کوئی رسک نہیں ہے تو پھر رسک کس کے لیے ہے؟ کیا اس کے لیے جس کے نام اکاؤنٹ ہے؟

کام مکمل کر کے اس نے سامان سمیٹا اور تمام درازیں لاک کر کے وہ بے دھیانی میں اپنے کیبن سے نکل کر باہر جانے والے راستے پر گھوما تھا کہ عقب سے ایمن کی آواز آئی۔ "ارے... مجھے چھوڑ کر چپکے سے جا رہے ہو؟"

"سوری، بے دھیانی میں باہر کی طرف مڑ گیا۔" رضوان نے معذرت کی۔

"ایسے معافی نہیں ملے گی۔" وہ ہینڈ بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ آئی۔ باقی عملہ چھٹی کر کے جا چکا تھا، بس اکا دکا لوگ تھے دفتر میں۔

"پھر کیسے ملے گی؟"

"کسی اچھے سے ریستوران میں اچھی سی چائے اور اسنیکس پر معافی مل سکتی ہے۔"

وہ شاہراہِ فیصل کے ایک معروف ریستوران میں آئے، یہاں کی چائے مشہور تھی۔ وہ دوسرے فلور پر سڑک والی سائڈ ایک بوتھ میں آئے۔ شیشے سے گزرتا ٹریفک صاف نظر آ رہا تھا۔ رضوان نے چائے اور دیگر لوازمات آرڈر کیے۔ ایمن اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟"

"ہاں، میں پریشان ہوں۔" رضوان نے کہا۔

"وجہ... گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں۔"

"جاب میں؟"

"براہ راست تو نہیں ہے لیکن زاہد صاحب نے میرے نام سے ایک فارن بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا ہے۔ اس کی ساری ڈیل ان کے پاس ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اکاؤنٹ میرے نام ہے لیکن میں اسے استعمال نہیں کر سکتا اور اس میں بہت بڑی رقم جمع کرائی گئی ہے۔"

"کتنی بڑی رقم؟" ایمن نے پوچھا۔

"ساڑھے چار کروڑ روپے کے مساوی ڈالرز۔"

ایمن حیران ہوئی۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"اکاؤنٹ میرے نام پر ہے اور مجھے یہی فکر ہے۔ تم نے فنانس میں ایم بی اے کیا ہے، تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

ایمن نے سر ہلایا۔ "ٹیکس بچانے اور فارن ایکسچینج اپنی مرضی سے استعمال کرنے کے لیے اکثر سرمایہ کار ایسے اکاؤنٹس کھلواتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"زاہد صاحب نے مجھ پر اعتماد کیسے کیا؟"

"دیکھا جائے تو تم سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اس اکاؤنٹ سے رقم نہیں نکلوا سکتے اور نہ ٹرانسفر کر سکتے ہو، نہ ہی کوئی خریداری کر سکتے ہو۔"

"میں اکاؤنٹ ہولڈ کرا سکتا ہوں۔" رضوان نے کہا۔ "اگرچہ میں ایسا کروں گا نہیں۔"

"نہیں، تم ایسا بھی نہیں کر سکو گے کیونکہ یہ اکاؤنٹ بینک والوں کی ملی بھگت سے کھلا ہے۔ بڑے لوگوں کے لیے ساری دنیا کے بینک کچھ خصوصی اکاؤنٹس بناتے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس کا صرف ایک طریقہ ہے کہ تم عدالت میں چلے جاؤ مگر تمہیں ثابت کرنا پڑے گا کہ تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی۔ دوسرے اس اکاؤنٹ سے فارن ایکسچینج باہر جا رہا ہے اس لیے تم خود پھنس جاؤ گے۔"

"یعنی یہ ٹیکس بچانے اور فارن ایکسچینج لاز سے ہٹ کر باہر بھیجنے کا معاملہ ہے۔" رضوان نے سوچ کر کہا۔ "اگر بعد میں کبھی انکوائری ہوئی تو میں پکڑا جاؤں گا۔"

ایمن کسی قدر فکر مند ہوئی پھر اس نے سر جھٹکا۔ "ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں ہے۔ بڑے لوگوں کے خلاف اول تو کوئی کارروائی نہیں ہوتی اور ہو بھی تو دبا دی جاتی ہے۔"

"میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔"

"لیکن زاہد صاحب بڑے آدمی ہیں۔ تم فکر مت کرو، وہ تم پر اور خود پر کوئی آنچ آنے نہیں دیں گے۔ اور میں نے بتایا نا کہ آج کل ایسا عام ہے۔ لوگ اپنے فیملی ممبرز کے نام پر اکاؤنٹس بنواتے ہیں تاکہ ٹیکس سے بچ سکیں۔"

"میں جنرل اکاؤنٹس میں آیا تھا لیکن زاہد صاحب نے اچانک مجھے اپنے پاس بلا لیا اور پھر یہ اکاؤنٹ کھلوایا۔ اب میرا کمپنی کے جنرل اکاؤنٹس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں کچھ کانفیڈنشل شیئرز ڈیلنگ اور فارن ایکسچینج میں کام کر رہا ہوں۔ درحقیقت میرا کام بہت معمولی سا ہے۔ جب ہوتا ہے تب کرنا پڑتا ہے۔ جیسے آج میں صبح سے فارغ بیٹھا تھا، شام کو زاہد صاحب نے کام بتایا تو کرنا پڑا۔"

ایمن نے غور سے اسے دیکھا۔ "رضوان! تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "میں ایک عام آدمی ہوں۔ مجھ پر ایک گھر اور اس کے افراد کی ذمے داریاں ہیں اور میں ڈرتا ہوں کہ کسی چکر میں آ گیا تو ان لوگوں کا کیا بنے گا؟"

"فکر مت کرو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس طرح ڈرو گے تو کوئی کام نہیں کر سکو گے۔" ایمن بولی۔ "ویسے تم کوشش کرو کہ باہر نکل جاؤ۔ اچھی ایجوکیشن ہے اور تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ تمہیں جاب ملنے میں مشکل نہیں ہوگی۔"

"اس کے لیے کانٹیکٹ ہونے چاہئیں، یہاں بیٹھے بیٹھے جاب نہیں ملے گی۔"

ایمن نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ باہر اچھی جاب اسی وقت ملتی ہے جب کانٹیکٹ ہوں۔ میرے ایک کزن ہیں دبئی میں۔ ایسا کرو تم اپنی سی وی مجھے دے دو، میں ان کو بھیج دیتی ہوں۔"

"میں ای میل کر دوں گا۔"

چائے اور ریفریشمنٹ کی چیزیں آ گئی تھیں۔ ایمن نے چائے بنا کر اس کے سامنے رکھی۔ "بس یہ بات تھی، میں سمجھ رہی تھی کہ شاید گھر سے کوئی بات ہوئی ہے۔ گھر والے جناب کی شادی کا پلان بنا رہے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے ایمن کا لہجہ شوخ ہو گیا۔ رضوان سمجھ رہا تھا کہ ایمن جان بوجھ کر شادی کے موضوع پر آئی تھی۔ وہ ٹوہ لے رہی تھی کہ رضوان کہیں انگیج تو نہیں ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اسے بتائے یا نہیں۔ اگر اسے نادیہ کے بارے میں بتاتا تو وہ یقیناً ہرٹ ہوتی لیکن بتانا بھی ضروری تھا۔ وہ ابھی بہت آگے نہیں آئی تھی، واپسی میں مشکل نہ ہوتی۔ اس لیے رضوان نے سرسری سے انداز میں بتا دیا۔ "اس میں پلان بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ پلان آل ریڈی موجود ہے۔"

چائے لیتے ہوئے ایمن کا چہرہ یک دم پھیکا پڑ گیا۔ اس نے کپ واپس رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ "اوہ... تم انگیج ہو؟"

رضوان کو افسوس ہوا۔ ایمن اس کی توقع سے زیادہ دکھی ہوئی تھی۔ ”ہاں... میری خالہ کی بیٹی ہے۔“

”تمہاری پسند ہے؟“

”ایک طرح سے کہہ سکتی ہو۔ نسبت بچپن سے طے تھی اور جب میں بڑا ہوا تو میری پسند بھی بن گئی۔ ویسے وہ ابھی فرسٹ ایئر میں ہے۔ کم سے کم گریجویشن تک شادی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“

”تم سے چھوٹی ہے؟“

”آٹھ سال چھوٹی ہے۔ اس کے پیدا ہوتے ہی امی نے اسے میرے لیے مانگ لیا تھا۔“

”خوش قسمت ہے وہ۔“ ایمن زبردستی ہنسی۔ ”مبارک ہو۔“

”تھینک یو۔“ رضوان نے آہستہ سے کہا۔

ایمن نے پھر چائے کی پیالی کو ہاتھ نہیں لگایا، کوئی اور چیز بھی نہیں لی۔ رضوان نے اصرار کیا لیکن اس نے کہا۔ ”بس اب دل نہیں چاہ رہا... پلیز مجھے ڈراپ کر دو۔“

رضوان اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس نے بل کے لیے ایک نوٹ میز پر رکھا اور وہ باہر نکل آئے۔ ایمن گھر کے سامنے اتر کر اسے خدا حافظ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس بار اس نے اسے اندر آنے کو نہیں کہا۔ رضوان ٹھنڈی سانس بھر کر ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

زاہد ڈنر کی میز پر گھر والوں کے ساتھ تھا۔ اس کا بڑا بیٹا صمد بھی موجود تھا جو بے حد سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”پاپا! یہ اسٹاک فرم میں کیا ہو رہا ہے؟“

”میں نے اس سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔“ زاہد نے سکون سے کہا۔

”پاپا یہ ہماری بیس فرم ہے۔ اس کی بنیاد پر ہماری ساکھ ہے۔“ صمد نے احتجاج کیا۔ ”آپ ایسے کیسے الگ ہو سکتے ہیں اس سے؟“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”پاپا! فرق تو پڑتا ہے۔“ اسد بول اٹھا۔ ”اگر آپ نے اسی مارکیٹ میں رہنا ہے تو فرق پڑے گا۔“

”اصل بات یہی ہے، اب مجھے اس مارکیٹ میں نہیں رہنا ہے۔“ زاہد نے انکشاف کیا تو سب ہی اچھل پڑے۔

”آپ وائنڈ اپ کر رہے ہیں؟“ صمد نے بے یقینی سے کہا۔

زاہد نے سر ہلایا۔ ”میں سرمایہ یو اے ای لے جا رہا ہوں۔“

”لیکن پاپا... ہمارا ملک تو پاکستان ہے۔“ شیما بولی۔ ”ہمارے سارے رشتے دار، دوست اور جاننے والے یہاں ہیں۔“

”وہ سب رہیں گے۔ آخر بہت سے پاکستانی باہر بھی تو جاتے ہیں۔ ہم بھی ان میں سے ایک ہوں گے۔“

”ان کی مجبوری ہوتی ہے پاپا۔“ اسد نے کہا۔ ”ہمیں ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔“

”تم لوگوں کو نہیں پتا، اب یہاں بزنس کرنا کتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“

”آپ فیصلہ کر چکے ہیں؟“ رومانہ نے پوچھا۔

”تقریباً۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ممکن ہے آنے والے کسی مہینے میں ہم یہاں سے منتقل ہو جائیں۔“

”پاپا! میرا کالج کا آخری سال ہے۔“ شیما نے احتجاج کیا۔

”میرا آخری سمسٹر ہے پاپا۔“ اسد بھی بولا۔

”تم فکر مت کرو، تمہارے پیپرز کے بعد ہی سوچ کریں گے۔ اسد! تم کینیڈا جاؤ گے آگے اسٹڈی کے لیے... شیما تمہارے ساتھ ہو گی۔ اس کے بعد میں بھی سرمایہ لگا کر وہاں کا امیگریشن حاصل کر لوں گا مگر فی الحال یو اے ای جانا ہوگا۔“

یو اے ای میں ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ زاہد کے پاس فیملی کے ساتھ رہائشی ویزا تھا اور وہاں ایک خوب صورت علاقے میں اس کا عالی شان اپارٹمنٹ بھی تھا۔ پھر ہما بھی شوہر کے ساتھ وہاں تھی۔ ایک طرح سے ان کی پوری فیملی ایک جگہ جمع ہو جاتی۔ صمد نے نکتہ اٹھایا۔ ”پاپا! دوسرے بزنس ہیں ان کا کیا ہوگا؟“

”ان کو گڈول سمیت فروخت کیا جا سکتا ہے ورنہ اپنا سرمایہ نکالا جا سکتا ہے۔“ زاہد کہتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے دوسرا آپشن ہی اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ موجودہ حالات میں کوئی کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ پھنسانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ زاہد اکیلا سرمایہ دار نہیں تھا جو ملک کے حالات کی وجہ سے باہر شفٹ ہو رہا تھا۔ یہاں تقریباً ہر پیسے والا شخص یہی کام کر رہا تھا۔ تمام بڑے بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار بیرون ملک اپنے ٹھکانے اور کاروبار قائم کر چکے تھے اور وہ صرف ایک منٹ کے نوٹس پر ملک چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ بہت سے تو بیرون ملک سے اپنے پاکستان کے کاروبار کنٹرول کر رہے تھے اور اپنی فیملی سمیت کسی دوسرے ملک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زاہد نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ حالات ویسے بھی خراب تھے

اور آنے والا وقت اس کے لیے مزید مشکلات لا سکتا تھا اس لیے اس سے پہلے یہاں سے نکل جانا اس کے مفاد میں تھا۔

☆☆☆

وہ تین افراد تھے اور تینوں زاہد کی اسٹاک فرم کے بڑے ڈائریکٹرز میں سے تھے۔ ایک عبدالرزاق تھا۔ دوسرا عبدالقادر منگی تھا۔ وہ زمیندار بھی تھا... اس لیے اس کا بیشتر وقت شہر میں گزرتا تھا۔ تیسرا شخص گل فراز خان تھا۔ وہ علاقہ غیر کا آدمی تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی کمائی کا بیشتر حصہ منشیات اور اسلحہ فروشی سے آیا تھا مگر اب وہ شہر کا ایک معزز کاروباری تھا اور کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ عبدالرزاق نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں اتنا بڑا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔“

”تو بابا ہم کون سا کر سکتے ہیں۔“ عبدالقادر نے سامنے رکھے گلاس کو ایک ہی بار میں حلق میں الٹ کر کہا۔ وہ بلا نوش تھا اور خالص پیتا تھا، اس پر عبدالرزاق نے زیر لب لاحول پڑھی۔ البتہ گل فراز خاموش رہا۔ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”ہم یہ نقصان برداشت نہیں کریں گے۔“ اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

”لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔“ عبدالقادر نے پوچھا۔

”معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے۔“ عبدالرزاق نے سر ہلایا۔ ”ہمیں دوسروں کو جواب دینا ہے۔“

”صرف جواب نہیں دینا ہے، ان کی رقم بھی دینی ہے۔“ گل فراز نے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں یہ پیسا کن لوگوں کا ہے اور وہ اپنا پیسا وصول کرنا جانتے ہیں۔“

”کاروبار میں نقصان بھی ہوتا ہے۔“ عبدالقادر نے کمزور لہجے میں کہا۔

گل فراز خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ان لوگوں کو صرف نفع سے دلچسپی ہے، چاہے وہ جیسے بھی ہو۔“

”یعنی اب رقم کی واپسی کا بھی ہمیں سوچنا ہوگا۔“ عبدالرزاق نے سوچ کر کہا۔

”بالکل... دوسروں کا نہیں پتا لیکن ہمیں اپنی ذمے داری پوری کرنا ہو گی۔“ گل فراز بولا۔ اس نے بھی اپنے لیے بوتل سے گلاس میں سے ارغوانی نکالی۔ وہ تینوں ایک ایسے ہوٹل کے کمرے میں تھے جہاں قانون کی رسائی سے دور وہ سکون سے سب وہ کام کر سکتے تھے جن کی اجازت ملک کا قانون نہیں دیتا ہے۔ عبدالرزاق نے پھر لاحول پڑھی اور بولا۔

”ذمے داری سے کیا مراد ہے... کیا ہمیں خود دینا ہوگا؟“

”اپنی جیب سے میں ایک روپیا نہیں دوں گا۔“ عبدالقادر نے اعلان کیا۔ اس کی آواز لہرا رہی تھی کیونکہ وہ پہلے ہی تین گلاس اپنے معدے میں اتار چکا تھا۔

”ہم میں سے کوئی نہیں دے گا۔“ گل فراز نے کہا۔

”تب کون دے گا؟“ عبدالرزاق کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”جس نے یہ روپیا ڈبویا ہے۔“

گل فراز کی بات پر وہ دونوں چونک گئے۔

”کیا مطلب؟“

"مطلب صاف ہے، یہ رقم زاہد کو دینا پڑے گی۔" گل فراز نے کہا۔

"کیسے؟ تم جانتے ہو وہ رقم نہیں دے گا۔" عبدالرزاق نے دریافت کیا۔ "بلکہ وہ ملک سے باہر جارہا ہے۔"

"وہ سیدھے طریقے سے نہیں دے گا اس لیے ہم سیدھے طریقے سے مانگیں گے بھی نہیں۔" گل فراز نے گلاس خالی کر کے میز پر پٹخ دیا۔ "گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں۔"

"اور یہ انگلیاں کون ٹیڑھی کرے گا؟" عبدالقادر نے پوچھا۔

"ہم سب۔" گل فراز نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے ایک بار کسی جلال منگی کا ذکر کیا تھا؟"

عبدالقادر نے سر ہلایا۔ "ہاں... وہ کام کا آدمی ہے مگر پیسے کا لالچی ہے۔"

"لالچی آدمی ہی کام کرے گا۔" گل فراز نے کہا۔

"میرا بھی ایک آدمی ہے۔ شوکت خان یہیں ہوتا ہے۔ اپنا کام کرتا ہے لیکن میں کہوں گا تو انکار نہیں کرے گا۔"

"میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے۔" عبدالرزاق نے داڑھی میں خلال کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک آدمی ہے میری نظر میں... مگر پہلے بتاؤ کرنا کیا ہے؟"

"جو کرنا ہے، جلد کرنا ہے۔" عبدالقادر نے کہا۔ "پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔"

گل فراز آگے جھکا اور دھیمی آواز میں بتانے لگا کہ انہیں زاہد سے رقم نکلوانے کے لیے کیا کرنا ہے۔ وہ دونوں دلچسپی سے سن رہے تھے اور جیسے جیسے گل فراز کی بات آگے بڑھ رہی تھی ان کی دلچسپی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ گل فراز نے بتایا کہ وہ ڈیڑھ ارب روپے وصول کریں گے تو وہ اس سے متفق نظر آنے لگے بلکہ عبدالقادر کچھ زیادہ ہی راضی تھا۔

مطلوبہ رقم اچھی خاصی رقم تھی اور پھر ان کا نقصان بھی پورا ہونے کا امکان تھا اس لیے کسی قدر بحث کے بعد وہ مان گئے تھے۔ اس کے بعد منصوبے پر بات ہونے لگی۔ آئیڈیا گل فراز کا تھا اور اب وہ اس کی نوک پلک درست کر رہے تھے۔

☆☆☆

رضوان کی فکرمندی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ زاہد نے اپنی دوسری کمپنیوں کا کاروبار تقریباً بند کر دیا تھا۔ وہ اس وقت سارا کام کلیکشن کا کر رہا تھا اور جہاں جہاں رقم پھنسی ہوئی تھی، اسے نکلوا رہا تھا۔ جب مسلسل دوسرے ہفتے بھی اس کے اکاؤنٹ میں رقم لاکھ روپے رہی تو اسے یقین ہو گیا کہ اب زاہد اس اکاؤنٹ کو استعمال نہیں کرے گا۔ ورنہ ہر دوسرے تیسرے دن اس اکاؤنٹ میں رقم آتی تھی یا جاتی تھی۔ رضوان ایک لیجر شیٹ تیار کر رہا تھا اور اسے اپ ڈیٹ کر کے وہ زاہد کے ایک ای میل ایڈریس پر بھیجتا تھا۔ اس شیٹ کے مطابق اب تک اس اکاؤنٹ سے تقریباً پانچ کروڑ ڈالرز مالیت کی رقم بیرون ملک بھیجی جا چکی تھی۔ اکاؤنٹ میں ہمیشہ کیش ڈالرز جمع کرائے جاتے تھے، کبھی اس میں کوئی چیک یا بینک ڈرافٹ نہیں آیا تھا اور نہ ہی بیرون ملک سے ڈالرز کی صورت میں کوئی رقم آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ تمام ڈالرز مقامی مارکیٹ سے اٹھائے جارہے تھے اور انہیں بیرون ملک منتقل کیا جارہا تھا۔ رضوان کی فکرمندی اس حوالے سے بھی بڑھ رہی تھی کہ اگر زاہد اپنا کام سمیٹ رہا تھا تو جلد یا بدیر اس کی بھی چھٹی ہونے والی تھی۔ اس کے بعد اسے جاب تلاش کرنی پڑتی۔ اگرچہ گزشتہ چھ مہینے میں اس نے اتنا بچا لیا تھا کہ ایک دو مہینے جاب نہ بھی کرتا تو اس کا گزارہ ہو سکتا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ زاہد نے اسے طلب کرلیا۔ اس نے حسب معمول بلاتمہید پوچھا۔

"رضوان! تم بیرون ملک جانے میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

"کس سلسلے میں سر؟"

"جاب کے لیے۔" زاہد نے کہا۔ "فی الحال یہ راز کی بات ہے لیکن میں دبئی منتقل ہو رہا ہوں۔ بزنس بھی وہیں ہو گا۔ کچھ ملازمین کو ساتھ لے جارہا ہوں، ان میں سے ایک تم ہو گے۔ تنخواہ وہاں کے معیار کے حساب سے ہو گی اور دو سال کا کنٹریکٹ ہو گا۔"

رضوان نے سکون کا سانس لیا مگر وہ یہ سوچ کر فکرمند ہو گیا کہ اب گھر والوں سے زیادہ ہی دور چلا جائے گا۔ یہاں وہ تین چار مہینے بعد جا کر مل سکتا تھا مگر دبئی سے سال بھر سے پہلے آنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس نے سوچنے کے لیے مہلت مانگی۔ "سر! میں سوچ سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں... تم مجھے پرسوں تک جواب دو اور یہ بات تم سے آگے نہ جائے۔"

"ٹھیک ہے سر... لیکن میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔"

"تم فکر مت کرو، وہ پندرہ دن میں ارجنٹ بن جائے گا۔ ویزا بھی آجائے گا۔ تم ایک مہینے میں باہر جا سکو گے۔"

دو دن بعد رضوان نے ہاں کر دی۔ اس نے ماں سے مشورہ کرلیا تھا اور وہ خوش تھیں کہ باہر جانے کی صورت میں رضوان زیادہ کما سکے گا۔ فاطمہ کا ارادہ تھا کہ جیسے ہی نادیہ

گریجویشن کرے گی، وہ اسے بہو بنا کر لے آئیں گی اور اس کے ساتھ ہی سیما کی شادی بھی کر دیں گی۔ سیما کے لیے بھی رشتہ دیکھا ہوا تھا۔ فاطمہ کی ایک سہیلی کا بیٹا تھا اور انہوں نے پہلے ہی فاطمہ سے بات کی ہوئی تھی۔ یہ جاب بھی اچھی تھی لیکن اس میں بچت کی رفتار بہت کم تھی اور رضوان کو اتنی رقم جمع کرتے کرتے کئی سال گزر جاتے کہ وہ عزت سے دونوں شادیوں سے نمٹ سکتیں۔ مگر باہر رہ کر رضوان ایک سال میں اتنا بچا سکتا تھا۔ دو سال کا کنٹریکٹ اچھا خاصا ہو جاتا۔ پھر جو ایک بار باہر نکل جاتا ہے اس کے رابطے بن جاتے ہیں اور اسے ایک کے بعد دوسری ملازمت تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ رضوان کو یقین تھا کہ دو سال میں وہ خود کو سیٹ کر لے گا۔

رضوان کے ہاں کرتے ہی زاہد احمد نے اس کے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی تھی۔ یہ درخواست ایک ایجنٹ کے توسط سے دی گئی تھی۔ پندرہ دن بعد پاسپورٹ بن کر آگیا۔ اس کے فوراً بعد اسی ایجنٹ کے توسط سے عارضی ویزے کی درخواست دی گئی۔ خرچ سارا زاہد کر رہا تھا اور اثر رسوخ بھی اسی کا تھا لیکن سامنے رضوان خود تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ جب زاہد اسے جاب دے رہا ہے تو اسے عارضی ویزے پر کیوں وہاں بلا رہا ہے؟ وہ اسے ورک ویزا دے سکتا تھا مگر اس نے زاہد سے پوچھا نہیں، شاید اس کی کوئی وجہ تھی۔ ویزا بھی جلدی لگ کر آگیا اور زاہد نے اس سے کہا کہ وہ دبئی چلا جائے۔ وہاں اسے ریسیو کرلیا جائے گا اور اسے رہائش اور دوسری تمام سہولتیں ملیں گی۔ اس کی جاب اور تنخواہ اسی دن سے اسٹارٹ ہو جائے گی۔ زاہد نے اس کی رضامندی پاتے ہی اس سے باضابطہ استعفا لے لیا تھا اور اب اس کا زاہد کی کمپنی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس دوران میں زاہد نے تمام کمپنیاں بند کر کے دفتر کی جگہ خالی کر دی تھی اور تمام ملازمین کو فارغ کر دیا تھا۔

☆☆☆

رضوان دبئی کے بجائے جس جگہ پہنچا تھا، اس کا تصور اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں کیا تھا۔ یہ بہت تنگ و تاریک جگہ تھی، یہاں بدبو اور گھٹن تھی۔ ائرپورٹ پر ابھی وہ امیگریشن کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ دو سادہ لباس والے افراد جن کے چہرے سخت تھے، اس کے پاس آئے۔ ایک نے پوچھا۔ "رضوان کمال تم ہو؟"

"جی۔" وہ چوکنا ہو گیا۔ "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"سوال نہیں... تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"لیکن کیوں... میری فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔"

اس نے احتجاج کیا جو رائگاں گیا۔ سادہ لباس والے افراد کے ساتھ آنے والے سیکیورٹی گارڈز نے اسے وہاں سے نکالا اور پھر ائرپورٹ کے باہر موجود ایک گاڑی میں لے جا کر ٹھونس دیا۔ اپنے انداز سے وہ کسی ایجنسی کے اہلکار لگ رہے تھے۔ اس سے اس کا سارا سامان لے لیا گیا تھا جس میں اس کا وہ بریف کیس بھی تھا جو زاہد نے اسے روانہ ہوتے ہوئے دیا تھا۔ اس میں اس کے کچھ کاغذات تھے۔ وہ اس نے رضوان کو کھول کر بھی دکھایا تھا۔ وہ مطمئن تھا۔ اسے اس عمارت میں لایا گیا اور اس تاریک جگہ دھکیل دیا گیا۔ وہ پوچھتا رہ گیا کہ اس کا قصور کیا ہے؟ اسے کیوں پکڑا گیا ہے؟ اور وہ کون لوگ ہیں؟ مگر اس کے ہر سوال کا جواب ایک بے حس خاموشی سے دیا گیا۔ وہ پولیس والے نہیں تھے ورنہ اب تک اس کے ساتھ مار پیٹ شروع ہو جاتی۔ رضوان کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا تھا اور کسی کو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے؟ اس ملک میں آئے دن لوگ غائب ہوتے رہتے ہیں اور ان کے لواحقین ان کی تلاش میں دربدر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کہیں اس کے ساتھ بھی ایسا تو نہیں ہوا تھا؟ تقریباً دو گھنٹے بعد اسے یہاں سے نکالا گیا اور ایک کمرے میں لایا گیا۔ ایک سادہ میز کے دوسری طرف وہی دو افراد بیٹھے تھے جنہوں نے اسے ائرپورٹ سے تقریباً اغوا کیا تھا۔ اسے دھکیل کر سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میز پر اس کے پاس سے برآمد ہونے والا سامان رکھا تھا۔ جس میں اس کا پاسپورٹ، موبائل اور پرس... اس کا ہینڈ کیری اور بریف کیس بھی تھا۔

"رضوان کمال۔" جس شخص نے پہلے بات کی تھی، اسی نے کہا۔ "تم دبئی کیوں جارہے تھے؟"

"مجھے وہاں ملازمت ملی ہے۔"

"تمہارے پاسپورٹ پر وزٹ ویزا لگا ہے۔" دوسرے نے رضوان کا پاسپورٹ اٹھا کر دیکھا۔ اس پر رضوان نے جلدی سے لیکن مناسب الفاظ میں انہیں بتایا کہ وہ کس طرح جارہا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اور جب وہ خاموش ہوا تو پہلے نے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم تم پر بہت عرصے سے نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تم زاہد احمد کی کمپنی سے استعفا دے چکے ہو۔"

"آپ ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا اور میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ مجھے پکڑا کیوں گیا ہے؟"

"ہم زاہد احمد سے بات کر چکے ہیں، وہ انکار کر رہا ہے کہ اس نے تمہیں کوئی جاب دی ہے یا دبئی بلوا رہا تھا۔"

رضوان دم بہ خود رہ گیا..... "وہ... وہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"بکو مت۔" دوسرا غرایا۔ "یہ بتاؤ... بینک میں... نمبر کا اکاؤنٹ تمہارا ہے؟"

"ہاں... نہیں۔" رضوان نروس ہو گیا۔ وہ عام سا شخص تھا اس کا کبھی پولیس سے بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ "میرا مطلب ہے، یہ اکاؤنٹ زاہد احمد کا ہے مگر میرے نام تھا۔ اسے آپریٹ وہی کر سکتا تھا۔"

"وہ کیسے؟"

"اس اکاؤنٹ کا آفیشل موبائل نمبر اور ای میل زاہد احمد کا ہے۔"

"یہی ای میل ہے نا۔" پہلے والے نے ایک کارڈ اس کے سامنے کر دیا۔ اس پر نہ صرف ای میل بلکہ اس کا پاس ورڈ بھی لکھا ہوا تھا۔

"ہاں یہی ہے۔"

"اور یہ سم ہے۔" اس نے سم بھی سامنے رکھ دی۔

رضوان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ چیزیں ان کے پاس کہاں سے آئی تھیں۔ "مجھے نہیں معلوم جناب... یہ میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"یہ دونوں چیزیں بریف کیس کے خفیہ خانے سے ملی ہیں۔" پہلے نے سرد لہجے میں کہا۔ "سم تمہارے نام پر ہے اور ای میل کا پاس ورڈ ہے تو لازمی تم ہی استعمال کرتے ہو گے پھر تم کس طرح زاہد احمد کو اس کا ذمے دار قرار دے رہے ہو؟"

اچانک رضوان کو خیال آیا کہ کہیں یہ رقم کی منتقلی کا معاملہ تو نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "پلیز! میری بات سن لیں اس کے بعد آپ جو چاہے کریں۔ میں حلفیہ بیان دینے کو تیار ہوں اور آپ تصدیق کر سکتے ہیں۔"

اس نے بینک اکاؤنٹ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس معاملے کا اس سے کوئی تعلق نہیں مگر اب بات کھل رہی تھی۔ وہ اسی چکر میں پھنسا تھا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ زاہد نے اسے کس طرح ملازمت دی اور پھر اس کے نام سے یہ اکاؤنٹ کھلوایا اور اس اکاؤنٹ کے ذریعے بہت بڑی رقم بیرون ملک بھیجی گئی۔ بھیجی جانے والی رقم کی مالیت پانچ کروڑ ڈالرز سے زیادہ تھی۔ اس بار بھی وہ دونوں خاموشی سے سنتے رہے۔ جب رضوان اپنی بات کر چکا تو دوسرے نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم ایک مہینے سے اس اکاؤنٹ کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن زاہد احمد کا اس سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا ہے۔ بینک والے بھی تمہیں جانتے ہیں۔"

"یہ سازش ہے جناب... آپ خود سوچیں، میں چھ مہینے پہلے تک بیس ہزار روپے مہینے کی جاب کر رہا تھا۔ میں کس طرح سے پانچ کروڑ ڈالرز کی رقم باہر بھیج سکتا ہوں۔"

"ہمیں معلوم ہے۔" پہلا بولا۔ "ہم نے ساری چھان بین کر کے ہی تمہیں اٹھایا ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ تمہاری اتنی اوقات نہیں ہے اس لیے معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کے پیچھے اصل میں کون ہے؟"

"زاہد احمد۔"

"یہ غلط ہے۔" دوسرا پھر غرایا۔ "تم اس کی آڑ میں کسی اور کا کھیل کھیل رہے تھے۔"

رضوان نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ اتنی آسانی سے کسی بات کا یقین کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ بریف کیس سے صرف سم اور ای میل والا کاغذ ہی برآمد نہیں ہوا تھا بلکہ دس ہزار ڈالرز نقد بھی ملے تھے۔ آنے والے دو دن رضوان پر بہت بھاری گزرے۔ ایک خوفناک سے کمرے میں حس سے عاری لوگ اس پر مشقِ ستم کرتے رہے۔ ان دو دنوں میں اس پر بے شمار اذیت کے ایسے طریقے آزمائے گئے جن سے اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں پڑا لیکن اندر سے وہ زخم زخم ہو گیا۔ دو دن بعد انہیں یقین ہو گیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے مگر وہ زاہد احمد کو اصل مجرم ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ایک ہفتے بعد اسے ایک عدالت میں پیش کیا گیا اور اس پر رقم غیر قانونی طریقوں سے بیرون ملک منتقل کرنے کا الزام تھا مگر یہ الزام بہت بڑا نہیں تھا۔ دوسری پیشی پر ایک وکیل اس کی طرف سے آیا اور اس نے پہلی سماعت میں ہی رضوان کی ضمانت منظور کرا لی۔ رضوان نہیں جانتا تھا کہ وکیل کس نے کرایا تھا کیونکہ اس نے تو سرکاری وکیل کے لیے درخواست دی تھی اور وہ بھی نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

وکیل باہر آتے ہی رخصت ہو گیا۔ رضوان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ رہا ہو گیا ہے۔ بے شک ضمانت پر ہی لیکن اسے امید نہیں تھی کہ وہ اب آزاد ہو سکے گا مگر اس کی ضمانت کا مرحلہ اتنا آسان ثابت ہوا۔ جج نے صرف ایک لاکھ کی ذاتی ضمانت پر اسے رہا کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ رقم وکیل نے جمع کرا دی تھی۔ وہ باہر آ کر پریشان تھا کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے؟ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس کا سارا سامان ان لوگوں کی تحویل میں تھا جنہوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ اس کے پاس سوائے جسم کے لباس اور پرس کے کچھ نہیں تھا۔ اس کا آئی ڈی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس تھا مگر پرس میں ایک روپیا نہیں تھا۔ وہ کورٹ کے باہر سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ وکیل باہر آتے ہی اس سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ابھی رضوان سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ اچانک ایک لگژری کار آ کر رکی اور اس کا عقبی کھڑکی کا شیشہ نیچے ہوا اور اس سے گل فراز کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"اندر آ جاؤ۔"

رضوان اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ "آپ...؟"

"تمہاری ضمانت میں نے کرائی ہے۔" گل فراز بولا تو اس بار رضوان اندر آ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار آگے بڑھ گئی۔ رضوان نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"اب آپ مہربان ہیں جیسے کبھی زاہد مہربان تھا۔"

"وہ دھوکے باز آدمی ہے، سب کو دھوکا دے گیا۔" گل فراز نے کہا۔ "تمہیں بھی اس نے پھنسایا ہے اور تم اکیلے نہیں ہو۔ کم سے کم تین افراد اور ہیں جن کے ذریعے اس نے رقم باہر بھیجی ہے اور خود بھی باہر چلا گیا ہے۔"

"آپ نے مجھ پر مہربانی کیوں کی؟" رضوان ابھی تک شک میں تھا۔

"ہمیں زاہد سے اپنی رقم واپس حاصل کرنی ہے۔" گل فراز نے کہا۔ "تمہیں ہماری مدد کرنی ہو گی۔"

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"یہ تمہیں جلد پتا چل جائے گا۔ ابھی تم ہمارے ساتھ رہو گے۔"

"اور یہ کیس...؟"

"اسے بھول جاؤ، ابھی تم واپس نہیں جاؤ گے۔ اگر مسئلہ حل ہو گیا تو تمہارا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ دوسری صورت میں تمہیں روپوش رہنا ہو گا کیونکہ ایک مہینے بعد جب تم اگلی پیشی پر نہیں پہنچو گے تو عدالت تمہیں مفرور قرار دے دے گی۔"

گل فراز خاصی خوفناک تصویر کشی کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "میں کیوں نہیں پیش ہوں گا؟"

"اگر تم پیش ہونا چاہو تو تمہاری مرضی لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اس صورت میں تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔ تمہارے خلاف ثبوت بہت مضبوط ہیں۔"

"مگر میں کیسے سزا سے بچ سکتا ہوں؟"

"اگر زاہد احمد ہمارے ہاتھ آ گیا تو پھر تمہاری بچت کا بھی امکان ہے ورنہ رقم کے ساتھ ساتھ تم بھی ڈوب جاؤ گے۔"

رضوان نے اس کی طرف دیکھا۔ "صرف میں؟"

"ہاں، ہمارا بھی نقصان ہو گا لیکن تمہارا نقصان بہت زیادہ ہو گا۔ اس میں تمہارے گھر والے بھی شامل ہوں گے جو تم پر انحصار کرتے ہیں۔"

گھر والوں کے ذکر پر رضوان مضطرب ہو گیا۔ وہ بیس دن پہلے گھر والوں کو دبئی کا کہہ کر نکلا تھا اور تب سے اب تک ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ سب کتنے پریشان ہوں گے، خاص طور سے فاطمہ کا برا حال ہو گا۔ وہ رضوان سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ وہ کراچی میں اسے تقریباً روز ہی کال کرتی تھی، اس کے کھانے پینے اور صحت کے لیے فکر مند رہتی تھی۔ وہ تڑپ گیا۔ اس نے گل فراز سے کہا۔ "مجھے اپنے گھر والوں سے بات کرنی ہے۔"

گل فراز نے ایک لمحے کو سوچا اور موبائل نکال کر اس کی طرف بڑھایا لیکن جب رضوان نے موبائل پکڑا تو اس نے اسے چھوڑا نہیں اور بولا۔ "تم موجودہ صورت حال کے بارے میں کوئی بات نہیں کرو گے، صرف اپنی خیریت سے آگاہ کرو گے۔"

رضوان نے سر ہلایا تو اس نے موبائل چھوڑ دیا۔ رضوان نے گھر کا نمبر ملایا۔ کال فاطمہ نے ریسیو کی۔ اس کی آواز سن کر وہ تڑپ گئی۔ "رضی... میرے بچے، یہ تو ہے نا...؟"

"جی امی میں ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"تو کہاں ہے... گھر رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

"امی میں کراچی میں ہوں۔ ایک معاملہ ہے، اسے نمٹا کر گھر آتا ہوں۔ ابھی صرف آپ کو اپنی خیریت کا بتانے کے لیے کال کی ہے۔"

"یہ تیرا نمبر ہے؟"

"نہیں امی! ایک پی سی او والے کا موبائل ہے۔" رضوان نے جھوٹ بولا۔ "میں پھر کال کروں گا۔" اس نے کہتے ہوئے دل پر جبر کر کے کال کاٹ دی کیونکہ گل فراز اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل واپس لے لیا اور مطمئن انداز میں سر ہلایا۔

"تم نے ٹھیک بات کی... اس معاملے میں جتنے کم لوگ ملوث ہوں، اتنا اچھا ہو گا۔"

رضوان باتوں کے دوران توجہ نہیں دے سکا کہ وہ کہاں جا رہے تھے۔ گاڑی کو دھچکے لگے تو وہ چونکا۔ گاڑی

ایک کچی آبادی میں داخل ہورہی تھی۔ یہاں گلیاں غیر متناسب اور کچی تھیں۔ جابجا گڑھے تھے اور گندہ پانی بہہ رہا تھا مگر دوسری کچی آبادیوں کی نسبت یہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ گلیوں میں بچوں کا ایک ہجوم نہیں تھا۔ رضوان نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا۔ ''ہم کہاں آگئے ہیں؟''

''اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔'' گل فراز نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اینٹوں سے بنا ہوا مکان تھا جس کی بیرونی دیواریں پلاستر سے بے نیاز تھیں۔

''یہاں کیوں؟''

''یہاں تم محفوظ ہو۔'' گل فراز نے کہا اور نیچے اتر آیا۔ اس کے اشارے پر رضوان بھی نیچے آیا۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہاں سناٹا کتنا شدید ہے۔ ڈرائیور بھی نیچے آگیا تھا۔ رضوان نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ تقریباً تیس سال کا صورت سے جرائم پیشہ نظر آنے والا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر کسی تیز دھار آلے کا پرانا نشان تھا۔ اس کے دانت تمباکو زدہ ہورہے تھے۔ اس نے دروازہ بجایا تو اندر سے ایک آدمی نے باہر جھانکا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ تینوں اندر آئے۔ مکان میں آگے پیچھے چار کمرے تھے جن کے دروازے اور کھڑکیاں چاروں طرف موجود صحن میں کھلتے تھے۔ وہ پہلے کمرے میں آئے جہاں فرش پر بچھے قالین پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ سفید لباس پر اس نے سفید ہی پگڑی باندھ رکھی تھی جس کا گھیر گلے تک آرہا تھا اور بوقت ضرورت اسے چہرے پر نقاب کی طرح بھی لیا جا سکتا تھا۔ عام طور سے اس طرح کی پگڑی ڈاکو باندھتے ہیں اور وہ .... مشہور ڈاکو جلال منگی تھا جبکہ ڈرائیور شوکت خان تھا۔

اگر مکان میں اور لوگ تھے تو فی الحال وہ سامنے نہیں تھے۔ انہیں اندر لانے والا کمرے تک پہنچا کر چلا گیا۔ جلال .... کے ساتھ دیوار سے اس کے کئی ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک جدید ترین خودکار رائفل اور ایک چھوٹی لیکن مہلک شاٹ گن تھی۔ اس کی کمر کی بیلٹ سے پستول بندھا ہوا تھا اور یہ سارا جدید ترین غیر ملکی اسلحہ تھا۔ جلال ... کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ خواب میں بھی مسلح رہتا تھا۔ اس کے سر کی قیمت لگی ہوئی تھی اور پولیس کئی بار یہ قیمت وصول بھی کرچکی تھی مگر جلال ... بدستور ٹھیک ٹھاک پھر رہا تھا۔ شوکت خان کا تعلق گل فراز خان کے علاقے سے تھا اور وہ یہاں ایک اغوا برائے تاوان کا ریکٹ چلا رہا تھا۔ اس کے ڈانڈے شمالی علاقے میں جاری جنگ سے بھی ملتے تھے۔

شوکت خان بہ ظاہر مسلح نہیں تھا مگر وہ جلال .... سے زیادہ خطرناک نظر آرہا تھا۔ گل فراز خان نے شوکت سے کہا۔

''اب یہ تمہارے ساتھ رہے گا۔''

''آپ فکر نہ کریں خان جی، اس کا پورا خیال رکھیں گے۔'' شوکت خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

رضوان اب گھبرا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے گل فراز کے ساتھ اس طرح یہاں آکر غلطی کی تھی۔ اب اس کی یہاں سے واپسی آسان نہیں لگ رہی تھی۔ ''گل فراز صاحب! میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''فکر مت کرو، تم مدد کرو گے اور تمہیں اس کا صلہ بھی ملے گا۔''

''کیسے جناب؟''

''ہم جلد زاہد کو اغوا کرلیں گے۔'' گل فراز نے اسے غور سے دیکھ کر کہا۔ ''تمہیں اس کے اغوا اور پھر اس سے رقم وصولی میں ہماری مدد کرنا ہوگی۔''

رضوان دنگ رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کبھی اغوا برائے تاوان کی واردات میں ملوث ہونا پڑے گا۔ وہ خاموش تھا۔ گل فراز نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''فکر نہ کرو، تم سے ایسا کوئی کام نہیں لیا جائے گا جو تم نہیں کرسکتے۔ اور ہاں یہاں رہتے ہوئے خیال رکھنا بلاوجہ باہر مت نکلنا۔''

''آپ فکر نہ کرو خان جی۔'' شوکت خان کہا۔

گل فراز وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس نے راستے میں عبدالرزاق کو کال کی۔ ''اسے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے۔''

''یہ کام ہوا ہے نا۔'' عبدالرزاق نے خوش ہوکر کہا۔ ''تم دیکھنا، یہ شخص ہمارے کتنے کام آتا ہے۔ یہ زاہد کے اندرونی رازوں سے بھی واقف ہوگا... تم کہاں ہو؟''

''میں آرہا ہوں پھر منصوبے پر بات کرتے ہیں۔'' گل فراز نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔

☆☆☆

زاہد احمد بیوی بچوں کے ساتھ دبئی کے ایک انڈور تفریحی پارک میں تھا۔ یہ بہت خوب صورت اور مہنگا پارک تھا۔ اس میں آئس اسکیٹنگ سے لے کر سوئمنگ پول اور ایک چھوٹا سا ٹروپیکل پارک بھی تھا اور یہ سب ائرکنڈیشنڈ تھا۔ باہر کے مقابلے میں اندر درجۂ حرارت صرف بیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ وہ دو ہفتے پہلے یہاں آئے تھے۔ شروع میں سب بہت ڈسٹرب تھے۔ وہ اپنی بہت بھری پُری اور مصروف زندگی چھوڑ کر آئے تھے۔ یہاں ہر سہولت تھی۔ وہ جس اپارٹمنٹ میں تھے، وہ اتنا خوب صورت اور صاف ستھرا تھا

کہ فرش کو آئینے کی جگہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ سامنے دبئی کا سمندر تھا۔ اپارٹمنٹ میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر اور ہر سہولت تھی مگر یہاں ان کے رشتے دار، دوست احباب نہیں تھے۔ روانگی سے دو دن پہلے زاہد نے انہیں بتایا تو وہ حیران رہ گئے۔ پہلے زاہد نے کہا تھا کہ وہ امتحان دے کر جائیں گے مگر اب اس نے اچانک ہی روانگی کا کہہ دیا تھا۔ صمد پہلے ہی دبئی جاچکا تھا۔ ہما شادی کے بعد دبئی میں رہ رہی تھی۔ اس کا شوہر انجینئر تھا اور اپنی کنسٹرکشن کمپنی چلا رہا تھا۔ اسد اور شیما کا مسئلہ تھا مگر زاہد کا کہنا تھا کہ جان سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔

''میرے کاروباری دشمن جرائم پیشہ عناصر سے مل کر مجھے یا میرے خاندان کے کسی فرد کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں اور اس صورت میں میں ذرا بھی رسک نہیں لے سکتا۔''

یہ سن کر وہ سب خوف زدہ ہوگئے اور پھر وہ دبئی جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ بیوی بچوں کو بوریت دور کرنے کے لیے وہ انہیں گھمانے پھرانے لگا۔ کام کوئی تھا نہیں اور جو چھوٹے موٹے معاملات تھے، وہ صمد دیکھ رہا تھا۔ اس نے زاہد کو تجویز دی تھی کہ ہما کے شوہر انصار کی کمپنی میں سرمایہ کاری کرتے ہیں کیونکہ دبئی میں کنسٹرکشن کا کام دوبارہ شروع ہوگیا تھا۔ زاہد نے اسے اجازت دے دی تھی کہ جب تک وہ کینیڈا کا امیگریشن حاصل نہیں کرلیتے، یہ کام کرلے۔ شیما اور اسد کے لیے اس نے ٹیوشن کا بندوبست کرلیا تھا اور ساتھ ہی ان کے کالج اور یونیورسٹیز میں ان کی حاضری پوری رکھنے کا بندوبست بھی کیا تھا تاکہ جب وہ امتحان دینے جائیں تو انہیں کوئی مشکل نہ ہو۔ چند دن بعد سب کی بوریت دور ہونے لگی اور وہ اب تفریح کے منصوبے بنا رہے تھے۔

زاہد نے پاکستان سے اپنا بیشتر سرمایہ نکال لیا تھا۔ کچھ جائداد تھی، اسے اس کی فکر نہیں تھی۔ وہ اسے کسی اسٹیٹ والے کے توسط سے بھی بکوا سکتا تھا۔ ہاں، ایک چیز ایسی تھی جس کے لیے اسے واپس جانا تھا۔ یہ ایک گولڈ شپ منٹ تھی جو مڈل ایسٹ سے پاکستان آتی اور یہاں سے اسمگل ہوکر بھارت جارہی تھی۔ زاہد کا کام اس شپ منٹ کو وصول کرکے حیدرآباد کے ایک تاجر کے حوالے کرنا تھا جو اسے آگے بھارت اسمگل کرتا۔ زاہد کی ایک کمپنی اس کام میں ملوث تھی۔ اس میں اس کا کمیشن محدود تھا مگر یہ شپ منٹ بھارت میں جس پارٹی کے لیے جارہی تھی، اس سے زاہد کے اچھے تعلقات تھے اور وہ مستقبل میں بھی اس کے کام آتے اس لیے وہ خود اپنی نگرانی میں یہ کام کروانا چاہ رہا تھا۔ اس نے ابھی بیوی بچوں کو نہیں بتایا تھا۔ وہ اس کے جانے کی مخالفت کرتے اس لیے وہ عین موقع پر بتاتا۔ اس کی آج رات کی فلائٹ تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ کل وہ شپ منٹ حوالے کرکے آنے والی رات کی فلائٹ سے واپس آجائے گا۔ اس کے پاس کئی فلائٹس کے اوپن ٹکٹ تھے۔ تفریح سے رات واپسی کے بعد اس نے رومانہ کو بتایا تو وہ پریشان ہوگئی۔

''جب وہاں خطرہ ہے تو واپس کیوں جارہے ہیں؟''

''یہ کام ضروری ہے اور میں ہی کرسکتا ہوں۔ ویسے میرے دشمن سمجھ رہے ہوں گے کہ اب میں واپس نہیں آؤں گا۔ اس شپ منٹ کے بارے میں ان کو کچھ علم نہیں ہے۔ صرف ایک دن کا کام ہے، کل رات یا زیادہ سے زیادہ صبح تک میں واپس تم لوگوں کے پاس ہوں گا۔'' زاہد نے اسے تسلی دی۔

رومانہ متفق نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ زاہد اپنے معاملات میں کسی کی نہیں سنتا۔ صمد کو علم تھا، وہی باپ کو ائرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔ روانگی سے پہلے زاہد نے اسے ایک سیل لفافہ دیا۔ ''اگر میں نہ آسکوں یا کوئی مسئلہ ہوجائے تو تم یہ لفافہ کھول لینا۔ اس میں تمام ضروری چیزیں ہیں اور تمہارے لیے کچھ ہدایات بھی ہیں۔''

صمد پریشان ہوگیا۔ ''پاپا! کیسی باتیں کررہے ہیں؟''

''آدمی کو ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔'' زاہد نے بیٹے کا شانہ تھپکا۔ ''ویسے امید ہے کہ میں کل صبح چار بجے تک واپس آجاؤں گا۔''

روانگی سے پہلے صمد نے کہا۔ ''آپ آنے سے پہلے فلائٹ کنفرم کردیجیے گا، میں لینے آؤں گا۔''

''نہیں، تم آرام کرنا... میں ٹیکسی کرکے آجاؤں گا۔''

دو گھنٹے کی پرواز کے بعد زاہد کراچی اترا تھا۔ امیگریشن اور کسٹم سے فارغ ہوکر وہ باہر آیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا ہینڈ کیری تھا جس میں اس کا ایک سوٹ اور ایک نائٹ سوٹ تھا۔ ویسے اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس نے عام ٹیکسی کے بجائے میٹرو کیب لی اور اسے ایک فائیو اسٹار ہوٹل چلنے کو کہا۔ ابھی رات کے تین بج رہے تھے، وہ صبح نو بجے تک آرام کرسکتا تھا۔ شپ منٹ اس وقت ایک گولڈ کمپنی کے پاس تھی۔ اسے وہاں سے لے کر حیدرآباد کے تاجر کے حوالے کرنا تھا۔ اس کے بعد زاہد کا کام ختم ہوجاتا۔ تاجر آگے خود گولڈ لے جاتا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنے لیے کمرا لیا اور کمرے میں آکر موبائل سے پہلے رومانہ کو خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی اور پھر حیدرآباد تاجر کو کال کی۔

''میں آگیا ہوں... آپ کل صبح گیارہ بجے تک پہنچ

جائیں۔“

”میں حاضر ہوتا ہوں سائیں۔“ تاجر بولا۔

زاہد لباس بدل کر لیٹ گیا۔ وہ گزشتہ تیس سال سے اس شہر میں رہ رہا تھا۔ اس ملک میں اس کی زندگی کے پچاس برس سے زیادہ گزرے تھے۔ یہاں کا پانی اور خوراک اس کے خون میں رچی ہوئی تھی مگر اسے یہاں سے کوئی انسیت نہیں تھی۔ اس نے کامل بے حسی سے یہاں سے اپنا کاروبار سمیٹا اور سرمائے کے ساتھ بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے نکل گیا۔ اس نے ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچا جو اس پر انحصار کرتے تھے۔ اس نے اچانک دفتر بند کیا اور لوگوں کی چھٹی کی تو کتنے ہی رو دیے ہوں گے۔ اس نے جو کمایا، اس سرزمین سے کمایا اور وہ اس سے لاتعلق ہو کر جا رہا تھا۔ اس نے کتنے لوگوں کو استعمال کیا جو بعد میں اس کا کیا دھرا بھگتنے کے لیے یہاں رہ گئے تھے۔ اسے رضوان کا خیال بھی نہیں آیا جسے اس نے جان بوجھ کر پھنسایا تھا۔ وہ ایک عام گھرانے کا واحد کفیل تھا۔ اب وہ کسی نامعلوم قید خانے میں پڑا سڑ رہا ہوگا۔

زاہد نے ضمیر نامی چیز کو بہت پہلے اپنے ذہن سے خارج کر دیا تھا۔ اس لیے وہ اب جو کرتا تھا، اس میں صرف اور صرف اپنا مفاد مدنظر رکھتا تھا۔ صبح بیدار ہو کر اس نے اپنے کمرے میں ناشتا طلب کیا اور پھر ہوٹل کی گاڑی میں وہ گولڈ کمپنی کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ تقریباً پچاس کلوگرام گولڈ تھا اور اس کی مالیت تیس کروڑ روپے کے آس پاس تھی۔ حیدرآباد سے تاجر آ گیا تھا۔ سونا لے کر اس کے حوالے کرنے میں تقریباً تین گھنٹے لگے۔ جب وہ سونا لے کر روانہ ہوا تو زاہد نے کال کر کے انڈین پارٹی کو سودے کی تکمیل سے آگاہ کیا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کا کمیشن اسے دبئی کے بینک اکاؤنٹ میں مل جائے گا۔ کام کے بعد وہ واپس آیا اور اس نے لنچ ہوٹل میں ہی کیا۔ اس کے بعد رات کی فلائٹ میں سیٹ کنفرم کرائی۔ اسے رات دس بجے ائرپورٹ پہنچنا تھا۔

رات دس بجے تک کا وقت اس نے ہوٹل اور اپنے کمرے میں گزارا۔ حیرت انگیز طور پر زاہد کو پینے پلانے اور شباب و کباب سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ اس نے ان سے سروکار ہی نہ رکھا ہو لیکن اس نے انہیں اپنی زندگی کا لازمی حصہ نہیں بنایا تھا۔ وہ فیملی والا شخص تھا مگر ساتھ ہی بہت بے رحم بزنس مین بھی تھا۔ رات ڈنر کر کے اس نے تیاری کی اور آٹھ بجے ہوٹل سے روانہ ہوا۔ اس بار بھی اس نے میٹرو کیب منگوائی تھی۔ وہ خوش تھا کہ سارا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا تھا اور وہ خدشے کے برعکس صحیح سلامت واپس جا رہا تھا۔ کیب ائرپورٹ کے پاس ایک سگنل پر رکی تو اچانک ہی دو افراد دائیں بائیں سے اندر گھس آئے۔ انہوں نے زاہد کو دبا لیا۔ وہ بوکھلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈرائیور نے آٹومیٹک ڈور لاک کیے ہوں گے مگر وہ کھلے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا ایک شخص نے اس کے منہ پر کپڑا رکھا اور دوسرے نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ زاہد نے مزاحمت کی کوشش کی، اس نے سانس روک لی مگر کب تک... اس نے سانس لی اور فوراً ہی اس کے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی آخری احساس یہ تھا کہ ڈرائیور نے کیب آگے بڑھا دی تھی۔ پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

کیب ڈرائیور نے انہیں سپر ہائی وے کے ساتھ سڑک سے ذرا دور ایک الگ تھلگ موجود مکان تک پہنچایا۔ یہ غیر آباد اسکیم تھی اور یہاں اِکا دُکا مکانات اور احاطے تھے جو لوگوں نے اپنی زمین کو قبضے سے بچانے کے لیے تعمیر کیے تھے۔ یہ مکان بھی بس احاطہ تھا۔ چار دیواری کے اندر کچھ کمرے بنے ہوئے تھے اور یہاں نہ بجلی تھی اور نہ گیس۔ احاطے میں ایک جنریٹر چل رہا تھا۔ کیب گیٹ سے اندر آئی تو جلال ... اور شوکت خان نے زاہد کو کھینچ کر گاڑی سے نکالا۔ شوکت خان نے ڈرائیور کے ہاتھ پر ہزار کے چند نوٹ رکھے، وہ اسے سلام کر کے واپس چلا گیا۔ یہ شوکت خان کا واقف کار تھا اور اس نے اس سے کام لیا تھا۔ وہ زاہد کی آمد اور اس کی نقل و حرکت سے پوری طرح آگاہ تھے اور انہوں نے اسے بہترین وقت پر اٹھا لیا تھا۔ زاہد کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کمرے میں کچا فرش تھا اور دیواریں بغیر پلاستر کے تھیں۔ ایک پیلا بلب روشن تھا اور اس کی روشنی میں کمرا خاصا بھیانک لگ رہا تھا۔ اس میں صرف ایک فولادی دروازہ تھا۔

مکان میں جلال، شوکت اور رضوان کے علاوہ صرف ایک شخص مقیم خان تھا جس کے ذمے تمام کام تھے۔ وہ کھانا لاتا، چوکیداری کرتا اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ اسے بھی شوکت لایا تھا۔ یہ مکان بہت عرصے سے یونہی پڑا تھا اور انہوں نے اسے نظر میں رکھا تھا۔ یہاں تمام انتظامات آج ہی کیے گئے تھے۔ زاہد کو لانے سے صرف چوبیس گھنٹے پہلے ہی سب ہوا تھا۔ رضوان گزشتہ ایک ہفتے سے ان کے ساتھ تھا اور ان کی مستعدی پر حیران تھا۔ وہ جرائم پیشہ تھے اور بظاہر ان پڑھ بھی تھے مگر انہوں نے واردات کی پلاننگ حیرت انگیز انداز میں کی تھی۔ ایک ایک چیز کا خیال رکھا تھا۔ طے ہوا تھا کہ زاہد کے سامنے جلال ... جائے گا اور وہی اس سے بات کرے گا۔ یہ سن کر رضوان دنگ رہ گیا کہ وہ اس سے ڈیڑھ ارب روپے کا تاوان مانگنے جا رہے تھے۔

”یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔“ اس نے گل فراز سے کہا۔ ”زاہد کبھی اتنا تاوان نہیں دے گا۔“

”وہ بالکل دے گا... اس نے صرف اسٹاک میں ہیر پھیر سے اس سے زیادہ رقم کمائی ہے۔ تم جانتے ہو، صرف تمہارے اکاؤنٹ سے پونے پانچ ارب کی رقم منتقل کی ہے۔ اس سے زیادہ رقم اس نے دوسرے طریقوں سے منتقل کی ہے۔“

رضوان جانتا تھا کہ یہ بات درست تھی لیکن پھر بھی ڈیڑھ ارب کی رقم اس کے گمان سے بھی زیادہ تھی۔ اس نے گل فراز سے پوچھا۔ ”رقم کیسے حاصل کی جائے گی؟“

”رقم تمہارے اسی اکاؤنٹ میں آئے گی جس سے زاہد باہر رقم بھیجتا تھا۔“ گل فراز مسکرایا۔

☆☆☆

زاہد کو ہوش آیا تو وہ کچے فرش پر پڑا تھا اور اس کے کپڑے اور بال گرد آلود ہو رہے تھے۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور دل متلا رہا تھا۔ یہ اس دوا کا اثر تھا جو اسے سنگھائی گئی تھی۔ مگر خراب حالت کے باوجود ہوش میں آتے ہی اسے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ کسی حد تک یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔ اس نے اپنا جائزہ لیا۔ اس کے پاس سے سوائے لباس اور جوتوں کے باقی ہر چیز غائب تھی۔ اس نے اپنا لباس اور بال جھاڑے اور ذرا پیچھے ہو کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی لیکن ساتھ ہی پیاس تنگ کرنے لگی تھی۔ باہر سے کسی مشین کی آواز آ رہی تھی۔ زاہد کو جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ جنریٹر تھا۔ اس آواز کے علاوہ یہاں سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آبادی سے دور کسی ویرانے میں ہے جہاں بجلی موجود نہیں تھی اور یہ بات درست تھی۔ یہ مکان ہائی وے سے کم سے کم چار سو گز کے فاصلے پر تھا۔ درمیان میں خاصی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ ہائی وے ٹریفک کا شور یہاں تک نہیں آ سکتا تھا۔ کمرے میں کہیں کوئی رخنہ نہیں تھا جس سے باہر جھانک کر وہ اندازہ کر سکتا کہ وہ کہاں ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور پھر وہ پُرشور انداز میں کھلا۔ باہر تاریکی تھی اور دروازے پر موجود آدمی ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اندر آیا تو زاہد کو سب سے پہلے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی خودکار رائفل نظر آئی۔ آدمی نے چہرے کا نچلا حصہ اپنی پگڑی کے پلو سے چھپا رکھا تھا۔ وہ جلال تھا۔ زاہد سنبھل گیا مگر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی۔

”زاہد احمد۔“ آنے والے نے گونجیلی آواز میں کہا۔ ”بابا تیرے کو ہوش آ گیا؟“

اس کے لہجے سے زاہد نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق اندرون صوبے سے تھا۔ اس کا انداز اور ہتھیار بتا رہا تھا کہ وہ جرائم پیشہ شخص ہے۔ ”ہاں... کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟“

”تو سمجھ دار آدمی ہے۔“ جلال نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”فوراً کام کی بات پر آ گیا۔ بابا! بات یہ ہے کہ تو ہمارے پاس ہے اور زندہ سلامت جانا چاہتا ہے تو اپنے بچوں سے بول ڈیڑھ ارب روپیا ادھر بھیج دیں۔“

”یہ بہت بڑی رقم ہے۔“ زاہد نے حیران ہوئے بغیر کہا۔ ”وہ نہیں دیں گے۔“

”دیں گے بابا... جب تیری آواز سنیں گے تو دیں گے۔“

زاہد چونکا۔ ”تم میری ان سے بات کراؤ گے؟“

”ہاں، تبھی تو وہ تیری آواز سنیں گے۔“

”میری بات کراؤ۔“ زاہد نے بے تابی سے کہا۔

”ضرور بابا! کیوں نہیں کرائے گا... ضرور کرائے گا۔“ جلال نے کہا اور اچانک رائفل کا دستہ زاہد کے منہ پر دے مارا۔ ضرب نہایت شدید تھی اور اس نے زاہد کے گال سے کھال پھاڑ دی۔ زاہد نے چیخ مار کر زخم پر ہاتھ رکھا۔ جلال نے یکے بعد دیگرے رائفل کے دستے سے اسے کئی ایسی چوٹیں لگائیں کہ اس کی حالت بری ہو گئی لیکن وہ بے ہوش نہیں ہوا۔ البتہ تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ اس پر یہ تشدد کیوں کیا جا رہا ہے جبکہ اس نے کسی بات سے انکار نہیں کیا ہے مگر جلال کسی سوال کا جواب دیے بغیر اپنا کام کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ پھر وہ پیچھے ہٹا اور اس نے زاہد کا جائزہ لیا۔ گال کے علاوہ اس کا سر بھی دائیں کنپٹی کے پاس سے پھٹ گیا تھا اور خون بہہ کر اس کے کپڑوں تک آ گیا تھا۔ جلال نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور اپنے لباس سے ایک جدید ترین ٹیب نکالا۔ یہ انٹرنیٹ... سروس کے ساتھ تھا، اس پر اسکائپ آن تھا۔ اس نے زاہد سے نہیں پوچھا اور اس کے دبئی والے اپارٹمنٹ کا نمبر ملایا۔ اسکائپ کی مدد سے کسی فون نمبر پر بھی کال کی جا سکتی ہے اور اس کا پتا چلانا ممکن نہیں تھا۔ چند گھنٹیوں کے بعد رومانہ نے کال ریسیو کی۔

”تو زاہد کی بیوی بات کر رہی ہے؟“ جلال نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”ہاں... تم کون ہو اور اس وقت کیوں کال کی ہے؟“ رومانہ نے اس کے لہجے پر برہم ہو کر کہا۔ دبئی میں صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ پاکستان میں ساڑھے پانچ بج گئے تھے۔

”تیرا شوہر ہمارے پاس ہے۔ اپنا اسکائپ آن کر... یہ تجھ سے بات کرے گا، اسے دیکھ بھی لینا۔“

”زاہد۔“ رومانہ پریشان ہوگئی۔ ”کون ہو تم...؟“

”اسکائپ آن کر۔“ جلال نے غرا کر کہا اور کال کاٹ دی پھر اس نے زاہد سے پوچھا۔ ”اپنی اسکائپ آئی ڈی بتا۔“

انکار کا فائدہ نہیں تھا اس لیے زاہد نے رک رک کر اپنی اسکائپ آئی ڈی بتائی اور جلال نے اسے ایڈ کر لیا۔ رومانہ تک ریکویسٹ گئی تھی، چند لمحے بعد اس نے قبول کر لی۔ جلال نے اسے اب اسکائپ سے ویڈیو کال کی۔ اس ٹیب میں بلٹن تھری جی انٹرنیٹ تھا اس لیے اس دور دراز جگہ بھی اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ جلال نے ویڈیو آن ہوتے ہی ٹیب کا رخ زاہد کی طرف کر دیا۔ کم روشنی میں خاک و خون میں لتھڑا زاہد بہت بری حالت میں دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رومانہ نے چیخ ماری۔ ”زاہد! آپ کو کیا ہوا ہے؟“

جلال جان بوجھ کر اس کے زخم اور جگہ جگہ لگ جانے والا خون دکھا رہا تھا۔ زاہد کوشش کر کے سیدھا ہوا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں ٹھیک ہوں، تم پریشان مت ہو۔“

”آپ کی کیا حالت ہو رہی ہے اور مجھ سے کہہ رہے ہیں پریشان نہ ہوں۔“ رومانہ رونے لگی۔ ”یہ... کون ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ زاہد بولا۔ ”مجھے فلائٹ کے لیے ائرپورٹ جاتے ہوئے اغوا کیا گیا اور میں کسی نامعلوم جگہ ہوں۔“

”زاہد! یہ کیا چاہتے ہیں؟ پلیز! ان سے کہو یہ تمہیں چھوڑ دیں... اس کے بدلے جو چاہے لے لیں۔“

”تیری بیوی سمجھ دار عورت ہے۔“ جلال ہنسا۔ ”اسے بتا ہم کیا چاہتے ہیں؟“

زاہد نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ”رومانہ! یہ ڈیڑھ ارب روپے مانگ رہے ہیں۔“

رومانہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر بہت زیادہ دولت کا مالک ہے، وہ ڈیڑھ ارب روپے دے سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”میں دوں گی لیکن تم انہیں چھوڑ دو۔“

”رومانہ! حواس میں رہو۔“ زاہد نے اسے تنبیہ کی۔ ”تم یہ رقم نہیں دے سکتیں۔“

جلال نے ٹیب اس طرح ایک طرف رکھا کہ رومانہ کو زاہد نظر آتا رہے اور پھر وہ اس کی طرف بڑھا۔ زاہد نے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہونے کی کوشش کی لیکن وہاں دیوار تھی۔ جلال نے پہلا وار اس کے شانے پر کیا۔ اس بار وہ اس کے ہاتھ پیروں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کے گھٹنوں، ٹخنوں اور شانوں کو نشانہ بنایا۔ رائفل کے دستے کی مار سخت تھی۔ زاہد کراہ رہا تھا اور خود کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جلال اپنے کام کا ماہر تھا۔ وہ پیچھے ہٹا تو زاہد کی حالت مزید ابتر ہو گئی تھی۔ اس دوران میں رومانہ مسلسل چیخ رہی تھی اور جلال کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے بچے بھی آگئے .... اور کمپیوٹر اسکرین پر اپنے باپ کی درگت بنتے دیکھ رہے تھے۔ جلال نے دوبارہ ٹیب اٹھایا۔ اس نے اسکرین پر اپنا چہرہ آنے نہیں دیا تھا۔ اس نے ٹیب کو زاہد کے سامنے کیا اور خونخوار لہجے میں کہا۔ ”اب بات کر اور بول... دو دن میں رقم کا انتظام کر کے رکھے پھر ہم بتائیں گے کہ رقم کیسے بھیجنی ہے؟“

صمد نے مائک سنبھال لیا تھا، وہ باپ سے بات کر رہا تھا۔ صورت حال اسے اسکرین پر نظر آ رہی تھی۔ زاہد نے اس سے کہا۔ ”صمد! تم ڈیڑھ ارب روپے کرو۔“

”پاپا! آپ جانتے ہیں دو دن میں یہ رقم نہیں ہو سکتی اور پھر اتنی بڑی رقم میں کیسے کروں گا؟“

”تم کوشش کرو۔“ زاہد نے مبہم انداز میں کہا۔ ”کہیں سے قرض لینے کی کوشش کرو، میں آ کر ادا کر دوں گا۔“

”پاپا! یہ رقم کون دے گا؟“

جلال نقاب تلے مسکرا رہا تھا۔ یہ ساری گفتگو اور ویڈیو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ اس نے اچانک مداخلت کی۔ ”تم دونوں باپ بیٹے اچھی اداکاری کر رہے ہو بابا... مگر اس کی داد کسی اور طرح سے ملے گی۔“

اس نے ویڈیو کال کاٹ دی اور ٹیب بند کر دیا۔ زاہد اسے روکتا رہ گیا مگر وہ باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے جلال دوسرے کمرے میں آیا جہاں گل فراز کے ساتھ عبدالرزاق اور عبدالقادر موجود تھے۔ اس نے ریکارڈنگ ان کے سامنے چلائی اور وہ اسے دیکھتے رہے۔ جب ریکارڈنگ ختم ہو گئی تو عبدالرزاق نے کہا۔ ”یہ بے وقوف بنا رہے ہیں۔ زاہد نے لازمی اپنے گھر والوں کو اپنے اکاؤنٹس اور دوسری چیزوں کے بارے میں بتا رکھا ہے۔ ڈیڑھ ارب کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے جلال ان لوگوں سے بات کرے۔“ گل فراز نے کہا۔

باقی دو نے اس سے اتفاق کیا اور جلال کو فون پر کال کرنے کا حکم دیا۔ اس نے زاہد کے دبئی والے اپارٹمنٹ کا نمبر ملایا۔ کال صمد نے ریسیو کی۔ جلال نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ”بابا غور سے سن... تیرے باپ نے ابھی آخری کھانا سات آٹھ گھنٹے پہلے کھایا تھا۔ پانی بھی اتنی دیر پہلے پیا ہوگا۔ اب اس کو کھانا پانی نہیں ملے گا جب تک ادھر رقم ہم کو نہیں مل جاتی۔ جتنی جلدی رقم ملے گی اتنی جلدی اس کو کھانا پانی مل جائے گا۔“

”دو دن میں رقم نہیں ہو سکتی۔“ صمد پریشان ہو کر بولا۔ ”وہ بوڑھے اور بیمار ہیں، ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”تب جتنے دن چاہے لگاؤ بابا۔ ہو سکتا ہے ادھر تم رقم بھیجے ادھر یتیم ہو جائے۔ تیرا باپ بھوک پیاس سے مر جائے۔“

”میری بات سنو...“ صمد نے کہنا چاہا لیکن جلال نے کال کاٹ دی اور پھر وہ عبدالقادر کے اشارے پر کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد گل فراز نے کہا۔

”پلان اچھا ہے لیکن اگر صمد اور اس کے ساتھ دوسروں نے فیصلہ کر لیا کہ باپ اور شوہر سے زیادہ رقم ضروری ہے تب...؟“

”تب ہم زاہد سے بات کریں گے۔“ عبدالرزاق نے کہا۔ ”وہ بہت شاطر آدمی ہے، اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی پتا ضرور ہوگا۔“

عبدالقادر نے سر ہلایا۔ ”ہمیں جلدی نہیں ہے۔ پولیس یا کسی کا خیال اس طرف نہیں جا سکتا۔“

گل فراز مسکرانے لگا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ رقم ملنے کا امکان زیادہ ہے بہ نسبت نہ ملنے کے۔“

یہ ان تینوں کا خیال تھا کہ جلدی کی ضرورت نہیں ہے لیکن جلال اور شوکت کا خیال ان سے مختلف تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس معاملے کو جتنی جلدی نمٹا دیا جائے، اتنا اچھا ہے۔ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں کل رقم کا دس فیصد دیا جائے گا مگر جلال کا خیال تھا کہ یہ رقم بہت کم تھی۔ سارا کام انہوں نے کیا تھا، پلاننگ سے لے کر عمل تک اور انہیں دس فیصد ملے گا جبکہ وہ تینوں نوے فیصد لے جائیں گے۔ جلال، عبدالقادر... کے علاقے اور ذات سے تھا۔ بہ ظاہر وہ اس کا وفادار تھا لیکن درحقیقت وہ صرف دولت کا وفادار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کے دور میں اور اس کے پیشے میں دولت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس سے پولیس اور انتظامیہ سمیت سب کو خریدا جا سکتا تھا۔ وہ تینوں رخصت ہو گئے اور ان کے ساتھ صرف مقیم خان رہ گیا۔ وہ شوکت خان کا وفادار تھا۔ صبح کا وقت قریب تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر ناشتا لینے چلا گیا۔ جلال اور شوکت صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ جلال نے اپنی پلی پلائی مونچھیں سہلائیں۔

”بابا! بات رقم تک پہنچ گئی ہے۔“

”لیکن رقم اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔“

”ملے گی بابا، ملے گی... اور اگر نہیں ملی تو ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔“

شوکت اس دوسرے راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر ایک اغوا کرنے والا گروہ کسی وجہ سے تاوان نہیں لے پاتا تھا تو وہ مغوی کو دوسرے گروہ کو فروخت کر دیتا تھا۔ شوکت کئی بار یہ کام کر چکا تھا۔ کبھی اس نے مغوی فروخت کیا تھا اور کبھی اس نے خریدا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ”پر اس میں زیادہ نہیں ملتا ہے۔“

”جتنا بھی مل جائے۔“ جلال نے کہا۔

”تیرا کیا خیال ہے؟“ شوکت نے سوچ کر کہا۔ ”ہمیں بس ساڑھے سات کروڑ ملے گا... باقی یہ لے جائیں گے۔“

جلال نے مونچھوں کو سہلانا جاری رکھا۔ ”بابا! میرا تو خیال ہے کام سارا ہم نے کیا ہے تو پیسا بھی ہمارے پاس آنا چاہیے۔“

”پر مسئلہ یہ ہے کہ ہم اندرونِ ملک سے پیسا وصول کر سکتے ہیں اور ادھر پیسا باہر سے آنا ہے۔“

جلال نے پُرخیال نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بابا تو پھر پیسا ادھر آنے کا انتظار کریں؟“

شوکت مسکرانے لگا۔ اس کے چہرے کا زخم زیادہ نمایاں اور بدصورت ہو گیا تھا۔ ان سے کچھ دور کمرے میں لیٹا ہوا رضوان کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کھیل میں اس کی حیثیت صرف ایک ایسے مہرے کی تھی جسے لازمی پٹوانا تھا اور جیسے ہی اس کا کام ختم ہوتا، شاید اسے بھی ختم کر دیا جاتا۔ اسے چھوڑنے کا مطلب تھا کہ گل فراز اینڈ پارٹی اپنے خلاف ایک گواہ چھوڑ دے۔ وہ کاروباری لوگ تھے، جرائم پیشہ نہیں تھے۔ وہ اپنے سر پر مستقل تلوار نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ آسان کام یہی تھا کہ رضوان کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ یہاں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا، اسے کمرے سے بھی بلا ضرورت باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جلال اور شوکت نے بلاواسطہ اس پر واضح کر دیا تھا کہ اگر اس نے

یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو امکان ہے اس کی روح ہی جاسکے گی اور جسم انہیں دفنانا پڑے گا۔ رضوان محسوس کر رہا تھا کہ بعد میں بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔

رضوان کو پتا نہیں تھا کہ زاہد یہاں آگیا ہے۔ وہ جس کمرے میں تھا، یہاں اسے کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ ویسے بھی باہر جنریٹر کا شور تھا۔ یہ جنریٹر تین گھنٹے چلتا تھا اور اس کے بعد دوسرا جنریٹر چلایا جاتا تھا۔ باری باری جنریٹرز چلانے سے انہیں مسلسل بجلی مل رہی تھی۔ یہاں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ سب باہر سے آتا تھا۔ مقیم خان کے پاس بائیک تھی، وہ دن میں دو بار باہر جاتا اور ساری چیزیں لے آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ باہر گیا ہوا تھا۔ رضوان کمرے سے باہر آیا اور کونے میں بنے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ ذرا سا کھلا رکھا اور باہر کا معائنہ کیا۔ اسے دائیں طرف والے صحن میں چارپائی پر شوکت اور جلال دکھائی دیے۔

وہ سر جوڑے آہستہ آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ رضوان کو ان کا انداز مشکوک لگا۔ پھر اس کی توجہ مکان کی چار دیواری کی طرف ہوگئی۔ یہ خاصی اونچی تھی، شاید نو فٹ اونچی تھی اور بغیر کسی چیز کی مدد کے اس پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ یہاں سوائے چارپائیوں کے ایسی کوئی چیز میسر نہیں تھی۔ دوسرے صحن میں ہمہ وقت کوئی نہ کوئی ہوتا تھا اس لیے موقع ملنا محال لگ رہا تھا۔ البتہ صحن میں ایک طرف پلاسٹر آف پیرس کے بنے ہوئے چہروں کے خول پڑے تھے۔ یہ مائع پلاسٹر آف پیرس سانچوں میں ڈال کر تیار کیے گئے تھے۔ شاید کسی زمانے میں یہاں یہ کام ہوتا تھا۔ ایک خول پر آنکھ والی جگہ کوئی سرخ چیز گری تھی۔ شاید یہ خول پر کرنے والا کلر تھا۔ اس کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے خول کی آنکھ سے خون نکل رہا ہو۔ کچے میں پڑے پڑے یہ خول کچرا ہو رہے تھے۔ بیشتر ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ بس چند ایک صحیح سلامت تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ آج کے انسانوں نے اپنے چہروں پر کتنے خول چڑھا رکھے ہیں۔ وہ کچھ دیر بعد باہر آیا تو خلافِ توقع اس نے شوکت خان کو موجود پایا۔ وہ اسے گھور رہا تھا۔

''اتنی دیر کیوں لگائی؟''

''میں باتھ روم آیا تھا۔'' رضوان نے وضاحت کی۔

''اب تم بغیر اجازت باہر نہیں آؤ گے... کمرے میں جاؤ۔'' شوکت خان نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ کمرے میں آیا تو باہر سے کنڈی لگنے کی آواز آئی۔ اس کمرے میں بھی سوائے ایک دروازے کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں کچے فرش پر ایک چارپائی تھی اور اوپر تار سے لٹکتا ہوا پیلا بلب تھا۔ یہ سوچ کر رضوان کا دل بیٹھنے لگا کہ اسے قید بھی کر دیا گیا ہے۔

☆☆☆

زاہد احمد بالکل پیچھے والے کمرے میں تھا۔ اسے بھی علم نہیں تھا کہ رضوان یہاں ہے۔ اگر پتا بھی ہوتا تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پڑ چکا تھا اور فی الحال اس سے نکلنے کی کوئی راہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اتنا سمجھ رہا تھا کہ اس پر تشدد اس کے بیوی بچوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ معاملہ یہاں تک رہتا تب بھی برا نہیں تھا مگر اسے خدشہ تھا کہ شاید اسے چھوڑا نہیں جائے گا۔ اس کے سامنے آنے والا شخص لہجے اور حلیے سے اندرون صوبے کا جرائم پیشہ لگ رہا تھا مگر اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بات اتنی سادہ نہیں ہے کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کرلیا گیا ہے۔ رقم نے اسے چونکا دیا تھا۔ ڈیڑھ ارب روپے خاصی بڑی رقم تھی۔ یہ تقریباً اس رقم کے مساوی تھی جو اس کی اسٹاک فرم نے مارکیٹ کریش میں گنوائی تھی۔

زاہد احمد نے وہی کھیل کھیلا تھا جو اسٹاک بروکر اکثر کھیلتے ہیں۔ اس نے ایسے شیئرز تھرڈ پارٹی کی مدد سے خریدے جن کی مارکیٹ ویلیو نہ ہونے کے برابر تھی اور پھر انہیں فیس ویلیو پر اپنی اسٹاک فرم کے توسط سے خرید لیا۔ سرمایہ کاروں کے اربوں روپے اس میں لگے۔ مارکیٹ بیٹھتے ہی ان شیئرز کی اصلیت سامنے آگئی اور سوائے زاہد کے سب نقصان میں رہے تھے۔ زاہد جانتا تھا کہ اس کی فرم کے بعض ڈائریکٹرز خطرناک لوگوں کے لیے کام کرتے ہیں۔ وہ ان کی بلیک منی اسٹاک میں لگا کر وائٹ کرتے تھے مگر یہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ تقریباً سارے بروکر یہ کام کرتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ مارکیٹ کریش میں جن لوگوں کی رقم ڈوبی تھی، ان میں یہ خطرناک لوگ بھی شامل تھے۔ اصل ذمے دار گل فراز، عبدالرزاق اور عبدالقادر منگی تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے اپنی گردن بچانے کے لیے اسے پھنسانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ڈیڑھ ارب دینا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے گزشتہ دس سالوں میں بہت کمایا تھا۔ ڈالرز باہر بھیجنے میں صرف وہی ملوث نہیں تھا۔ اس نے کمیشن پر یہ کام کیا تھا اور اسے دس فیصد ملا تھا۔ یہ دس فیصد اتنا تھا کہ اس کی ساری عمر کی کمائی

ایک طرف تھی۔ ساتھ ہی وہ جانتا تھا کہ اس کمائی کے ساتھ وہ پاکستان میں نہیں رہ سکے گا۔ یہاں جرائم پیشہ افراد کی ایسی مافیائیں وجود میں آگئی تھیں جو دولت والوں کی بو سونگھتی تھیں۔ جیسے درندے جنگل میں شکار تلاش کرتے ہیں اور جہاں سے انہیں دولت کی خوشبو آجاتی، وہاں وہ جھپٹ پڑتے تھے۔ زاہد خود شکاری تھا مگر درندہ نہیں تھا۔ وہ دوسروں کی آڑ میں شکار کرتا تھا اور مردار خور تھا۔ ایسے شکاریوں کو خود خطرہ ہوتا ہے اس لیے وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا بلکہ نکل بھی گیا تھا۔ اگر وہ واپس نہ آتا تو کبھی نہ پھنستا۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اغوا کرنے والے اس کے بارے میں سب جانتے تھے۔ حد یہ کہ اس کے دبئی والے اپارٹمنٹ کا فون نمبر بھی جانتے تھے۔

باہر روشنی ہوگئی تھی کیونکہ دروازے کی درز سے ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ اچانک جنریٹر کی آواز بند ہوگئی۔ سناٹا ہوا تو زاہد جلدی سے اٹھ کر دروازے تک آیا۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ باہر سناٹا تھا ایسا سناٹا۔ جیسے یہ جگہ آبادی سے بہت دور کسی ویرانے میں ہو۔ اسی لمحے دوسرا جنریٹر اسٹارٹ ہوا اور اس کا شور ہوا تو زاہد واپس اپنی جگہ آگیا۔ کچے فرش اور وہاں صفائی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جگہ استعمال نہیں ہوتی تھی۔ اندر دیواروں پر پلاستر اور سفیدی تک نہیں تھی۔ زاہد کو لگا اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ وہ کسی ایسی جگہ تھا جہاں سے کوئی اسے چھڑا نہیں سکتا تھا۔ چھڑانا تو دور کی بات تھی، کوئی جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ اغوا ہوگیا ہے، سوائے اس کے گھر والوں کے۔ اگر وہ پولیس سے رابطہ کرتے، تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پولیس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ کسی نامعلوم جگہ قید زاہد کو آزاد کرا لے گی۔ اس کی رہائی صرف ایک صورت میں ممکن تھی کہ ان لوگوں کا مطالبہ پورا کردیا جاتا۔

زاہد بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا۔ موسم اتنا گرم نہیں تھا مگر اس بند کمرے میں حبس تھا اور اس وجہ سے گرمی لگنے لگی تھی۔ زاہد نے اپنا کوٹ اتار کر زمین پر بچھا لیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اسے پیاس لگ رہی تھی مگر اس نے پانی کے لیے دروازہ نہیں بجایا۔ اسے ڈر تھا کہ ایسی صورت میں پانی دینے کے بجائے اسے تشدد کا نشانہ نہ بنایا جائے۔

ڈیڑھ ارب روپے کا بندوبست کرنا دشوار نہیں تھا۔ وہ صمد کو جو لفافہ دے کر آیا تھا، اس میں اس کے تمام اکاؤنٹس کی تفصیلات تھیں اور صمد اکاؤنٹ سے رقم نکلوا بھی سکتا تھا۔ اس اکاؤنٹ میں دو کروڑ ڈالرز جمع تھے۔ اسے خوشی تھی کہ صمد نے فوری حامی نہیں بھری۔ وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے زاہد کے بغیر یہ کام مشکل ہو۔ حالانکہ خود صمد کے پاس اس سے زیادہ رقم موجود تھی۔ یہ وہ کیش تھا جو زاہد نے اسے انصاری کے ساتھ مل کر کنسٹرکشن کا بزنس کرنے کے لیے دی تھی مگر ان لوگوں کا مطالبہ اتنی جلدی پورا کرنے کا مطلب ہوتا ان کو شہ دینا یا وہ زاہد کے بارے میں جو عزائم رکھتے تھے ان کو جلد سامنے لے آتا۔ اگر کسی طرح ان لوگوں کو قائل کرلیا جاتا کہ رقم زاہد کے بغیر نہیں مل سکتی ہے تو اس کی آزادی کا امکان ہوسکتا تھا یا پھر تاوان کی رقم کم ہوجاتی۔ مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس سے بات کرتے۔ اس پہلی ملاقات کے بعد وہ اسے جیسے بھول گئے تھے۔ زاہد سوچتے سوچتے تھک گیا۔ اب اس کے دل و دماغ پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ اگر انہوں نے اسے رہا نہ کیا اور مار دیا تو؟ یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں آرہا تھا۔ اس نے بہت دولت کمائی تھی۔ زندگی کے تیس سال اس نے دن رات کام کیا تھا۔ اچھے برے کی پروا کیے بغیر دولت کمائی تھی۔ اب وہ اس دولت سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا اسی لیے وہ بیوی بچوں کے ساتھ باہر گیا تھا۔ وہ اپنی باقی عمر کینیڈا میں گزارنا چاہتا تھا۔ کینیڈا اسے پسند تھا۔ وہاں کاروباری مواقع اچھے تھے۔ اگر وہ کاروبار نہ بھی کرتا تب بھی ٹھاٹ سے رہ سکتا تھا۔ مگر وہ کینیڈا جانے کے بجائے اس تنگ وحشت ناک کمرے میں قید تھا۔ مزید ایک گھنٹا گزر گیا۔ اب اس کی پیاس ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ بجایا اور چلایا۔

”کوئی ہے... مجھے پانی دو۔“

وہ دروازہ بجاتا رہا اور پانی مانگتا رہا مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ فولادی دروازہ پیٹنے سے اس کے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ تھک ہار کر وہ واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اب وہ دھیمی آواز میں گالیاں دے رہا تھا اور یہ وہ گالیاں تھیں جو اسے ناپسند تھیں۔ مگر اس وقت بے اختیار اس کے منہ پر آگئی تھیں۔ وہ تھک گیا تھا، اس لیے نیچے لیٹ گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد دروازہ کھلا، وہ غنودگی میں چلا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر روشنی کا سیلاب آگیا، اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ آنے والا جلال تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا تو زاہد دیکھنے کے قابل ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجھے پیاس لگی ہے... پانی دو۔“

”بابا! تجھے پانی تب ملے گا جب ہم کو تاوان کی رقم مل جائے گی۔ لے بات کر اپنے بیوی بچوں سے، ان کو بتا۔“ جلال نے ٹیب نکال کر اس کے سامنے کیا۔ ”ان کو بتا پیاس سے تیرا برا حال ہے۔“

رومانہ اور بچے زاہد کی حالت دیکھ کر تڑپ گئے۔ چند گھنٹوں میں اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا اور ہونٹوں پر پیاس سے پپڑی جم گئی تھی۔ صمد غصے سے بولا۔ ”یہ ظلم ہے... تم لوگ ڈیڑھ ارب روپے مانگ رہے ہو اور پاپا کو اس حال میں رکھا ہوا ہے۔“

”بابا! اسے کھانا پانی سب مل جائے گا بلکہ اسے چھوڑ دیا جائے گا۔“

”رقم کا بندوبست کرنے میں وقت لگے گا۔“ رومانہ نے کہا۔ ”اتنی دیر یہ بھوکے پیاسے رہیں گے؟ ان کی حالت دیکھو... رحم کرو۔“

”یہ تمہارا آدمی ہے، تم رحم کرو۔“ جلال کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔ ”ہم ڈاکو آدمی ہے، ہم کیا رحم کرے۔ ہم تو جانتا ہی نہیں ہے رحم کیا ہوتا ہے۔“

”تم پاپا کو کھانا نہ سہی پانی تو دے سکتے ہو۔“ صمد نے کہا۔ ”یہ دل کے مریض ہیں۔ انہیں کچھ ہوگیا تو تم تاوان کس سے لوگے؟“

”اس کی ایک ہی صورت ہے بابا۔“ جلال نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس کو کھانا پانی سب مل جائے گا پر ہم کو دو دن میں تاوان نہ ملا تو اس کو آگے بیچ دیں گے۔ ابھی بات کراچی میں ہے، ہوسکتا ہے پھر یہ دور چلی جائے جہاں سے اسے موت آکر آزاد کرائے۔ اب فیصلہ کرلو۔ دو دن میں رقم دے سکتا ہے تو اسے کھانا پانی دیتا ہے ورنہ...“

”ہم تمہیں ایک گھنٹے بعد بتاتے ہیں۔“ صمد نے کہا اور ویڈیو کال بند کردی۔ اس دوران میں زاہد نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتا اور دیکھتا رہا۔ جلال نے اس کی طرف دیکھا۔

”تو نے سن لیا نا... اب دیکھ تیری بیوی بیٹا کیا فیصلہ کرتے ہیں۔“

زاہد پریشان ہوگیا۔ یہ دھمکی سن کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے کہ اسے کسی دوسرے گروہ کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے جو پھر اس کے گھر والوں سے بات کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح تاوان کی رقم بڑھ جاتی ہے اور دوسری کئی پیچیدگیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ابھی معاملہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تاوان کی ادائیگی کم کرا سکتا تھا اور اسے رہائی بھی مل سکتی تھی۔ اگر یہ لوگ اسے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ فروخت کردیتے تو اس کی رہائی کا امکان کم ہوجاتا۔ جلال اس کے سر پر کھڑا تھا۔ زاہد سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”دیکھو، میرے بغیر یہ ڈیڑھ ارب نہیں کرسکتے... ہاں پچاس کروڑ روپے مل سکتے ہیں۔“

”ڈیڑھ ارب روپے سے ایک روپیا کم نہیں ہوگا بابا۔“ جلال نے ذرا جھک کر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اس لیے اب یہ بات دوبارہ اسی وقت کرنا جب مرنے کا ارادہ ہو۔“

یہ بات زاہد نے بھی محسوس کرلی تھی کہ تاوان کی رقم بہت سوچ سمجھ کر مانگی گئی ہے اور اس میں کمی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”تب کوشش کرنا پڑے گی۔“

”کرلو بابا۔“ جلال نے بے پروائی سے کہا۔ ”بھوک پیاس تو تجھے برداشت کرنی ہے۔“

”کیا میں اکیلے میں اپنے بیوی بچوں سے بات کرسکتا ہوں؟“

جلال ہنسا۔ ”سیٹھ... تجھے میری شکل نظر نہیں آرہی پر کیا آواز اور باتوں سے کم عقل لگتا ہوں؟ جو بات ہوگی، سامنے ہوگی۔“

زاہد گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایک گھنٹے بعد جلال نے دوبارہ اسکائپ کال کی اور رومانہ نے کال ریسیو کی۔ اس نے جلال سے کہا۔ ”پہلے میری زاہد سے بات کراؤ۔“

جلال نے ٹیب زاہد کے سامنے کردیا۔ ”تیری بیوی بات کرے گی۔“

”زاہد۔“ رومانہ نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تاوان دینا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ زاہد نے کہا۔ ”صمد سے کہنا جاتے ہوئے میں نے اسے جو چیز دی تھی اس سے مدد لے۔“

”اس نے دیکھ لیا ہے۔“ رومانہ نے سر ہلایا۔ ”ہم جلد از جلد کوشش کریں گے۔“

”تم بارہ گھنٹے میں کرسکتے ہو۔“

”تم میری بات سن رہے ہو۔“ رومانہ نے جلال کو پکارا۔ ”میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ انہیں پانی اور کھانے کو کچھ دو۔ اب ہماری ڈیل ہوگئی ہے۔“

”بابا! ابھی تو بات ہوئی ہے، جب کچھ ہاتھ میں آئے گا تو تیرے شوہر کو بھی کھانا پانی مل جائے گا۔“ جلال نے کہا۔ ”تیرا آدمی بول چکا ہے۔ تم لوگ بارہ گھنٹے میں رقم کا انتظام کرسکتے ہو۔ اب میں بتاتا ہوں کہ رقم کس صورت میں چاہیے۔ رقم یورو میں ہو۔ جب رقم ہوجائے تو بتانا، تم کو ایک بینک اور اکاؤنٹ کا بتایا جائے گا تم رقم اس میں جمع کراؤ گی۔“

رومانہ اور زاہد دونوں چونک گئے۔ رومانہ نے بے یقینی سے کہا۔ ”تم بینک سے رقم منگوا رہے ہو؟“

”تم لوگ پکڑے جاسکتے ہو۔“ زاہد نے کہا۔ اس کے

لہجے میں ہلکی سی امید آئی تھی۔

''وہ پکڑا جائے گا جس کا اکاؤنٹ ہے۔'' جلال ہنسا۔ ''وہ بھی اگر پولیس کے ہاتھ آیا تو۔۔۔؟ ہاں بابا جب تک رقم نکل کر ہمارے پاس نہیں آجاتی، یہ بندہ یہیں رہے گا۔'' جلال نے زاہد کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ کیوں جب رقم تمہارے اکاؤنٹ میں بھیج دی جائے تو تم بھی انہیں چھوڑ دو۔''

''زیادہ مت بولو۔'' جلال نے رومانہ کو جھڑک دیا۔

''تمہاری نیت ٹھیک نہیں ہے۔'' رومانہ غصے سے بولی۔ ''تم انہیں بعد میں بھی نہیں چھوڑو گے۔''

''ہم نے اس کا کیا کرنا ہے۔'' جلال نے کہا۔ ''اب بولو میں تم سے کب بات کروں؟''

''بارہ گھنٹے بعد۔'' رومانہ نے کہا۔ ''اچھا کم سے کم پانی تو دے دو، زیادہ نہیں تو ایک گلاس دے دو۔ اسے ایک بہن کی التجا سمجھ لو۔''

اس بار جلال سے انکار نہیں ہوا۔ ''ٹھیک ہے، اسے ایک گلاس پانی مل جائے گا لیکن اب اس سے زیادہ کچھ مت کہنا۔''

☆☆☆

رضوان بہترین لباس میں اور پوری طرح تیار ہو کر اس بینک میں داخل ہوا۔ شوکت خان اور اس کا ایک ساتھی باہر گاڑی میں موجود تھے۔ شوکت نے گاڑی سے اترنے سے پہلے اسے خبردار کیا۔ ''کوئی الٹا سیدھا خیال مت لانا۔ تم ضمانت پر ہو اگر پکڑے گئے تو پولیس جیل بھیج دے گی۔ اور یاد رکھنا ہمارے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ تمہارے گھر تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''میں کوئی حرکت نہیں کروں گا۔'' رضوان نے آہستہ سے کہا۔ سچی بات تھی کہ اس میں ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جان گیا تھا کہ یہ کتنے خطرناک لوگ ہیں اور انسان کی حیثیت ان کے نزدیک مچھر مکھی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی حیثیت ان لوگوں میں ایسے تھی جیسے کوئی بھیڑ بھیڑیوں کے نرغے میں آگئی ہو اور کسی بھی لمحے اس کی جان جا سکتی تھی۔ شوکت خان یا جلال ہر تیسرے دن ایک دو منٹ کے لیے گھر والوں سے اس کی بات کراتے تھے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے گھر تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ گزشتہ رات شوکت نے اسے بہترین سوٹ دیا تھا اور تیار ہونے کا دوسرا سامان دیا تھا۔

''تیار رہنا۔۔۔ کل تجھے بینک جا کر اکاؤنٹ کھولنا ہے۔''

''کیسا اکاؤنٹ؟''

''جس سے تو زاہد والے اکاؤنٹ سے رقم ٹرانسفر کرے گا۔''

''لیکن وہ اکاؤنٹ تو عدالت کے حکم سے بند کیا جا چکا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تب تیرے اسی اکاؤنٹ میں رقم آجائے گی۔'' شوکت نے بے پروائی سے کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اگلے دن وہ تیار ہوا۔ نہا دھو کر اور شیو بنا کر اس نے سوٹ پہنا۔ اس کے ساتھ بہترین جوتے اور ایک نیا بریف کیس بھی تھا۔ مکان کے باہر ایک تقریباً نئی کرولا کار کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی ڈرائیور کی وردی پہنے موجود تھا۔ وہ روانہ ہوئے۔ کلفٹن کے علاقے میں ایک غیر ملکی بینک کی یہ برانچ زرمبادلہ کے اکاؤنٹ بھی ڈیل کرتی تھی۔ شوکت خان کی دھمکی نے رضوان کے فرار کے بارے میں موہوم سے ارادے کو بھی ختم کر دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''لمبا کام ہے، دیر لگ سکتی ہے۔''

''فکر مت کرو۔'' شوکت نے کہا اور ایک چھوٹا سا مائک اس کی جیب میں ڈال دیا۔ ''اسے مت چھیڑنا، یہ آف نہیں ہوگا۔ ہم تمہاری ساری گفتگو سنے گا۔ اگر تمہاری آواز نہیں آئی تو اس کا مطلب ہوگا کہ دال میں کالا ہے۔''

رضوان مزید بے بس ہو گیا۔ وہ بینک کی شاندار عمارت میں داخل ہوا۔ باہر کسی قدر گرمی کے مقابلے میں اندر خنکی تھی۔ اس نے ریسپشن پر موجود الٹرا ماڈرن حلیے والی لڑکی سے کہا۔ ''مجھے فارن ایکسچینج اکاؤنٹ کھلوانا ہے۔''

''آپ مس ایمن کے پاس چلے جائیں۔'' لڑکی نے ایک طرف موجود کیبنوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ تیسرے نمبر کا کیبن ہے لیکن ابھی وہ مصروف ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر لیتا ہوں۔'' رضوان نے کہا۔ وہ ایمن کا نام سن کر چونکا۔ اسے ایمن صدیقی کا خیال آیا تھا۔ اسی لمحے کیبن سے ایک خاتون اور ان کے پیچھے ایمن نکلی۔ وہ خاتون کو رخصت کرنے اٹھی تھی۔ ان سے ہاتھ ملا کر وہ دوبارہ کیبن میں چلی گئی۔ اسے دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے ویٹنگ نشستوں پر جا کر بریف کیس کھولا اور مائک جیب سے نکال کر اس میں ڈال کر بند کر دیا۔ اسے امید تھی کہ ائر ٹائٹ بریف کیس میں یہ کام نہیں کرے گا پھر وہ ایمن کے کیبن کی طرف بڑھا۔ اس نے کارڈ بورڈ پر ہلکی سی دستک دی تو ایمن نے چونک کر دیکھا اور اسے دیکھ کو اس

کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''رضوان تم۔۔۔؟''

وہ اندر آیا اور میز کے دوسری طرف موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''ہاں لیکن اونچی آواز سے بات مت کرو۔''

جب رضوان نے ایمن کو جتا دیا کہ وہ اس کی طرف نہیں بڑھ سکتا ہے تو ایمن پیچھے ہٹ گئی تھی پھر دو مہینے بعد اس نے جاب چھوڑ دی تھی۔ اس کے بعد بس کبھی کبھی کال پر اس سے ہیلو ہائے ہو جاتی تھی مگر وہ کیا کر رہی تھی، رضوان اس سے ناواقف تھا۔ ایمن چونکی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایسی کیا بات ہے؟''

بینک میں اس جگہ لائن سے کیبن بنے تھے جہاں آفیسر کسٹمرز کو ڈیل کرتے تھے۔ کیبن بس چھ فٹ اونچے اور اوپر سے کھلے ہوئے تھے۔ رضوان نے کہا۔ ''ہماری گفتگو کوئی اور تو نہیں سنے گا؟''

''ایسی بات ہے تو میرے ساتھ آؤ۔''

ایمن اسے ایک الگ کمرے میں لے آئی۔ اس کے پارٹیشن شیشے کے تھے۔ آر پار دیکھا جا سکتا تھا لیکن یہاں ہونے والی گفتگو باہر نہیں سنی جا سکتی تھی۔ رضوان کے پاس وقت کم تھا اس لیے اس نے تیزی کے ساتھ مختصر الفاظ میں ایمن کو پوری کہانی سنائی۔ وہ دنگ رہ گئی۔ ''میرے خدا۔۔۔ تم پر یہ گزری؟ جب تم سے رابطہ نہیں ہوا اور سیل بھی بند جانے لگا تو میں سمجھی کہ اب تم مجھ سے سیل پر بھی بات نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ یہاں سے واپس جا چکے ہو ہرنا تا توڑ کر۔۔۔''

''لیکن اب تم جان گئی ہو کہ میں کن مصیبتوں میں پھنس چکا ہوں۔ سب سے بڑا خطرہ میری جان کو ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ تاوان کی رقم وصول کرتے ہی مجھے مار دیں گے۔''

ایمن نے تجویز دی۔ ''ہمیں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

رضوان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ پولیس کے بس کا روگ نہیں ہے ایمن۔۔۔ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ میرے گھر والوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں اور میں ان کی ذات پر ذرا سا بھی رسک نہیں لے سکتا۔''

ایمن پریشان ہو گئی۔ ''پھر تم کیا کرو گے؟''

رضوان نے کہا۔ ''ابھی کچھ مہلت ہے۔ جب تک یہ لوگ تاوان کی رقم حاصل نہیں کر لیتے، مجھے خطرہ نہیں ہے۔ ہاں اس کے بعد میری ضرورت باقی نہیں رہے گی۔''

ایمن سوچنے لگی۔ ''ہم اس پروسیس کو سلو کر سکتے ہیں جیسے بینک اکاؤنٹ ایکٹو کرنے میں دو دن لگا دیں۔ اسی طرح رقم نکالنے میں پابندی ہو کہ ایک خاص حد سے زیادہ رقم نہیں نکل سکتی ہے۔''

''رقم بہت بڑی ہے، ڈیڑھ ارب روپے کے مساوی یورو آئیں گے۔''

ایمن حیران رہ گئی۔ ''میرے خدا! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''ہاں اور یہ زاہد احمد کے گھر والے ادا کریں گے۔'' رضوان نے تلخی سے کہا۔ ''اس نے جو گڑھا میرے لیے کھودا تھا، اس میں خود گر گیا۔''

''وہ جائے جہنم میں۔۔۔ ابھی تو مسئلہ تمہارا ہے۔'' ایمن بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیسے اس چکر سے نکلو گے؟''

''خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا۔'' رضوان نے کہا۔ ''سنو، وقت کم ہے۔۔۔ اتنی دیر خاموشی رہے گی تو ان لوگوں کو شک ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، ہم بات کرتے ہیں۔ تم مائک نکال لو اور ساتھ ہی کاغذ پر تمام تفصیلات لکھتے جاؤ۔ ان کے نام، جگہ جہاں تمہیں اور زاہد کو رکھا گیا ہے اور کوئی ایسی چیز جس سے ان تک پہنچنے میں مدد ملے۔''

رضوان نے مائک نکال لیا اور پھر وہ یوں آپس میں بات کرنے لگے جیسے اجنبی ہوں۔ ایمن نے معذرت کی کہ اسے خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ رضوان نے اسے بتایا کہ وہ فارن ایکسچینج اکاؤنٹ کھلوانے آیا ہے۔ ایمن اسے اکاؤنٹ انفارمیشن دینے لگی۔ رضوان نے اسے بتایا کہ اسے ایسا اکاؤنٹ کھلوانا ہے جس میں رقم نکالنے یا جمع کرانے پر کوئی پابندی نہ ہو۔ ایمن نے بتایا کہ ایسا اکاؤنٹ کم سے کم دس ہزار ڈالرز سے کھلتا ہے۔ وہ راضی ہو گیا کیونکہ اس کے پاس بریف کیس میں اتنی ہی رقم موجود تھی۔ اسے بھیجنے والے اکاؤنٹس کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ اکاؤنٹ کھلنے کی کارروائی میں تقریباً ایک گھنٹا لگا۔ رضوان کی تصویر اور انگلیوں کے ڈیجیٹل پرنٹ لیے گئے۔ اس نے دس ہزار ڈالرز جمع کرائے۔ ایمن نے اسے بتایا کہ بعض وجوہات کی بنا پر چیک بک اور کریڈٹ کارڈ چار دن میں بن کر آئے گا۔ یعنی اس کے پاس چار دن کا وقت تھا۔ پانچویں دن چیک بک آتے ہی وہ بینک سے رقم نکلوا لیتے۔ یہ تقریباً ایک کروڑ دس لاکھ یورو بنتے تھے۔ پانچ سو یورو کے نوٹ کی صورت میں یہ رقم تقریباً دو سو بیس گڈیوں میں آجاتی۔ یہ رقم دو بڑے بیگز

میں آسکتی تھی اور اس کا وزن پچیس کلوگرام سے زیادہ نہیں ہوتا۔ یعنی رقم ایک ہی بار میں لے جائی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد رضوان کا کام ختم ہو جاتا۔ وہ باہر آیا تو شوکت خان بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ وہ اس کے کار میں بیٹھتے ہی غرایا۔
"تم نے اتنی دیر لگادی؟"
"میں نے بتایا تھا ناکہ دیر لگے گی۔"
"اور چیک بک دو دن میں آتی ہے۔ یہ لڑکی چار دن کا کیوں کہہ رہی تھی؟"
"تم نے سنا ہوگا کہ کوئی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے چیک بک اور کریڈٹ کارڈ لیٹ آرہا ہے۔"
شوکت خان کا موڈ خراب تھا۔ اب معاملہ دو دن آگے چلا گیا تھا۔ وہ واپس پہنچے۔ رضوان کو اس کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ شوکت خان دوسرے کمرے میں آیا جہاں گل فراز، عبدالرزاق اور عبدالقادر منگی موجود تھے۔ ان کے ساتھ جلال بھی تھا۔ شوکت نے انہیں ریکارڈنگ سنائی جو مائک کی مدد سے اس نے ریکارڈ کی تھی۔ وہ غور سے سن رہے تھے۔ جب ریکارڈنگ ختم ہوئی تو گل فراز نے شک سے کہا۔
"اتنی دیر یہ خاموش رہا اور کوئی دوسری آواز بھی نہیں آئی۔"
"ہاں... سرے سے کوئی آواز نہ آنا شک کی بات ہے۔" عبدالرزاق نے سرہلایا۔
"میرا نہیں خیال کہ اس نے کوئی چکر کیا ہے۔ وہاں بینک میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔" شوکت نے تردید کی۔ "ہم دو گھنٹے سے زیادہ باہر رہے اور اس دوران میں مشکل سے دس بارہ لوگ بھی اندر نہیں گئے تھے اور ممکن ہے یہ کسی الگ تھلگ جگہ بیٹھا ہو۔"
"رقم لینے کون جائے گا؟" عبدالقادر نے سوال کیا۔
"ہم تینوں جائیں گے۔" عبدالرزاق نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "ہم وہیں اپنی اپنی رقم لے کر اپنی راہ لیں گے۔"
"سرعام؟" گل فراز نے سوال کیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ معاملہ بہت بڑی رقم کا تھا... کوئی کسی کا اعتبار نہیں کرے گا۔
"ہاں، ہم گاڑیوں میں ہوں گے۔" عبدالقادر نے کہا۔ "رضوان اندر سے رقم تین الگ الگ بیگز میں لے کر آئے گا۔ اس میں سب کے حصے کے حساب سے الگ الگ رقم ڈالے گا۔ وہ بیگ باہر آکر ہمارے حوالے کرے گا۔ ہم سب اپنی اپنی رقم چیک کریں گے اور روانہ ہو جائیں گے۔ اگر گڑبڑ ہوئی تو موقع پر ٹھیک کرلی جائے گی۔"
شوکت خان اور جلال... خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہے تھے مگر ان کے چہرے سپاٹ تھے۔ پھر جلال نے زبان کھولی مگر اس نے اپنے حصے کے بجائے رضوان کے بارے میں پوچھا۔ "چھوکرے کا کیا کرنا ہے سائیں؟"
گل فراز نے معنی خیز انداز میں باقی دو کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اسے چھوڑنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"
"ٹھیک ہے سائیں... ادھر ایک خالی ٹینک ہے، اسے ادھر ڈال جائیں گے۔"
"زاہد کا کیا کرنا ہے؟" عبدالرزاق نے پوچھا۔
"یہ فیصلہ ہم تینوں کو کرنا ہے۔" گل فراز نے کہا۔ "اگر دو افراد اس کی موت کا کہتے ہیں تو اسے موت ملے گی۔ اگر دو آدمیوں نے اس کی زندگی کا کہا تو اسے چھوڑ دیں گے۔"
"سائیں ایک تجویز ہے۔" جلال نے مداخلت کی۔ "اگر تم لوگ مانو تو..."
"کیا تجویز ہے؟"
"سائیں اسے ہمارے حوالے کر دو۔ بڑی پارٹی ہے، دوبارہ تاوان دے سکتی ہے۔ ہم اسے آگے بیچ دیں گے۔"
عبدالرزاق نے نفی میں سرہلایا۔ "اس میں خطرہ ہے۔ اگر دوسری پارٹی کی غلطی سے پکڑے گئے اور زاہد مل گیا تو پوری چین پکڑی جائے گی۔"
"سائیں، ہم سامنے آئے بغیر تیسری پارٹی کی مدد سے بیچے گا۔" جلال نے اصرار کیا۔
"آج کل حالات بدل رہے ہیں۔ آنے والے دنوں میں سختی ہوگی۔" گل فراز نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "بہتر ہے اس معاملے کو زمین میں دبا دیا جائے۔"
عبدالرزاق زاہد کے قتل کے حق میں نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح زاہد کے گھر والے پیچھے پڑے رہیں گے اور کیس کو کہیں نہ کہیں اٹھاتے رہیں گے۔ اگر اسے چھوڑ دیا جاتا تو امید تھی کہ وہ خاموش ہو جاتے۔ مگر گل فراز اور عبدالقادر کا خیال تھا کہ وہ سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ اس کا شک لازمی ان لوگوں کی طرف جائے گا اور اگر زاہد نے کوئی بڑی ڈور ہلائی تو وہ مشکل میں پڑ سکتے تھے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ رضوان کے ساتھ اسے بھی ٹینک میں ڈال دیا جائے۔ ٹینک نو فٹ گہرا تھا اور وہ کسی کی مدد کے بغیر وہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ وہیں بھوکے پیاسے مر جاتے کیونکہ گل فراز پہلے ہی تجویز کر چکا تھا کہ ووٹنگ ہوگی اس لیے ایک کے مقابلے میں دو ووٹوں سے زاہد کی موت کا فیصلہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی شوکت خان اور جلال... کے تاثرات بدل گئے۔ شوکت نے زمین پر تھوک کر گالی دی۔

"ہم کو بے وقوف سمجھتا ہے۔ ہم اس کو بتائے گا۔" اس نے کہتے ہوئے جلال کی طرف دیکھا۔ "یارا تیرا کتنا ساتھی ہے لڑنے مرنے والا؟"
"ساتھی تو بہت ہیں، پر چھ ایسے ہیں جن پر میں آنکھ بند کر کے اعتبار کرتا ہوں۔"
"میں آنکھ بند کر کے اپنے باپ پر بھی اعتبار نہیں کرتا۔" شوکت خان نے کہا۔ "پر میرے پاس بھی چھ ساتھی ایسا ہے۔"
"بس تو ان کو تیار کرلو۔" جلال نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ پیسا ہمارا ہوگا۔ کسی کو ایک روپیا بھی نہیں دے گا۔"
"میرے پاس اتنی رقم آجائے تو میں اپنے ملک میں بادشاہ بن جاؤں۔" شوکت بولا۔
جلال مسکرایا۔ "ادھر اپنی حکمرانی ہے پر روپیا بڑی طاقت ہے۔ ابھی روپے کا خاطر دوسروں کے لیے جان خطرے میں ڈالتا ہے، روپیا ہوگا تو دوسرا ہمارے واسطے جان خطرے میں ڈالے گا۔"

☆☆☆

واپسی کے سفر میں عبدالرزاق نے ان دونوں کو کال کی۔ "میرے اندر ایک چیز چبھ رہی ہے، میں اس پر بات کرنا چاہتا ہوں۔"
انہوں نے گاڑیاں ایک جگہ روک لیں اور نیچے اتر آئے۔ گل فراز نے کہا۔ "کیا بات رزاق صاحب؟"
"کیا ہم جلال اور شوکت پر اعتماد کر سکتے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔
"ہاں، وہ ہمارے آدمی ہیں۔" گل فراز نے سرہلایا۔
عبدالرزاق نے نفی میں سرہلایا۔ "آج کل کوئی کسی کا نہیں ہوتا، سب پیسے کے ہوتے ہیں۔ تم لوگ دیکھو، ساری محنت وہ کر رہے ہیں۔ کام بھی انہوں نے کیا ہے۔ کیا ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئے گی؟ وہ جرائم پیشہ ہیں اور پیسے کے لیے سب کرتے ہیں۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"
گل فراز اور عبدالقادر سوچ میں پڑ گئے۔ رضوان کا نام عبدالرزاق نے تجویز کیا تھا اور اس کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا۔ گل فراز نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "ہم شوکت یا جلال کے بارے میں رضوان والا فیصلہ نہیں کر سکتے۔"
"ان کے گروہ ہیں اور وہ سب خطرناک لوگ ہیں۔" عبدالقادر نے تائید کی۔ "ان کو کچھ ہوا تو وہ ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔"
"میں بھی مارنے کو نہیں کہہ رہا لیکن ہمیں ان کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہنا چاہیے۔"
"وہ کیسے؟"
"میرا خیال ہے کہ اب رضوان کو ان سے الگ کرلیا جائے اور ہم خود اپنے آدمیوں کے ساتھ اسے بینک لے جائیں گے۔ ان لوگوں کو بس زاہد تک محدود کر دو۔"
عبدالرزاق کی تجویز نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اگر وہ رضوان کو اپنے قبضے میں کر لیتے اور اس کی مدد سے بینک سے رقم نکلوا لیتے تو انہیں جلال اور شوکت پر انحصار نہیں کرنا پڑتا۔ انہوں نے مختصر بحث کے بعد طے کیا کہ کل گل فراز دو آدمیوں کے ساتھ جائے گا اور رضوان کو وہاں سے لے آئے گا۔ جلال اور شوکت اسے نہیں روک سکتے تھے۔
اگلے دن گل فراز صبح سویرے اپنے دو آدمیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا، وہ مشین گنوں سے مسلح تھے۔ جلال اور شوکت اسے دیکھ کر چونکے۔ گل فراز نے ان کی حیرت نظرانداز کرتے ہوئے حکم دیا۔ "رضوان کو لاؤ۔"
"کیوں خان؟" شوکت نے سوال کیا۔
"سوال مت کرو... اسے لاؤ۔" گل فراز نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کے دونوں آدمی مشین گن کے دستوں پر ہاتھ رکھے چوکس کھڑے تھے۔ شوکت اور جلال نے یہ بات محسوس کرلی تھی کہ وہ اصل میں ان کی طرف سے چوکس تھے۔ اس بار شوکت نے سوال نہیں کیا اور اندر جا کر رضوان کو لے آیا۔ اس بے وقت کی طلبی سے وہ کچھ ہراساں تھا۔ گل فراز نے اس سے کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو گے۔"
"سائیں، اس کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے؟" جلال نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔
"بس ایک ضرورت ہے۔" گل فراز نے لہجہ نرم کرلیا۔ "ہمیں اس سے کچھ پوچھنا ہے۔"
"پھر اسے واپس چھوڑ جاؤ گے خان؟" شوکت نے پوچھا۔ وہ رضوان کے جانے سے بے چین لگ رہا تھا۔
"شاید۔" گل فراز نے مبہم انداز میں کہا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ وہ رضوان کو لے کر چلیں۔ اپنی آمد کے پانچ منٹ کے اندر وہ جاچکا تھا۔ جلال اور شوکت ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ پھر جلال نے غصے سے کہا۔ "تم نے دیکھی اس کی چالاکی۔"
"ہاں۔" شوکت [illegible] "اس سے کوئی فرق نہیں [illegible]"
"وہ کیسے؟" [illegible]
جلال نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "وہ رضوان کو لے گیا ہے اسی

لیے کہ اب وہ خود اسے لے جائے گا اور رقم نکلوا لے گا۔"
"اگر ہم ساتھ ہوتے تو ہماری توجہ بٹ جاتی لیکن اب ہم پوری توجہ سے اپنا کام کریں گے۔" شوکت نے پر خیال انداز میں کہا۔ "جب وہ رقم لے کر نکلیں گے تو ہم اپنا کام کر جائیں گے۔"
"ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ کب رقم نکلوانے جائیں گے؟"
"میرا ایک آدمی گل فراز کے پیچھے ہے۔ وہ ہر وقت اس پر نظر رکھے گا اور جیسے ہی وہ بینک جائیں گے، ہمیں پتا چل جائے گا۔ بس ہمیں تیار رہنا ہوگا۔"
"بینک کے آس پاس بھی دیکھنا ہوگا۔" جلال بولا۔ "انہیں روکنے اور نکلنے کے راستے پہلے سے دیکھنا ہوں گے۔"
"اب ہم یہی کام کریں گے۔" شوکت بولا۔ "گل فراز نے مجھ پر شک کر کے میرا کام آسان کر دیا ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔"
"اس کا کیا ہوگا؟" جلال نے کہا۔ اس کا اشارہ زاہد کی طرف تھا۔
شوکت مسکرایا۔ "ہم آم کے ساتھ گٹھلیوں کے دام بھی لیں گے۔ اسے آگے فروخت کر دیں گے۔"
جلال خوش ہو گیا۔ "موٹی مرغی ہے، بیس تیس کروڑ کا آرام سے چلا جائے گا۔"
"بلکہ اس سے بھی زیادہ کا جائے گا۔" شوکت بولا۔ وہ سب اپنا اپنا کھیل کھیل رہے تھے اور آنے والے وقت سے بے خبر تھے کہ وہ ان کے لیے کیا لا رہا ہے۔

☆☆☆

رضوان پریشان تھا کہ گل فراز اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ پہلے اسے ڈر لگا کہ شاید اس کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اور وہ اسے قتل کرنے لے جا رہا ہے لیکن ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ساحل کے ساتھ ایک چھوٹی مگر خوش نما کوٹھی میں داخل ہوئے اور رضوان گل فراز کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے سوال کیا۔ "مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"
"یہاں تم محفوظ ہو۔"
"وہاں میں محفوظ نہیں تھا؟"
"نہیں۔" گل فراز نے نفی میں سر ہلایا۔ "شوکت اور جلال وحشی قسم کے لوگ ہیں۔ اگر تم سے کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ تمہیں ایک لمحے میں شوٹ کر دیتے۔"
رضوان کو بھی وہ اسی قسم کے مجرم لگے تھے لیکن وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ گل فراز اسے حفاظت کے خیال سے یہاں لایا ہے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس رقم کے پیچھے کئی افراد تھے۔ یقیناً ان کے آپس میں کھینچا تانی اور تصادم کا امکان تھا۔ اس سارے معاملے میں وہ کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کا مطلب تھا کہ رقم کی ادائیگی طے پا گئی ہے۔ اس کی مدد سے وہ رقم منگواتے اور پھر اس کا پتا صاف کر دیتے۔ پولیس کو کوئی بتانے والا نہیں رہتا کہ اصل میں مجرم کون تھے۔ اسے ہی مجرم قرار دے کر اس کی تلاش کی جاتی اور اس کے گھر والوں کو ہراساں کیا جاتا۔ اس نے ایمن کو سب بتا دیا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اس کی مدد کرے گی لیکن اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ شاید وہ پولیس سے رابطہ نہیں کر پائی تھی یا اگر اس نے ایسا کچھ کیا تھا تو پولیس ان لوگوں کا ٹھکانا تلاش نہیں کر سکی تھی۔
رضوان کو بینک اکاؤنٹ کھلوائے دو دن ہو چکے تھے اور مزید دو دن بعد چیک بک اور کریڈٹ کارڈ تیار ہو کر آ جاتے۔ اس سے اگلے دن انہیں بینک جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انٹرنیٹ بینکنگ بھی آن ہو جاتی مگر اسے یہ سب استعمال کرنے کا موقع نہیں ملتا کیونکہ وہ ایک ہی بار چیک کے ذریعے رقم نکلوا لیتا۔ رضوان کو کوٹھی کی اوپری منزل میں ایک کمرا ملا تھا۔ یہاں اس کی نگرانی وہی دو مسلح افراد کر رہے تھے جو گل فراز کے ساتھ آئے تھے۔ دو دن بعد صبح کے وقت گل فراز آیا اور اس نے رضوان سے تیار ہونے کو کہا۔ "ہم بینک جا رہے ہیں۔"
"وہ کیوں... چیک بک تو کل ملے گی۔"
"آج رقم آ چکی ہے، تمہیں چیک کرنی ہے اور بینک والوں کو بتانا ہے کہ کل تمہیں یہ رقم یورو میں کیش چاہیے۔"
رضوان سمجھ گیا۔ رقم بہت زیادہ ہی بڑی تھی اس لیے بینک والوں کو پہلے بتانا ضروری تھا۔ وہ خوش ہو گیا۔ آج اسے ایمن سے ملاقات کا پھر موقع ملتا اور اگر اس نے کوئی کام کیا تھا تو اسے پتا چل جاتا۔ دوسری صورت میں واحد حل یہی رہ جاتا کہ وہ ایک بار بینک میں جانے کے بعد باہر نہیں آتا اور وہیں سے پولیس کی مدد طلب کر لیتا۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ اسے اندر اکیلا جانے دیا جائے مگر وہ کوشش تو کر سکتا تھا۔ وہ تیار ہو کر گل فراز اور دونوں مسلح افراد کے ہمراہ بینک روانہ ہوا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ وہ آج ہی موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھا لیتا۔ وہ بینک سے پولیس کو کال کر سکتا تھا، بینک والوں کو حقیقت بتا سکتا تھا مگر شاطر گل فراز نے پہلے ہی اس کا حل سوچ لیا تھا۔ اس نے رضوان کو ایک چھوٹا سا مگر موٹا پین نکال کر دکھایا۔
"یہ پین پستل ہے۔" اس نے کہا اور ڈرائیو کرنے

والے کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ اس نے تعمیل کی۔ گل فراز نے پین پستل باہر نکالا اور فٹ پاتھ پر رکھے آرائشی گملے پر فائر کیا۔ ہلکا سا دھماکا ہوا اور گولی نے سیمنٹ سے بنے گملے میں سوراخ کر دیا۔ گل فراز نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہاری کھوپڑی اس گملے سے زیادہ مضبوط نہیں ہوگی۔ میرا ایک آدمی اس سمیت اندر جائے گا اور اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو تم زندہ نہیں رہو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"
"ہاں۔" رضوان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "اس کی کیا ضرورت ہے جب میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہوں؟"
"ضرورت ہے۔" گل فراز مسکرایا۔ "کیونکہ انسان کا دماغ پلٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میں نے سوچا تمہیں پہلے خبردار کر دوں۔"
بینک میں گل فراز کا ایک آدمی اس کے ساتھ اندر آیا۔ وہ دیکھنے میں کسی قدر معقول لگتا تھا اس لیے الیکٹرانک آلے سے تلاشی کے بعد انہیں جانے دیا گیا۔ آلے نے پین پستل کی نشان دہی نہیں کی تھی کیونکہ اس کی تیاری میں دھات کا استعمال کم ہوتا ہے۔ وہ اندر آئے اور رضوان نے منیجر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ریسپشن پر موجود لڑکی نے اندر رابطہ کیا اور پھر رضوان سے بولی۔ "آپ یہاں بیٹھیں، وہ ابھی آپ سے ملتے ہیں۔"
رضوان اور دوسرا آدمی چیئرز نما نشستوں پر آ گئے۔ اسی لمحے ایمن اپنے کیبن سے نکلی اور رضوان کی طرف آ رہی تھی کہ اس نے دوسرے آدمی کو دیکھ لیا پھر اس نے محسوس کیا کہ رضوان بھی اسے نظر انداز کر رہا ہے تو وہ راستے سے واپس پلٹ گئی۔ دوسرے آدمی نے توجہ نہیں دی۔ وہ ریسپشن پر موجود لڑکی کو گھور رہا تھا۔ دس منٹ بعد منیجر نے اسے بلا لیا۔ وہ دونوں اندر پہنچے۔ تعارف کے بعد رضوان نے اکاؤنٹ اسٹیٹمنٹ کا مطالبہ کیا۔ منیجر نے اس کے اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ لانے کو کہا۔ چند منٹ بعد وہ اس کی میز پر سیل لفافے میں پہنچا دی گئی تھی۔ وہ اس نے رضوان کے سامنے رکھ دی۔ اس نے لفافے سے اسٹیٹمنٹ نکال کر دیکھی۔ اکاؤنٹ میں گزشتہ دن ایک کروڑ بارہ لاکھ یورو منتقل کیے گئے تھے۔ یہ ڈیڑھ ارب روپے کے مساوی رقم بنتی تھی۔ رضوان نے بینک منیجر سے کہا۔
"مجھے کل ایک کروڑ بارہ لاکھ یورو کی رقم درکار ہے۔"
منیجر پریشان ہو گیا۔ "اتنی بڑی رقم... یہ تو بہت مشکل ہے۔"
"اسی لیے تو آپ کو ایک دن پہلے بتا رہا ہوں۔ یہ رقم آ چکی ہے اور آپ پابند ہیں اسے ادا کرنے کے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں ایک دن میں اتنی بڑی رقم منگوانے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک کروڑ تو بہت بڑی رقم ہے۔ ہم نے آج تک پچاس لاکھ یورو سے زیادہ کی رقم نہیں منگوائی ہے۔"
"چلیے آپ کو ریکارڈ بہتر کرنے کا موقع ملے گا۔" رضوان نے کہا۔
منیجر نے سر ہلایا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن میں ایک کروڑ یورو سے زیادہ نہیں منگوا سکتا۔ بینک ریگولیشن اس کی اجازت نہیں دیتے۔"
رضوان اس بات پر دل ہی دل میں خوش تھا۔ اس نے کہا۔ "چلیے آپ اتنی رقم تو منگوائیں اور تمام رقم پانچ سو یورو کے نوٹوں کی صورت میں ہو۔"
"یہ کام ہو جائے گا۔" منیجر نے کہا۔ "رقم منتقل کیسے ہو گی؟"
"ہم خود سیکیورٹی لائیں گے۔" رضوان کے ساتھ آنے والے نے کہا۔ "آپ اس کی فکر مت کریں۔"
رضوان اب پریشان تھا۔ بینک منیجر کا رویہ کہیں سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اسے ایمن نے رضوان کے بارے میں بتایا ہو۔ وہ اسے عام کسٹمر کی طرح ڈیل کر رہا تھا۔ وہ رضوان کو اپنے کمرے سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس نے یقین دلایا کہ دن بارہ بجے تک رقم آ جائے گی۔ منیجر کے جاتے ہی ایمن اپنے کیبن سے نمودار ہوئی اور وہ بہ ظاہر بے خیالی میں رضوان سے ٹکرائی تھی پھر اس نے جلدی سے معذرت کی۔ "سوری سر! میں نے دیکھا نہیں تھا۔"
"کوئی بات نہیں۔" رضوان نے اسے غور سے دیکھا تو وہ اس سے نظریں چرا کر منیجر کے کمرے میں چلی گئی۔ رضوان کے ساتھ آنے والے نے معنی خیز انداز میں کہا۔
"مہربان لگ رہی ہے تبھی تو خود ٹکرائی تھی۔"
وہ واپس آئے کیونکہ اس بار گل فراز کا آدمی ساتھ تھا اس لیے اس نے رضوان کے ساتھ مائنڈ نہیں کیا تھا، البتہ یہ سن کر اس کا موڈ خراب ہو گیا کہ کل پوری رقم نہیں بلکہ ایک کروڑ یورو کی رقم ملے گی۔ اس نے کہا۔ "یہ کیا بکواس ہے، وہ پوری رقم دے سکتا ہے۔ تم نے اس سے کہا کیوں نہیں؟"
"آپ کا آدمی ساتھ ہے، اس سے پوچھ لیں۔ وہ تو ایک کروڑ پر بھی مشکل سے راضی ہوا ہے کیونکہ بینک میں آج تک اتنی رقم نہیں آئی۔"
"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اس سے زیادہ رقم منگوانے

پر راضی نہیں ہے۔" گل فراز کے آدمی نے رضوان کی تائید کی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ واپس آئے اور رضوان کو اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ یہ خاصا معقول کمرا تھا۔ اس میں ایک بیڈ کے ساتھ چھوٹا صوفہ سیٹ اور ایک ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی۔ واش روم بھی ساتھ تھا۔ البتہ یہاں بھی اسے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کوٹ اتار رہا تھا کہ اسے جیب میں کسی چیز کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ ڈالا اور پھر چونک گیا۔ یہ ایک چھوٹا سادہ اسکرین والا موبائل تھا۔ آج کل ایسے موبائل کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ ان کی بیٹری لانگ لائیو ہوتی ہے اور انہیں عام طور سے وہی لوگ استعمال کرتے ہیں جنہوں نے بہت زیادہ کالز کرنی ہوتی ہیں۔ موبائل آف تھا۔ رضوان واش روم میں آیا اور شاور کھول کر اس نے موبائل آن کیا تاکہ اس کی اوپننگ ٹون دب جائے مگر اس کی تمام ٹونز آف تھیں۔ اس نے فون بک چیک کی تو اس میں ایک ہی نمبر تھا اور یہ ایمن کا تھا۔ اس نے کال کی۔ ایمن نے دوسری بیل پر ریسیو کر لی۔

"ہیلو۔"

"میں ہوں رضوان۔" اس نے کہا۔

"شکر ہے۔" ایمن نے سکون کا سانس لیا۔ "ورنہ میں ڈر رہی تھی کہ تمہاری تلاشی نہ لی گئی ہو۔"

"مجھے تو خود یہاں آکر پتا چلا ہے۔"

"سنو، میں ابھی کھل کر بات نہیں کر سکتی۔" ایمن بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔ "ایک گھنٹے بعد میں لنچ کے لیے نکلوں گی تب تم سے بات کروں گی۔ تم ایک گھنٹے بعد کال کرنا... اوکے؟"

"اوکے۔" رضوان نے کہا۔ وہ خوش تھا کہ ایمن اس کے لیے کچھ کر رہی تھی لیکن بینک میں بات نہ کرنے کا مطلب تھا کہ بینک والے شاید اس معاملے میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس نے کال بند کرنے کے بعد موبائل بھی آف کر دیا اور پھر اسے واش روم کے روشن دان پر یوں رکھ دیا کہ جب تک کوئی چڑھ کر نہ دیکھتا، موبائل اسے نظر نہیں آتا۔ وہ باہر آیا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اس کا ایک نگراں اس کے لیے کھانا لے آیا تھا۔ یہ زنگر برگر اور ساتھ میں فرنچ فرائز اور کولڈ ڈرنک کا ٹن تھا۔ اسے زیادہ تر ایسے ہی تیار چیزیں ملتی تھیں۔ البتہ چائے یہیں بنائی جاتی تھی۔ اس نے لنچ کیا اور ٹہلتا رہا۔ اس کے پاس گھڑی نہیں تھی، موبائل میں تھی مگر اسے بند کر کے رکھا تھا۔ رضوان بار بار اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے اندازے سے اس نے ایک گھنٹے کا وقت گزارا۔ پھر اس نے کپڑے اتارے اور واش روم میں گھس گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر کے اس نے کموڈ پر چڑھ کر موبائل اٹھایا اور کال ملانے سے پہلے شاور چلا دیا۔ ایمن باہر آچکی تھی کیونکہ اس نے فوری کال ریسیو کی۔

"تم نے لیٹ کال کی ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کا لنچ بریک ملتا ہے، اس میں سے بیس منٹ گزر چکے ہیں۔"

"سوری... لیکن میرے خیال میں چالیس منٹ کافی ہیں۔" رضوان نے کہا۔ "اب بتاؤ تم نے کچھ کیا؟"

"ہاں، پہلے میں نے اپنے برانچ منیجر سے بات کی اور اس نے اوپر والوں سے بات کی لیکن ان کی طرف سے کسی قسم کا کوئی ایکشن لینے سے انکار کر دیا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک بینک رولز کی وائلیشن نہیں ہوگی، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"بینک رولز۔" رضوان نے تلخی سے کہا۔ "میں نے ایک بات جان لی ہے۔ اس ملک میں رولز کی جتنی وائلیشن بینک کرتے ہیں کوئی دوسرا ادارہ نہیں کرتا ہے۔ بہر حال پھر تم نے کیا کیا؟"

"پھر میں نے اپنے ایک انکل سے بات کی۔ وہ سی آئی ڈی میں کام کرتے ہیں اور اچھی پوسٹ پر ہیں۔ آئی تھنک ایس پی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ کوشش کریں گے، ان مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی۔ اس صورت میں تمہیں بھی فائدہ ہوگا اور زاہد ہاتھ آیا تو تم پر جو کیس ہے، وہ بھی کلیئر ہو جائے گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" رضوان خوش ہو گیا پھر اس نے تفصیل سے ایمن کو بتایا کہ ان لوگوں کا کیا پروگرام ہے اور کیا عزائم ہیں۔ اس نے آخر میں کہا۔ "ایمن! مجھے لگ رہا ہے کہ یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔ کام نکلتے ہی مار ڈالیں گے اور اس کے بعد تمام الزام مجھ پر لگ جائے گا کیونکہ تاوان کی رقم میرے اکاؤنٹ میں آئی ہے۔"

"تم فکر مت کرو، میرے انکل ان لوگوں کو پکڑ لیں گے۔ میں یہ گفتگو ریکارڈ کر رہی ہوں تاکہ انہیں سنا سکوں۔ تم ان لوگوں کے نام ایک بار پھر دہراؤ گے جو اس معاملے میں ملوث ہیں۔"

"میرے سامنے گل فراز خان نامی شخص آیا۔ وہ زاہد کی اسٹاک فرم میں ڈائریکٹر تھا۔ دو جرائم پیشہ افراد جن میں سے ایک اندرون صوبے کا ہے، اس کا نام جلال منگی ہے اور دوسرا یہیں کا رہنے والا ہے لیکن اس کا تعلق علاقہ غیر سے ہے۔ اس کا نام شوکت خان ہے۔ دونوں جرائم پیشہ گروہ چلا

رہے ہیں اور اغوا برائے تاوان کے دھندے میں ملوث ہیں۔ تیسرا فرد مقیم خان تھا، وہ شوکت خان کا آدمی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اس غیر آباد علاقے کے مکان میں زاہد احمد بھی ہے لیکن میں نے اسے دیکھا نہیں۔ کل گل فراز خان مجھے وہاں سے نکال کر ڈیفنس کی ایک کوٹھی میں لے آیا ہے۔" رضوان نے کوٹھی کا نمبر اور لوکیشن بتائی۔ "یہاں گل فراز کے دو آدمی میری نگرانی کر رہے ہیں۔ مجھے کمرے سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"اتنا کافی ہے۔ میں آفس کے بعد انکل سے ملتی ہوں۔ وہ کل تک تمام انتظامات کر لیں گے۔ رضوان! تم گھبرانا مت... اللہ نے چاہا تو تم بالکل صحیح سلامت ان کے قبضے سے نکل آؤ گے اور کیس بھی ختم ہو جائے گا۔ یہ اچھا ہوا کہ کل ایک کروڑ یورو کی رقم دی جائے گی۔ یہ باقی بارہ لاکھ حاصل کرنے کے لیے تمہارے محتاج ہوں گے۔"

"انشاء اللہ۔" رضوان نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ "ایمن! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

ایمن ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "رضوان! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ تم رات آٹھ بجے کے بعد کال کرنا، میں انکل کی ہدایات تم تک پہنچاؤں گی۔"

فون بند کر کے رکھتے ہوئے رضوان کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید ایمن اسے اب تک بھول چکی ہوگی اور اپنی زندگی میں خوش ہوگی لیکن اس کے آخری جملے سے واضح تھا کہ وہ اسے بھولی نہیں تھی۔ محبت بھولنے والی چیز ہوتی بھی نہیں ہے۔ اس نے مختصر غسل کیا اور باہر آیا تو گل فراز کا ایک آدمی وہاں موجود تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے رضوان کو دیکھا۔ "تم اتنی دیر سے اندر کیا کر رہے تھے؟"

"نہا رہا تھا۔" رضوان نے تولیا لپیٹے ہوئے کہا۔ "اب تم باہر جاؤ تو میں کپڑے پہن لوں؟"

وہ رضوان کو گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ سوٹ کے علاوہ رضوان کے پاس صرف ایک جوڑا تھا۔ یہ سادہ جینز اور شرٹ تھی۔ ایک جوڑا سلیپر تھا۔ سوٹ اور جوتے اسے احتیاط سے استعمال کرنے کو کہا گیا تھا تاکہ بہ وقت ضرورت بالکل صاف ستھرے ہوں اور استری کا جھنجھٹ نہ کرنا پڑے۔ رضوان کپڑے پہن کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آنے والا کل اس کے لیے کیا لاتا ہے؟

☆☆☆

رضوان کے ہمراہ گل والا آدمی تھا، وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ دونوں بینک میں داخل ہوئے تو ریسپشن پر موجود لڑکی نے چونک کر انہیں دیکھا اور غیر محسوس انداز میں ایک بٹن دبایا۔ رضوان اس کے پاس آیا۔ "ایکسکیوز می... مجھے منیجر سے ملنا ہے۔"

"آپ بیٹھیں۔" اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا اور منیجر کو اطلاع دینے لگی۔ رضوان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ اپنے جذبات اپنے چہرے پر آنے سے روک رہا تھا۔ چند منٹ بعد منیجر نے اپنے کمرے سے باہر آکر رضوان سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کی چیک بک آگئی ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔"

دوسرے آدمی نے رضوان کے ساتھ جانا چاہا لیکن منیجر نے اسے روک دیا۔ "سوری سر! یہ بڑے کیش کا معاملہ ہے۔ رول کے تحت صرف ایک شخص اسٹرانگ روم میں جا سکتا ہے جو کیش کا مالک ہوگا۔"

"یہ میرے ساتھ ہے۔" رضوان نے کہا لیکن منیجر کا سر نفی میں ہلتا رہا۔

"پلیز! آپ بات سمجھیں، یہ رولز کے خلاف ہے۔"

"رقم زیادہ ہے اسے اٹھا کر لانا ہوگا۔" دوسرے آدمی نے اصرار کیا۔

"اس کام کے لیے بینک میں ملازم ہیں۔" منیجر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ اس نے رضوان سے کہا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

دوسرے آدمی نے رضوان کو دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں اسے خبردار کیا کہ وہ کسی غلط حرکت سے گریز کرے۔ رضوان منیجر کے ساتھ اندر آیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی بدمزہ لہجے میں کہا۔ "آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اب میں اوپر والوں کو کیا جواب دوں گا؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ آپ کس طرح مشکل میں ہیں۔"

منیجر اسے اپنے کمرے میں لایا تھا اور وہاں تین عدد بیگ تیار رکھے تھے۔ "ان میں آپ کی مرضی کے مطابق کرنسی موجود ہے لیکن یہ ساری جعلی کرنسی ہے، پورے ایک کروڑ یورو کی۔ میں سی آئی ڈی کے حکم پر ایسا کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔"

رضوان فکر مند ہو گیا کیونکہ اسے جعلی کرنسی کا نہیں بتایا تھا۔ اس نے منیجر کی طرف دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ چیک کی ضرورت نہیں ہے؟"

''ہاں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے نوٹ چیک کرلیں۔ یہ ہر گڈی میں صرف اوپر نیچے کے نوٹ اصلی ہیں، باقی اندر کے جعلی ہیں مگر یہ بھی اچھی نقل ہے۔ ہر شخص انہیں نہیں پکڑ سکتا ہے۔''

رضوان کو نہیں معلوم تھا کہ گل فراز کا پلان کیا ہے، بس اس نے اسے اتنا بتایا تھا کہ اسے رقم تین بیگز میں تیار کرانی ہے۔ ہر بیگ کی رقم بھی اس نے بتائی تھی۔ ایک بیگ میں چالیس لاکھ یورو ہونے چاہیے تھے۔ یہ گل فراز کا بیگ تھا۔ باقی دو میں تیس تیس لاکھ یورو ہوتے اور یہ بیگ عبدالرزاق اور عبدالقادر کے لیے ہوتے۔ رضوان گل فراز کے دونوں آدمیوں کے ہمراہ بینک آیا تھا اور اسے ان کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ بہر حال یہ ایمن کے انکل کا کام تھا۔ اس نے منیجر سے کہا۔ ''میری چیک بک اور کریڈٹ کارڈ کہاں ہیں؟''

منیجر کو کیونکہ ان کے بارے میں کوئی ہدایات نہیں تھیں اس لیے اس نے دونوں چیزیں رضوان کے حوالے کر دیں کیونکہ ابھی وقت تھا اس لیے رضوان نے انٹرنیٹ بینکنگ کا پروسیس بھی وہیں بیٹھ کر مکمل کر لیا۔ منیجر نے اپنا کمپیوٹر اس کے حوالے کر دیا تھا۔ بینک میں انٹرنیٹ کے علاوہ عام انٹرنیٹ بھی تھا۔ رضوان انٹرنیٹ استعمال کر رہا تھا۔ وہ تقریباً آدھا گھنٹا کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہا پھر اس نے اکاؤنٹ بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔ منیجر مضطرب تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر بینک کے باہر گولیاں چلیں اور مار اماری ہوئی تو اس کا اثر برانچ کی ساکھ پر پڑے گا اور ظاہر ہے اس پر بھی پڑے گا۔ رضوان نے دو ہلکے بیگ اٹھائے اور نسبتاً بھاری بیگ منیجر نے اٹھایا۔ وہ باہر آئے جہاں گل فراز کا آدمی پریشان صورت کے ساتھ موجود تھا۔ رضوان کو بیگز کے ساتھ دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا اور جلدی سے آگے آیا۔ اس نے منیجر سے بیگ لے لیا۔ وہ باہر نکلے تو اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''اتنی دیر کیوں لگائی؟''

''رقم گن رہا تھا۔'' رضوان نے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایمن کے انکل ایس پی نے اسے باہر آنے کو کیوں کہا اس لیے کہ تمام مجرم رنگے ہاتھ پکڑے جائیں لیکن اس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی۔ وہ سب خطرناک حد تک مسلح تھے اور انسان کی جان لینے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے۔ اگر انہیں ذرا بھی شک ہو جاتا کہ رضوان نے دھوکا کیا ہے تو وہ اسے سب سے پہلے شوٹ کرتے۔ باہر جاتے ہوئے اس کے قدم لرز رہے تھے اور بیگ بہت وزنی لگ رہے تھے۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھے تھے کہ اس کے آگے پیچھے تین گاڑیوں سے گل فراز، عبدالرزاق اور عبدالقادر اپنے مسلح ساتھیوں سمیت نکل آئے۔ ہر ایک کے دو مسلح افراد گارڈز کی وردیوں میں تھے۔ وہ رضوان کی طرف بڑھے۔ گل فراز نے قریب آنے پر دھیمی آواز میں کہا۔ ''جیسا تم سے کہا تھا بیگز ویسے ہی بنوائے ہیں؟''

رضوان نے خود پر قابو پاتے ہوئے سر ہلایا۔ ''میں نے رقم اسی حساب سے رکھی ہے۔ آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔''

''منیجر سے باقی رقم کے لیے کہہ دیا تھا... وہ ہم کل نکلوائیں گے؟''

اس بار رضوان نے صرف سر ہلایا۔ آنے والے مسلح افراد بہت چوکنا تھے اور رقم کے بیگز سے زیادہ ان کی توجہ ایک دوسرے کی طرف تھی۔ رضوان اور اس کے ساتھ جانے والے نے بیگ نیچے رکھ دیے اور وہ گل فراز، عبدالرزاق اور عبدالقادر نے اٹھا لیے۔ ان کے آدمی ہتھیار بدست چوکنا تھے۔ وہ پیچھے ہٹے تو ان کے آدمی بھی ان کے ساتھ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی گاڑیوں تک پہنچ گئے۔ رضوان اور گل فراز کا ساتھی سڑک پر تھے۔ اس نے رضوان کے شانے پر تھپکی دی۔ ''آؤ چلیں... ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ کل پھر بینک آنا ہوگا۔''

ابھی تک پولیس یا کسی بھی سرکاری ایجنسی کی آمد کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ یہ دو رویہ سڑک تھی۔ رضوان کو خیال آیا کہ شاید سرے سے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ایمن کے انکل ایس پی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا مگر وہ بہت پُراعتماد تھی اور اس نے رضوان کو بتایا تھا کہ ان لوگوں کو رقم سمیت گرفتار کرنے کی حکمت عملی تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد غیر آباد جگہ والے ٹھکانے پر چھاپا مار کر زاہد کو برآمد کرنا تھا۔ ایک بار تمام مجرم گرفت میں آ جاتے تو رضوان کی جان بھی چھوٹ جاتی اور اسے آئندہ کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہتا۔ وہ کار کے پاس پہنچے۔ گل فراز کی گاڑی اس سے آگے تھی جبکہ پیچھے عبدالرزاق اور عبدالقادر کی گاڑیاں تھیں۔ جیسے ہی گل فراز کی گاڑی حرکت میں آئی، اچانک ہی سامنے اور عقب سے دو بڑی لینڈ کروزر نمودار ہوئیں۔

جیپوں کی دونوں طرف پچھلی کھڑکیوں سے دو افراد کے نصف جسم باہر آئے اور ان کے ہاتھوں میں موجود خودکار رائفلیں گولیاں برسانے لگیں۔ ان کا پہلا نشانہ وہ مسلح گارڈز

بنے جو ابھی گاڑیوں کے باہر تھے۔ مرنے والوں کی چیخیں بلند ہوئیں اور پھر فائرنگ کے شور میں دب گئیں۔ آنے والے بلا امتیاز سب پر گولیاں برسا رہے تھے۔ رضوان سمیت سب کے لیے یہ غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ رضوان گاڑی میں بیٹھنے جا رہا تھا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ بینک کی طرف بھاگے مگر فوراً عقل آ گئی۔ کھلی سڑک پر وہ آسانی سے نشانہ بن جاتا۔ وہ نیچے گرا اور کار کے نیچے رینگ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والا جوابی کارروائی کے لیے کار سے باہر نکلا تھا کہ گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ وہ رضوان کے سامنے نیچے گرا اور ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ایک گولی اس کی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی گزر گئی تھی۔

جو بچ گئے تھے، وہ جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔ آنے والی دونوں لینڈ کروزر کچھ فاصلے پر رک گئیں اور ان سے جلال اور شوکت اترے۔ وہ پوری تیاری سے آئے تھے اور ان کے ساتھی مارنے کے لیے فائرنگ کر رہے تھے۔ رضوان گاڑی کے نیچے دبکا چیخیں سن رہا تھا اور اسے آنے والے کسی قدر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر ان میں سے بھی کچھ جوابی فائرنگ کا نشانہ بنے۔ ایک منٹ میں یہ پُرامن اور تقریباً ویران سڑک میدانِ جنگ بن گئی تھی۔ اپنے کچھ ساتھی نشانہ بننے کے بعد جلال اور شوکت محتاط ہو گئے تھے۔ اب وہ بے دھڑک آگے آنے کے بجائے آڑ لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا مقصد رقم کے بیگز حاصل کرنا تھا اور دوسری طرف ان تینوں کے آدمی رقم بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔ دونوں بے خبر تھے کہ بیگز میں جعلی کرنسی ہے۔

اسی دوران میں چار عدد بکتر بند گاڑیاں نکل کر اس طرح سڑک پر آ گئیں کہ انہوں نے سڑک کو دونوں طرف سے بلاک کر دیا اور پھر ان سے اسپیشل فورس کے اہلکار نکل کر پوزیشن سنبھالنے لگے۔ پولیس کی طرف سے وارننگ دی جانے لگی کہ فائرنگ کرنے والے ہتھیار پھینک کر خود کو پولیس کے حوالے کر دیں۔ یہ گل فراز اینڈ پارٹی اور آنے والوں کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ وہ گرفتاری دینے والے لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے اسپیشل فورس پر فائرنگ شروع کر دی۔ جواب میں ان کی طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ بینک گارڈز سمٹ کر بینک کی طرف چلے گئے تھے اور انہوں نے وہاں پوزیشن سنبھال لی تھی مگر انہوں نے فائرنگ نہیں کی۔ پولیس کا سامنا ہوا تو دونوں متحارب گروپ ایک ہو گئے۔ مگر پولیس کی جانب سے گھیرا ایسا تنگ تھا کہ فرار کی جگہ نہیں تھی۔ کچھ افراد نے بینک میں گھسنے کی کوشش تو گارڈز نے ان کا استقبال کیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب فائرنگ رکی اور بچ جانے والے افراد نے ہتھیار ڈالے تو شاید ہی کوئی ایسا فرد تھا جسے گولی نہ لگی ہو۔ گل فراز، عبدالقادر، جلال اور شوکت مارے گئے تھے۔ عبدالرزاق زخمیوں میں شامل تھا۔ مجموعی طور پر دس مارے گئے تھے اور ایک درجن شدید زخمی تھے۔ پکڑے جانے والوں کی تعداد سولہ تھی۔

کچھ دیر بعد میڈیا کی ٹیمیں وہاں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ پولیس نے اس پورے علاقے کو گھیر رکھا تھا۔ سب سے پہلے رقم کے بیگز اندر بینک میں پہنچائے گئے کیونکہ ان کے اصل نوٹ بینک کی امانت تھے اور پھر ایک ٹیم رضوان کے ہمراہ زاہد والے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوئی۔ ایمن رضوان سے ملنا چاہتی تھی لیکن اس کا موقع نہیں تھا۔ جب رضوان پولیس کے ہمراہ وہاں پہنچا تو وہاں صرف مقیم خان تھا اور اس نے مزاحمت کی لیکن پولیس والوں نے اسے قابو کر لیا۔ بھوکا پیاسا زاہد ایک کمرے میں قید تھا اور جب کمرا کھولا گیا تو زاہد بہ ظاہر مردہ ہو گیا تھا مگر وہ زندہ تھا۔ البتہ پیاس سے اس کی جان لبوں پر آ گئی تھی۔ اسے پانی دیا گیا تو وہ پھر سے جی اٹھا مگر جب اس نے سامنے رضوان کو دیکھا تو مرجھا گیا۔

''تم...؟''

''ہاں میں۔'' رضوان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرے لیے جو گڑھا کھودا تھا۔ اس میں خود گر گئے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''میں تمہارا احسان مند ہوں۔ اگر تم کچھ دیر اور کرتے تو شاید میں زندہ نہ ملتا۔ چار دن میں مجھے صرف ایک گلاس پانی دیا گیا ہے۔''

رضوان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے بے وقوف مت بناؤ، مجھے معلوم ہے۔ ابھی تم پولیس کی تحویل میں جاؤ گے اور خود کو بچانے کے لیے مجھے پھنسوانے کی پوری کوشش کرو گے۔''

''انہوں نے رقم تمہارے اکاؤنٹ میں منگوائی ہے نا؟''

''ہاں، وہ میرے اکاؤنٹ میں ہے۔''

زاہد نے پیشکش کی۔ ''اگر تم وہ رقم واپس کر دو تو میں تمہارا کیس ختم کرا دوں گا۔''

''پہلے کیس ختم کرا دو، اس کے بعد بات

کرتا۔" رضوان نے جواب دیا۔ پولیس مقیم خان کو ہتھکڑی بدست اور ان دونوں کو لے کر واپس روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

رضوان اور ایمن ائر پورٹ میکڈونلڈز میں بیٹھے تھے۔ رضوان کا بیگ اس کے ساتھ رکھا تھا اور دو گھنٹے بعد اس کی اسلام آباد کے لیے فلائٹ تھی۔ تین ہفتے لگے تھے تب رضوان کو گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ اس سارے قصے کا تیسرا کردار عبدالرزاق بھی اسپتال میں دم توڑ گیا تھا۔ شوکت اور جلال کے مزید ساتھی گرفتار ہوئے تھے۔ انویسٹی گیشن میں زاہد کی طرف سے منی لانڈرنگ کا کیس بھی سامنے آگیا تھا اور وہ گرفتار تھا۔ رضوان کا دوسرا اکاؤنٹ بھی سیز کر دیا گیا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ حلال کمانے پر یقین رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ اس کے نصیب میں جو ہے وہ اسے ضرور ملے گا۔ معاملہ عدالت میں جا چکا تھا۔ ایمن کے ایس پی انکل اس سے خوش تھے کیونکہ اسی کے توسط سے انہیں یہ کیس ملا تھا اور انہیں یقین تھا کہ اس کے صلے میں جلد ان کی ایس ایس پی کے عہدے پر ترقی ہو جائے گی۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے رضوان کو رعایت دلوائی تھی اور اب اسے عدالت میں بھی پیش نہیں ہونا تھا۔ اغوا برائے تاوان کے اصل مجرم مارے جا چکے تھے اور صرف زاہد کا کیس تھا۔ اس نے اکاؤنٹ میں موجود رقم کی واپسی کے بدلے قبول کر لیا تھا کہ اکاؤنٹ اس کا تھا اور وہی زرِمبادلہ باہر بھیجنے کا ذمے دار تھا۔ ایمن افسردہ تھی۔

"یہ شاید ہماری آخری ملاقات ہے؟"

"شاید۔" رضوان نے کہا۔ اس لمحے اس کے دل نے بے اختیار خواہش کی کہ کاش وہ نادیہ سے رشتے کی زنجیر میں نہ جکڑا ہوتا۔ ایمن کی محبت نے اس کے اندر جگہ بنالی تھی مگر وہ اس کا اقرار نہیں کر سکتا تھا۔ ایمن نے گھڑی دیکھی اور چونک گئی۔

"تمہاری فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے۔"

رضوان ایمن سے رخصت ہونے لگا تو اس کا دل چاہا کہ وہ اسے ایک بار کہہ دے کہ وہ اسے پسند کرتا ہے۔ اس نے ایمن کا ہاتھ تھام لیا اور ایمن سراپا انتظار بن گئی مگر رضوان کہہ نہیں سکا۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر بوجھل قدموں سے ٹرمنل کی طرف بڑھ گیا۔ چار گھنٹے بعد وہ گھر میں تھا جہاں ماں اسے بار بار پیار کر رہی تھی اور بہنیں چمٹی جا رہی تھیں۔ بھائی اس کے ہاتھ پکڑ کر بیٹھے تھے۔ عدنان کہہ رہا تھا۔ "رضوان بھائی... آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی صرف جاب کروں گا۔"

"نہیں، تم اپنا ایم بی اے مکمل کرو گے۔"

"ہاں میرے بچے... ہم جیسے تیسے گزارہ کر لیں گے مگر اب تجھے دور نہیں جانے دیں گے۔"

سینا اور آمنہ گھر چلانے کے لیے اسکول میں نوکری کرنے کا سوچ رہی تھیں مگر جسے رضوان کی زندگی میں آنا تھا اور ساری زندگی ساتھ نبھانا تھا، وہ پہلی آزمائش میں ہمت ہار گئی۔ فاطمہ کی بہن نے رضوان کی واپسی کے ایک ہفتے بعد ہی رشتہ ختم کر دیا۔ فاطمہ ششدر رہ گئیں۔ "مگر کیوں؟"

"رضوان کی جاب نہیں ہے اور آج کل جاب کہاں ملتی ہے۔ نادیہ کے لیے ایک رشتہ ہے، ہم نے وہاں ہاں کر دی ہے۔"

"یہ تو نے کیا کیا؟ میرا بچہ بے روزگار ہوا ہے مگر اس کے پاس تعلیم ہے، تجربہ ہے۔ آج نہیں تو کل اسے ملازمت مل جائے گی۔"

"ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے۔" بہن نے آنکھیں ماتھے پر رکھ کر کہا۔

رضوان کو پتا چلا تو اسے شاک لگا مگر پھر اسے خوشی ہونے لگی۔ اس نے ماں کو بتایا کہ اسے کراچی میں ایک لڑکی ملی تھی اور وہ آج جو زندہ سلامت گھر والوں کے ساتھ ہے تو اس میں اس کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ فاطمہ بے تاب ہو گئیں۔ "رضوان! تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ تیری خوشی میری خوشی ہوتی۔"

"امی ابھی میں بے روزگار ہوں۔"

مگر اسی رات اسے ایمن کے کزن کی ای میل ملی۔ اس نے جاب کے لیے رضوان کے ڈاکیومنٹس اسکین کر کے بھیجنے کو کہا تھا۔ دو دن بعد اسکائپ پر اس کا انٹرویو ہوا اور اسے جاب مل گئی۔ اسے فوری طور پر پاسپورٹ سمیت یو اے ای کے سفارت خانے سے رجوع کرنے کو کہا گیا تھا اور اسی دن رضوان نے ایمن کو کال کی۔ "میں آتے ہوئے تم سے ایک بات کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا تھا۔"

"کون سی بات؟"

"ایمن... میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہیں اپنی زندگی کے سفر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ بولو مجھ سے شادی کرو گی؟"

ایمن ہنسی تو اس کی کھنک نے رضوان کے سوال کا جواب دے دیا۔

⊖